سلسلة احياء التراث العلمي
للامام
النواب محمد صديق حسن خان القنوجي

مجموعہ رسائلِ عقیدہ

تسہیل و تخریج

حافظ عبداللہ سلیم   حافظ شاہد محمود

کمپوزنگ	نقیب الرحمن
سیٹنگ	ابوسفیان عزیزی 0321-6487621
طبع اول	جولائی 2013ء
قیمت	

دار ابی الطیب
للنشر والتوزیع

گل روڈ جمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ ۔ فون 055-3823990 / 0321-6466422

Contact us: hasanshahid85@hotmail.com

فہرست

⑧ الانفکاك عن مراسم الإشراك

پہلی فصل

دوسری فصل

تیسری فصل

چوتھی فصل

پانچویں فصل

⑨ دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع

باب اول

باب دوم

باب سوم

باب چہارم

باب پنجم

باب ششم

باب ہفتم

⑩ سائق العباد إلى صحة الاعتقاد

⑪ دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمان

پہلا باب

دوسرا باب

تیسرا باب

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

ساتواں باب

الانفكاك
عن
مراسم الإشراك

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله القائل في كتابه العزيز ﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ والصلاة والسلام على خير خلقه محمد وآله وصحبه ومن تبعهم بالإحسان في الإيمان والإسلام أبدا. أما بعد:

بندگی کا معیار:

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ تمام لوگ اللہ کے بندے ہیں۔ بندے کا کام بندگی کرنا ہوتا ہے اور جو بندہ بندگی نہ کرے، وہ بندہ نہیں ہوتا۔ اصل بندگی ایمان کا درست کرنا ہے۔ جس کے ایمان میں کچھ خلل ہے، اس کی بندگی قبول نہیں اور جس کا ایمان درست ہے، اس کی تھوڑی سی بندگی بھی بہت ہے۔

بندگی کی بہترین راہ یہ ہے کہ بندہ اللہ و رسول کے احکام کو اصل جانے، اسی کی سند پکڑے اور اپنی عقل کو اس میں دخل نہ دے۔ جس عالم یا درویش کا کلام اس کے موافق ہو، قبول کر لے اور جو اس کے موافق نہ ہو، اس کو سند نہ بنائے، اسی طرح جو راہ و رسم اس کے خلاف ہو، اسے ترک کر دے۔

دین فہمی کے لیے تھوڑا سا علم بھی کافی ہے:

اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کلام سمجھنے کے لیے بہت زیادہ علم نہیں چاہیے، کیونکہ پیغمبر تو نادانوں کو راہ بتانے، جاہلوں کو سمجھانے اور بے علموں کو علم سکھانے کے لیے آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الجمعة: ۲]

[وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول انھی میں سے بھیجا، جو ان کے سامنے اس کی آیات پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے، حالانکہ بلاشبہہ وہ اس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں تھے]

ایک جگہ فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ [البقرة: ٩٩]

[اور بلاشبہ یقیناً ہم نے تیری طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور ان سے کفر نہیں کرتے مگر جو فاسق ہیں]

اب کہاں رہی یہ بات کہ پیغمبر کی بات کو علما کے سوا کوئی نہیں سمجھتا اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر بزرگوں کے سوا کوئی نہیں چل سکتا؟ اس کے بجائے یوں کہنا چاہیے کہ جاہل لوگ اللہ و رسول کا کلام سمجھ کر عالم بن جاتے ہیں اور گمراہ لوگ ان کی راہ پر چل کر ہدایت یافتہ بزرگ بن جاتے ہیں۔

ایمان کے دو اجزا:

ایمان کے دو جزو ہوتے ہیں۔ ایک اللہ کو اللہ جاننا اور دوسرا رسول کو رسول سمجھنا۔ اللہ کو اللہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ کسی بات میں کسی کو اس کا شریک نہ سمجھے اور رسول کو رسول سمجھنا اس طرح ہوتا ہے کہ اس کے سوا کسی کی راہ اختیار نہ کرے۔ پہلی بات کو توحید اور اس کے خلاف کو شرک کہتے ہیں اور دوسری بات کو اتباعِ سنت کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو بدعت۔ لہٰذا ہر مسلمان پر فرض ہے کہ توحید و اتباعِ سنت کو خوب مضبوطی سے تھامے اور شرک و بدعت سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرے، کیونکہ یہ دونوں چیزیں اصل ایمان میں خلل ڈالتی ہیں، ان کے سوا دیگر گناہ ان کے بعد ہیں، کیونکہ وہ صرف اعمال میں خلل پیدا کرتے ہیں۔

مقدمہ

توحید وشرک کا بیان

دعویٰ ایمان کا ...کام مشرکوں والے:

اکثر لوگ توحید وشرک کے معانی تک نہیں سمجھتے، لیکن پھر بھی وہ ایمان کا دعویٰ رکھتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [یوسف: ۱۰۶]

[اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، مگر اس حال میں کہ وہ شریک بنانے والے ہوتے ہیں]

مطلب یہ ہے کہ اکثر لوگ ایمان لا کر بھی شرک کرتے ہیں اور پیروں، پیغمبروں، اماموں، شہیدوں، فرشتوں اور پریوں کو مشکل کے وقت پکارتے ہیں، ان سے مرادیں مانگتے ہیں، ان کی منتیں مانتے ہیں، اپنے کام نکلوانے کے لیے ان کی نذر ونیاز کرتے ہیں، بلا وآزمایش ٹالنے کے لیے اپنی اولاد کو ان کی طرف منسوب کرتے ہیں، کوئی اپنے بیٹے کا نام عبدالنبی رکھتا ہے تو کوئی پیر بخش اور غلام محی الدین۔ کوئی اپنے بچوں کی زندگی کی خاطر کسی کے نام کی چوٹی رکھتا ہے تو کوئی انھیں کسی کے نام کا پٹکا یا کپڑے پہناتا ہے، کوئی کسی کے نام کی بیڑی پہنتا ہے، کوئی کسی کے نام کا جانور ذبح کرتا ہے، کوئی مشکل کے وقت کسی کی دہائی دیتا ہے اور کوئی اپنی گفتگو میں کسی کے نام کی قسم کھاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام شریک بے اختیار ہیں:

اللہ تعالیٰ بندوں کے سب سے زیادہ نزدیک ہے۔ اللہ کو چھوڑ کر مشرک لوگ جن کو پکارتے ہیں، اللہ نے انھیں کچھ قدرت نہیں دی، نہ کسی کو فائدہ پہنچانے کی نہ کسی کا نقصان کرنے کی۔ وہ کسی کے سفارشی بھی نہیں بن سکتے، حتی کہ انبیا کی سفارش بھی اللہ کے اختیار میں ہے۔ مشرکوں کے ٹھہرائے

ہوئے ان شریکوں کو پکارنے نہ پکارنے سے کچھ نہیں ہوتا ہے، بلکہ جو شخص کسی کو سفارشی سمجھ کر پوجے تو وہ بھی مشرک ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ بندے کے سب سے زیادہ قریب ہے اور اپنے فضل و کرم سے کسی واسطے اور طفیل کے بغیر سب مرادیں پوری کرتا ہے اور سب بلائیں ٹال دیتا ہے۔ اگر بندہ اس مشکل کشا و حاجت روا اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر الٹی راہ پر چلے گا تو جیسے جیسے اس راہ میں چلے گا، ویسے ویسے اللہ سے دور ہوتا جائے گا۔

کافروں سے بھی اگر پوچھو کہ وہ ہستی کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی مکمل بادشاہی ہے اور وہ پناہ دیتا ہے اور اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دی جاتی؟ تو وہ بھی ضرور کہیں گے کہ اللہ ہے، پھر یہ کہاں سے خبطی ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں کسی کو تصرف کرنے کی قدرت نہیں دی ہے اور کوئی کسی کی حمایت کرتے ہوئے اسے پناہ نہیں دے سکتا۔

زمانۂ جاہلیت کے شرک کی نوعیت:

رسول اللہ ﷺ کے دور میں کافر بھی اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں جانتے تھے، بلکہ انھیں اللہ کا بندہ اور مخلوق سمجھتے تھے اور پھر بھی وہ کافر اور مشرک تھے، کیونکہ وہ ان معبودوں کو پکارتے، ان کی منتیں مانتے، ان کی نذر و نیاز کرتے اور انھیں اپنا وکیل اور سفارشی سمجھتے تھے، لہٰذا جو شخص کسی سے یہ معاملہ کرے، چاہے اسے اللہ کا بندہ اور مخلوق سمجھے، تو وہ اور ابوجہل شرک میں برابر ہیں۔

شرک کی حقیقت:

شرک محض اسی پر موقوف نہیں ہے کہ انسان کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے، بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے حق میں بندگی کا نشان و علامت ٹھہرائی ہیں، وہ کسی اور کے لیے کرے، جیسے کسی کو سجدہ کرنا، جانور کسی کے نام پر وقف اور ذبح کرنا، اس کی منت ماننا، مشکل کے وقت اسے پکارنا، اسے ہر جگہ حاضر و ناظر سمجھنا اور اس کے لیے تصرف کی قدرت ثابت کرنا؛ ان سب باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ یاد رہے کہ اس بات میں انبیا و اولیا، جن و شیاطین اور بھوت و پری میں کچھ فرق نہیں ہے۔ یعنی بندہ جس کسی سے یہ معاملہ کرے گا، وہ مشرک ہو جائے گا، خواہ وہ یہ معاملہ انبیا، اولیا، پیروں اور شہیدوں ہی سے کیوں نہ کرے، جو اللہ کے نیک بندے ہیں یا خواہ بھوت و پری اور بتوں سے یہ معاملہ کرے جو بد ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

بت پرستوں پر جس طرح کے غصے اور ناراضی کا اظہار کیا ہے، اسی طرح کا غصہ اہلِ کتاب پر کیا ہے، کیونکہ وہ انبیا اور اولیا کے ساتھ مذکورہ بالا شرک کا سبب بننے والا معاملہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴾

[التوبة: ۱۳]

[انھوں نے اپنے عالموں اور اپنے درویشوں کو اللہ کے سوا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں اس کے سوا حکم نہیں دیا گیا تھا کہ ایک معبود کی عبادت کریں، کوئی معبود نہیں مگر وہی، وہ اس سے پاک ہے جو وہ شریک بناتے ہیں]

حالانکہ آسمان و زمین میں جتنے بھی لوگ ہیں، وہ سب اللہ کے سامنے مطیع بن کر آئیں گے۔ اللہ نے ان کو ایک ایک کر کے گن رکھا ہے۔ ہر شخص قیامت کے روز اللہ کے پاس اکیلا اکیلا اپنی حیثیت میں حاضر ہوگا۔ یعنی کوئی فرشتہ اور آدمی غلامی سے زیادہ رتبہ نہیں رکھتا۔ وہ اللہ کے قبضے میں ایک عاجز بندہ ہے، کچھ قدرت نہیں رکھتا اور آخرت میں وہاں اس کا کوئی وکیل اور حمایتی نہ بنے گا۔

ذیل میں شرک کی کچھ مزید اقسام بیان کی جاتی ہیں۔

① اشراک فی العلم:

جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھی ہیں، ان میں ایک بات یہ ہے کہ ہر جگہ ہر حال میں حاضر و ناظر رہنا، ہر چیز کی ہر لحہ برابر خبر رکھنا، خواہ وہ چیز دور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، آسمان میں ہو یا زمین میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں، یہ اللہ ہی کی شان ہے اور کسی کی یہ شان نہیں ہے، لہٰذا جو شخص اٹھتے بیٹھتے کسی کا نام لیا کرے، نزدیک و دور سے اسے پکارے، بلا و آزمایش کے وقت اس کی دہائی دے، اس کا نام لے کر دشمن پر حملہ کرے، اس کے نام کا ختم پڑھے یا ہر وقت اسی کا نام لینے میں مصروف و مشغول رہے یا اس کی صورت کا خیال (تصور شیخ) باندھے تو ان سب باتوں سے وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ پیر پرستی اور گور پرستی کی یہی اساس ہے اور اسے ہی ''اشراک فی العلم'' کہتے ہیں۔

''اشراک فی العلم'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی دوسرے کے لیے اللہ جیسا علم ثابت کرنا، خواہ یہ

عقیدہ انبیا و اولیا کے متعلق ہو یا پیر و شہید کے متعلق، امام و امام زادے سے اس کا تعلق ہو یا بھوت و پری سے، غرض کہ اس عقیدے سے ہر طرح شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

② اشراک فی التصرف:

اللہ تعالیٰ کے اپنے ساتھ خاص کی ہوئی چیزوں میں سے دوسری چیز یہ ہے کہ کائنات میں اپنے ارادے سے تصرف کرنا، اپنا حکم جاری فرمانا، اپنی خواہش سے مارنا اور زندہ کرنا، مرادیں پوری کرنا، حاجتیں بر لانا، بلائیں ٹالنا، مشکل میں دستگیری کرنا اور برے وقت میں پہنچنا؛ یہ سب اللہ ہی کی شان ہے۔ کسی نبی، ولی، پیر، شہید، بھوت اور پری کی یہ شان ہرگز نہیں ہے۔ تو جو شخص کسی کے لیے ایسا تصرف ثابت کرے، وہ مشرک ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے شرک کو ''اشراک فی التصرف'' کہتے ہیں۔

''اشراک فی التصرف'' کا مفہوم یہ ہے کہ کسی دوسرے کے لیے اللہ کے تصرف جیسا تصرف ثابت کرنا، چنانچہ یہ شرک محض ہے۔ پھر خواہ یوں سمجھے کہ انھیں ان کاموں کی طاقت ہے یا اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی قدرت بخشی ہے، ہر طرح سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

③ اشراک فی العبادۃ:

تیسری چیز یہ ہے کہ بعض تعظیم کے کام اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کیے ہیں، جن کو عبادت کہا جاتا ہے، جیسے سجدہ، رکوع اور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا، اس کے نام پر مال خرچ کرنا، اس کے نام کا روزہ رکھنا، اس کے گھر کی طرف دور دور سے چل کر آنا، ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی جان لے کہ یہ لوگ اس کے گھر کی زیارت کو جاتے ہیں، راستے میں اس مالک کا نام پکارنا اور کہنا:

''لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ''

[اے اللہ! میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں تیری خدمت میں حاضر ہوں، سب تعریف اور نعمت تیرے لیے ہی ہے اور سلطنت بھی تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں]

اس دوران میں نامعقول کاموں اور شکار کرنے سے بچنا اور انھی پابندیوں کو اختیار کرتے ہوئے جا کر طواف کرنا، اس کے گھر (بیت اللہ) کی طرف سجدہ کرنا، اس کی طرف قربانی کے لیے

جانور لے جانا، وہاں منتیں ماننا، اس کی چوکھٹ کے آگے کھڑے ہو کر دعا مانگنا، التجا کرنا، دین و دنیا کی مرادیں مانگنا، حجر اسود کو چومنا، مقام ملتزم سے اپنا منہ اور چھاتی ملنا، اس کا غلاف پکڑ کر دعا کرنا، اس کا مجاور بن کر اس کی خدمت میں مشغول رہنا، جیسے جھاڑو دینا، چراغ جلانا، قالین وغیرہ بچھانا، پانی پلانا، لوگوں کے لیے وضو اور غسل کا سامان درست کرنا، چاہِ زم زم کے پانی کو تبرک سمجھ کر پینا، بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، دوسروں کے لیے لے جانا، رخصت ہوتے وقت الٹے پاؤں چلنا،[1] بیت اللہ کے آس پاس جنگل کا ادب کرنا، مثلاً اس کا درخت نہ کاٹنا، گھاس نہ اکھاڑنا اور مویشی نہ چرانا تو یہ سب وہ کام ہیں جو اس نے اپنی عبادت کے لیے بندوں کو بتائے ہیں۔ پھر جو شخص ایسے کام اللہ کے سوا کسی اور کے لیے کرے تو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے اور اسے ''اشراک فی العبادۃ'' کہتے ہیں۔

پھر خواہ یوں سمجھے کہ یہ خود ہی اس تعظیم کے لائق ہیں یا ان کی اس طرح کی تعظیم سے اللہ خوش ہوتا ہے اور اس تعظیم کی برکت سے اللہ تعالیٰ مشکلیں آسان کر دیتا ہے، ہر طرح سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

④ اشراک فی العادۃ:

اللہ تعالیٰ کے اپنے ساتھ خاص کی ہوئی چیزوں میں سے چوتھی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنے دنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ان کا ایمان بھی درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہو، جیسے کسی پھنسے ہوئے کام پر اللہ کی نذر ماننا، مشکل کے وقت اسے پکارنا، اس کے نام سے ہر کام کی ابتدا کرنا، جب بندے کو اولاد سے نوازا جائے تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا، اولاد کا نام عبداللہ، عبدالرحمٰن، اللہ بخش، اللہ دتہ، امت اللہ اور الہدیٰ رکھنا، کھیت و باغ میں سے تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا، ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز رکھنا، حج کی قربانی والے جانور کا ادب کرنا، جو بھلائی اور برائی دنیا میں پیش آتی ہے، جیسے قحط و ارزانی، صحت و بیماری، فتح و شکست، اقبال و ادبار اور غمی و خوشی؛ یہ سب اسی کے اختیار میں سمجھنا، کام کرنے سے پہلے ان شاء اللہ کہنا، اس کے نام کو ایسی تعظیم سے لینا جس میں اس کی مالکیت اور اپنی بندگی ظاہر ہو، جیسے یوں کہنا: ہمارا رب، ہمارا مالک اور ہمارا خالق، ضرورت کے وقت اسی کی قسم کھانا وغیرہ، اس طرح کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے لیے بتائی ہیں، پھر جو کوئی کسی اور کی اس

[1] اس عمل کی کتاب و سنت میں کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔

طرح پر تعظیم کرے تو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ اسے ''اشراک فی العادۃ'' کہتے ہیں۔

مذکورہ بالا چاروں قسم کے شرک کا قرآن و حدیث میں صریح ذکر موجود ہے، ان کے افراد واجزا بے شمار ہیں، لیکن جب اصولِ شرک کو سمجھ لیا جائے تو تھوڑے سے تامل اور غور وفکر سے اس کی تمام فروع واقسام بے تکلف سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

پہلی فصل

شرک کی برائی اور نحوست کا اجمالی تذکرہ

شرک کی معافی نہیں ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النساء: ١١٦]

[بے شک اللہ اس بات کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک بنایا جائے اور بخش دے گا جو اس کے علاوہ ہے، جسے چاہے گا اور جو اللہ کے ساتھ شریک بنائے تو یقیناً وہ بھٹک گیا، بہت دور بھٹکنا]

اس فرمانِ باری تعالیٰ سے ثابت ہوا کہ شرک کی مذکورہ بالا چاروں قسموں میں سے کوئی سا شرک ہو، بخشا نہیں جائے گا، بلکہ اس کی جو سزا مقرر ہے، وہ ضرور ملے گی۔

انتہائی درجے کے شرک کی سزا:

پھر اگر کوئی ایسے پرلے درجے کے شرک کا مرتکب ہوا ہے جس سے آدمی کافر ہو جاتا ہے، جیسے کسی کو خدا کہنا یا کسی اور میں اللہ کی صفت ثابت کرنا، جیسے علم غیب، رزق دینا، مارنا اور زندہ کرنا وغیرہ، تو اس کی سزا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ کبھی اس سے باہر نکلے گا نہ کبھی اس میں آرام پائے گا۔ وہ تمام قسموں کے عذابوں کا، جیسے سانپ، بچھو، خون، پیپ، تھوہر، گرم کھولتا ہوا پانی اور طوق وجولان وغیرہ، مزہ چکھے گا۔

ہلکے درجے کے شرک کی سزا:

جو شرک ہلکے درجے کے ہیں، جیسے دکھلاوا، شہرت اور غیر اللہ کی قسم اٹھانا وغیرہ، ان کی جو سزا اللہ

کے ہاں مقرر ہے، وہ ضرور پائے گا۔ رہے شرک کے سوا باقی گناہ، خواہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، تو ان کی جو سزا اللہ کے ہاں مقرر ہے، وہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔

شرک سب سے بڑا گناہ ہے:

دل سے صادر ہونے والے گناہوں کی تعداد ساٹھ ہے اور دیگر اعضا سے چار سو گناہ صادر ہوتے ہیں، پھر دل کے گناہ کا عذاب اعضا کے گناہوں سے بڑھ کر ہیں۔ بہر حال یہ بات بہ خوبی ثابت ہے کہ شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں ہے۔ شرک کے ستر دروازے ہیں۔ ان میں سے جو مخفی شرک ہے، اس سے بچنا بہت مشکل ہے۔ چنانچہ جس شخص کو اپنا ایمان عزیز ہوتا ہے اور وہ اللہ کے قہر ناک عذاب سے نجات پانا چاہتا ہے تو وہ جستجو کر کے ہلکے درجے کے شرک سے بھی بچتا رہتا ہے اور جو کمزور ایمان والا ہے، وہ سہل انگاری کر کے اگر شرک جلی سے بچ بھی گیا تو شرک خفی سے نہیں بچتا، اور جب شرک سے نہ بچ سکا تو پھر اس کی نجات کیوں کر ممکن ہو سکتی ہے؟

شرک کی سنگینی کا بیان ...ایک مثال:

ایک بادشاہ کی رعایا اس کی جتنی نافرمانی کرتی ہے جیسے چوری و ڈاکا زنی، پہرے کے وقت سو جانا، دربار میں حاضری کے وقت کو ٹال جانا، لڑائی کے میدان سے کھسک جانا اور سرکار کا پیسہ پہنچانے میں کوتاہی کرنا وغیرہ؛ ان سب جرائم کی سزائیں بادشاہ کے ہاں مقرر ہیں، چاہے تو وہ ان پر پکڑ کر سزا دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ کوتاہیوں میں سے کچھ کوتاہیاں اس رنگ ڈھب کی ہوتی ہیں جن سے بغاوت ظاہر ہوتی ہے، جیسے کوئی شخص بادشاہ کی موجودگی میں کسی امیر یا وزیر یا چودھری یا قانون گو یا کسی چُوہڑے چمار کو بادشاہ بنائے یا اس کے لیے تاج و تخت تیار کرے یا اسے ظلِ سبحانی کے لقب سے یاد کرے یا اس کے سامنے بادشاہ کے آداب جیسے آداب بجا لائے، اس کی تعظیم کرے یا اس کے لیے جشن کا ایک دن مقرر کرے اور بادشاہ کی طرح اس کو نذرانے پیش کرے، چونکہ یہ بڑا گناہ ہے، اس لیے اس جرم کی جو سزا مقرر ہے، وہ مجرم کو ضرور ملتی ہے۔ جو بادشاہ اس سے غفلت کرے اور ایسے بڑے مجرموں اور باغیوں کو سزا نہ دے تو اس کی بادشاہی میں نقص اور کمزوری ہے۔ عقل مند لوگ ایسے بادشاہ کو بے غیرت کہتے ہیں۔

مشرکین اللہ غیور و قہار کی سزا سے نہیں بچ پائیں گے:

شہنشاہ، مالک الملک، غیور و قہار اور سخت عذاب کرنے والے اللہ سے ڈرنا چاہیے کہ وہ انتہائی درجے کا علم اور قوت بھی رکھتا ہے اور ویسی ہی غیرت و عار بھی، لہٰذا وہ مشرکوں سے کیوں کر غفلت کرے گا اور کس طرح ان کو بے سزا چھوڑ دے گا؟ انھیں چھوڑنا تو درکنار ان کو ہمیشہ کے لیے جہنم کے ساتوں طبقوں میں رکھے گا اور کبھی اپنے سخت عذاب کو ان سے دور نہ کرے گا۔ آگ اور آگ میں جانے والوں کو ہرگز فنا نہ ہوگی، سارے مشرک ہمیشہ آگ میں رہیں گے، عیاذا باللہ.

مشرک کسی صورت میں عذاب سے نجات نہیں پائے گا:

کوئی مشرک ہرگز یہ طمع نہ کرے کہ وہ عذابِ الٰہی سے نجات پائے گا، گو دنیا میں اس نے بہت طاعات، عبادات، حسنات اور خیرات کیے ہوں، کیونکہ شرک کی موجودگی میں ایمان باقی نہیں رہتا ہے اور بے ایمان کی کوئی عبادت، کم ہو یا زیادہ، قبول نہیں ہوتی۔

نجات کی واحد صورت:

لہٰذا سب سے پہلے ایمان درست کیا جائے اور پھر عمل۔ اس درستی کو اخلاص و صواب کہا جاتا ہے۔ جو عمل خاص اللہ کے لیے ہوتا ہے اور اس میں کسی قسم کے شرک کی آمیزش نہیں ہوتی، وہ خالص کہلاتا ہے اور اللہ تعالیٰ خالص اپنی رضا کے لیے کیے گئے عمل کے سوا کوئی عمل قبول نہیں کرتا۔ پھر جب وہ عمل سنتِ مطہرہ کے مطابق ہوتا ہے تو اس کا نام صواب ہے، اس کے سوا کوئی عمل قبول و منظور نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایمان و عمل کا یہی طریقہ ہے، اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ عجیب افسانہ یا خیالی باغ ہے۔

بعثتِ انبیا کا مقصد دعوتِ توحید اور ردِ شرک ہے:

اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی انبیا و رسل اس دنیا میں مبعوث کیے، سب کی طرف یہی وحی کی:

﴿ أَنَّهُ لَآ إِلَٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

[بے شک حقیقت یہ ہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری عبادت کرو]

یہ تو توحید کو اختیار کرنے کا حکم ہے، باقی رہا شرک تو قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اسے ظلمِ عظیم فرمایا ہے، نیز ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث قدسی میں ہے:

«أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلاً أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَ شِرْكَهُ وَ أَنَا مِنْهُ بَرِيءٌ» (رواه مسلم)[1]

[میں شرکا میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں۔ جس کسی نے کوئی ایسا عمل کیا، جس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو ترک کر دیتا ہوں اور میں اس سے بے زار ہو جاتا ہوں]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جیسے اور لوگ اپنی شرکت اور حصے داری کی چیز آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں، میں ایسے نہیں کرتا، کیونکہ میں بے پروا ہوں، بلکہ جو شخص کوئی کام میرے لیے کرے اور غیر کو بھی اس میں شریک کر دے تو میں اپنا حصہ بھی نہیں لیتا، بلکہ سارے کام ہی کو چھوڑ دیتا ہوں اور اس سے بے زار ہو جاتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ مشرک جو عبادت کرے، وہ اللہ کے ہاں مقبول نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ اس سے سخت بے زار ہے۔

حسن غیور او نہ پسندد شریک را
آئینہ را بدست نگیرد نگار ما

[اس کا غیرت مند حسن شریک کو پسند نہیں کرتا، میرا محبوب (حسن کے نقائص دور کرنے لیے) ہاتھ میں آئینہ نہیں پکڑتا]

عالم ارواح میں توحید کا اقرار اور شرک کی نفی:

جس دن اللہ تعالیٰ نے اولادِ آدم سے ﴿أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کا عہد لیا تھا، اس دن ان سے یہ بات بھی کہہ دی تھی کہ جان رکھو! میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تم کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرانا، میں تمھارے پاس رسول بھیجوں گا، وہ تم کو میرا قول وقرار یاد دلائیں گے اور میں تم پر کتابیں نازل کروں گا تو اس پر لوگوں نے اقرار کر لیا تھا۔ (رواه أحمد عن أبي بن كعب)[2]

اس عہد و میثاق کا ذکر سورت اعراف میں بھی آیا ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٨٥)

[2] مسند أحمد (١٣٥/٥) المستدرك للحاكم (٣٢٣/٢)

[3] اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَ إِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ أَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا أَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٧٢] ←

پھر اللہ نے آسمان، زمین اور آدم علیہ السلام کو اس بات پر گواہ کر لیا اور ہر کسی نے جدا جدا اللہ کی توحید کا اقرار کیا۔ لہٰذا کوئی بھی شرک کی بابت ایک دوسرے کی سند نہ پکڑے، نہ پیر کی نہ استاد کی نہ کسی فقیر و مولوی و بزرگ کی، بلکہ جس کا قول و فعل پیغمبر کے قول و فعل سے بال برابر بھی مختلف ہو، اس کو نہ مانے بلکہ رد کر دے۔ غرض کہ عالمِ ارواح ہی میں توحید کا حکم اور شرک سے ممانعت ہو چکی ہے۔ دنیا میں جتنے بھی پیغمبر آئے، اسی کی تائید میں آئے اور ساری کتابیں اسی کے بیان میں نازل ہوئیں۔

ان ہزاروں بلکہ لاکھوں پیغمبروں کا فرمانا اور ساری آسمانی کتابوں کا علم اسی ایک نکتہ میں ہے کہ انسان توحید کو خوب درست کرے اور شرک سے بہت دور بھاگے، اللہ کے سوا کسی کو حاکم سمجھے کہ وہ کسی چیز میں تصرف کر سکتا ہے نہ کسی کو اپنا مالک ٹھہرائے کہ اس سے اپنی کوئی مراد مانگے اور اپنی حاجت اس کے پاس لے جائے۔

انسان ہر حال میں شرک سے بچے:

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّإِنْ قُتِلْتَ أَوْ حُرِّقْتَ» (رواہ أحمد)[1]

[تم اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراؤ، خواہ تم قتل کر دیے جاؤ یا جلا دیے جاؤ]

موحد کہ دری پائے ریزی زرش
وگر ارّہ مے نہی بر سرش

[اگر تم موحد کے قدموں میں سونا چاندی ڈھیر کر دو اور اگر تم اس کے سر پر (اسے دو نیم کرنے کے لیے) آرا رکھ دو]

امید و ہراسش نہ باشد زکس
ہمیں ست بنیاد توحید و بس

← [اور جب تیرے رب نے آدم کے بیٹوں سے ان کی پشتوں میں سے ان کی اولاد کو نکالا اور انھیں خود ان کی جانوں پر گواہ بنایا: کیا میں واقعی تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم نے شہادت دی۔ (ایسا نہ ہو) کہ تم قیامت کے دن کہو: بے شک ہم اس سے غافل تھے]

[1] مسند أحمد (٢٣٨/٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٣٤)

[نہ اسے کسی چیز کی امید و لالچ ہوگی اور نہ کسی چیز کا ڈر اور خوف ہوگا۔ توحید کی بنیاد بس یہی ہے]

جن اور بھوتوں سے ڈرنا چھوڑ دو اور اللہ تعالیٰ سے ناتا جوڑ لو!

مسلمان جس طرح ظاہری بلاؤں پر صبر کرتا ہے اور ان کے ڈر سے اپنا دین نہیں بگاڑتا، اسی طرح وہ جن اور بھوتوں کی ایذا و تکلیف پر بھی صبر کرے اور ان سے ڈر کر انھیں نہ مانے، بلکہ یہ سمجھے کہ فی الحقیقت ہر کام اللہ ہی کے اختیار میں ہے اور اسی کے ارادے سے ہوتا ہے، مگر کبھی کبھی وہ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور بروں کے ہاتھوں بھلوں کو ایذا پہنچاتا ہے، تاکہ کچوں اور پکوں میں فرق ہو جائے اور مومن و منافق جدا جدا معلوم ہو جائیں۔ اگر کوئی شخص شرک سے بے زار ہو کر اوروں کو ماننا چھوڑ دے اور غلط رسموں کو مٹانے لگے، پھر اسے اگر مال یا آبرو یا اولاد میں کوئی نقصان پہنچے یا کوئی شیطان کسی پیر و شہید کا نام لے کر اسے تنگ کرے تو یہ صابر بن کر یہ سمجھے کہ دراصل اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے میری دین داری کو پرکھتا ہے اور ان ظالموں کو ڈھیل دیتا ہے، مگر وہ انھیں کبھی ضرور پکڑے گا۔

توحید کی برکتیں اور شرک کی نحوستیں:

ذرا توحید کے رتبے کو دیکھو! انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: يَا ابْنَ آدَمَ! إِنَّكَ لَوْ لَقِيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْأَرْضِ خَطَايَا ثُمَّ لَقِيْتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً » (رواه الترمذي)[1]

[اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے آدم کے بیٹے! اگر تم میرے پاس زمین بھر کر گناہ لے کر آؤ مگر مجھے اس حال میں ملو کہ تم میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہراتے ہو تو میں تمھیں اتنی ہی بخشش کے ساتھ ملوں گا]

اس حدیث قدسی کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں سب گناہ گاروں نے گناہ کیے ہیں۔ فرعون بھی اس دنیا میں تھا اور ہامان بھی بلکہ شیطان بھی اسی میں ہے۔ جتنے گناہ ان سب گناہ گاروں سے ہوتے ہیں، ایک آدمی وہ سب گناہ کرے، لیکن شرک سے پاک رہے تو جتنے گناہ ہیں، اللہ تعالیٰ اتنی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٤٠)

ہی اس پر بخشش کرے گا۔ معلوم ہوا کہ توحید کی برکت سے سب گناہ بخش دیے جاتے ہیں، جس طرح شرک کی نحوست سے سارے اچھے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں اور حق بھی یہی ہے، کیونکہ جب بندہ شرک سے پاک ہوا، اللہ کے سوا کسی کو مالک نہ سمجھا، اس کے سوا کسی طرف بھاگنے کی جگہ نہ جانی، اس کے دل میں یہ بات خوب پختہ ہوگئی کہ اس کے جرم دار اور کوتاہی کرنے والے کو کہیں بھی پناہ نہیں، اس کے مقابلے میں کسی کا زور نہیں چلتا، اس کے روبرو کسی کی حمایت نہیں چلتی اور کوئی کسی کی سفارش اپنے اختیار سے نہیں کر سکتا تو پھر جتنے گناہ اس سے سرزد ہوں گے، وہ بہ تقاضاے بشریت بھول چوک کر ہوں گے، ان گناہوں کا ڈر اس کے دل کو گھیرے ہوئے ہوگا اور وہ ان سے ایسا بے زار اور شرمندہ ہوگا کہ اپنی جان سے تنگ آ جائے گا، سو ایسے شخص پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے، پھر جیسے جیسے اس سے گناہ ہوں گے، ویسے ویسے یہ حالت بڑھے گی، اور جس قدر یہ حالت بڑھے گی اتنی ہی اللہ کی رحمت بڑھے گی۔

لہٰذا یہ جان لینا چاہیے کہ جس کی توحید کامل ہے، اس کا گناہ وہ کام کرتا ہے کہ اوروں کی عبادت وہ کام نہیں کر سکتی۔ فاسق موحد شخص، متقی مشرک سے ہزار درجے بہتر ہے، جیسے رعیتی قصور وار باغی خوشامدی سے ہزار درجہ بہتر ہے، کیونکہ یہ اپنی کوتاہی اور قصور پر شرمندہ ہے اور وہ اپنے فریب پر مغرور ہے۔ یہ درست ہے کہ "التوحيد رأس الطاعات و أفضل الحسنات" [توحید اطاعتوں کی چوٹی اور تمام نیکیوں سے افضل ہے]

دوسری فصل

شرک فی العلم کی خرابی کا تذکرہ

غیب کی کنجیاں صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

[اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں، انھیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا]

غیب کی بات کا جاننا اللہ ہی کی شان ہے، اس نے کسی نبی، ولی، جن، فرشتے، پیر، شہید، امام، امام زادہ، بھوت اور پری کو یہ طاقت نہیں بخشی ہے کہ وہ جب چاہے غیب کی باتیں جان لے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کئی دفعہ یہ اتفاق ہوا کہ آپ ﷺ نے کوئی بات دریافت کرنا اور جاننا چاہی مگر معلوم نہ ہوئی اور جب اللہ نے چاہا ایک آن میں بتا دی۔

منافقوں نے عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تو رسول اللہ ﷺ نے کئی دن تک اس مسئلے کی تحقیقات کیں، مگر کچھ معلوم نہ ہوا۔ جب اللہ نے چاہا تو بتا دیا کہ منافق جھوٹے ہیں اور عائشہ رضی اللہ عنہا پاک دامن ہے۔

غیب دانی کا ڈھونگ رچانے والا جھوٹا اور خدائی کا دعویدار ہے:

اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ وہ جب چاہے غیب کی باتیں معلوم کر لے تو جان لو کہ وہ انتہائی جھوٹا اور خدائی کا دعویدار ہے اور جو کوئی کسی نبی، ولی، جن، فرشتے، پیر، شہید، نجومی، رمال، جفار اور فال نکالنے والے کو یا برہمن شگونی یا بھوت پری کو غیب دان جانے تو وہ مشرک ہے اور مذکورہ بالا آیت کا منکر۔ ایسے لوگوں کی اٹکل کبھی درست اور اکثر غلط ہوتی ہے اور یہی حال استخارہ، کشف اور قرآن کی فال کا ہے۔ ہاں پیغمبروں کے پاس آنے والی وحی میں کبھی غلطی نہیں ہوتی، اس لیے کہ وہ اللہ کے اختیار میں ہے، اللہ جب چاہے وحی نازل کر کے انھیں آگاہ کرے۔ اس میں پیغمبروں کی خواہش نہیں چلتی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴾ [النمل: ٦٥]

[کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہے غیب نہیں جانتا اور وہ شعور نہیں رکھتے کہ کب اٹھائے جائیں گے]

اس آیت کے عموم میں سارے فرشتے، آدمی، جن اور ہر چیز داخل ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَ يَعْلَمُ مَا فِي الْاَرْحَامِ وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَ مَا تَدْرِيْ نَفْسٌۢ بِاَيِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴾ [لقمان: ٣٤]

[بے شک اللہ، اسی کے پاس قیامت کا علم ہے اور وہ بارش برساتا ہے اور وہ جانتا ہے جو کچھ ماؤں کے پیٹوں میں ہے اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کل کیا کمائی کرے گا اور کوئی شخص نہیں جانتا کہ وہ کس زمین میں مرے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، پوری خبر رکھنے والا ہے]

اگرچہ حکیم اور طبیب لوگوں نے ان سب چیزوں کے اسباب تحریر کیے ہیں، مگر صورت حال یہ ہے کہ جب کوئی اپنا حال نہیں جانتا کہ وہ کل کو کیا کرے گا تو وہ اور کسی کا حال کیوں کر جان سکتا ہے؟

اب جو لوگ کشف کا دعویٰ کرتے ہیں یا استخارے کا عمل سکھاتے ہیں یا تقویم اور پترا نکالتے ہیں یا رمل کا قرعہ پھینکتے ہیں یا فالنامہ لیے پھرتے ہیں؛ یہ سب جھوٹے، مکار، دغاباز اور فریبی ہیں۔ ان کے پاس جانے والے مشرک بڑے احمق اور بے وقوف ہیں کہ اللہ جیسے قادر و علیم کو چھوڑ کر ایسوں کے پاس جاتے اور انھیں پکارتے ہیں جو کوئی قدرت رکھتے ہیں نہ ان کی پکار ہی سنتے ہیں۔

سماعِ موتی اور سید الانبیاء سے متعلق غیب دانی کی نفی:

وہ احادیث جن میں سماعِ موتی کا بیان ہے، وہ اپنے جائے وقوع پر ہی محدود و مقصور ہیں اور

ان کے برعکس اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

﴿ وَ مَآ اَنْتَ بِمُسْمِعٍ مَّنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ [الفاطر: ٢٢]

[اور تو ہرگز اسے سنانے والا نہیں جو قبروں میں ہے]

نیز اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا ہے:

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٨٨]

[کہہ دے میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا خوشخبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں]

ہمارے پیغمبر تمام انبیا اور اولیا کے سردار ہیں، جب ان کا یہ حال ہے تو کسی اور کی کیا ہستی ہے کہ وہ نفع پہنچانے والا نقصان پہنچانے والا، علم غیب جاننے والا اور ضرر کو دور کرنے والا ہو سکے؟

انبیا کی بڑائی کا راز:

مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوا کہ انبیا کی بڑائی یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ بتاتے اور صراط مستقیم پر چلاتے ہیں۔ وہ برے اور بھلے کاموں سے واقف ہیں، لہٰذا وہ لوگوں کو اس سے آگاہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی دعوت میں تاثیر پیدا کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بہت سے لوگ راہِ راست پر آجاتے ہیں۔

انبیا کی بڑائی اس میں نہیں ہے کہ ان کو کائنات میں کچھ تصرف کرنے کی قدرت و طاقت دی گئی ہو کہ جس کو چاہیں مار ڈالیں یا اولاد دیں یا مشکل دور کر دیں یا عمر بڑھا دیں یا مرادیں پوری کریں یا فتح و شکست دیں یا غنی و فقیر کر دیں یا کسی کو بادشاہ یا امیر وزیر بنا دیں یا کسی سے سلطنت یا امارت چھین لیں، بلکہ ان باتوں میں چھوٹے بڑے تمام بندے برابر ہیں اور عاجز و بے اختیار۔

اسی طرح انبیا کی بڑائی ان کی غیب دانی سے بھی نہیں ہے کہ جب چاہیں کسی کا حال جان

لیں، اس میں بھی سب بڑے چھوٹے برابر ہیں۔ ہاں وحی اور الہام کی تو بات ہی نرالی ہے، مگر وہ ان کے اختیار میں نہیں ہے۔

کسی نبی اور ولی کی غیب دانی کا عقیدہ رکھنا درست نہیں ہے:

کوئی شخص کسی نبی، ولی، امام اور شہید کے متعلق ہرگز یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب دان ہے اور نہ ان کی مدح سرائی میں شاعروں جیسا ناجائز مبالغہ کرے، بلکہ خود جناب محمد رسول اللہ ﷺ سے متعلق یہ عقیدہ نہ رکھے کہ وہ غیب جانتے تھے۔

ربیع بنت معوذ[1] اور عائشہ رضی اللہ عنہا[2] سے مروی حدیث میں اس کا صاف انکار موجود ہے۔

بلکہ ام العلاء رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمایا:

«وَاللّٰهِ لَا أَدْرِي وَأَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ؟» (رواه البخاري)[3]

[اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہونے کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ میرے اور تمھارے ساتھ کیا کیا جائے گا؟]

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے دنیا میں یا آخرت میں جو کچھ معاملہ کرے گا، اس کی حقیقت کسی نبی اور کسی ولی کو خود اپنے حال کے متعلق یا کسی دوسرے کے حال کے متعلق معلوم نہیں ہے۔ رہی وحی اور الہام کے ذریعے بتائی ہوئی بات تو وہ مجمل ہوتی ہے اور اس سے زیادہ معلوم کر لینا ان کے اختیار سے باہر ہے۔

---

1. صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۷۷۹)
2. صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۷)
3. صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٦١٥)

تیسری فصل

اشراک فی التصرف کی خرابی کا تذکرہ

اللہ ہی نفع ونقصان کا مالک ہے:

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو مخاطب فرما کر ارشاد فرمایا:

﴿ قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّیْ لَنْ يُّجِيْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴾ [الجن: ٢١۔٢٢]

[کہہ دے بلا شبہہ میں تمھارے لیے نہ کوئی نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ کہہ دے یقیناً میں، مجھے اللہ سے کوئی بھی کبھی پناہ نہیں دے گا اور میں اس کے سوا کبھی پناہ کی کوئی جگہ نہیں پاؤں گا]

مطلب یہ ہے کہ تم اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر حد سے تجاوز نہ کرنا کہ ہمارا پایہ مضبوط ہے، ہمارا وکیل زبردست ہے اور ہمارا سفارشی بڑا محبوب ہے، لہٰذا ہم جو چاہیں کریں، وہ ہمیں اللہ تعالیٰ کے عتاب وعذاب سے بچا لے گا، کیونکہ یہ بات سراسر غلط ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے یہ بات کہلواتے ہیں کہ اے نبی کہہ! میں اللہ کے سوا کہیں بچاؤ نہیں پاتا، دوسرے کو کیا بچا سکوں گا؟

غیروں کو مدد کے لیے پکارنا سراسر گمراہی ہے:

اب تک کے بیان سے معلوم ہوا کہ پیروں، شہیدوں اور ولیوں کی حمایت پر بھروسا کر کے اللہ تعالیٰ کو بھول جانا اور اس کے احکام کی تعظیم نہ کرنا محض گمراہی ہے۔ سب پیروں کے پیر ہمارے نبی محمد ﷺ ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ دن رات اللہ سے ڈرتے تھے اور اس کی رحمت کے سوا اپنا بچاؤ نہیں سمجھتے تھے، پھر اور کسی کا ذکر کیا ہے؟ پھر بھی اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکارنا، جو نفع پہنچا سکیں نہ نقصان، نری بے انصافی ہے۔

اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَ لَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝ وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ﴾ [سبأ: ٢٢-٢٣]

[کہہ دے پکارو ان کو جنھیں تم نے اللہ کے سوا گمان کر رکھا ہے، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ ان کا ان دونوں میں کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی مددگار ہے۔ اور نہ سفارش اس کے ہاں نفع دیتی ہے، مگر جس کے لیے وہ اجازت دے]

توحید کے بغیر انبیا و اولیا کی شفاعت پر تکیہ کرنا بے سود ہے:

من جملہ تصرف کے ایک سفارش ہوتی ہے، وہ بھی بغیر اذن و اجازت کے نہیں ہو گی۔ گویا سفارش بھی غیر اللہ کے تصرف کی حد سے خارج ہے۔ لوگ اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ ہم انبیا و اولیا کی سفارش کی وجہ سے بچ جائیں گے اور وہ یہ نہ سمجھے کہ ہماری سفارش کا ان انبیا و اولیا کو حکم بھی ہو گا یا نہیں؟ پھر یہ کیسے معلوم ہے کہ ہماری شفاعت ہو گی؟ حدیث میں صاف بیان ہو چکا ہے کہ سفارش اس کی ہو گی جو موحد ہے نہ کہ مشرک، ہاں اتنا ضرور ہے کہ اس سے کبیرہ گناہوں کا ارتکاب ہو گیا تھا۔ اب محض ان کی شفاعت کا کیا بھروسا رہا، جس پر یہ لوگ اتنا اچھلتے کودتے ہیں؟

شفاعت کی اقسام:

شفاعت کئی طرح کی ہوتی ہے، جس کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

① شفاعتِ وجاہت:

اس قسم کی شفاعت کو یوں سمجھو جیسے کوئی بادشاہ کسی امیر و رئیس کی عزت و آبرو کے سبب سے اس کی سفارش قبول کر لیتا ہے، یہ شفاعت اللہ کی جناب میں ہرگز نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی کسی نبی، ولی، امام، شہید، فرشتہ، پیر اور استاد کو اللہ کی جناب میں اس طرح کی سفارش کرنے والا سمجھے، وہ اصل میں مشرک ہے۔ وہ بڑا جاہل ہے کہ اس نے اللہ کے معنی کچھ بھی نہ سمجھے اور اس مالک الملک کی قدر بالکل نہ پہچانی۔ اس شہنشاہ کی تو یہ شان ہے کہ ایک حکم "کن" سے چاہے تو کروڑوں نبی و ولی، جن و فرشتے پیدا کر ڈالے اور ایک لمحے میں عرش سے فرش تک سارا عالم الٹ پلٹ کر دے اور اس کی جگہ کوئی

دوسرا عالم قائم کر دے، کیونکہ اس کے تو محض ارادے ہی سے ہر چیز معرض وجود میں آ جاتی ہے۔

② شفاعتِ محبت:

اس شفاعت کو یوں سمجھو کہ کسی بادشاہ نے کسی کی محبت کے سبب سے سفارش قبول کر لی اور یہ سمجھا کہ ایک بار غصہ پی جانا اور چور سے درگزر کر جانا اس رنج سے بہتر ہے جو اس سفارشی محبوب کے روٹھ جانے سے مجھے لاحق ہو گا۔ اس طرح کی شفاعت بھی اللہ کے دربار میں کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ جو شخص کسی کو اللہ کی جناب میں ایسا سفارشی سمجھے تو وہ بھی ویسا ہی جاہل اور مشرک ہے، جیسا کہ شفاعت کی پہلی قسم میں ذکر ہو چکا ہے۔ وہ مالک الملک چاہے اپنے بندوں پر بہت سی نوازشیں کرے اور کسی کو حبیب یا خلیل یا کلیم یا روح اللہ کا خطاب عطا فرمائے، پھر بھی مالک، مالک ہے اور غلام، غلام۔ ان میں سے کوئی بندگی کے رتبے سے اپنا قدم باہر رکھ سکتا ہے نہ غلامی کی حد سے تجاوز کر سکتا ہے۔

③ شفاعت بالاذن:

شفاعت کی یہ تیسری قسم خود مالک کے اذن و اجازت سے ہوتی ہے۔ اللہ کے ہاں اس قسم کی شفاعت ہو سکتی ہے اور قرآن و حدیث میں جس نبی اور ولی کی شفاعت کا ذکر آیا ہے، اس کے معنی یہی ہیں۔ غرض کہ جیسے اپنی ہر حاجت اللہ کو سونپنا اور سپرد کرنا چاہیے، اسی طرح بندہ یہ حاجت بھی اسی کے اختیار پر چھوڑ دے کہ وہ جسے چاہے ہمارا سفارشی بنا دے، نہ یہ کہ وہ کسی کی حمایت پر بھروسا کرے اور اسے اپنا حمایتی سمجھ کر اصل مالک کو بھول جائے اور اس کی شریعت کو بے قدر کر دے، کیونکہ سارے نبی اور ولی ایسے شخص سے بے زار ہیں۔ وہ ایسے لوگوں کی ہرگز شفاعت نہیں کرتے، بلکہ وہ تو ناراض ہو کر الٹے ان لوگوں کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان تو "الحب للہ" [اللہ ہی کے لیے محبت] اور "البغض للہ" [اللہ ہی کے لیے نفرت] ہے، چنانچہ جس کے حق میں اللہ تعالیٰ یوں ہی راضی ہوں گے کہ اسے دوزخ میں داخل کریں تو یہ انبیا و اولیا ایسے لوگوں کو مزید دو چار دھکے دینے کو تیار ہوں گے۔

کسی نبی اور ولی کو مختار کل ماننا غلط ہے:

رسول اللہ ﷺ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے فرمایا تھا:

«يَا غُلَامُ! إِنِّي أُعَلِّمُكَ كَلِمَاتٍ، اِحْفَظِ اللّٰهَ يَحْفَظْكَ، اِحْفَظِ اللّٰهَ تَجِدْهُ

تُجَاهَكَ، إِذَا سَأَلْتَ فَاسْأَلِ اللّٰهَ، وَإِذَا اسْتَعَنْتَ فَاسْتَعِنْ بِاللّٰهِ، وَاعْلَمْ أَنَّ الْأُمَّةَ لَوِ اجْتَمَعَتْ عَلَى أَنْ يَّنْفَعُوْكَ بِشَيْءٍ، لَمْ يَنْفَعُوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ، قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ لَكَ، وَلَوِ اجْتَمَعُوْا عَلَى أَنْ يَّضُرُّوْكَ بِشَيْءٍ لَمْ يَضُرُّوْكَ إِلَّا بِشَيْءٍ قَدْ كَتَبَهُ اللّٰهُ عَلَيْكَ، رُفِعَتِ الْأَقْلَامُ وَجَفَّتِ الصُّحُفُ» (رواه الترمذي)[1]

[اے لڑکے! میں تمھیں چند باتیں سکھاتا ہوں۔ ہمیشہ اللہ کو یاد رکھو، وہ تجھے محفوظ رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھو، اسے اپنے سامنے پائے گا۔ جب مانگو تو اللہ تعالیٰ سے مانگو اور اگر مدد طلب کرو تو صرف اسی سے مدد طلب کرو۔ جان لو کہ اگر پوری امت اس بات پر متفق ہو جائے کہ تمھیں کسی چیز میں فائدہ پہنچائیں تو وہ صرف اتنا ہی فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے لکھ دیا ہے۔ اگر وہ تمھیں نقصان پہنچانے پر اتفاق کر لیں تو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر وہ جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے، اس لیے کہ قلم اٹھا دیے گئے اور صحیفے خشک ہو چکے ہیں]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے اولیا کو یہ طاقت بخشی ہے کہ وہ تقدیر کو بدل ڈالیں یا اولاد دیں یا عمروں میں اضافہ کر دیں؛ یہ بات غلط ہے۔ ہر بندہ خواہ بڑا ہو یا چھوٹا، نبی ہو یا ولی، وہ اللہ سے مانگنے اور اس کی جانب دعا کرنے کے سوا اور کچھ طاقت نہیں رکھتا، پھر وہ مالک و مختار چاہے تو براہِ مہربانی قبول کرے، چاہے تو براہِ حکمت قبول نہ کرے۔

اللہ کا در چھوڑنے والے سے رحمتِ الٰہی روٹھ جاتی ہے:

جب آدمی کو کسی چیز کی طلب ہوتی ہے یا کوئی مشکل پڑ جاتی ہے تو اس کے دل میں ہر طرف کے خیال دوڑتے ہیں کہ فلاں پیر سے مدد مانگو، فلاں شہید کی منت مانو، فلاں نجومی، رمال اور جفار سے پوچھو، فلاں ملا سے فال کھلواؤ؛ اب جو شخص ہر خیال کے پیچھے پڑتا ہے تو اللہ اس سے اپنی قبولیت کی نگاہ پھیر لیتا ہے۔ ان خیالات کے پیچھے لگ کر کوئی دہریہ بن جاتا ہے تو کوئی ملحد اور کوئی مشرک۔ لیکن جو شخص اللہ پر بھروسا کرتا ہے، کسی خیال کے پیچھے نہیں پڑتا تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو ایسا چین و آرام دیتا ہے جو ان خیالات کے اسیر لوگوں کو ہرگز میسر نہیں ہوتا۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥١٦)

سیدنا عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے مروی مندرجہ ذیل مرفوع حدیث کا بھی یہی مفہوم ہے:

«إِنَّ مِنْ قَلْبِ ابْنِ آدَمَ بِكُلِّ وَادٍ شُعْبَةً، فَمَنِ اتَّبَعَ قَلْبُهُ الشُّعَبَ كُلَّهَا، لَمْ يُبَالِ اللّٰهُ بِأَيِّ وَادٍ أَهْلَكَهُ، وَمَنْ تَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ كَفَاهُ التَّشَعُّبَ» (رواہ ابن ماجہ)[1]

[یقیناً ابن آدم کے دل کے لیے ہر وادی میں ایک راہ ہے، پھر جو شخص اپنے دل کو سب راہوں میں لگا دے تو اللہ تعالیٰ اس کی پروا نہ کرے گا کہ اس کو کون سی راہ میں ہلاک کر دے اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرے تو سب راہوں کی فکر اس کو جاتی رہے گی]

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ہر شخص کو چاہیے کہ اپنی ضرورت و حاجت کی تمام چیزیں اپنے رب سے مانگے، یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور اگر جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگے۔''

(رواہ الترمذي)[2]

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رشتے داروں کو جمع کر کے ہر ایک قبیلے کو نام لے لے کر خطاب کیا اور فرمایا:

«أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا»

(أخرجه الشيخان بطوله)[3]

[(اے فاطمہ!) تم اپنے نفس کو دوزخ سے بچا لو، کیونکہ میں قیامت کے روز تم لوگوں کو خداوند قدوس کی گرفت سے بچانے میں کسی کام نہیں آ سکتا]

انبیا و اولیا کے قرابت دار کسی بھول میں نہ رہیں:

جو لوگ کسی بزرگ کے قرابت دار ہوتے ہیں، ان کو اس کی حمایت پر بھروسا ہوتا ہے اور وہ مغرور ہو کر اللہ کا اتنا خوف نہیں رکھتے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا:

﴿وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ﴾ [الشعرآء: ٢١٤]

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١٦٦) اس روایت کی سند میں ''صالح بن رزیق العطار'' راوی مجہول ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٠٤) نیز دیکھیں: مشكاة المصابيح (٢/٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٠٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٤)

[اور اپنے سب سے قریب رشتے داروں کو ڈرا]

اس پر آپ ﷺ نے انھیں سنا دیا کہ میرا مال موجود ہے، مَیں اس میں کسی قسم کا بخل نہیں کرتا، مگر اللہ کے ہاں کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے، وہاں میں کسی کی حمایت نہیں کر سکتا، لہٰذا ہر شخص وہاں کا اپنا اپنا معاملہ درست کر لے اور دوزخ سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچ لے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی بزرگ کی فقط قرابت اللہ کے ہاں کچھ کام نہیں آتی، جب تک وہ اللہ ہی سے اپنا معاملہ صاف نہ کرے، تب تک کچھ کام نہیں نکلتا۔

چوتھی فصل

اشراک فی العبادۃ کی خرابی کا بیان

انبیا کی دعوت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْكُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴾ [هود: ٢٥-٢٦]

[اور بلاشبہہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف بھیجا، بے شک میں تمھارے لیے صاف صاف ڈرانے والا ہوں۔کہ تم اللہ کے سوا (کسی کی) عبادت نہ کرو۔ بے شک میں تم پر ایک دردناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں]

اس سے ثابت ہوا کہ نوح علیہ السلام کے وقت سے مسلمانوں اور کافروں میں یہ مقابلہ شروع ہے، اسی وقت سے اس بات پر مقابلہ ہے کہ اللہ کے مقبول بندے یہی کہتے آئے کہ اللہ کی تعظیم کی طرح کسی اور کی تعظیم نہ کی جائے، جو کام اس کی تعظیم کے ہیں وہ اوروں کے لیے نہ کیے جائیں۔

سجدہ تعظیمی، قیام اور پکار صرف اللہ کے لیے:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سورج چاند کو سجدہ کرنے سے منع فرمایا ہے اور کہا ہے کہ تم سورج چاند کے بجائے ان کے خالق کو سجدہ کرو۔ ایک جگہ فرمایا:

﴿ قُلْ اِنَّمَاۤ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِهٖۤ اَحَدًا ﴾ [الجن: ٢٠]

[کہہ دے میں تو صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے لیے ادب سے کھڑا ہونا، اس کو پکارنا اور اس کی دہائی دینا، انھیں کاموں سے ہے جو کام اللہ تعالیٰ نے اپنی تعظیم کے لیے ٹھہرائے ہیں۔ کسی دوسرے سے یہ معاملہ کرنا

شرک ہے، جیسے انبیا، اولیا، اصحابِ کہف اور اصحابِ بدر کے نام جپنا۔

حج کے اعمال دوسروں کے لیے بجا لانا شرک ہے:

فریضہ حج میں جو افعال کیے جاتے ہیں، اس طرح کے کام اوروں کے لیے کرنا، جیسے کسی قبر یا چلہ گاہ یا کسی کے مزار اور بت پر دور دور سے قصد کرنا، میلے کچیلے ہو کر وہاں پہنچنا، وہاں جا کر جانوروں کا چڑھاوا چڑھانا، منت پوری کرنا، کسی قبر یا مکان کا طواف کرنا اور اس قبر و مکان کے آس پاس کے جنگل کا ادب و احترام کرنا؛ یہ سب شرک ہے۔

غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا حرام اور کرنے والا مشرک ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ [الأنعام: ١٤٥]

[بے شک وہ گندگی ہے، یا نافرمانی (کا باعث) ہو، جس پر غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو]

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح خنزیر، خون اور مردار ناپاک و حرام ہے، اسی طرح وہ جانور بھی ناپاک و حرام ہے جو خود گناہ کی صورت بن رہا ہو، کیونکہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کا ٹھہرایا گیا ہے۔ اس آیت میں یہ ذکر نہیں ہوا کہ اس جانور کو ذبح کرتے وقت مخلوق کا نام لیا جائے تو تب حرام ہوگا، بلکہ صرف اتنی بات کا ذکر ہے کہ کسی مخلوق کے نام پر جہاں کوئی جانور مشہور کیا، مثلاً یہ گائے سید احمد کبیر کی ہے، یہ بکرا شیخ سدّو کا ہے؛ ایسا کرنے سے وہ حرام ہو جاتا ہے۔ پھر کوئی جانور ہو یا مرغی ہو یا اونٹ؛ جب وہ کسی مخلوق ولی، نبی، باپ یا دادا اور بھوت پری کے نام کا ٹھہرایا جائے تو یہ سب حرام و ناپاک ہے اور کرنے والے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

غیر اللہ کے راہ و رسم کی تقلید کرنا شرک ہے:

یوسف علیہ السلام نے قید خانے میں قیدیوں سے کہا تھا:

﴿ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۝ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ﴾ [يوسف: ٣٩۔٤٠]

[اے قید خانے کے دو ساتھیو! کیا الگ الگ رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، نہایت

زبردست ہے؟ تم اس کے سوا عبادت نہیں کرتے مگر چند ناموں کی، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نہیں اتاری۔ حکم اللہ کے سوا کسی کا نہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا اور کسی کی عبادت مت کرو، یہی سیدھا دین ہے]

معلوم ہوا کہ کسی کی راہ و رسم کو ماننا اور اس کے حکم کو اپنی سند اور بنیاد سمجھنا، یہ بھی انھیں باتوں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی تعظیم کے لیے ٹھہرائی ہیں، نیز کسی اور سے یہ معاملہ کرنے پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ کا حکم بندوں تک پہنچنے کا ذریعہ رسول کا خبر دینا ہے۔ اب جو کوئی کسی امام یا مجتہد یا غوث یا قطب یا مولوی مشائخ یا باپ دادوں یا کسی بادشاہ یا وزیر یا پادری یا پنڈت کی بات کو اور ان کی راہ و رسم کو رسول کی بات اور فرمان سے مقدم سمجھے اور آیت و حدیث کے مقابلے میں اپنے پیر و استاد کے قول کی سند پکڑے یا خود پیغمبروں ہی کو یوں سمجھے کہ شریعت انھیں کا حکم ہے، ان کا جو جی چاہتا تھا، وہ اپنی طرف سے کہہ دیتے تھے، وہی بات ان کی امت پر لازم ہو جاتی تھی تو ایسی باتوں سے شرک لازم ہو جاتا ہے، بلکہ اصل حاکم اللہ تعالیٰ ہے، پیغمبر تو صرف خبر دینے والا ہے، لہٰذا جس کی بات رسول کے موافق ہو تو مانے اور اگر موافق نہ ہو تو نہ مانے۔

قیام تعظیم اللہ کے لیے خاص ہے:

سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ لوگ بت بن کر اس کے روبرو کھڑے رہیں تو وہ اپنا ٹھکانا آگ سمجھ لے۔'' (رواہ الترمذي)[1]

اس حدیث میں جس شخص کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ شخص گویا خدائی کا دعوی رکھتا ہے۔ تعظیم کا جو کام اللہ کے لیے خاص ہے، یعنی اس کے بندے نماز میں اس کے رو برو ہاتھ باندھ کر باادب کھڑے ہوتے ہیں۔ مذکور شخص یہ چاہتا ہے کہ لوگ یہ عمل اس کے لیے بجا لائیں، جیسے امیروں کے دربار میں چوبدار اور چپڑاسی ادب کے ساتھ خاموش کھڑے رہتے ہیں۔

امت محمدیہ میں بت پرستی کا آغاز:

ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں یہ خبر دی گئی ہے کہ قیامت سے پہلے اس امت کے کچھ لوگ

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٥٥)

قبروں اور مزاروں کو پوجنے لگیں گے۔ (أخرجه الترمذي)[1]

شرک دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ کسی کے نام کی صورت بنا کر اسے پوجا جائے، اس کو "صنم" کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی استھان کو مانے، یعنی کسی کے مکان کو یا دکان کو یا درخت کو یا پتھر یا لکڑی یا کاغذ کو کسی کے نام کا ٹھہرا کر پوجے، اس کو "وثن" کہتے ہیں۔ اس وثن میں قبر، چلہ گاہ، لحد، چھڑی [کسی بزرگ کے نام پر بنائی ہو جھنڈی]، تعزیہ، علم شدہ (شہداے کربلا کی یاد کا جھنڈا اور نشان) امام قاسم اور پیر دستگیر کی منہدی، امام کا چبوترہ اور استاد و پیروں کے بیٹھنے کی جگہ جس کی لوگ تعظیم کرتے ہیں، اسی طرح شہید کے نام کا طاق اور نشان و توپ جس پر لوگ بکرا چڑھاتے ہیں اور اس کی قسم کھاتے ہیں۔ اسی طرح بعض بیماریوں کے نام جیسے سیتلا (ماتا) کا تھان یا مسانی (خسرا) کا، یا بھوانی (چیچک) کا یا کالی کلکتہ والی کا یا کالکا کا، غرض کہ یہ سب وثن اور بت ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ خبر دی ہے کہ جو مسلمان قیامت کے قریب مشرک ہو جائیں گے، ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا کہ لوگ ایسی چیزوں کو مانیں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ برخلاف دوسرے مشرکوں کے جیسے ہنود یا مشرکین عرب کہ یہ اکثر صنم پرست ہیں، یعنی مورتوں کو مانتے ہیں، سو یہ دونوں مشرک، اللہ تعالیٰ سے پھرے ہوئے اور رسول کے دشمن ہیں۔

غیر اللہ کے لیے ذبح کرنا شرک ہے:

سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس موجود صحیفے میں لکھا تھا: "اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر لعنت فرمائی جس نے غیر اللہ کے لیے ذبح کیا۔" (رواہ مسلم)[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، انھیں کاموں میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص اپنی تعظیم کے لیے ٹھہرائے ہیں، لہٰذا اسے چھوڑ کر اور کسی کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے۔

آخری زمانے میں جدید وقدیم شرک کا رواج:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢١٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٧٨)

«لَا يَذْهَبُ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ حَتّٰى تُعْبَدَ اللَّاتُ وَالْعُزّٰى» (رواہ مسلم)[1]

[قیامت قائم ہونے سے پہلے لات وعزیٰ کی عبادت کی جائے گی]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آخری زمانے میں قدیم شرک بھی رائج ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جس طرح مسلمان لوگ اپنے نبی، ولی، امام، شہیدوں اور پیروں کے ساتھ شرک کا معاملہ کرتے ہیں، اسی طرح قدیم شرک بھی پھیل رہا ہے اور کلمہ گو مسلمان کافروں کے بتوں کو بھی مانتے ہیں اور ان کی رسموں پر چلتے ہیں، جیسے برہمن سے تقدیر کا حال پوچھنا، بدشگونی لینا، ساعت ماننا، سیتلا مسانی (چیچک اور خسرے کی بیماریوں کی دیویاں) پوجنا، ہنومان، لونا چماری، کلوابیر کی دہائی دینا، ہولی اور دیوالی کا تہوار کرنا، نو روز اور مہر جان کی خوشی کرنا، قمر درعقرب (چاند کے برج عقرب میں آنے کا نامبارک خیال کیا جانے والا وقت) اور تحت الشعاع (قمری مہینے کے منحوس سمجھنے والے آخری دو تین دن) کا اعتبار کرنا، جو سب ہنود و مجوس کی رسمیں ہیں اور مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں پر شرک کی راہ اسی طرح کھلے گی کہ وہ قرآن و حدیث کو چھوڑ کر باپ دادوں اور پیروں اماموں کی رسموں کے پیچھے لگ جائیں گے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی مرفوع حدیث میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا میں آنے اور دجال کے ہلاک ہوجانے کے بعد شام کی طرف سے ٹھنڈی ہوا چلے گی تو جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا، اس کو قبض کر لے گی، پھر برے لوگ ہی دنیا میں باقی رہ جائیں گے جو بے وقوفی میں پرندوں جیسے اور پھاڑ کھانے میں درندوں جیسے ہوں گے، انھیں اچھے برے کی کچھ تمیز نہ ہوگی۔ شیطان بھیس بدل کر ان کے پاس آئے گا اور کہے گا: تم کو شرم نہیں آتی کہ تم بے دین ہو، وہ پوچھیں گے تو ہمیں کیا بتاتا ہے؟ وہ کہے گا کہ تم استھانوں (آستانوں) کو پوجو۔ وہ ایسا کریں گے تو ان کی گزران عیش وعشرت کے ساتھ ہوگی اور انھیں بہت سا رزق میسر آئے گا۔ (رواہ مسلم)[2]

معلوم ہوا کہ آدمی کتنا ہی گناہوں میں ڈوب جائے، پورا بے شرم بن جائے، پرایا مال کھا جانے میں کوئی کسر نہ چھوڑے اور اس میں کچھ بھلائی برائی نہ سمجھے، پھر بھی شرک کرنے سے اور اللہ کے سوا اور

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٠٦)

کسی کو ماننے سے بہتر ہے، کیونکہ شیطان دیگر گناہوں کو چھوڑ کر انسان کو شرک والے گناہ کی طرف لاتا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت سے پہلے دوس قبیلے کی عورتوں کی سرینیں ذوالخلصہ بت کے ارد گرد حرکت کریں گی۔'' (یعنی اس کی عبادت کریں گی) (رواہ الشیخان)[1]

معلوم ہوا کہ بیت اللہ کے سوا کسی کا طواف کرنا شرک اور کافروں کی رسم ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٩٠٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٦٦٩٩)

پانچویں فصل

اشراک فی العادۃ کی خرابی کا ذکر

شرک میں مبتلا کرنے والے شیطانی وسوسے:

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا ۝ لَّعَنَهُ اللّٰهُ ۘ وَ قَالَ لَاَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا ۝ وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ ﴾

[النساء: ۱۱۷۔۱۱۹]

[وہ اس کے سوا نہیں پکارتے مگر مونثوں کو اور نہیں پکارتے مگر سرکش شیطان کو۔ جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس نے کہا کہ میں ہر صورت تیرے بندوں سے ایک مقرر حصہ ضرور لوں گا۔ اور یقیناً میں انھیں ضرور گمراہ کروں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور آرزوئیں دلاؤں گا اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور چوپاؤں کے کان کاٹیں گے اور یقیناً میں انھیں ضرور حکم دوں گا تو یقیناً وہ ضرور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورت بدلیں گے اور جو کوئی شیطان کو اللہ کے سوا دوست بنائے تو یقیناً اس نے خسارہ اٹھایا، واضح خسارہ]

بی بی کا نام ٹھہرانا بھی عورتوں کو پکارنے میں داخل ہے، کوئی بی بی آسیہ کا، کوئی بی بی اوتاولی کا، کوئی لال پری، سیاہ پری اور سبز پری کا اور کوئی سیتلا مسانی اور کالی کا نام ٹھہراتا ہے، جب کہ صورت حال یہ ہے کہ وہاں کوئی عورت ہے نہ مرد، محض اپنا خیال ہے اور شیطان کا وسوسہ۔ یہ جو کبھی سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور کبھی کوئی کرشمہ دکھاتا ہے تو وہ شیطان ہے۔ اسی طرح جانور کا کان چیرنا یا کان کاٹنا یا اس کے گلے میں ناڑا (دھاگا) باندھنا یا ماتھے پر مہندی لگانا، منہ پر سہرا باندھنا، منہ کے اندر پیسا رکھنا یا کسی جانور پر نشان کرنا کہ یہ فلاں کی نیاز ہے یا کسی کی چوٹی رکھنا یا کسی کے نام پر ناک کان چھیدنا یا

ڈاڑھی منڈوا کر یا کترا کر یا چڑھا کر یا چار ابرو کا صفایا کر کے فقیری جتانا؛ یہ سب کام مذکورہ بالا آیت میں داخل ہیں، جو شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے ہیں۔ ان کا انجام یہ ہوتا ہے کہ آدمی اللہ کی راہ سے بھٹک جاتا ہے، پھر شرک میں پھنس جاتا ہے اور جہنمی بن جاتا ہے۔

شرک فی التسمیہ:

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٩٠]

[پھر جب اس نے انھیں تندرست بچہ عطا کیا تو دونوں نے اس کے لیے اس میں شریک بنا لیے جو اس نے انھیں عطا کیا تھا، پس اللہ اس سے بہت بلند ہے جو وہ شریک بناتے ہیں]

یہ شرک فی التسمیہ کی دلیل ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ حوا علیہا السلام کی اولاد زندہ نہیں رہتی تھی تو شیطان نے آ کر یہ وسوسہ ڈالا کہ اب جو لڑکا ہو گا، اس کا نام میرے نام پر رکھنا، چنانچہ انھوں نے لڑکے کا نام "عبدالحارث" رکھا، اتفاق سے وہ لڑکا زندہ رہا۔[1]

ان سے جس شرک کا ارتکاب ہوا، یہ شرک فی التسمیہ، یعنی نام میں شرک ہے نہ کہ عبادت میں۔ یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ سب سے پہلے جس نے شرک کیا، وہ عورت تھی، اسی لیے سب سے زیادہ عورتیں جہنم میں جائیں گی، کیونکہ یہ کسی نہ کسی قسم کا شرک کیے بغیر نہیں رہتیں، الا ماشاء اللہ۔ یہ خاوندوں سے چھپ کر شرک کا کام کرتی ہیں۔

غیر اللہ کی نذر و نیاز دینا شرک ہے:

شرک کے مرتکبین کھیتوں اور مویشیوں میں غیر اللہ کی نذر و نیاز مقرر کرتے ہیں، جس کا ذکر

---

[1] مسند أحمد (٥/١١) اس کی سند میں موجود راوی "عمر بن ابراہیم البصری" سے متعلق امام ابو حاتم رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "لا يحتج به" "وہ قابل حجت نہیں"۔ پھر جیسے کہ دوسری سند سے ثابت ہے کہ یہ روایت سمرہ بن جندب پر موقوف ہے، مرفوع نہیں ہے، علاوہ ازیں اس کی سند میں حسن بصری رحمہ اللہ مدلس ہیں اور عن سے روایت کرتے ہیں۔ نیز حسن بصری رحمہ اللہ نے اس آیت کی تفسیر مذکورہ تفسیر کے خلاف بھی بیان کی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر: ٢٧٤/٤) اگر ان کے ہاں مذکورہ روایت مرفوع ہوتی تو وہ اسے کبھی نہ چھوڑتے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ مسند احمد اور سنن الترمذی کی مذکورہ روایت پایہ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔

قرآن مجید کی اس آیت میں آیا ہے:

﴿ وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا یَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ یَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٣٧]

[اور انھوں نے اللہ کے لیے ان چیزوں میں سے جو اس نے کھیتی اور چوپاؤں میں سے پیدا کی ہیں، ایک حصہ مقرر کیا، پس انھوں نے کہا یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے خیال کے مطابق اور یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے، پھر جو ان کے شرکا کے لیے ہے سو وہ اللہ کی طرف نہیں پہنچتا اور جو اللہ کے لیے ہے سو وہ ان کے شریکوں کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ برا ہے جو وہ فیصلہ کرتے ہیں]

لہٰذا یہ کام بھی شرک ہے۔

کسی چیز کو اچھوتا ٹھہرانا شرک ہے:

کسی چیز کو اچھوتا ٹھہرانا کہ فلاں اسے کھائے اور فلاں نہ کھائے، فلاں جانور پر بوجھ وغیرہ نہ لادا جائے یا سواری نہ کی جائے، جیسے فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِیْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِیْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ﴾ [المائدة: ١٠٣]

[اللہ نے نہ کوئی کان پھٹی اونٹنی مقرر فرمائی ہے اور نہ کوئی سانڈ چھٹی ہوئی اور نہ کوئی اوپر تلے بچے دینے والی مادہ اور نہ کوئی بچوں کا باپ اونٹ]

یہ سب چیزیں اللہ پر افترا ہے۔ وہ لوگ جس جانور کا کان پھاڑ دیتے وہ ''بحیرہ'' ہوتا، سانڈ کو وہ ''سائبہ'' کہتے، جس مادہ کے نر و مادہ اکٹھے ہوتے اسے ''وصیلہ'' کہتے اور جس جانور کے دس بچے ہو چکے ہوتے وہ جانور ''حام'' کہلاتا۔ مذکورہ بالا آیت سے معلوم ہوا کہ اس میں بیان کردہ سب عادات شرک ہیں۔

تحلیل و تحریم کا شرک:

اپنی طرف سے جھوٹ موٹ ٹھہرانا کہ فلاں کام درست ہے اور فلاں نا درست، کیونکہ کسی کام کو روا اور ناروا ٹھہرانا اللہ ہی کی شان ہے نہ کہ کسی اور کی، جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں پان نہ کھاؤ، لال کپڑا نہ پہنو، بی بی کی صحنک (نیاز) مرد نہ کھائیں اور ان کی نیاز میں فلاں فلاں

ترکاری ضرور ہو اور اس میں مِسّی [چنے کا آٹا ملی ہوئی روٹی] اور منہدی ہو اور اسے لونڈی نہ کھائے اور نہ وہ عورت ہی کھائے جس نے دوسرا خاوند کیا ہو۔

اسی طرح شاہ عبدالحق کا توشہ حلوا ہوتا ہے، حقہ نوش وہ نہ کھائے۔ شاہ مدار کی نیاز مالیدہ ہے، بوعلی قلندر کی سہ منی اور اصحابِ کہف کی گوشت روٹی ہے۔ شادی بیاہ میں فلاں رسمیں ناگزیر اور ضروری ہیں، شوہر کی موت کے بعد وہ خود شادی کرے نہ کسی کی شادی میں بیٹھے اور نہ اچار ڈالے، فلاں آدمی نیلا کپڑا پہنے نہ رنگین دھاری دار کپڑا پہنے۔ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں، لوگ ان کے ذریعے شرک میں گرفتار ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی حکومت کی شان میں دخل اندازی کرتے ہیں اور اپنی الگ ہی شریعت نکالتے ہیں۔

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ کفر اور شرک ہے:

جو شخص کائنات کے نظام کا چلنا ستاروں کی تاثیر سے سمجھے، وہ اللہ کا منکر ہے اور ستارہ پرستوں میں شامل ہے۔

شیخین نے زید بن خالد رضی اللہ عنہ سے جو مرفوعاً حدیث نقل کی ہے: «مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا»[1] [ہمیں فلاں فلاں ستارے سے بارش پلائی گئی] وہ اس بات کی دلیل ہے کہ نیک و بد گھڑی کا ماننا، اچھی بری تاریخ کا پوچھنا اور نجومی کے کہے پر یقین کرنا، یہ تمام شرکیہ چیزیں ہیں۔

علم نجوم سیکھنا حرام اور نجومی کی باتوں کی تصدیق کرنا کفر ہے:

نجوم کا ماننا ستارہ پرستوں کا کام ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے علمِ نجوم سیکھا، اس نے جادو کے علم کی ایک شاخ کا علم حاصل کیا۔''[2] (رواہ رزین)

حفصہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو شخص کسی عراف کے پاس آیا اور اس سے کچھ دریافت کیا تو چالیس دن تک اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔ (أخرجه مسلم)[3]

''عراف'' وہ شخص ہے جو غیب کی باتیں بتائے۔ اس میں نجومی، رمال، جفار، فال دیکھنے

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٦٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧١)

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٩٠٥)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٩٠٧)

والے، نامہ نکالنے والے اور کشف و استخارہ کا دعوی کرنے والے داخل ہیں۔

عیافت، طِرق اور طیرہ شرک اور کفر ہے:

قبیصہ رضی اللہ عنہ سے مروی روایت میں عیافت [پرندوں کے ذریعے اچھا یا برا شگون لینے کا پیشہ]، طِرق [پیش گوئی اور فال لینے کے لیے کنکریاں وغیرہ پھینکنا] اور طیرہ [نحوست پکڑنا اور شگون لینا] کو جبت قرار دیا گیا ہے۔ (رواہ أبوداوٗد)[1] مطلب یہ ہے کہ شگون لینے کے لیے جانور اڑانا، فال لینے کے لیے کچھ ڈالنا اور کسی طرح کا شگون لینا کفر کی رسموں میں سے ہے۔

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں تین بار یہ کہا گیا ہے:

''طیرہ یعنی بدفالی اور شگون لینا شرک ہے۔'' (رواہ أبوداوٗد)[2]

ہامہ، عدویٰ اور طیرہ کا اسلام میں کوئی تصور نہیں ہے:

سیدنا سعد بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث کے الفاظ ہیں:

''ہامہ نہیں ہے اور نہ کسی کا مرض کسی کو لگتا ہے اور نہ کسی چیز میں نحوست ہے، اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو گھر، گھوڑے اور عورت میں ہوتی۔'' (رواہ أبوداوٗد)[3]

ہامہ، عدوی اور طیرہ کیا ہے؟

عرب میں مشہور تھا کہ جو شخص مارا جائے اور اس کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کی کھوپڑی سے ایک الو نکل کر فریاد کرتا پھرتا ہے۔ وہ اسے ''ہامہ'' کہتے تھے۔ ''عدویٰ'' کا مطلب ہے بیماری کا متعدی ہونا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات غلط ہے کہ خارش اور جذام کا مرض ایک سے دوسرے کو لگ جاتا ہے۔ اب لوگ کیا کرتے ہیں کہ چیچک والے لڑکے سے دوسرے لڑکوں کو بچاتے ہیں کہ کہیں اسے بھی چیچک نہ نکل آئے، یہ کفر کی رسم ہے۔ کوئی شخص قطعاً اس کا اعتقاد نہ رکھے کہ بیماری از خود متعدی ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ فلاں کام فلاں شخص کے لیے منحوس اور نا مبارک

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحدیث (۳۹۰۷) اس کی سند میں ''حیان أبو العلاء'' راوی مجہول ہے، لہٰذا یہ روایت ضعیف ہے۔

[2] سنن أبي داوٗد، رقم الحدیث (۳۹۲۱)

[3] سنن أبي داوٗد، رقم الحدیث (۵٤۳۷)

ثابت ہوا، اسے راست نہ آیا۔ اگر نحوست کا کچھ اثر ہے تو تین چیزوں میں ہے، کیونکہ بعض اوقات یہ چیزیں نامبارک اور منحوس بھی ہوتی ہیں، مگر یہ معلوم کرنے کی راہ نہیں بتائی کہ انسان یہ کس طرح معلوم کرے کہ یہ چیز مبارک ہے اور یہ نا مبارک۔ چنانچہ جو لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ جو گھر شیر دھان، جو گھوڑا ستارہ پیشانی اور جو عورت کلجبی (مسلمانوں زبان والی) ہو وہ نا مبارک اور منحوس ہوتی ہے تو اس کی کوئی سند اور دلیل نہیں ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان باتوں کی ذرا پروا نہ کریں اور جب نیا مکان خریدیں یا گھوڑا ہاتھ لگے یا بیاہ کریں یا لونڈی خریدیں تو اللہ تعالیٰ سے اس کی بھلائی کا سوال کریں۔

صفر کچھ نہیں ہے:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں صفر کا بھی انکار کیا گیا ہے۔ (رواہ البخاري)[1]

صفر کی وضاحت:

جس شخص کو ایسا مرض ہو جس میں وہ کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے جسے طبیب لوگ ''جوع الکلب'' کہتے ہیں، اس کے متعلق عرب لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ ایسے شخص کے پیٹ میں کوئی بھوت یا بلا گھس جاتی ہے اور وہی کھانا کھاتی چلی جاتی ہے، اسے وہ صفر کہتے تھے، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے غلط قرار دیا کہ صفر نامی کوئی بھوت اور بلا نہیں ہے۔

عرب میں یہ بھی مشہور تھا کہ صفر کا مہینہ منحوس و نامبارک ہے، لہٰذا آدمی اس میں کوئی کام نہ کرے، لیکن یہ بھی غلط ہے۔ جاہل خواتین و حضرات کہا کرتے ہیں کہ صفر کے تیرہ دن منحوس ہیں، اس میں کچھ بلائیں اترتی ہیں۔ اسی بنیاد پر ان دنوں کا نام تیرہ تیزی ہے، کیونکہ ان کی تیزی سے کچھ کام بگڑ جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی مہینے یا تاریخ یا دن کو نا مبارک و منحوس سمجھنا، یہ سب شرک کی رسمیں ہیں۔ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مجذوم (کوڑھ کا مریض) کا ہاتھ پکڑ کر کھانے والے برتن میں رکھا اور فرمایا:

« كُلْ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَ تَوَكُّلاً عَلَيْهِ » (رواہ ابن ماجہ)[2]

[اللہ پر توکل اور بھروسا کرتے ہوئے کھاؤ]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٣٧)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٧٢٦)

آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ ہم کو اللہ پر بھروسا ہے، ہم کسی بیمار کے ساتھ کھانے سے پرہیز نہیں کرتے اور بیماری کے متعدی ہونے کو نہیں مانتے۔ وہ اللہ ہی ہے جسے چاہے بیمار کرے اور جسے چاہے تندرست۔

ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ کے روبرو قحط کی سختی بیان کی اور کہا کہ ہم اللہ کے ہاں آپ ﷺ کی سفارش چاہتے ہیں اور اللہ کی آپ ﷺ کے پاس۔ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ پر خوف اور دہشت طاری ہوگئی اور زبان سے اللہ کی بڑائی اور کبریائی بیان کرنے لگ گئے، جس سے اہلِ مجلس کے چہروں کے رنگ بدل گئے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کو کسی کے پاس سفارشی نہیں ٹھہراتے۔ اللہ کی شان اس سے بلند اور بڑی ہے۔ (أخرجه أبوداود عن جبير بن مطعم)[1]

بے دین لوگوں کی کفریہ اور شرکیہ باتیں:

گزشتہ حدیث سے معلوم ہوا کہ "یا شیخ عبد القادر شیئاً لله" [اے شیخ عبدالقادر! اللہ کے لیے ہماری مراد پوری کرو] یا اس قسم کا کوئی جملہ کہنا شرک ہے۔ وہ مالک الملک ایک آن میں کروڑوں کام کر دیتا ہے۔ وہ کس کے روبرو سفارش کر سکتا ہے؟ جس شہنشاہ کے دبدبے سے عرش عظیم چرچرائے، اس کے ساتھ جاہل لوگ بھائی بندی کا سا رشتہ یا دوستی آشنائی کا سا علاقہ سمجھ کر بڑھ بڑھ کر کیا کیا کفریہ باتیں کرتے ہیں۔ کوئی بد دین کہتا ہے کہ اگر میرا رب میرے پیر کے سوا کسی اور صورت میں ظاہر ہو تو میں ہرگز اسے نہ دیکھوں۔ کوئی بدبخت حقیقتِ محمدی کو حقیقتِ الوہیت سے بہتر بتاتا ہے، عیاذاً باللہ، حالانکہ حقیقتِ محمدی اسی قدر ہے کہ "عبده ورسوله" یعنی آپ ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ﷺ ہیں۔

الرب رب و إن تنزل
والعبد عبد و إن ترقى

[رب رب ہی ہے، اگرچہ وہ نیچے اترے اور غلام غلام ہی ہے اگرچہ وہ اوپر چڑھے]

شہنشاہِ عالم سے ہمارا رویہ کیا ہو؟

یہ محض بے جا بات ہے کہ آدمی بہ ظاہر بے ادبی کا لفظ بولے اور اس سے کچھ اور معنی مراد لے،

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦)

کیونکہ پہیلی، چیستان اور معما بولنے کی اور بہت سی جگہیں ہیں، کچھ اللہ ہی کی جناب میں ضروری نہیں۔ کوئی شخص بادشاہ سے ضلع جگت اور پہلو دار بات نہیں کرتا اور نہ اس سے ٹھٹھا کرتا ہے، کیونکہ اس کام کے لیے دوست اور آشنا ہوتے ہیں نہ کہ باپ اور بادشاہ۔

شرکیہ ناموں سے بچو اور توحیدی نام اختیار کرو!

رسول اللہ ﷺ شرک کی تردید کا اتنا اہتمام فرماتے کہ جس نام میں ذرا بھی شرک کی بو معلوم ہوتی، اسے بدل دیتے تھے۔

ایک شخص کی کنیت ابو الحکم تھی۔ آپ ﷺ نے یہ سن کر فرمایا: حکم تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، تم نے یہ کنیت کیوں رکھی ہوئی ہے؟ (رواه أبوداؤد و النسائي عن شريح بن هانئ)[1]

دوسری طرف توحیدی نام رکھنے کی رغبت کے حوالے سے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا: ”تمھارے تمام ناموں میں سے اچھے نام عبداللہ اور عبدالرحمن ہیں۔“ [رواه مسلم][2]

یعنی جس نام میں اللہ کی غلامی اور بندگی کا پہلو نکلے، خصوصاً اللہ کے ویسے نام کا ذکر ہو جو اور کسی کے لیے نہیں بولا جا سکتا۔

محبتِ الٰہی کا تقاضا ہے کہ مخلوق میں سے کسی کو اس کے ساتھ نہ ملایا جائے:

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

”تم یوں نہ کہو کہ جو اللہ چاہے اور محمد (ﷺ) چاہے، بلکہ یوں کہو: جو فقط اللہ چاہے۔“

(رواه في شرح السنة)[3]

مطلب یہ ہے کہ محبت کی شان بہت بڑی ہے، لہٰذا اللہ کا بندہ اس میں کسی مخلوق کو نہ ملائے خواہ وہ پیغمبر یا وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، کیونکہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ بندہ یہ نہ کہا کرے: اللہ و رسول چاہے گا تو فلاں کام ہو گا۔ کیونکہ سب کچھ اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے، رسول کے

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٩٥٥) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٣٨٧)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٣٢)

[3] شرح السنة (٣٦١/١٢) امام بغوی رحمہ اللہ نے یہ روایت منقطع سند کے ساتھ ذکر کی ہے، لیکن یہ حدیث دیگر صحیح اسانید کے ساتھ بھی مروی ہے۔ دیکھیں مسند أحمد (٣٨٤/٥) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٩٨٠) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٧) سنن النسائي الكبرى، رقم الحديث (١٠٨٢٥)

چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا تو پھر ولی، پیر، شہید اور فرشتے کس گنتی میں ہیں؟

اسی طرح بندہ یہ نہ کہے کہ اللہ و رسول جانیں، کیونکہ غیب بھی اللہ ہی جانتا ہے، رسول کو کیا خبر؟ رہا دین کا معاملہ تو اس کی بات اور ہے، اس لیے کہ وہ باتیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو بتا دی ہیں۔

غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے:

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

''جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی یقیناً وہ مشرک ہوا۔'' (أخرجه الترمذي)[1]

اسی طرح عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''تم جھوٹے معبودوں کی قسمیں نہ کھاؤ اور نہ باپ دادوں ہی کی۔'' (رواه مسلم)[2]

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

''اللہ تعالیٰ تمھیں باپ دادوں کی قسم کھانے سے منع کرتا ہے، جسے قسم کھانا ہو، وہ اللہ کی قسم کھائے یا چپ رہے۔'' (رواه الشيخان)[3]

معلوم ہوا کہ جن کی قسم کھانے کا مشرکوں میں دستور ہے، ان کی قسم کھانے سے ایمان میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر تو یہ ہے کہ اللہ کو بھی قسم کھانے کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ رہی جھوٹی قسم تو اس کی سزا یہ ہے کہ جہنم میں غوطہ دیا جائے گا۔ جھوٹی قسم کو ''یمین غموس'' کہا جاتا ہے۔[4]

غیر اللہ کی منت ماننا اور پورا کرنا ناجائز و حرام ہے:

سیدنا ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ ایک آدمی نے منت مانی کہ میں بوانہ مقام پر اونٹ ذبح کروں گا۔ آپ ﷺ نے پوچھا: وہاں کوئی وثن (دورِ کفر کا کوئی تھان) تھا، جسے لوگ پوجتے ہوں؟ اس نے جواب دیا: جی نہیں! آپ ﷺ نے پھر سوال کیا: وہاں کوئی تہوار منایا جاتا

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٣٥)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٦)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٢٢)

تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ تب آپ ﷺ نے اسے اجازت دی کہ اپنی منت پوری کر، لیکن اس منت کو پورا نہ کر جس میں اللہ کی معصیت اور نافرمانی ہو۔ (رواہ أبو داؤد)[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اول تو اللہ کے سوا کسی کی منت نہ مانے اور اگر مانی ہو تو پوری نہ کرے، کیونکہ ایسا کرنا گناہ ہے۔ جس جگہ لوگ کسی کے نام پر جانور چڑھاتے ہوں یا غیر اللہ کی پوجا کرتے ہوں یا وہاں شرک کا میلہ لگتا ہو تو وہاں اللہ کے نام کا جانور بھی نہ لے جائے اور کسی طرح اس میں شریک نہ ہو، نہ اچھی نیت سے نہ بری نیت سے، کیونکہ ان سے مشابہت کرنا خود ایک گناہِ عظیم ہے۔

قبور و مشاہد پر منعقدہ میلوں اور عرسوں میں شرکت کرنا حرام ہے:

وہ میلے ٹھیلے جو اولیا و صلحا کی قبور و مشاہد پر عرس وغیرہ کے نام سے منعقد ہوتے ہیں، ان میں شرکت کرنے کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ ناجائز اور حرام ہے۔ قبر کی زیارت کے لیے تو خالی سفر کرنا ہی ثابت نہیں ہے، پھر وہاں پر شرکیہ افعال بجا لانا کب درست ہو سکتا ہے؟ اسی وجہ سے گور پرستی اور پیر پرستی ناجائز اور حرام ثابت ہوتی ہے۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنا اور ان کی تعظیم کرنا حرام ہے:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کی کہ جانور اور درخت آپ کو سجدہ کرتے ہیں تو کیا ہم آپ کو سجدہ نہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے رب تعالیٰ کی بندگی اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو۔ (رواہ أحمد)[2]

اس سے معلوم ہوا کہ نبی، ولی، امام، پیر، شہید اور جتنے بھی اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے ہیں، سب انسان ہیں اور ہمارے عاجز بھائی ہیں، البتہ اللہ نے انھیں بزرگی عطا کی ہے، لہٰذا ہمیں ان کی تعظیم انسانوں کی طرح کرنی چاہیے نہ کہ اللہ جیسی، اور انسان کو جانور کی تقلید نہیں کرنا چاہیے۔

سیدنا قیس بن سعد رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا: میں نے حیرہ شہر کے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنے مرزبان یعنی بادشاہ کو سجدہ کرتے تھے، جب کہ (اے اللہ کے رسول ﷺ!) آپ اس سجدہ (تعظیمی) کے زیادہ حق دار ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اگر تو میری قبر کے پاس سے گزرے تو کیا تو

---

[1] سنن أبي داؤد، رقم الحديث (٣٣١٣)

[2] مسند أحمد (٧٦/٦) اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف ہے۔

اسے سجدہ کرے گا اس نے کہا: نہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: تو اب بھی مت کر۔ (رواہ أبوداوٗد)[1]

آپ ﷺ کا مطلب یہ تھا کہ میں بھی ایک دن فوت ہو کر مٹی میں چلا جاؤں گا تو میں سجدے کے لائق کب ہوا؟ سجدہ تو صرف اس ذات با برکات کے لیے خاص ہے، جسے موت نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندہ کسی زندہ کو سجدہ کرے نہ کسی مردے کو اور نہ کسی قبر کو، اگر چہ وہ پیغمبر کی قبر ہو اور نہ ہی کسی تھان کو۔ کیونکہ جو زندہ ہے، وہ ایک دن مرے گا اور جو مر گیا وہ کبھی زندہ تھا اور بشریت کی قید میں گرفتار تھا، پھر مرنے کے بعد وہ خدا نہیں بن گیا، بندہ ہی رہا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ صرف اللہ کا بن کر رہے:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ آقا اپنے غلام اور لونڈی کو بندہ اور بندی نہ کہے، نیز غلام اپنے آقا کو مالک نہ کہے، کیونکہ سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ (رواہ مسلم)[2]

اس سے ثابت ہوا کہ جب کوئی شخص حقیقت میں غلام ہو تو وہ بھی آپس میں ایسی گفتگو نہ کرے کہ یہ اس کا بندہ اور وہ اس کا مالک ہے، پھر جھوٹ موٹ کا بندہ بننا اور عبد النبی، بندہ علی، بندہ حضور، پرستار خاص، امرد پرست، آشنا پرست اور پیر پرست کہلانا اور ہر کسی کو خداوند خدایگاں داتا کہنا اور یہ کہنا کہ تم ہمارے جان و مال کے مالک ہو، ہم تمھارے بس میں ہیں، جو چاہو سو کرو؛ یہ محض بے جا اور انتہائی بے ادبی ہے اور رسومِ کفر و شرک سے قریب ہے۔

رسول اللہ ﷺ کو حدِ بندگی اور رسالت سے بڑھانا منع ہے:

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

''مجھے اس طرح حد سے مت بڑھاؤ، جیسے نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو بڑھایا تھا۔ میں تو اس کا بندہ ہوں، سو تم مجھے اللہ کا بندہ اور رسول ہی کہو۔''[3]

آپ ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے جتنی خوبیاں اور کمالات عطا کر رکھے ہیں، رسول کہہ دینے میں وہ سب آ جاتے ہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑا کوئی رتبہ نہیں ہے، اس

---

[1] سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (۲۱٤۰)

[2] صحیح مسلم، رقم الحديث (۲۲٤۹)

[3] صحیح البخاري، رقم الحديث (۳۲٦۱)

کے علاوہ جتنے مرتبے ہیں، وہ اس سے نیچے ہیں، مگر آدمی رسول ہو کر آدمی ہی رہتا ہے اور بندہ ہونا اس کا فخر ہوتا ہے، اس میں خدائی کی شان آ جاتی ہے نہ وہ اللہ کی ذات میں مل جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی وضاحت فرما دی کہ نصاریٰ بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ایسی باتیں کہہ کر کافر ہوئے تھے۔

اس لیے آپ ﷺ نے اپنی امت کو نصیحت فرمائی کہ تم ان کی چال نہ چلو اور اپنے پیغمبر کی تعریف میں حد سے نہ بڑھو، تا کہ تم بھی نصاریٰ کی طرح راندے نہ جاؤ۔

تعظیم و تعریف میں غلو ... گمراہی کا بہت بڑا سبب ہے:

رسول اللہ ﷺ کی مذکورہ بالا نصیحت کے باوجود بے ادبوں نے حدِ اعتدال میں رہنے کو، خصوصاً وحدتِ وجود کا عقیدہ رکھنے والوں اور شاعروں نے، قبول نہ کیا۔ کسی دغا باز نے حدیث: «أَنَا أَحْمَدُ»[1] کو بدل کر "أنا أحد" میم کے بغیر وضع کیا۔ کسی نے لمبی چوڑی عربی عبارت گھڑ کر اس کا نام "خطبة الافتخار" رکھا اور اسے علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا۔ کسی نے امکان و وجوب و اتحاد کے مجمع کا شعر بنایا، جب کہ دربار رسالت کا منظر کچھ یوں ہے کہ مطرف رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کو کہا کہ آپ ﷺ ہمارے سید ہیں تو آپ ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ سید تو اللہ تعالیٰ ہے۔
(رواه أبو داود)[2]

لفظ "سید" کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ "سید" اسے کہتے ہیں جو خود مالک و مختار ہو اور کسی کا محکوم نہ ہو، وہ جو چاہے سو کرے، جیسے بہ ظاہر بادشاہ، جب کہ یہ بات صرف اللہ ہی کی شان ہے، اس کے سوا کوئی ایسا سید اور سردار نہیں۔ دوسرے یہ کہ "سید" وہ ہے جو رعیتی ہو اور رعیتوں سے امتیاز رکھتا ہو کہ اصل حاکم کا حکم پہلے اس کے پاس آئے، پھر اس کی زبانی اوروں کو پہنچے، جیسے ہر قوم کا چودھری اور ہر گاؤں کا زمیندار ہوتا ہے، اس معنی میں ہر پیغمبر اپنی امت کا سید اور سردار ہے۔

تصویروں سے نفرت کرنا شرک سے بچاؤ کا سبب ہے:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول ﷺ ہے:

"یقیناً تصویریں بنانے والے قیامت کے دن عذاب میں مبتلا ہوں گے اور انھیں کہا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦١٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٥٤)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٨٠٦)

جائے گا کہ اپنی بنائی ہوئی تصویر میں جان ڈالو۔ جس گھر میں تصویر ہوتی ہے، اس میں فرشتے نہیں آتے۔" (رواه البخاري)[1]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اکثر مشرک مورتوں اور تصویروں کو پوجتے ہیں، اس لیے فرشتوں کو تصویروں سے گھن آتی ہے اور وہ تصویروں والی جگہوں میں نہیں جاتے۔ رہا مصوروں کا معاملہ تو انھیں اس لیے عذاب ہوگا کہ وہ بت پرستی کا سامان اکٹھا کرتے ہیں۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ جو بعض جاہل پیغمبروں یا اماموں یا ولیوں یا اپنے پیروں کی تصویروں کی تعظیم کرتے ہیں اور اپنے پاس برکت کے لیے ان کی تصویریں رکھتے ہیں، یہ سب شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں، پیغمبر اور فرشتے سب ان سے بے زار ہیں۔

لہٰذا بہتر یہ ہے کہ انسان ان سب تصویروں کو ناپاک سمجھ کر گھر سے نکال دے، تاکہ پیغمبر بھی خوش ہوں اور فرشتے بھی گھر میں آئیں اور ان کے قدم رنجہ کرنے سے گھر میں برکت پھیلے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ مصور کو پیغمبر کے قاتل کے برابر گناہ ہوتا ہے۔ (رواه البيهقي)[2]

نیز سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور کو سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔ (رواه الشيخان)[3]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ مصور در پردہ خدائی کا دعویٰ کرتا ہے کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں، یہ ان کے مثل بنانے کا ارادہ کرتا ہے، تو اس بے ادب سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوگا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل مقام و مرتبہ:

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنِّي لَا أُرِيْدُ أَنْ تَرْفَعُوْنِي فَوْقَ مَنْزِلَتِيَ الَّتِي أَنْزَلَنِيهَا اللّٰهُ تَعَالٰى، أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ، عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ» (رواه رزين)[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٩٩٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٠٧)

[2] شعب الإيمان (١٩٧/٢) اس کی سند میں "محمد بن حمید رازی" ضعیف ہے، البتہ اسی معنی میں ایک اور روایت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، جس کی سند حسن ہے۔ دیکھیں: مسند أحمد (٤٠٧/١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١١١)

[4] سنن النسائي الكبرى (٧١/٦)

[یقیناً میں نہیں چاہتا کہ تم مجھے اس مقام و مرتبے سے بڑھاؤ جو اللہ نے مجھے عطا کیا ہے۔
میں تو وہی عبداللہ کا بیٹا محمد، اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں]

آپ ﷺ کا مطلب یہ ہے کہ میرا نام محمد (ﷺ) ہے، اللہ، خالق اور رازق نہیں ہے اور میں تمام لوگوں کی طرح اپنے باپ ہی سے پیدا ہوا ہوں اور بندہ ہونا ہی میرا فخر ہے۔ دوسرے لوگوں سے میرا یہی امتیاز ہے کہ میں اللہ کے احکام سے واقف ہوں، جب کہ لوگ ان سے غافل ہیں، لہٰذا انھیں ہم سے اللہ کا دین سیکھنا چاہیے۔ ذات وصفاتِ محمدیہ ﷺ کی یہی حقیقت ہے، رہا وہ مبالغہ جو جاہل لوگ کیا کرتے ہیں اور آپ ﷺ کو بشر کہنا ایک بے ادبی سمجھتے ہیں اور آپ ﷺ کو بندہ کہنے سے برا مانتے ہیں، وہ سب بے دلیل ہے۔ یہاں پر کتاب "تقوية الإيمان" کا خلاصہ مکمل ہوا، وللہ الحمد.

خاتمہ

نجاتِ اخروی کے حصول کا طریقہ

دینِ اسلام نجاتِ اخروی کی واحد بنیاد ہے:

آخرت کی نجات دینِ اسلام میں منحصر ہے۔ دین حق کے سوا کسی اور دین والے کی ہرگز نجات نہ ہوگی۔ آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم الانبیاء محمد ﷺ تک جتنے نبی اور رسول آئے، سب یہی دینِ اسلام دنیا میں لائے۔ سب سے پہلے جس نے ہمارا نام مسلمان رکھا، وہ ابراہیم علیہ السلام ہیں۔

چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ [الحج: ۷۸]

[اسی نے تمھارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے]

مزید فرمایا:

﴿وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَ هُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [آل عمران: ۸۵]

[اور جو اسلام کے علاوہ کوئی اور دین تلاش کرے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں سے ہوگا]

قیامت کے دن اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کی عدمِ قبولیت پر یہ آیت نص صریح ہے۔

اسلام کیا ہے؟

اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ پہلی بنیاد گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، دوسری نماز، تیسری روزہ، چوتھی زکات اور پانچویں حج ہے۔ جو شخص تصدیق قلبی کے بعد ان بنیادوں پر قائم ہے، وہ مسلمان اور نجات پانے والا ہے۔ جو کوئی ان میں سے کسی چیز کو بلا عذر ترک کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں رہتا ہے۔

رسول اور مومنوں کی مخالفت جہنمی ہونے کی دلیل ہے:

جو شخص اسلام قبول کرنے کے بعد پیغمبر ﷺ کی مخالفت کرتا ہے اور مومنوں کی راہ کے سوا شرک و گناہ کی کوئی اور راہ و رسم نکالتا ہے تو وہ بھی آخرت میں نجات نہیں پائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ۱۱۵]

[اور جو کوئی رسول کی مخالفت کرے، اس کے بعد کہ اس کے لیے ہدایت خوب واضح ہو چکی اور مومنوں کے راستے کے سوا (کسی اور) کی پیروی کرے ہم اسے اسی طرف پھیر دیں گے جس طرف وہ پھرے گا اور ہم اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بری لوٹنے کی جگہ ہے]

مذکورہ آیت میں مومنوں سے مراد صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کی جماعت ہے اور انھیں کو سلف صالحین کہتے ہیں۔ اب جو شخص اپنے دین و مذہب میں ان کی راہ کے خلاف چلتا ہے، وہ ہلاک ہونے والا ہے، نجات پانے والا نہیں۔

نجات اخروی توحید اور ترکِ شرک و بدعت پر موقوف ہے:

مذکورہ بالا آیت کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ ذکر کیا ہے کہ شرک ہرگز معاف نہیں ہو گا۔ موضح القرآن میں کہا ہے کہ دین اسلام کے سوا جو دین ہے سب شرک ہے، اگرچہ اس کے ماننے والے پوجا و پرستش میں شرک نہ کرتے ہوں۔ انتھیٰ.

غرض کہ آخرت کے عذاب سے نجات پانا اخلاص و توحید کے حصول اور شرک و بدعت کو ترک کرنے پر موقوف ہے۔ جو شخص یہ سمجھے کہ صرف کلمہ پڑھ لینے یا شرک جلی یا شرک کی دیگر انواع خفی میں مبتلا ہو کر چاروں ارکان بجا لانے سے نجات ہو سکتی ہے تو وہ جاہل ہے، اس نے کلمہ طیبہ کے معنی کو سمجھا ہے نہ دین حق کو پہچانا ہے۔

قیامت کے دن لوگوں کے چار گروہ:

① ایک گروہ تو ان کامیاب لوگوں پر مشتمل ہو گا جنھیں دوزخ کی ہوا بھی نہیں لگے گی، یہی وہ بڑی

کامیابی ہے، جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے:

﴿ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَ اُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَ مَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ [آل عمران: ١٨٥]

[پھر جو شخص آگ سے دور کر دیا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا تو یقیناً وہ کامیاب ہو گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کے سامان کے سوا کچھ نہیں]

② دوسرا گروہ عذاب میں مبتلا ہونے والوں کا ہے، جو اعمالِ بد اور گناہِ کبیرہ کے سبب جہنم میں جائیں گے اور پھر عدمِ شرک اور وجودِ توحید کے سبب جلد یا بدیر شفاعت یا بلا شفاعت سزا پانے کے بعد جہنم سے نکلیں گے۔

③ تیسرا گروہ نجات پانے والوں کا ہے، جیسے بچے اور پاگل، کیونکہ یہ مرفوع القلم تھے۔ انھیں جہنم سے نجات ملے گی، ثواب خواہ ملے یا نہ ملے۔

④ چوتھا ہلاک ہونے والوں کا گروہ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جنت سے بالکل محروم رہیں گے۔ ان میں اہلِ کفر و شرک سب داخل ہیں، خواہ وہ موحد تھے یا منافق، کیونکہ اقرارِ رسالت کے بغیر خالی توحید باعث نجات نہیں ہوتی ہے، اسی طرح اتباع کے بغیر رسالت کا اقرار نجات نہیں دیتا۔ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا عقیدہ و عمل ظاہر کتاب و سنت کے مطابق ہو، کیونکہ بدعت کے بہتر دروازے ہیں جس طرح شرک کے ستر دروازے ہیں۔ سارے اہلِ بدعت حدیث: «كُلُّهُمْ فِي النَّارِ إِلَّا مِلَّةً وَّاحِدَةً» کے حکم کے ساتھ آگ میں جانے والے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آگ سے نجات پانے والا کون سا گروہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: «مَا أَنَا عَلَيْهِ وَ أَصْحَابِي»[1] [جو اس راہ پر چلے جس پر میں اور میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم گامزن ہیں]

مشرک ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور موحد ہمیشہ جنت میں:

مذکورہ بالا حدیث میں بیان کردہ راہ کو اپنانے والے گروہ کو فرقہ ناجیہ کہتے ہیں، اس طریقہ سلفیہ کے لوگ سرے سے جہنم میں نہیں جائیں گے، گو ان میں سے بعض اعمال میں کوتاہی کرنے والے ہوں۔ ان کی توحید اس دن وہ کام کر جائے گی جو اہلِ بدعت کی اطاعت اور عبادت بھی نہیں کرے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

گی۔ یہی وجہ ہے کہ توحید کو اساسِ طاعات اور افضل حسنات کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی موحد و متبعِ سنت کبیرہ گناہوں کے سبب دوزخ میں چلا بھی گیا تو ان شاء اللہ انجام کار وہ رہائی پائے گا۔ مگر اس کے برخلاف وہ نام کا مسلمان جو شرک میں گرفتار تھا، پیر پرست، گور پرست، امام پرست، شہید پرست، پیغمبر پرست اور دیگر چیزوں کا پرستار تھا، وہ دوزخ سے کبھی نجات نہ پا سکے گا، گو وہ کتنا ہی بڑا عالم یا عابد کیوں نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ بَلٰی مَنْ کَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ [البقرة: ٨١]

[کیوں نہیں! جس نے بڑی برائی کمائی اور اسے اس کے گناہ نے گھیر لیا تو وہی لوگ آگ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں]

اس سے معلوم ہوا کہ مشرک ہمیشہ جہنم کی آگ میں رہے گا اور مومن صالح جنتِ خلد میں رہے گا اور دونوں کے لیے دائمی زندگی ہے۔

نجاتِ آخرت کا راستہ:

جس شخص کی مراد یہ ہو کہ وہ آخرت میں بھڑکتی ہوئی آگ کے عذاب سے بچ جائے تو اسے چاہیے کہ وہ اولاً عقیدہ درست کرے، سلف کے اعتقاد پر ثابت قدم رہتے ہوئے اپنی عقل کو دخل نہ دے اور کسی بدعتی کی تاویل پر دھوکا نہ کھائے۔ پھر جب عقیدہ درست ہو گیا تو اب عمل صالح بجا لانے اور بدعات سے بچنے میں سعی کرے۔ اگر نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہو جائیں گی تو نجات مل جائے گی اور اگر ایسا نہ ہوا تو جہنم موجود ہے، گو اس میں ہمیشہ نہ رہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

«يُؤْتٰى بِأَنْعَمِ أَهْلِ الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ النَّارِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيُصْبَغُ فِي النَّارِ صَبْغَةً ثُمَّ يُقَالُ: يَا ابْنَ آدَمَ! هَلْ رَأَيْتَ خَيْرًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ نَعِيمٌ قَطُّ؟ فَيَقُولُ: لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ، وَيُؤْتٰى بِأَشَدِّ النَّاسِ بُؤْسًا فِي الدُّنْيَا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيُصْبَغُ صَبْغَةً فِي الْجَنَّةِ فَيُقَالُ لَهُ: يَا ابْنَ آدَمَ! هَلْ رَأَيْتَ بُؤْسًا قَطُّ؟ هَلْ مَرَّ بِكَ شِدَّةٌ قَطُّ؟

فَيَقُوْلُ: لَا وَاللّٰهِ يَا رَبِّ! مَا مَرَّ بِي بُؤْسٌ قَطُّ، وَلَا رَأَيْتُ شِدَّةً قَطُّ» (رواہ مسلم)[1]

[قیامت کے دن جہنم والوں میں سے اس آدمی کو لایا جائے گا جو اہلِ دنیا میں سے بہت نعمتوں والا تھا، پھر جہنم میں ایک غوطہ دے کر اس سے کہا جائے گا: اے ابنِ آدم! کیا تو نے کبھی کوئی بھلائی بھی دیکھی تھی؟ کیا تجھے کبھی کوئی نعمت بھی ملی تھی؟ وہ کہے گا: اے میرے رب! اللہ کی قسم، نہیں۔ پھر اہلِ جنت میں سے اس آدمی کو پیش کیا جائے گا، جسے دنیا میں لوگوں سے سب سے زیادہ تکلیفیں آئی ہوں گی، پھر اسے جنت میں ایک دفعہ غوطہ دے کر پوچھا جائے گا: اے ابنِ آدم! کیا تو نے کبھی کوئی تکلیف بھی دیکھی؟ کیا تجھ پر کبھی کوئی سختی بھی گزری؟ وہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! اللہ کی قسم! نہیں۔ کبھی کوئی تکلیف میرے پاس سے گزری اور نہ میں نے کبھی کوئی شدت اور سختی دیکھی]

مذکورہ بالا حدیث سے دوزخ کی سختی اور جنت کی خوبی یہ خوبی معلوم ہوتی ہے۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ ''آگ میں سب سے کم عذاب اس شخص کو ہوگا، جو دنیا کی عمر کے برابر دوزخ میں رہے گا۔'' اللهم أجرنا من النار.

ایمان کی خوبی یہ ہے کہ مسلمان اس بات کی کوشش کرے کہ سرے سے جہنم کی صورت نہ دیکھے۔ نعیم جنت کا ادنا درجہ یہ ہے کہ جنت میں ایک کوڑے کے برابر جگہ دنیا وما فیھا سے بہتر ہے۔[2] اللهم إنا نسألك الجنة.

احکامِ شرعیہ تین طرح کے ہیں:

دینِ اسلام میں احکامِ شرعیہ تین طرح کے ہیں:

① واضح حلال۔

② واضح حرام۔

③ مشتبہ۔

جو شخص دین کے معاملے میں بڑا حریص ہوتا ہے وہ برے خاتمے کے خوف سے مشتبہات سے

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۸۰۷)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۷۸)

بچتا رہتا ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ترکِ شبہہ پر کچھ مواخذہ نہ ہوگا اور شبہے والے فعل پر اسے باز پرس کا ڈر لگا ہوا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے:

"المؤمنون وقافون عند الشبهات" [مومن شبہات پر کھڑے ہونے والے ہیں]

اسی طرح خوف زدہ اور باخبر مسلمان پر لازم ہے کہ جس مسئلے میں اہلِ علم کا اختلاف ہو، اس کو ترک کر دے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مراد پر ایمان لا کر خاموش ہو جائے، کسی ایک قول کی طرف مائل اور اس کا قائل نہ ہو، کیونکہ ایسا کرنے میں نجات کا یقین ہے اور اس کے خلاف میں ہلاکت یقینی ہے۔ اسی طرح وہ مسائل و مقالات جن میں سلف نے کلام کیا ہے نہ بحث مباحثہ، جبکہ خلف نے دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے ہیں اور مدعیانِ علم نے طومار کے طومار لکھ ڈالے اور لمبے چوڑے دعوے ظاہر کیے ہیں، انھیں طاق نسیان پر رکھ دے اور ظاہر کتاب و سنت پر قناعت اور اکتفا کرتے ہوئے پکا سچا مسلمان بن جائے۔ ظاہری اضافوں کو نافرمانی کی طرح سمجھ کر ترک کر دے، اسی لیے کہا گیا ہے کہ "التوحید ترك الإضافات" [توحید ترکِ اضافات کا نام ہے] پیر، شیخ، استاد، صوفی، فقیر، مجتہد، حافظ، قاری، ملا، مولوی اور منشی کہلانا آسان چیز ہے، مگر مسلمان بننا نہایت مشکل امر ہے۔

اے دل تو دمے مطیع رحمٰن نشدی
وز کردہ خویشتن پشیمان نشدی

[اے دل! تو لمحہ بھر کے لیے بھی رحمٰن کا مطیع نہ بنا اور اپنے کیے پر نادم و پشیمان نہ ہوا]

صوفی شدی و شیخ شدی دانشمند
ایں جملہ شدی ولے مسلمان نشدی

[تو صوفی بھی بن گیا اور دانشمند شیخ بھی بن گیا، تو یہ سب کچھ تو بن گیا، مگر مسلمان نہ بن سکا]

ہم مسلمان اور سنی ہیں:

ہمارا لقبِ قدیم اور عطیۂ خلیل جلیل علیہ السلام مسلمان ہے اور خطاب جدید عطیۂ خاتم النبیین سید المرسلین سنی ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

«عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ»[1]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه (٤٢)

[میری اور ہدایت یافتہ خلفا کی سنت کو لازم پکڑو]

اب ہم کو اس کے بعد کوئی لقب و خطاب پسند نہیں ہے۔ جو کوئی اس کے سوا دوسرا نام ونشان اپنے لیے پسند کرے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔

هذا و أقول: رَب أنت ولي في الدنيا والآخرة، توفني مسلما وألحقني بالصالحين، و اجعل لي لسان صدق في الآخرين، و أخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين و سلام على المرسلين.

دَعوة الدَّاع

إلى

إيثار الاتباع على الابتداع

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله رب العالمين، والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلى آله وصحبه أجمعين، وبعد:

قرآن کریم اور حدیث شریف کا بہ غور مطالعہ کیجیے اور عصرِ نبوی سے آج تک علمائے حق کی دعوتی و اصلاحی مساعی پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ توحید اور اتباعِ سنت کا مسئلہ کس قدر اہم ہے۔ توحید کے مسئلے کو اگر آپ توحیدِ ربوبیت کے زاویے سے دیکھیں تو معاملہ آسان نظر آتا ہے، لیکن توحیدِ الوہیت کے سوال پر مسلمانوں کی اچھی خاصی تعداد الجھاؤ بلکہ غلط روی کا شکار نظر آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے توحید وسنت کی اہمیت کو واضح کرنے اور انسانی معاشرے کے لیے اس کی ضرورت کو بیان کرنے کے لیے علما اور ائمہ دین کی ایک جماعت ہمیشہ سر بہ کف رہی۔ (سر بہ کف کی تعبیر یہاں کنایتاً نہیں بلکہ حقیقی معنی میں استعمال کی گئی ہے، جس کی تصدیق کے لیے برصغیر اور عالمِ اسلام کی دینی تاریخ کا مطالعہ کافی ہے) خصوصیت کے ساتھ تحریکِ شہیدین پر نظر ڈالیے، جس کی آبیاری میں علما اور عوام کی بہت بڑی تعداد سرگرم رہی ہے۔

امیر والا جاہ علامہ سید صدیق حسن خاں حسینی بخاری رحمہ اللہ کا نام علما کی اس جماعت میں سرِفہرست ہے۔ آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ برصغیر میں کثیر التصنیف علما اور بھی ہوئے ہیں، لیکن مسلکِ سلف کے لیے فدائیت، علومِ اسلامیہ کی خدمت، علما کی سرپرستی ومعاونت اور تصنیف وتحقیق کی آبیاری کا جو امتیاز آپ کو حاصل ہوا، وہ کسی اور جگہ نظر نہیں آتا۔ معاصر نسل پر نواب رحمہ اللہ کا یہ قرض ہے کہ آپ کی تمام تصانیف کو موجودہ معیار کے مطابق زیورِ طبع سے آراستہ کیا جائے۔ اس میں علمی و دعوتی دونوں فائدے ہیں۔ موجودہ دور کے ناشرین اور بعض علما نے اس پہلو پر کسی حد تک توجہ مبذول کی ہے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے فدائے سلفیت محترم مولانا عارف جاوید محمدی۔ حفظه الله تعالىٰ۔

کو کہ انھوں نے اس جانب عرصے سے توجہ مبذول کر رکھی ہے اور ایسی کتابوں کی اشاعت کے لیے برابر کوشاں رہتے ہیں جن سے دعوتِ عمل بالکتاب والسنۃ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ آج کے دور میں مسلک ومنہج کے لیے اس طرح سوچنا بے حد غنیمت ہے، ورنہ عام طور پر رجحان کچھ اور ہی ہے۔ محترم عارف صاحب نے توحید وسنت سے اپنی شیفتگی کے پیش نظر زیر تقدیم کتاب کو تسہیل وتخریج کے لیے منتخب کیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ان کے اس انتخاب سے جذبہ اتباعِ سنت کو عام کرنے اور معاشرے میں پھیلے ہوئے مفاسد کو ختم کرنے میں یقیناً بے حد مدد ملے گی اور اس طرح کتاب کی تالیف کا مقصد پورا ہوگا۔

اس کتاب کی تسہیل وتخریج کے لیے محترم عارف محمدی صاحب نے جامعہ سلفیہ کے فاضل مولانا ضیاء الحسن سلفی ﷾ کی خدمات حاصل کی ہیں۔ اس انتخاب پر بھی موصوف مبارک باد کے مستحق ہیں، کیونکہ فاضل موصوف نے الدار السلفیہ ممبئی میں محترم ڈاکٹر عبدالعلی ازہری ﷾ کی سرپرستی میں ایک عرصہ تک تحقیق وتالیف اور ترجمہ کی خدمت انجام دی ہے اور ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ تحقیق وتخریج کے ان کے متعدد کام ایسے ہیں جن پر عرب دنیا کے علما نے کلماتِ تحسین سے نوازا ہے۔

نواب رحمہ اللہ کی زیرنظر کتاب ''دعوۃ الداع'' پر کام کے لیے محترم عارف صاحب کے ایما پر جو منہجِ عمل سلفی صاحب نے اختیار کیا ہے، یقیناً اس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جائے گا اور نواب صاحب کی تحریر کو قارئین مزید اطمینان وسہولت کے ساتھ پڑھیں گے، بالخصوص احادیث کی تخریج کے بعد لوگوں کے ذہن میں کسی طرح کا سوال نہ پیدا ہوگا اور انھیں یہ اندازہ بھی ہوگا کہ اہلِ حدیث علما اپنی تحریروں میں کس طرح صحیح علمی منہج کی پابندی کرتے تھے اور انھیں اس بات کا کتنا خیال ہوتا تھا کہ قارئین کے سامنے جو کچھ پیش کیا جائے، وہ صحیح اور مستند ہو۔ سلفی صاحب نے اس کتاب میں وارد عربی وفارسی عبارتوں کا اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے۔

جناب عارف صاحب نے نواب صاحب کی اس کتاب کی اشاعت کے لیے جن شروطِ اربعہ کی بات کی تھی، وہ یقیناً موجودہ زمانے کے مطابق ہیں اور خاکسار کو بھی ان سے مکمل اتفاق ہے، البتہ پہلی شرط میں قدیم اردو کو جدید کا لباس پہنانے کی جو بات ہے، اس پر بہ نیت خیر یہ عرض کرنا ہے کہ معمولی ومتوسط قارئین کے لحاظ سے ''تغییر وتقریب'' کا یہ عمل یقیناً مفید ہے، لیکن کسی مصنف کے

اسلوبِ بیان اور اندازِ تحریر سے واقفیت کا مدعا اس سے حاصل نہیں ہوتا، دوسرے لفظوں میں اس کی تحریر کا نمونہ ہماری نظروں سے دور ہو جاتا ہے جو ایک طرح سے امانت ہے اور ہم پر اس کا تحفظ ضروری ہے۔ اس معمولی ملاحظے کے باوجود مجھے بے حد مسرت ہے کہ جماعت کے دو مخلص و معتبر عالموں کے تعاون سے نواب رحمہ اللہ کی ایک معتبر و مفید کتاب منظر عام پر آ رہی ہے اور اس طرح علم کی اشاعت اور سلفیت کی تائید کا فرض ادا ہو رہا ہے۔

زمانے کے تقاضوں پر نظر ڈالی جائے تو اس نوعیت کے کام کی سخت ضرورت ہے، یقین جانیے سلفیت کو مطعون کرنے والا طبقہ بہت مختصر ہے، اکثریت ایسے حضرات کی ہے جو کتاب و سنت کی دعوت کو سمجھنے، پھر اس پر عمل پیرا ہونے کی تڑپ رکھتے ہیں، اس لیے مثبت انداز میں دعوت کو پیش کرنے والی کتابوں کی اشاعت ضروری ہے، اور ہمارے علمانے جو ذخیرہ مولفات ہمارے لیے چھوڑا ہے، اس میں اس طرح کی وقیع کتابیں بہت زیادہ ہیں۔ ہمارا یہ دینی و جماعتی فریضہ ہے کہ سلف کے اس ورثے کو موجودہ دور کے سامنے اس کے ذوق اور معیار کے مطابق پیش کریں۔ اس سے بہت بڑی دعوتی ضرورت پوری ہو گی۔ میری اس گزارش کا مقصود دفاعی و جوابی لٹریچر سے صرف نظر نہیں، بلکہ ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھ کر آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ سیرت طیبہ میں ہمیں واضح طور پر یہ سبق ملتا ہے۔ اسی طرح ماضی قریب کی جماعتی تاریخ میں بھی اس کی مثالیں موجود ہیں، استثنا کو اصل بنانا یا انفرادی رجحان کو عمومیت دینا مفید نہیں ہوتا۔

کتاب ''دعوۃ الداع'' کے مشتملات پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہو گا کہ موضوعاتِ بحث اہم اور ضرورت کے عین مطابق ہیں۔ ان میں جن مسائل پر روشنی ڈالی گئی وہ خیالی نہیں بلکہ زندگی سے متعلق ہیں۔ ایک مومن یہ چاہتا ہے کہ ان سے متعلق شریعت کی راہنمائی سے واقف ہو۔

پہلے باب میں سنت و بدعت کی بحث اس لحاظ سے مقدم ہے کہ اعتقادی بدعتیں انسان کا ایمان غارت کر دیتی ہیں اور امت بدعات کی آزمائش میں شروع زمانہ ہی سے مبتلا ہے۔ نیز کتاب کا موضوع ہی سنت و بدعت ہے اور رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو اسوہ قرار دیا گیا ہے، اس لیے سنت کی بحث کو مقدم کرنا مناسب ہے۔

دوسرے باب میں ایمان کی حقیقت پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ ایمان کی ستر سے زائد شاخیں ہیں۔ یہ زندگی کے اکثر شعبوں کو محیط ہیں۔ احادیث کی رو سے اعمال ایمان میں داخل ہیں، اس لیے سنت وبدعت کے بعد اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی۔

تقدیر کے مسئلے کو صحیح طور پر سمجھا جائے تو اس سے ترکِ عمل کے بجائے تحریکِ عمل کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور انسان کے اندر شانِ بندگی نمایاں ہوتی ہے، یہی تقدیر تیسرے باب کا موضوع ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ اور صحیح عقیدہ وعمل کا پیکر ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھ کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت وتربیت، تبلیغ اور تزکیہ کی تاثیر اور معجزانہ انداز کا علم ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم اور احادیثِ نبویہ میں ان کا مقام ومرتبہ منصوص ہے، اسی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے چوتھا باب منعقد کیا گیا ہے۔

آخرت کی پہلی منزل قبر ہے۔ قبر کے احوال سے غفلت ہی انسان کو عمل سے دور اور لذائذ وشہوات میں مسرور بنا دیتی ہے۔ یہ احوال سامنے رہیں تو انسان ضرور نیک عمل کی طرف راغب ہوگا اور قبر کے سوال وجواب کی تیاری کرے گا۔ اس نقطے کو پانچویں باب میں واضح کیا گیا ہے۔

چھٹا باب تقلید کی تردید میں ہے۔ اتباعِ سنت پر بحث کے دوران میں یہ موضوع ضرور سامنے آتا ہے۔ عامی شخص کا عالم سے مسئلہ دریافت کرنا اور اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلنا ایک الگ چیز ہے، لیکن بحث وتحقیق کی راہ سے ہٹ کر کسی رائے کو حرفِ آخر قرار دینا اور اسی کے لیے ضد اور اصرار کرنا دوسری چیز ہے۔ ائمہ دین کا احترام ضروری ہے، لیکن کہیں ایسا تو نہیں کہ تقسیم وتحزب کا موقف اختیار کر کے ہم خود ائمہ کے خلاف ماحول بنا رہے ہیں؟

ساتواں باب رسوم کی تردید سے متعلق ہے۔ معاشرتی زندگی میں اس کی فتنہ سامانی وسیع ہے۔ شرعی احکام سے ناواقفیت اور اسلام کے تئیں اپنی ذمے داری محسوس نہ کرنے کی وجہ سے رسم ورواج کا مسئلہ کبھی کبھی سنگین ہو جاتا ہے اور لوگ اسے شریعت کے بالمقابل کھڑا کر دیتے ہیں۔ رسم ورواج کو فروغ دے کر برائی کی تہیں دبیز بنا دی جاتی ہیں، پھر مصلحین ودعاۃ سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ درگزر سے کام لیں! نواب صاحب رحمہ اللہ نے اس باب کے ضمن میں جن مسائل پر روشنی ڈالی ہے، ان پر غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ کس طرح انسان اسلام کا کلمہ پڑھ کر بھی دوسری بندشوں میں گرفتار ہو جاتا ہے

اور کبھی کبھی اس کا قدم دائرہ اسلام سے باہر نکل جاتا ہے۔ ان رسوم پر آپ اس پہلو سے بھی نظر ڈالیے کہ ان میں سے اکثر یا سب کھلے شرعی احکام کے بالمقابل ہیں، پھر بھی مسلم معاشرے میں انھیں قبولیت حاصل ہے اور جو لوگ ان کو ختم کرنے کے لیے آواز اٹھاتے ہیں، انھیں تحقیر و تذلیل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پوری اسلامی تاریخ میں اس کشمکش کو دیکھا جا سکتا ہے۔

اصلاحی پہلو کی تکمیل کے خیال سے نواب صاحب نے ''دعوۃ الداع'' کے اندر زیرِ بحث موضوعات کے لیے اپنی بعض دوسری کتابوں کا حوالہ دیا ہے، تاکہ موضوع پر مزید معلومات حاصل کر کے قاری تشفی حاصل کرے اور توحید و سنت سے متعلق تمام ضروری مسائل اس کی نگاہوں کے سامنے رہیں، ساتھ ہی اسے یہ اندازہ ہو کہ ان بنیادی امور پر علمائے حق نے کس قدر توجہ دی ہے۔

نواب صدیق حسن رحمہ اللہ صرف امتِ مسلمہ پر نہیں بلکہ پوری انسانی تاریخ پر غائرانہ نظر رکھتے تھے اور آپ کو اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ سابقہ اقوام سے کہاں لغزش ہوئی اور اصلاح کے عمل میں نقطہ آغاز کیا ہونا چاہیے، اس لیے آپ نے ''دعوۃ الداع'' کے مقدمے ہی میں اس مسئلے کو منقح کر دیا۔ سورۃ الانعام کی آیت (۱۵۳) پر اظہارِ خیال کے دوران میں فرمایا:

''یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ کلمۂ طیبہ کی تصدیق و اقرار کے ہمراہ عمل کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ سیدھی راہ پر چلنا عین عمل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل دو طرح پر ہوتی ہے، ایک منطوق کلمۂ طیبہ کے مطابق اعتقاد لانا، دوسرے اس کے معنی پر عمل کرنا۔'' (مقدمہ، ص:۴۶)

حدیث «بني الإسلام على خمس» پر اپنا تاثر یوں ظاہر فرماتے ہیں:

''یہ اس بات پر دلیل ہے کہ اسلام عمل سے عبارت ہے۔ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں بھی اسلام کی یہی تعریف آئی ہے جو اس حدیث میں مذکور ہے۔'' (مقدمہ، ص:٤٧)

عمل کا جو بحران امت میں ہے، اسی سے متعلق عمل کی کیفیت کا مسئلہ بھی ہے۔ ایک طرف عمل میں اخلاص کا فقدان ہے اور دوسری طرف وہ عمل نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق نہیں ہے۔ نواب صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اسی طرح جو آدمی توحید و رسالت کا قائل ہے، مگر اتباعِ رسول ﷺ نہیں کرتا ہے، بلکہ متبعِ بدعات اور خواہشِ نفسانی کا پیروکار ہے، وہ بھی مومن و مسلم اور محسن نہیں ہے، کیونکہ جہنم سے نجات کی امید اور جنت میں دخول کی توقع نہیں ہو سکتی ہے ...الخ۔''

(مقدمہ، ص:۴۸)

نواب رحمہ اللہ نے مزید لکھا ہے:

''اس بنیاد پر اس رسالے میں اتباعِ سنت اور اجتنابِ بدعت کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کو کتاب ''دین خالص'' میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کتاب اس باب میں ایک جامع تالیف ہے ...الخ۔'' (مقدمہ، ص:۴۸)

کسی کتاب کی تقدیم میں اصل مسئلے سے ہٹ کر استطراد کی گنجایش نہیں ہوتی، لیکن چونکہ خود نواب صاحب رحمہ اللہ نے زیرِ تقدیم کتاب کے مقدمے میں ''الدین الخالص'' کا نام لے لیا ہے، اس لیے درازنفسی کے طور پر ایک چھوٹی سی بات عرض کرنا چاہوں گا۔

نواب صاحب کی شخصیت عظیم و متنوع محاسن و کمالات کی جامع تھی۔ ہر شخص آپ کے تذکرے کے وقت مدح و ستایش کے جملے رقم کرتا ہے اور آپ کی علمی و دینی خدمات کو سراہتا ہے، لیکن مدح و ستایش اور تحسین و تمجید کے یہ جملے اکثر عمومی انداز کے ہوتے ہیں اور ان کے اندر توحید و اتباعِ سنت کی اس خاص دعوت پر روشنی نہیں پڑتی جسے نواب صاحب کا مقصودِ اولین اور آپ کی دینی و علمی جدوجہد کا حاصل کہا جا سکتا ہے۔

چند برس پہلے کی بات ہے، شہر بھوپال ہی میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار بہ عنوان ''أدب الدعوة والإصلاح'' منعقد ہوا تھا۔ خاکسار نے اس کے لیے ''الدین الخالص'' ہی کو موضوع بنایا تھا۔ عربی زبان کی اس کتاب میں علامہ نواب رحمہ اللہ نے توحید اور اتباعِ سنت کے مسائل کو جس طرح منقح کیا ہے اور اپنے دور کے فکری و عملی انحراف کی جو جامع و موثر تصویر پیش کی ہے، اس کا حق تو میں ادا نہ کر سکا، پھر بھی یہ مجھے اطمینان ہے کہ علما کی اس مجلس میں نواب صاحب کی کتاب ''الدین الخالص'' کا عربی زبان میں ایک مختصر تعارف آ گیا۔ بعد میں یہ مقالہ ''صوت الأمة'' کے مارچ و اپریل ۱۹۹۳ء کے دو شماروں میں شائع ہوا۔

نواب رحمہ اللہ نے ''دعوۃ الداع'' کے مقدمے میں تحریر فرمایا ہے کہ یہ کتاب تذکیر الاخوان کی تلخیص ہے۔ اس بات کی وضاحت سلفی صاحب نے بھی اپنے پیش لفظ میں کی ہے اور ''تقویۃ الایمان'' سے متعلق عمدہ معلومات فراہم کی ہیں۔ موصوف نے جامعہ سلفیہ کے فضلا میں سے ان حضرات کے نام بھی ذکر کیے ہیں، جنھوں نے شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی مذکورہ کتاب پر کسی نہ کسی حیثیت سے کام کیا ہے، یقیناً یہ تذکرہ مفید اور برمحل ہے۔ "تقوية الإيمان" پر "هو المسك ما كررته يتضوع" والی بات صادق ہے۔ میں اس مقام پر بہ طور استدراک نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کے قصد سے ایک دو باتیں ذکر کرنا چاہتا ہوں، امید ہے ''طولِ مُمل'' نہ ہوگا۔

برصغیر کے علماے حق نے توحید، اتباعِ سنت اور شرک وبدعت کی تردید کے باب میں "تقوية الإيمان" کی اہمیت پر نظر کرتے ہوئے جس طرح اس کتاب کی خدمت کی ہے، اس میں ایک مختصر سا حصہ جامعہ سلفیہ بنارس کا بھی ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ شیخ الجامعہ مولانا عبدالوحید رحمانی رحمہ اللہ نے کیا۔ یہ ستر کی دہائی کے آغاز کی بات ہے، خاکسار اس وقت علی گڑھ میں تھا اور وہیں سے عربی ترجمے کا پیش لفظ لکھ کر بھیجا تھا، پھر اس کی دوسری اشاعت مترجم رحمہ اللہ کے اضافے اور خاکسار کی مراجعت سے منظر عالم پر آئی۔ عربی داں حلقے میں یہ ترجمہ مقبول ہے اور ہندوستانی سماج کے مزاج ومسائل نیز اس کے مذہبی رجحان کو سمجھنے میں اس سے بہت مدد ملتی ہے۔

جامعہ سلفیہ نے "تقوية الإيمان" کے دونوں بابوں پر مشتمل ایک مکمل ایڈیشن بھی شائع کیا ہے اور باب اول کو درس میں داخل کیا ہے۔

جامعہ سلفیہ کے ایک فاضل ڈاکٹر اختر جمال محمد لقمان نے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ سے نواب رحمہ اللہ پر رسالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، آپ کے رسالے کا عنوان "السيد صديق حسن القنوجي، آراؤه الاعتقادية وموقفه من عقيدة السلف" ہے۔

جامعہ سلفیہ ہی کے ایک فیض یافتہ ڈاکٹر ابو حاتم خان نے نواب رحمہ اللہ پر عربی زبان میں ایک مقالہ لکھ کر بنارس ہندو یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی (Ph.D.) کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالے کا عنوان تھا: "حياة النواب صديق حسن ومآثره".

قارئین کرام بہ خوبی جانتے ہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کا ایک فرقہ (جو بے حد فخریہ انداز میں

اپنی کثرتِ تعداد کا ذکر کرتا رہتا ہے) "تقوية الإيمان" کی مخالفت اور اس کے مصنف علام کے خلاف تہمت تراشی میں سرگرم رہتا ہے۔ پچھلے دنوں اسی فرقے کے ایک مضمون نگار کی تحریر دہلی کے ایک معروف اردو سہ روزہ کی ایک خصوصی اشاعت میں نظر سے گزری جس پر خاکسار کو سخت حیرت ہوئی۔ معلوم نہیں مذکورہ معاصر نے اس تحریر کو کسی تبصرے کے بغیر شائع کیا تو اس کا مقصد کیا تھا؟

مضمون نگار موصوف نے تحریر فرمایا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں میں کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے سبب اختلاف وافتراق پیدا ہوا، اس کتاب کے ظہور سے پہلے یہاں کے مسلمان متحد تھے!! (مضمون نگار کی عبارت نہیں مفہوم نقل کیا گیا ہے)

ہر صاحبِ قلم پوری طرح آزاد ہے، جو چاہے لکھے، لیکن سچائی کا خون اور امر واقع کی تکذیب کو کسی طرح گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ برصغیر کی تاریخ پہلی صدی ہجری سے آپ کے سامنے ہے۔ سیاسی پہلو سے صرف نظر کرتے ہوئے مذہبی لحاظ سے مسلمانوں پر نظر ڈالیے کہ ان میں جو اتحاد موجود تھا، اس کی نوعیت کیا تھی اور مختلف مذہبی فرقوں نے کس طرح ان کی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا تھا؟

بعض حلقوں سے یہ تاثر دینے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اتحاد میں بہر صورت خیر ہے، لیکن یہ صحیح نہیں۔ اسلامی احکام کے اصل سرچشمہ یعنی کتاب وسنت پر اتحاد کی قیمت ہے اور وہی امت کو مطلوب ہے۔ اسی طرح اسلام کے بنیادی اصول کے تحفظ کے لیے جو افتراق ہوتا ہے، اسے مذموم نہیں قرار دیا جا سکتا۔ شریعت کے بنیادی اور متفقہ مسائل کے خلاف عمل پر اگر نکیر کی جاتی ہے تو بعض لوگ اسے افتراق سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایسے حضرات کو سوچنا چاہیے کہ قرآن کریم کی دعوت میں یہ چیز خاص ہے، اس نے قدم قدم پر شرک ومعصیت کی تردید کی ہے اور اس کے مرتکب لوگوں سے بے زاری کا اعلان کیا ہے۔ اس کی ایک صفت ''فرقان'' یعنی حق وباطل کے مابین فرق کرنے والی کتاب ہے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے بھی جب اپنی دعوت کا آغاز فرمایا تو آپ کے خلاف تفریق کی بات کہی گئی، لہٰذا اتحاد کو مطلق طور پر مطلوب تصور کرنا صحیح نہیں۔ قرآن کریم میں اتحاد کا واضح حکم ﴿وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا﴾ میں ہے، یہاں بھی دیکھیے مطلق اتحاد کی دعوت نہیں بلکہ "حبل الله" کی قید ہے، اس لیے یہ موضوع غور طلب ہے۔ اہلِ علم اس پر بات کریں تو شریعت کے مقصود کی رعایت ضروری ہے۔

اس تقدیم میں ممکن ہے کچھ غیر متعلق باتیں بھی آ گئی ہوں، لیکن مجھے امید ہے کہ اس تحریر سے لوگ مستفید ہوں گے۔ مناسب ہے کہ کتاب کے ناشر سے متعلق چند سطریں لکھ کر اس تقدیم کو ختم کروں۔

مکتبہ فہیم کے ذمہ داروں نے زیرِ نظر کتاب کی اشاعت پر آمادگی ظاہر کر کے علمی سر پرستی کی اپنی روایت میں ایک اہم اضافہ کیا ہے، توحید وسنت کی اشاعت میں اس مکتبے کا کردار نمایاں ہے۔ اس کے ذمے داروں نے مثال قائم کی ہے کہ خلوص، محنت اور لگن سے کام کیا جائے تو کامیابی قدم چومتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مکتبے کو اسی طرح دین اور علومِ دین کی خدمت میں سرگرم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ڈاکٹر مقتدی حسن محمد یاسین ازہری

ریکٹر جامعہ سلفیہ بنارس

۶/ جمادی الاولیٰ ۱۴۲۵ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

بارھویں صدی ہجری میں پورا ہندوستان بدعات وخرافات کی آماج گاہ بنا ہوا تھا۔ باطل نظریات ومعتقدات، شرکیہ اعمال وافکار اور جاہلانہ رسوم ورواج کا بازار گرم تھا۔ شیطان نے لوگوں کو راہِ مستقیم سے ہٹا کر بدعات وشرکیہ اعمال اور گور پرستی ومشائخ پرستی میں گرفتار کر رکھا تھا۔ ایسے وقت میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ (۱۱۱۴ھ-۱۱۷۶ھ) نے مسلمانوں کو نفسانی خواہشات کی پیروی اور شخصیات کی غلامی سے نجات دلانے کی تدبیر کی اور باطل اعتقادات ونظریات اور خرافات وبدعات سے نکال کر ان کو کتاب وسنت کی روشن راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی، دلوں میں خالص توحید کی شمع روشن کی، تصنیف وتالیف، درس وتدریس، مواعظ وخطب کے ذریعے سے خوب خوب دعوت وتبلیغ کی، یہاں تک کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے بعض شاگردوں اور ان کی کتابوں سے استفادہ کرنے والوں کا ذہن شرکیہ اعمال وبدعات، مشائخ وپیر پرستی اور تقلید کی آلائشوں سے بالکل پاک ہو گیا اور وہ کتاب وسنت کے شیدائی بن گئے اور اس سے بہ خوبی آشنا ہو گئے کہ تقلید شخصی خواہ کسی کی بھی ہو، وہ بہر حال شرک فی عبادۃ اللہ سے خالی نہیں ہے۔

علامہ شہید محمد اسماعیل دہلوی بن عبد الغنی شہید رحمہ اللہ (۱۱۹۳ھ-۱۲۴۶ھ) ان ناگفتہ بہ حالات کا بہ غور جائزہ لیتے رہے اور ان عوامل واسباب سے آپ بہ خوبی واقف ہو گئے، جنھوں نے مسلمانوں کو انحطاط وزوال تک پہنچا دیا تھا۔ جب علامہ شہید رحمہ اللہ تعلیم وتربیت کے مرحلے سے فارغ ہوئے تو دعوت وارشاد کا کام شروع کر دیا۔ اپنے دادا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی اصلاحی وتجدیدی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنے ساتھیوں کو دعوت دی کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو شرک وبدعات اور باطل افکار وخیالات سے روکیں اور ان کو خالص توحید کی دعوت دیں

اور رسول اللہ ﷺ کی مُردہ سنتوں کو زندہ کرنے کی ترغیب دیں، تاکہ اتمامِ حجت ہو جائے۔

خود شاہ محمد اسماعیل محدث دہلوی رحمہ اللہ نے اپنی دعوت وتبلیغ کا مرکز دہلی کی جامع مسجد کو بنایا اور یہیں سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔ شروع میں آپ کے مواعظ اور خطبے توحید اور اسلام کے بنیادی صحیح عقیدے کی وضاحت پر مرکوز ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ آپ نے اپنے مواعظ کے ذریعے اولیا ومشائخ پرستی، قبروں پر سجدے، غیر اللہ کے لیے قربانی اور نذر ونیاز جیسے شرکیہ اعمال اور باطل اعتقادات کے خلاف آواز بلند کی اور لوگوں کو معبودانِ باطلہ کی پرستش اور ان مروجہ رسوم ورواج کو ترک کرنے کی دعوت دی، جس نے مسلمانوں کی صفوں میں سرایت کر کے انھیں دینی روح سے غافل کر رکھا تھا۔ توحیدِ خالص کی اس آواز اور بدعات وشرکیہ اعمال کے خلاف آپ کی سخت نکیر نے علمائے سو اور صوفیہ کو مشتعل کر دیا، پھر آپ کی شدید مخالفت کی گئی اور فتنے کی آگ بھڑک اٹھی، یہاں تک کہ آپ کو قتل کرنے کی سازش تیار کی گئی، جیسا کہ اس سے قبل فتح پوری مسجد میں آپ کے دادا کو ختم کرنے کی ناپاک کوشش کی گئی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی سازش کو ناکام بنا دیا۔[1]

شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ حق وباطل کی آمیزش پر زبردست گرفت رکھتے تھے اور منکرات وبدعات پر علما کی مجرمانہ خاموشی کے معاملے میں بڑے سخت واقع ہوئے تھے۔ وہ حق بات علی الاعلان کہتے تھے، چنانچہ جب سید احمد بن عرفان شہید بریلوی رحمہ اللہ (۱۲۰۱ھ۔۱۲۴۶ھ) نے ۱۲۳۶ھ میں حج کا ارادہ کیا تو شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے اپنے چچا شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے اشارے پر سید احمد شہید رحمہ اللہ کے معتقدین کو سفرِ حج کی ترغیب دینا شروع کی اور خود آپ نے اس مبارک سفر میں ان کا ساتھ دینے کا ارادہ محض اس فریضے کے احیا کے مقصد سے کیا، جس کو آپ کے مخالفین اور بہت سے ہندوستانی علما نے راستے کے پر خطر ہونے کی بنیاد پر ساقط کر رکھا تھا۔

ان حالات میں شاہ صاحب نے "تقوية الإيمان" نامی عربی میں ایک کتاب تصنیف کی، پھر اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے ان کے سامنے یہ کتاب پیش کی اور کہا کہ میں نے یہ کتاب لکھی ہے۔ میرے خیال میں اس کے بعض الفاظ میں تھوڑی اور بعض الفاظ میں پوری شدت ہے۔ مثلاً میں نے شرکِ خفی کو شرکِ جلی لکھا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ اس کتاب کی اشاعت کے بعد فتنہ کھڑا ہو جائے۔

[1] دیکھیں: مقدمہ "تقوية الإيمان" (عربی) از قلم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ (ص: ۱۹، ۲۰)

اگر میں یہاں خود موجود رہتا تو اس کتاب کے مشمولات کو آٹھ دس سالہ مدت میں آہستہ آہستہ منظرِ عام پر لاتا، لیکن سفرِ حج کے درپیش ہونے کے باعث میں ایسا نہ کر پاؤں گا، کیونکہ سفرِ حج سے واپسی کے بعد جہاد کا عزم ہے اور یہاں میری نگاہ میں کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس کو میں قائم مقام بنا دوں۔ اس خطرے کے بہ خوبی احساس کے باوجود میں نے یہ کتاب لکھی ہے اور میرا گمان ہے کہ معاملہ جلد ہی رفع دفع ہو جائے گا۔ اگر آپ لوگ اس کی اشاعت پر متفق ہوں تو ٹھیک ہے، ورنہ میں اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیتا ہوں۔ ایک شخص کے علاوہ تمام ساتھیوں نے بالاتفاق کسی ترمیم واصلاح کے بغیر اس کی اشاعت کی تائید کی۔ تائید کرنے والوں میں سید احمد شہید، مولانا عبدالحی بڈھانوی، شاہ محمد اسحاق مہاجر مکی، ان کے برادر شاہ محمد یعقوب مہاجر مکی، مولوی فرید الدین مراد آبادی، مشہور شاعر مومن خان مومن اور مولوی عبداللہ خان علوی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔[1]

اس طرح یہ کتاب جو ماہ شوال ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء سے قبل لکھی گئی تھی، ۱۲۴۲ھ مطابق ۱۸۲۶ء میں شائع ہوئی اور علما میں متداول ہو کر دادِ تحسین حاصل کرنے لگی، لیکن دوسری طرف اس کتاب کے شائع ہوتے ہی ایوانِ بدعت اور اہلِ قبور میں زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور مخالفت کی تیز وتند آندھی چل پڑی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لوگوں نے ''تقویۃ الایمان'' کا جواب لکھنے اور اس پر اعتراض کرنے کو اپنا مشغلہ بنالیا اور اس کے مصنف کو لعن وطعن اور رسوا کرنے کا فتویٰ دے ڈالا۔ مخالفت کے اس بڑھتے ہوئے رخ کو موڑنے کے لیے شاہ عبدالعزیز اور شاہ محمد اسحاق رحمہما اللہ کے شاگردوں نے ''تقویۃ الإیمان'' کی تائید اور شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ کی تعریف میں ایک فتویٰ جاری کیا۔ اس پر دستخط کرنے والوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچتی ہے، جس میں سے چند نام یہ ہیں:

سید رحمت علی خان، نواب قطب الدین، مولوی مملوک علی، مفتی عنایت احمد، شیخ سخاوت علی، مولوی عبدالجلیل شہید، مفتی امام الدین، مولوی بزرگ علی، علامہ فضل امام، سید حسین شاہ بخاری، مولوی محبوب علی، مولوی آل حسن، مولوی انور علی، مولوی احسان کریم، مولوی سعد الدین، مولوی رافت علی، مولوی محمد نظام الدین، مولوی محمد وحید اللہ، مولوی محمد وزیر علی، سید محبوب علی، مولوی محمد احسن نانوتوی، مولوی یعقوب علی بریلوی، مولوی عبدالخالق، سید محمد عالم علی، مولوی خواجہ ضیاء الدین احمد، مولوی اکبر علی خان،

[1] دیکھیں: رسالہ ''امیر الروایات'' (ص: ۹۲) بہ حوالہ مجلّہ ''محدث'' بنارس (مجریہ ستمبر ۲۰۰۱ء، ص: ۱۷)

سید محمد علی، مولوی محمد یعقوب بن مملوک علی وغیر ہم۔

لیکن اس کے باوجود مخالفین نہ ماننے اور رد وقدح، طعن وتشنیع اور دشنام طرازی کا سلسلہ جاری رہا، بلکہ مذکورہ لوگوں کی تائید نے اس میں اضافہ ہی کیا کہ وہ لوگ اپنی فطرت سے مجبور تھے۔[1]

جامعہ سلفیہ کے فاضل جناب ڈاکٹر بدر الزماں نیپالی رحمہ اللہ نے اپنے پُرمغز مقالے میں ''تقویۃ الایمان'' کے شائع ہونے پر اس کی مخالفت وتردید اور اس کی تائید میں لکھی جانے والی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ڈاکٹر موصوف نے تردید میں لکھی جانے والی کتابوں کی تعداد تیس [۳۰] اور تائید میں تحریر کردہ کتابوں کی تعداد ستائیس [۲۷] تحریر کی ہے۔

تائید میں لکھی جانے والی کتابوں میں سے بعض اہم کتب یہ ہیں:

① علامہ محمد نقی دہلوی کی "نشر في جواب مقالات عشر"

② سید نذیر حسین محدث دہلوی اور شیخ علی حسنی لکھنوی کی "رسالة في تائيد تقوية الإيمان"

③ سید امیر حسن سہوانی کی "تحسين تقوية الإيمان"

④ شہود الحق کی "صيانة الإيمان"

⑤ مولانا عبد القہار گوالیاری کی "توقية الإيقان في شرح تقوية الإيمان"

⑥ شیخ عزیز الدین مراد آبادی کی "أكمل البيان في تائيد تقوية الإيمان"

⑦ مولانا داود راز دہلوی رحمہ اللہ کی "فيض الرحمٰن في تائيد تقوية الإيمان".[2]

"تقوية الإيمان" کی مقبولیت اور مخالفت کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ صرف ایک کتاب ہی نہیں ہے، جس کا مصنف ایسا بلیغ تھا کہ اس کا اندازِ بیان اور طرزِ نگارش آج بھی دلوں پر دستک دے رہا ہے، بلکہ اس کا سحر انگیز بیان اس سرمدی پیام کا امین بھی ہے جس کی تبلیغ ودعوت کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیا ورسل بھیجے۔

"تقوية الإيمان" کی مقبولیت اور پذیرائی کا اس سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ متعدد زندہ زبانوں میں اس کو منتقل کیا گیا۔ سب سے پہلے اس کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی سعادت

[1] اکمل البیان (ص ۸۱۲-۸۱۳)، مجلہ ''محدث'' بنارس (مجریہ ماہ ستمبر ۲۰۰۱ء، ص: ۲۲)

[2] ''تقویۃ الایمان'' کی تائید وتردید کی تفصیلی بحث کے لیے جامعہ سلفیہ بنارس کا موقر جریدہ ماہنامہ ''محدث'' (مجریہ جمادی الآخرۃ ۱۴۲۲ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۰۱ء) کا مطالعہ کریں۔

ہمارے استاذ گرامی قدر ماہرِ عربی ادب علامہ شیخ عبدالوحید ابوالقاسم رحمانی رحمہ اللہ (شیخ الجامعۃ السلفیۃ بنارس) نے حاصل کی۔ آپ نے عالی جناب ڈاکٹر علامہ تقی الدین ہلالی مراکشی رحمہ اللہ کی خواہش اور مولانا عبد الوحید عبدالحق سلفی رحمہ اللہ (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ بنارس) کے ایما پر اس کتاب کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۹۲ مطابق ۱۹۷۲ء میں ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے مقدمے کے ساتھ مطبع جامعہ سلفیہ بنارس سے طبع ہو کر منصہ شہود پر آئی اور اس کو عربی داں حلقے میں کافی پذیرائی حاصل ہوئی۔ فجزاہ اللہ أحسن الجزاء فی الدنیا والآخرۃ، وقدس روحہ ونور ضریحہ. اس عربی مترجم کتاب کو پڑھ کر مولانا ابوالحسن میاں ندوی رحمہ اللہ بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے خود "رسالۃ التوحید" تصنیف کی۔

علاوہ ازیں اس کے ترجمے اردو، فارسی، ہندی، انگریزی اور تلگو زبان میں بھی کیے گئے۔ اسی طرح اس کتاب کی اہمیت کے پیش نظر جامعہ سلفیہ بنارس نے اس کے دونوں بابوں کے ترجمے کو یکجا کر کے مولانا حافظ محفوظ الرحمن سلفی کی مختصر تعلیق اور ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ کے عرضِ ناشر کے ساتھ "تقویۃ الإیمان الکامل" کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ یہ طباعت ۳۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔[1]

"تقویۃ الایمان" درحقیقت شاہ محمد اسماعیل شہید ۔قدس اللہ روحہ۔ کی عربی کتاب "رد الإشراك" کے پہلے باب کا شرح وبسط کے ساتھ ترجمہ ہے۔ اس میں "لا الہ الا اللہ" کی وضاحت ہے اور دوسرے باب میں "محمد رسول اللہ ﷺ" کی تشریح ہے۔ خود شاہ صاحب نے اس کتاب کے مقدمے میں تحریر کیا ہے کہ میں نے اس رسالے کا نام "تقویۃ الإیمان" رکھا ہے اور دو ابواب میں اسے تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں توحید کا بیان اور شرک کی مذمت ہے اور دوسرے باب میں اتباعِ سنت کا بیان اور بدعت کی مذمت ہے۔ عربی کتاب کے اس پہلے باب کا ترجمہ شاہ صاحب نے خود اپنی زندگی میں اردو زبان میں کر کے اس کا نام "تقویۃ الایمان" رکھا اور بابِ دوم کا بھی اردو میں ترجمہ کرنے کا آپ نے ارادہ کیا تھا، مگر زندگی نے وفا نہ کی اور فرصت نہ پائی۔ تو آپ کے بعد آپ کے شاگرد مولانا محمد سلطان خان صاحب نے بابِ دوم کا ترجمہ اردو زبان میں ۱۲۵۰ھ میں شروع کیا اور یہ ترجمہ

[1] جماعت اہلِ حدیث کی تصنیفی خدمات (ص: ۳۹۲)

"تذكير الإخوان بقية تقوية الإيمان" کے نام سے ۱۲۹۳ھ میں مطبع فاروقی دہلی سے شائع ہوا۔

خود محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ عربی مترجم کتاب ''تقویۃ الایمان'' کے مقدمے میں اس کتاب کا تعارف کراتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ کتاب شاہ محمد اسماعیل شہید کی اردو زبان میں مشہور تصنیف ہے۔ شاہ صاحب نے پہلے عربی زبان میں ''رد الاشراک'' نامی کتاب تحریر کی تھی، جس میں دو باب تھے۔ پہلا باب توحید کے بارے میں تھا اور دوسرے باب میں اتباعِ سنت اور اجتنابِ بدعت کا بیان تھا، پھر آپ پر یہ بات واضح ہوئی کہ اس کتاب کا پورا فائدہ اس وقت ہو گا جب یہ لوگوں کی عام فہم اردو زبان میں ہو، چنانچہ آپ نے پہلے باب کا اردو میں ترجمہ شرح وتوضیح کے اضافے کے ساتھ کر کے اس کا نام "تقوية الإيمان" رکھ دیا اور دوسرے باب کا اردو ترجمہ شاہ صاحب کے تلمیذِ رشید جناب مولانا محمد سلطان خان نے کیا اور اس کا نام "تذكير الإخوان" رکھا۔

یہ کتاب اپنے اندازِ بیان اور دلائل وبراہین کے اعتبار سے ایک اہم دینی مرجع کی حیثیت رکھتی ہے اور معاشرے میں اس کی زبردست تاثیر ہے۔ اس کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ بڑی سے بڑی کتابوں کو نصیب نہ ہو سکی اور علما محققین اس بات کے معترف ہیں کہ یہی وہ کتاب ہے جس نے تنہا دینی اور معاشرتی اصلاح کا کام انجام دیا اور آج ہندوستان میں سنتِ صحیحہ کی نشر واشاعت اور بدعات و رسوم ورواج کے مظاہر کا جو خاتمہ ہم دیکھ رہے ہیں، وہ اسی کتاب اور اس کی زبردست تاثیر کا فیضان ہے۔

لوگوں نے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کو بے مثال مقبولیت ملی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اب تک اس کے پچاس لاکھ سے زائد نسخے طبع ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکے ہیں۔[1]

"تقوية الإيمان" سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مولانا ابو یحییٰ امام خان نوشہروی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ "تقوية الإيمان" ہے جس کے ابوابِ توحید اور فصولِ اتباعِ سنت نے بے شمار انسانوں کو پرستارِ خدائے واحد اور متبعِ سنتِ نبی خیر الوریٰ بنا دیا۔ جس کے سادہ الفاظ اور اعلا معانی نے عاملین بالحدیث و حاملانِ تقلید سب کو اپنا گرویدہ کر رکھا ہے اور ان میں سے ہر ایک ''تقویۃ الایمان'' کو اپنا سمجھے بیٹھا ہے اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مذہبی کتابوں میں سب سے زیادہ اشاعت ہندوستان میں اسی کتاب کو نصیب ہوئی اور جماعت اہلِ حدیث کے مخیر اصحاب تو

---

[1] مقدمہ "تقوية الإيمان" (عربی) از ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری رحمہ اللہ (ص: ۲۶-۲۸)۔

ہزاروں کی تعداد میں اسے مفت تقسیم کرتے رہتے ہیں، جیسا کہ کئی سال سے آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس، جماعت اہلِ حدیث کے مشہور مخیر جناب حافظ حمید اللہ صاحب سوداگر دہلی (والد ماجد حافظ محمد یحییٰ صاحب موجودہ امیر مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند) اور میاں عطاء الرحمٰن صاحب مالک مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ کا شعار ہے۔[1]

مولانا رشید احمد گنگوہی لکھتے ہیں کہ کتاب ''تقویۃ الایمان'' نہایت عمدہ سچی کتاب اور موجبِ قوت و اصلاحِ ایمان ہے۔ قرآن وحدیث کا مطلب پورا اس میں ہے۔ اس کا مولف ایک مقبول بندہ تھا۔ یہ کتاب ردِ شرک وبدعت میں لا جواب ہے۔ استدلال اس کے بالکل کتاب اللہ اور احادیث سے ہیں۔ اس کا رکھنا اور پڑھنا اور عمل کرنا عین اسلام ہے اور موجب اجر کا ہے۔ اس کے رکھنے کو جو برا کہتا ہے، وہ فاسق وبدعتی ہے۔ بڑے بڑے عالم اہلِ حق اس کو پسند کرتے ہیں۔[2]

مزید دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب (تقویۃ الایمان) سے بہت استفادہ کیا گیا۔ شاہ اسماعیل رحمہ اللہ کی زندگی میں اس کی بدولت تقریباً ڈھائی لاکھ لوگ راہِ حق پر چل پڑے۔ ان کی زندگی کے بعد تو اس سے فیض یاب ہونے والوں کا کوئی حساب ہی نہیں۔[3]

شیخ الاسلام علامہ ابو الوفا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ (م ۱۹۴۸ء) کا بیان ہے کہ شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے ''تقویۃ الایمان'' لکھی، جس میں محض قرآن وحدیث کے آئینے میں اسلام کی سچی تصویر دکھائی۔ اس کتاب اور آپ کے مواعظ کا اہلِ دہلی بلکہ اہلِ ہند پر بہت اچھا اثر ہوا۔ اللہ کے فضل سے کتاب ''تقویۃ الایمان'' اتنی مقبول ہوئی کہ آج اسلامی کتب میں کتاب اللہ کے بعد یہی کثیر الاشاعت ہے۔ اس کے برابر کوئی کتاب اتنی کثیر الاشاعت نہیں۔ ذلك فضل الله۔ توحید پسند علما نے اس کو بہت پسند کیا۔[4]

اسی طرح مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمہ اللہ گوجرانوالہ (متوفی ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۹۶۸ء) کا بیان ہے کہ آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے ہندوستان سے ایک تحریک اٹھی جس کی قیادت حضرت سید احمد

---

① تراجم علمائے حدیث ہند (ص: ۱۰۸)

② فتاویٰ رشیدیہ (ص: ۱۲۲)

③ دیکھیں: أرواح ثلاثہ (ص: ۸۲) أمیر الروایات (ص: ۹۲) مطبوعہ لاہور۔

④ اخبار ''اہل حدیث'' امرتسر (مجریہ ۱۸/ ذوالحجہ ۱۳۵۱ھ) یادگار مجلہ اہل حدیث، مرکزی جمعیت اہلِ حدیث مطبوعہ محرم الحرام ۱۴۲۵ھ۔ (ص: ۱۰۴-۱۰۵)

شہید اور شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے فرمائی، ان کے سامنے دو مقصد تھے، ہندوستان میں ایسے نظام کا قیام ونفاذ جس کی اساس قرآن وحدیث پر ہو اور دوسرا کتاب وسنت کے فہم میں جمود اور توحید خالص کے راستے میں حائل بدعات ورسوم کو ہٹا کر اس کی تعلیمات کو شائع کرنا۔ پہلا مسئلہ دین کے ساتھ سیاسی بھی تھا، اس لیے اس کے پورے ماحول پر سیاست محیط ہوگئی اور دوسرے مقصد کے لیے مولانا محمد اسماعیل شہید ۔قدس اللہ روحہ۔ نے کتاب ''تقویۃ الایمان'' اور ''تذکیر الاخوان'' لکھیں اور شائع فرمائیں۔ ''تذکیر الاخوان'' گو دوسرے کے نام سے شائع ہوئی، مگر تحریک کی معنویت کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ تذکیر، تقویۃ الایمان ہی کا دوسرا حصہ ہے۔ دونوں کتابوں کی بڑی کثرت سے اشاعت ہوئی۔ ان کی روشنی نے لاکھوں دلوں کو منور کیا اور کروڑوں مردہ روحوں کو ان سے اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی ۔تحریک کا یہ پہلو کافی کامیاب رہا۔ جاننا چاہیے کہ توحید وسنت کی اشاعت اور جمود کے خلاف ہزاروں زبانیں جو نغمہ سرا ہیں، ان ہی کی بدولت ہیں۔ ''تقویۃ الایمان'' کی زبان، اندازِ بیان، پھر نصوصِ قرآن وحدیث کے مضامین کی دل نواز چاشنی نے فضا کو ایسا مسحور اور اذہان کو اتنا متاثر کیا کہ ہزاروں دلوں نے اس کی تعلیمات کو قبول کیا۔ لاکھوں کی تعداد میں یہ کتاب ہر سال شائع ہوتی اور گھروں میں پڑھی جاتی ہے۔[1]

مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ (م ۱۹۸۷ء) فرماتے ہیں کہ خانوادۂ ولی اللہ کے گلِ سر سبد مولانا محمد اسماعیل شہید ۔قدس اللہ روحہ و نور ضریحہ۔ کی پر درد، پر تاثیر، سراپا اخلاص، ایمان پرور، نکتہ آفریں اور مقبول خاص وعام تالیف ''تقوية الإيمان'' جب تیرھویں صدی کے پانچویں عشرے (۱۲۴۰ھ تا ۱۲۵۰ھ) میں منصہ شہود پر جلوہ افروز ہوئی اور اس وقت کے احوال وظروف کے مطابق اشاعت پذیر ہوئی تو بہ مصداق:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے[2]

زیر نظر کتاب ''دعوۃ الداع'' اسی ''تقویۃ الایمان'' کے باب دوم کے اردو ترجمے بہ نام

---

[1] مقدمہ ''اکمل البیان فی تائید تقویۃ الایمان'' (ص:۲۴) مجلّہ یادگار کانفرنس پاکوڑ مطبوع باہتمام مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند (ص:۱۰۵-۱۰۶)

[2] یادگار مجلّہ اہلِ حدیث مرکزی جمعیت اہلِ حدیث ہند (ص:۱۰۶)

’’تذکیر الاخوان بقیۃ تقویۃ الایمان‘‘ کی تلخیص ہے جس کو تحریکِ شہیدین کے کارواں کے سرخیل علامہ نواب والا جاہ صدیق حسن خان حسینی بخاری قنوجی نے اختصار کے پیش نظر ملخص کر کے پیش کیا ہے اور اس کا نام ”دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع“ رکھا ہے، جو درحقیقت اتباعِ سنت اور اجتنابِ بدعت کی اسلامی دعوت ہے۔ مجھے اس کتاب کی تسہیل وتخریج کی تحریک لجنۃ القارۃ الهندیۃ کویت کے مخلص ومعروف عالم باعمل تقویٰ صفات علما نواز شیخ عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ سے ملی جنھوں نے چار شرائط کے ساتھ اس پر تسہیل وتحقیق کا کام کرنے پر زور دیا۔

① پہلی شرط: دورِ حاضر کے تقاضے کے مطابق قدیم اردو عبارت کو جدید کا لباس پہنایا جائے۔

② دوسری شرط: اس میں مذکور عربی نصوص اور فارسی عبارات کا اردو میں ترجمہ کیا جائے۔

③ تیسری شرط: اس میں موجود آیات کریمہ کے حوالے دیے جائیں اور احادیث نبویہ کی مختصر طور پر تخریج کی جائے۔

④ چوتھی شرط: فہرست تیار کی جائے۔

یہ کتاب ایک مقدمے، سات ابواب اور خاتمے پر مشتمل ہے۔ اس تسہیل وتخریج سے نواب والا جاہ کی اس شاہ کار تصنیف کو عام فہم اور آسان بنانا مقصود ہے۔ اس کے پیش نظر جہاں ضرورت محسوس کی گئی، عبارت کو جدید اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی نواب والا جاہ کی طرزِ تحریر کی حلاوت کو باقی رکھا گیا ہے۔ قرآنی آیات اور احادیثِ نبویہ کا ترجمہ کیا گیا ہے، نیز آیات واحادیث میں تصحیح کے اہتمام کے ساتھ جہاں کہیں کسی انداز کا تسامح نظر آیا، اس پر مختصراً حاشیے میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کی تحقیق وتخریج میں تذکیر الاخوان بقیۃ تقویۃ الایمان، مشکاۃ المصابیح بتحقیق علامہ محدث ناصر الدین البانی، رد الاشراک تالیف شاہ محمد اسماعیل شہید بتحقیق ڈاکٹر عزیر شمس سلفی مدنی اور شیخ علامہ محدث مولانا عبید اللہ رحمانی رحمہ اللہ کی تالیف شہیر ’’مرعاۃ المفاتیح‘‘ کو سامنے رکھا گیا ہے اور نہایت دقت کے ساتھ اس کی تسہیل وتہذیب اور تخریج کی گئی ہے، تاکہ عوام وخواص اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں استاذ گرامیِ قدر مفکرِ اسلام عالی جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری حفظہ اللہ (وکیل الجامعہ السّلفیہ بنارس) کا شکریہ نہ ادا کروں کہ آپ نے میری درخواست پر اس کتاب پر تفصیلی

گراں قدر تقدیم تحریر کر کے اسے درجہ استناد بخشا اور جا بجا میری علمی راہنمائی فرمائی۔ اللہ رب العزت آپ کو صحت وعافیت کے ساتھ تا دیر قائم و دائم رکھے، تا کہ آپ کے علمی فیوض سے ہم جیسے تہی دامن لوگ زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور دعوتِ دین کی راہ میں آپ کی مساعیِ جمیلہ کو شرفِ قبولیت بخشے، آمین۔ فجزاه الله أحسن الجزاء، وبارك في حياته الطيبة.

اسی طرح میں مکتبہ فہیم مئو کے باعزم نوجوان برادران شفیق الرحمٰن وعزیز الرحمٰن صاحبان کا ازحد مشکور ہوں، جنھوں نے اس کتاب کی طباعت کی علمی ذمے داری کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور مزید کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور دین وعلم کی خدمت کی توفیق بخشے۔ اس مکتبے کو خالص کتاب وسنت کا داعی ونقیب بنائے اور مزید ترقی سے ہم کنار کرے۔ اللہ تعالیٰ نواب والا جاہ رحمہ اللہ کی اس کتاب کو قبول عام بخشے اور مولف، محقق، ناشرین اور جملہ معاونین کو دنیا وآخرت کی سعادت سے سرفراز فرمائے۔ آمین

کتبه العبد الضعيف

ضیاء الحسن محمد سلفی

استاذ جامعہ عالیہ عربیہ مئوناتھ بھنجن

مقدمہ

الحمد لله القائل في تنزيله ﴿فَبَشِّرْ عِبَادِ۝ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ﴾ [الزمر: ١٧، ١٨] والصلاة والسلام على سيد رسله وخاتم أنبيائه، المبين لنا كل سيئة في الدين وحسنه، وعلى صالحي أمته من الآل والصحب، ومن عداهم في كل لمحة ويوم وشهر وسنة. أما بعد:

① سیدنا ابو سعید سعد بن مالک بن سنان خدری رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے کہا: رضيت بالله رباً، وبالإسلام ديناً، وبمحمدٍ رسولاً" یعنی میں اللہ کو رب مان کر اور اسلام کو دین مان کر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول مان کر راضی ہو گیا تو اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔" اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[1]

یہ حدیث کلمہ پڑھنے والے کے لیے وجوبِ جنت کی دلیل ہے۔

② صحیح مسلم میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"جس نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں تو اللہ اس پر جہنم کو حرام کر دیتا ہے۔"[2]

یہ حدیث کلمہ طیبہ کے قائل کے لیے جہنم سے نجات کی دلیل ہے۔ معلوم ہوا کہ جنت میں داخل ہونا اور جہنم سے نجات پانا اس کلمہ مبارکہ کے اقرار پر موقوف ہے۔ اس کلمے کے دو جزو ہیں۔ ایک دل اور زبان سے توحید کا اقرار کرنا، دوسرے زبان اور دل سے رسالت کا اقرار کرنا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

یعنی یہ کلمہ طیبہ یا یہ سیدھا میرا راستہ ہے تم اس پر چلو اور راہوں پر نہ جاؤ۔

---

① سنن أبي داود، كتاب الوتر، رقم الحديث (١٥٢٩)

② صحيح مسلم (٤٣/١)

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ کلمہ طیبہ کی تصدیق واقرار کے ہمراہ عمل کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ (سیدھی) راہ پر چلنا عین عمل ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ایمان کی تکمیل دو طرح پر ہوتی ہے۔ ایک کلمہ طیبہ کے منطوق کے مطابق اعتقاد لانا، دوسرے اس کے معنی پر عمل کرنا۔ اسی لیے حدیثِ اول میں دخولِ جنت کے واسطے رضا بہ اسلام کو بھی ذکر کیا ہے، کیونکہ اسلام عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اقرارِ لسان، تصدیقِ جنان اور عمل بالارکان سے عبارت ہے، جب تک یہ تینوں امر جمع نہیں ہوتے ہیں، تب تک ایمان کامل نصیب نہیں ہوتا۔

③ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مرفوعاً مروی ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلَهَ إِلَّا اللّٰهُ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ»

[اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر رکھی گئی ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود حقیقی نہیں ہے اور یہ کہ محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرنا اور زکات ادا کرنا اور بیت اللہ کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا]

اس کو ابوداود کے علاوہ پانچ ائمہ نے روایت کیا ہے۔[1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام عمل سے عبارت ہے۔

④ حدیثِ جبریل علیہ السلام میں بھی اسلام کی یہی تعریف آئی ہے، جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ پھر ایمان کی تعریف یوں فرمائی ہے:

«أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَ كُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهِ وَ شَرِّهِ»

[ایمان یہ ہے کہ تو اللہ پر، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، قیامت کے دن پر اور ہر اچھی بری تقدیر پر ایمان لائے]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان اعتقاد کا نام ہے۔ پھر احسان کا بیان کیا ہے:

«أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠٩) السنن الكبرى للنسائي (٦/٥٣١) مسند أحمد (٢/١٢٠)

[احسان یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے جیسے تو اسے دیکھ رہا ہے، لیکن اگر تو اسے دیکھنے کا تصور پیدا نہیں کرسکتا تو پھر یہ خیال کر کہ اللہ تجھے دیکھ رہا ہے]

اس حدیث کو مسلم رحمہ اللہ نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1]

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ احسان اخلاص کا نام ہے۔ کلمہ طیبہ کے جزو اول کا بیان رسالہ "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمٰن" اور رسالہ "الانفكاك عن مراسم الإشراك" میں اس سے قبل ہو چکا ہے۔ اس جگہ کلمہ طیبہ کے جزو دوم کا معنی بیان کرنا منظور ہے، کیونکہ مجرد اقرارِ توحید اور اعترافِ تجرید وتفریدِ باری تعالیٰ سے کوئی انسان مومن مسلمان نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ نبی آخر الزماں ﷺ کی نبوت ورسالت کا اقرار نہ کرے، جس طرح کہ مجرد اعترافِ رسالت ونبوت سے بھی کوئی شخص مسلمان مومن نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ توحیدِ الٰہی کا اقرار نہ کرے اور اللہ عزوجل کے سوا کسی کی الوہیت وربوبیت کا قائل نہ ہو۔ اسی طرح جو آدمی توحید ورسالت کا قائل ہے، مگر اتباعِ رسول ﷺ نہیں کرتا، بلکہ متبعِ بدعات اور خواہشِ نفسانی کا پیروکار ہے، وہ بھی مومن ومسلم ومحسن نہیں ہے، اس کے لیے جہنم سے نجات کی امید اور جنت میں دخول کی توقع نہیں ہوسکتی، جب تک کہ وہ توحید میں اعتقاد وعمل کے اعتبار سے مخلص اور اتباع میں قول وفعل کے لحاظ سے صادق اور ترکِ ہوا میں قاصر الامل نہ ہو۔

اس بنیاد پر اس رسالے میں اتباعِ سنت اور اجتنابِ بدعت کا بیان کیا جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل کو کتاب ''دینِ خالص'' میں بیان کیا گیا ہے، اس لیے کہ وہ کتاب اس باب میں ایک جامع تالیف ہے۔

اس رسالے کو "تذكير الإخوان حصۂ دوم تقوية الإيمان" سے ملخص کر کے اس کا نام "دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع" رکھا گیا ہے۔ جس مسلمان کا یہ ارادہ ہو کہ کلمہ طیبہ کے معنی کے ساتھ متحقق ہو کر دخولِ جنت کا مستحق بنے اور نار سے نجات پائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کلمہ مبارکہ کے معنی بہ خوبی سمجھ لے اور لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے منطوق کے مطابق اپنے عقیدے وعمل کو درست کرے۔ یہ بات رسالہ "دعاية الإيمان" اور اس رسالے کے مطالعے سے ان شاء اللہ بہ خوبی اس کو حاصل ہو جائے گی۔ اللہ پاک کا کام بیان فرمانا ہے، رسول اللہ ﷺ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨)

کا کام پہنچانا ہے اور ہمارا کام اس کا ماننا اور تسلیم کرنا ہے۔ توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو اسے بخشنا منظور ہوتا ہے تو وہ اس کو دنیا میں رشد وہدایت اور اتباع واخلاصِ عمل کی توفیق دیتا ہے اور جس کو اسے بخشنا منظور نہیں ہوتا تو اس کو صراطِ مستقیم سے گمراہ کر کے مختلف راہوں کا متبع بنا دیتا ہے۔

ہدایت ونجات کی اساس:

علمائے محققین نے فرمایا ہے کہ ہدایت ونجات کی اساس دو امر پر موقوف ہے۔ ایک اخلاص، دوسرے صواب۔ اخلاص سے مراد تصحیحِ عقائد ہے کہ اللہ پاک کے سوا ہرگز کسی دوسرے کی عبادت نہ کرے، گو وہ پیغمبر ہو، پھر کسی ولی یا صنم یا بُت کا کیا ذکر ہے، کیونکہ اللہ ہرگز کسی عمل کو قبول نہیں فرماتا ہے، جب تک کہ وہ عمل خالصاً اس کی ذات پاک کے واسطے نہ ہو، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ [الزمر: ٣]

[خبردار! اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خالص عبادت کرنا ہے]

''صواب'' سے مراد یہ ہے کہ وہ عمل سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہو، اس لیے کہ جو قول وفعل سنتِ مطہرہ کے مخالف ہوتا ہے، گو نظرِ خلائق میں کیسا ہی عمدہ اور بہتر کیوں نہ ہو، اس پر کچھ ثواب نہیں ملتا ہے، کیونکہ اشیا کا حسن وقبح شرعی ہے نہ کہ عقلی۔ جس امر کو ہم اپنی رائے واجتہاد سے حسنہ کہیں گے اور شارع علیہ السلام نے اس کا حکم نہیں کیا ہے تو وہ امر ہرگز نفس الامر میں مقبول نہ ہوگا، بلکہ مردود ہوگا۔

⑤ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»[1]

[جس نے ہمارے اس دین میں اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں تو وہ مردود ہے]

اس کو شیخین اور ابو داؤد نے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

⑥ دوسری روایت میں ہے:

«مَنْ عَمِلَ عَمَلاً لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[2]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٩٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤) مسند أحمد (٦/ ٢٧٠)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[جس نے کوئی ایسا کام کیا جس کی بابت ہمارا حکم نہیں ہے تو وہ مردود ہے]

یہ حدیث تمام غیر شرعی اعمال کے لیے قامع بنیان ہے، جس طرح کہ حدیث اول قاطع جمیع علائق محدثہ ہے۔ یہ اس بات پر نص صریح اور دلیل صحیح ہے کہ جملہ حسنات مبتدعہ مردود ہیں، کیونکہ اُن کا امر آپ ﷺ نے امت کو نہیں فرمایا ہے، بلکہ خود امت نے ان کو اپنی خواہش سے احداث وایجاد کیا ہے۔ اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ نے استحسان کو ابتداع ٹھہرایا ہے اور امام مالک رحمہ اللہ سدِ ذرائع کے قائل ہیں، ظاہریہ قیاسات کے منکر ہیں اور امام احمد رحمہ اللہ اجماع کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ ان سب ائمہ کا مطلب یہ ہے کہ اتباعِ سنت مطہرہ میں محوضت صرفہ اور صرافت محضہ ہو۔ کسی کی رائے، بدعت اور ہویٰ کا ادنا لگاؤ بھی پایا نہ جائے، تب کہیں اسلام خالص، ایمان کامل اور احسان محض کا وجود ہو گا۔

فائدہ:

جو اعتقاد یا قول یا فعل ہمارے رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے نہ انھوں نے کیا اور نہ کسی کو کرتے دیکھا اور منع نہ کیا اور نہ آپ ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم میں جاری ہوا اور نہ کسی صحابی نے اس پر انکار کیا اور نہ صحابہ کے بعد زمانہ تابعین وتبع تابعین میں انکار کے بغیر رائج ہوا اور نہ ان چاروں زمانوں میں اس کی نظیر پائی گئی اور نہ مجتہدین نے اپنے اجتہاد سے اس کو ثابت رکھا، بلکہ لوگوں نے اپنی طرف سے ان قرون کے بعد اسے نکالا تو وہ عقیدہ اور قول وعمل بالکل بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے، خواہ وہ بات خود نئی ہو یا خود نئی نہ ہو، مگر اس اعتقاد اور قول وفعل میں کوئی نئی بات اپنی طرف سے نکالے جو خیر القرون میں مروج ہو تو وہ بھی داخل بدعت اور شامل ضلالت ہے، جس کو لوگ شرعی کام کی طرح تقید واہتمام سے بجالائیں اور موجب ننگ وتعریف جانیں گو اس میں ثواب نہ سمجھیں، اسی طرح جو امور ان قرون مشہود لہا بالخیر میں بلا انکار رائج ہو چکے ہیں اور مجتہدین کے اجتہاد سے کتاب وسنت اور آثارِ صحابہ کی مخالفت کے بغیر ثابت ہیں، وہ داخل سنت ہیں۔ ایسے امر کو سنتِ حکمیہ کہتے ہیں، نہ کہ بدعتِ حقیقیہ۔ واللہ أعلم.

جب یہ بات معلوم ہو گئی تو اب اس اجمال کی تفصیل آیندہ ابواب وفصول سے دریافت ہو جائے گی۔

اے اللہ! ہمیں کلمہ طیبہ کے معانی پر زندہ رکھ اور عقیدہ وعمل کے طور پر ان معانی پر ہی ہمیں وفات دے۔ یہ کام تجھ پر کچھ دشوار نہیں ہے۔

باب اول

سنت کو مضبوط پکڑنے اور بدعت سے بچنے کا بیان

اتفاق و اتحاد کی ترغیب:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ اعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا وَ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾

[آل عمران: ۱۰۳]

[اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوط تھام لو اور پھوٹ نہ ڈالو اور اللہ تعالیٰ کی اس وقت کی اپنے اوپر نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اس نے تمھارے دلوں میں الفت ڈال دی، پس تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے]

اس جگہ اللہ کی رسی سے مراد کتاب اللہ یا دینِ اسلام ہے۔ احادیث میں اللہ کی کتاب کو ''حبل اللہ'' فرمایا ہے۔[1]

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ تم سب قرآن کے ساتھ تمسک کرنے پر مجتمع ہو جاؤ اور فرقت واختلاف سے بچو، جس طرح کہ تم جاہلیت میں باہم عداوت واختلاف رکھتے تھے یا جس طرح کہ اہلِ کتاب مختلف ہوکر اکہتر (۷۱) بہتر (۷۲) فرقے ہو گئے، اس طرح تم تفرقہ نہ کرو اور ایسی بات نہ نکالو جس سے دین میں تفرقہ واختلاف پڑے، بلکہ اجتماع وائتلاف کا اہتمام رکھو۔ یہ بات جب ہی ممکن ہے کہ سب لوگ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامیں، متبعِ سنت بنیں اور اہلِ سنت وجماعت کہلائیں، مگر ایسا نہ ہوا اور لوگ مختلف ہو کر اہلِ بدعت وفرقت ٹھہر گئے۔

معلوم ہوا کہ گمراہی کی جڑ یہی ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر دین میں بدعتیں اور نئی نئی باتیں نکالی

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۷۱۵)

جائیں، کیونکہ انھیں نئی نئی باتوں اور جدید رسموں کے رائج ہونے سے قرآن چھوٹا ہے اور آپس میں مسلمانوں میں پھوٹ پڑی ہے، جس سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے منع کیا ہے۔

اس آیت میں ایک امر ہے، ایک نہی ہے اور ایک خبر ہے۔ امر میں اصل وجوب ہے، نہی میں اصل تحریم ہے اور خبر میں اصل عبرت ہے۔

اختلاف و افتراق کی ممانعت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴾ [آل عمران: ۱۰۵]

[تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنھوں نے اپنے پاس روشن دلیلیں آ جانے کے بعد بھی تفرقہ ڈالا اور اختلاف کیا، ان ہی لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے]

جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ اس آیت سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں۔ یہی لوگ تاویلاتِ فاسدہ کرنے کی بنا پر دین میں متفرق اور مختلف ہو گئے۔

① عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس کی تصدیق آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بنی اسرائیل بہتر [۷۲] فرقے ہو گئے اور میری امت تہتر [۷۳] فرقے ہو جائے گی۔ وہ سب آگ میں جائیں گے، مگر ایک ملت والے۔ پوچھا: وہ کون ہیں؟ فرمایا:

« مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي » [جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں]

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1] مسند احمد اور سنن ابو داود میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

''بہتر (۷۲) آگ میں ہوں گے اور ایک جنت میں اور وہ جماعت ہے۔''[2]

اجتماعیت کی اہمیت:

② اسی جماعت کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۹۱)

[2] مسند أحمد (۱۰۲/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٥٩٧)

«يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ، وَمَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ»

[اللہ کا ہاتھ جماعت کے اوپر ہے اور جو جماعت سے علاحدہ ہو گیا، وہ جہنم میں الگ پھینک دیا جائے گا] اس کو ابن عمر رضی اللہ عنہما سے ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

③ دوسری روایت میں ہے:

«إِيَّاكُمْ وَالشِّعَابَ وَعَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ»[2]

[اپنے آپ کو گروہوں میں بٹنے سے بچاؤ اور جماعت کو اپنے اوپر لازم کر لو]

اس کو امام احمد اور ابو داود نے ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔

④ تیسری روایت میں ہے:

«مَنْ فَارَقَ الْجَمَاعَةَ [شِبْراً] فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَةَ الْإِسْلَامِ مِنْ عُنُقِهِ»[3]

[جو شخص ایک بالشت کے برابر بھی جماعت سے علاحدہ رہا، گویا اس نے اپنی گردن سے اسلام کا پٹا اتار پھینکا]

یہ حدیثیں اس بات کی دلیل ہیں کہ جماعت سے مراد اہلِ کتاب وسنت کا گروہ ہے، کیونکہ عہدِ سعادت اور مہدِ حضرت نبوی میں صحابہ کے سوا دین کی اور کوئی جماعت نہ تھی۔ صحابہ بھی صرف مکے کے مہاجرین تھے یا اہلِ مدینہ انصار تھے۔ ان کے سوا جو لوگ ہیں وہ شعاب، فرق اور سبل ہیں۔

یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ مختلف مذاہب اور مشارب میں بٹ جانا لفظِ جماعت کے مقصود کے خلاف ہے۔ اعتقاد و عمل میں کسی خاص مذہب کا پیروکار جماعت و سنت کے مخالف ہوتا ہے، خواہ وہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔ مذکورہ بالا آیتِ شریفہ نے یہ بات سمجھائی ہے کہ یہ تفرقہ واختلاف دلائل آنے کے بعد ہوا ہے۔ دیدہ ودانستہ یہ لوگ حق بات کو سمجھ بوجھ کر الگ الگ ہو گئے ہیں، اسی وجہ سے ان کے لیے اس تفرقہ واختلاف پر عذابِ عظیم تجویز ہو چکا ہے۔

فرقہ بندی کا انجام:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس دن کچھ منہ سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے۔[4]

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٦٧)

② مسند أحمد (٥٠/٢٣٣)

③ مسند أحمد (٥/١٨٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٨)

④ دیکھیں: سورۃ آل عمران [١٠٦]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ اہلِ سنت کے چہرے سفید ہوں گے اور اہلِ بدعت وضلالت کے چہرے سیاہ ہوں گے۔ یہی قول سیدنا ابن عمر اور ابو سعید رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے۔[1]

غرض کہ اس آیت میں صاف حکم دیا گیا ہے کہ تم اپنے دین میں نئے نئے عقیدے اور نئی نئی رسمیں نکالو اور نہ پھوٹ ڈالو کہ کوئی معتزلی ہو، کوئی خارجی ہو، کوئی رافضی ہو، کوئی قدری، کوئی جبری، کوئی مرجئی، کوئی جہمی، کوئی تفضیلیہ۔ کوئی چار ابرو کا صفایا بنا کر اور کوئی سر پر بال رکھ کر فقیری جتائے۔ کوئی پیری مریدی کی دکان رکھے۔ کوئی قادری نقشبندی، چشتی صابری کہلائے، بلکہ یہ چاہیے کہ سب لوگ مل کر قرآن وحدیث پر چلیں اور سنتِ صحیحہ کے موافق اپنا اسلام اور ایمان درست کریں۔ زندگی وموت اور شادی وغم میں سرِمو کتاب وسنت کے حکم سے باہر نہ نکلیں اور یہود ونصاریٰ کی طرح کئی کئی فرقے نہ ہو جائیں۔

یہ آیت وحدیث اس بات کی دلیل ہے کہ جو کوئی نئی نئی باتیں اور بدعتیں نکالے اور بدعت کا کام کرے اور اہلِ بدعت کا عقیدہ رکھے تو وہ قرآن کا منکر ٹھہرتا ہے اور قیامت کے دن روسیاہ اٹھے گا اور عذاب میں گرفتار ہوگا۔ اس سے یہ بات کہی جائے گی کہ اب اپنی بدعت مکفرہ کا مزہ چکھ لو۔

فرقہ واریت سے براءت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ١٥٩]

[بے شک جن لوگوں نے اپنے دین کو جدا جدا کر دیا اور گروہ گروہ بن گئے آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ تفرقہ وتشیع سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی براءت فرمائی ہے کہ تم کو ان لوگوں سے کوئی کام نہیں ہے۔ ہم ان کو ان کے حال پر آگاہ کر دیں گے۔ یہ آیت اہلِ اسلام کے تمام بدعتی فرقوں کو شامل ہے۔ ان فرق کا نام ونشان ہم نے رسالہ "كشف الغمة عن افتراق الأمة" میں لکھا ہے اور ہر ایک کا تفرقہ واختلاف دوسرے فرقے سے اصولی وفروعی اور عقیدہ وعمل کو ذکر کرنے کے ساتھ بیان کیا ہے۔

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۰۸)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ﴾ [الروم: ٣١-٣٢]

[اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ ان لوگوں میں سے جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور خود بھی گروہ گروہ ہو گئے، ہر گروہ اس چیز پر مگن ہے جو اس کے پاس ہے]

یہ آیت اس بات پر نص ہے کہ تفرق و تشیع شرک کی ایک شاخ ہے۔ رسالہ "كشف الغمة" کے دیکھنے سے اس شرک کا حال جملہ فرق میں باستثنائے فرقہ ناجیہ اہلِ سنت و جماعت بہ خوبی معلوم ہوتا ہے۔

اللہ اور رسول ﷺ سچے ہیں۔ جو انھوں نے خبر دی ویسا ہی واقع ہوا ہے۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ اہلِ بدعت و تفرقہ کا ہر گروہ اپنے حال وقال میں خوش ہے۔ اپنے آپ کو ناجی جانتا ہے اور دوسرے کو ہالک سمجھتا ہے۔ یہ محض ان کا خیالِ خام ہے۔ نجات و ہلاکت کا معیار قرآن و حدیث ہے، اجماع پر اس دعوے کا تحقق ہو سکتا ہے نہ کہ مجرد زبانی ادعا پر۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کام شرع یا عقل میں صریحاً غلط ہے، اس کو ہر کوئی برا جانتا ہے اور جو برا کام آدمی اپنی عقل سے یا کسی اور سے سیکھ کر ایجاد کرتا ہے تو اس کی بُرائی صریحاً قرآن و حدیث میں نہ پا کر اس کام کو نیک جانتا ہے اور اس پر خوش ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے جدا جدا فرقے اور نئی نئی بدعتیں نکل آتی ہیں، جیسے ایک فرقہ تفضیلیہ ہے جو محبِ علی رضی اللہ عنہ بنے ہوئے ہیں اور دوسرا خارجیہ ہے جو علی رضی اللہ عنہ کے دشمن ہیں۔ تیسرا فرقہ ناصبیہ ہے، یہ اولادِ علی رضی اللہ عنہ کے دشمن ہیں۔ چوتھا فرقہ متصوفہ کا ہے۔ یہ ترکِ امر و نہی کر کے گوشہ گزین ہو کر شغل برزخ، نماز معکوس، نو ایجاد درود و وظیفے، تعویذ و گنڈے، حاضرات اور عرسِ قبور پر مراقبے اور زیارت کے لیے سفر میں لگے رہتے اور مشائخ و پیر کہلاتے ہیں۔ کوئی اپنے آپ کو مولوی ملا قاری حافظ مشہور کرتا ہے۔ اگر اس نام ولقب سے اس کو نہ پکارو تو وہ برا مانتا ہے، بلکہ بعض احمق خود یہ الفاظ اپنے نام کے ساتھ لکھتے ہیں اور اپنے منہ سے میاں مٹھو بنتے ہیں۔ شیطان نے ان کو اپنا مسخرہ بنایا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم اپنے دین میں جدا جدا مت ہو اور اکٹھے رہو۔ قرآن و حدیث کی پیروی کرو، کیونکہ مرضِ اختلاف و افتراق کا اس سے بہتر کوئی نسخہ نہیں ہے۔ گمراہی کی اصل یہی ہے کہ

آدمی اپنے باپ دادا یا پیرو مرشد کی چال ڈھال پر اڑا رہے اور ان کی بدعات و رسوم کو دین سمجھ کر بے فکر ہو کر بیٹھ رہے۔ بہت سی خلق اسی وجہ سے گمراہ ہوگئی۔ انھوں نے اللہ و رسول ﷺ کے حکم کی تحقیق نہ کی اور اپنے بزرگوں کے قول و فعل کو عین سعادت سمجھ کر خاطر جمع سے مطمئن ہو بیٹھے اور جان لیا کہ یہی حق ہے، حالانکہ حق کتاب و سنت کے سوا، جس کو قیامت تک اسی ہدایت و امتیازِ حق و باطل کے لیے باقی رکھا ہے، کسی شخص یا کسی کتاب میں نہیں ہے، مگر وہ کتاب کہ جس میں آیت و حدیث کا مطلب کھول کر بیان کیا گیا ہو اور مشکاتِ نبوت اور مصباحِ قرآن سے ماخوذ ہو۔

علمے کہ نہ ماخوذ ز مشکوٰۃ نبی ست
واللہ کہ سیرابی ازاں تشنہ لبی ست

[ایسا علم جو مشکاتِ نبوی سے ماخوذ نہ ہو۔ اللہ کی قسم اس سے سیرابی ایک طرح کی تشنہ لبی ہے]

جائیکہ بود جلوۂ حق حاکم وقت
تابع شدن حکم خرد بولہبی ست

[جس جگہ حاکم وقت اللہ برحق کا جلوہ موجود ہو وہاں عقل و خرد کے حکم کے تابع ہونا ابولہب کا شیوہ ہے]

صراطِ مستقیم کی اتباع کا حکم:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

[اور یہ کہ دین میرا سیدھا راستہ ہے سو اس راہ پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تم کو اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیز گاری اختیار کرو]

اس آیت میں اس امر کا صاف حکم دیا گیا ہے کہ تم ایک ہی راہ اتباعِ توحید و ایثارِ سنت پر چلو اور ادیانِ مختلفہ و مذاہب مستحدثہ پر نہ چلو۔ اگر تم دوسری راہوں پر چلو گے تو راہِ خدا سے بھٹک جاؤ گے۔ امام ابن عطیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ لفظ ''سبل'' میں سارے اہلِ ملل اور اہلِ بدع داخل ہیں، خواہ

اصول میں ہوں یا فروع میں۔ امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سبیل واحد جماعتِ ہُدیٰ ہے۔ اس کا انجام جنت ہے۔ ابلیس نے بہت سے سبل متفرقہ نکال دیے ہیں۔ اس جماعتِ ضلالت کا ٹھکانا جہنم ہے۔ پھر انھوں نے حدیثِ تخطیط کو ذکر کیا ہے۔[1]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ سُبل سے مراد ضلالات ہیں۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ جس کو صحیفہ مختوم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دیکھنا ہو وہ اس آیت کو پڑھے۔ اللہ نے امتِ اسلام کو سبیل واحد کے اتباع کی وصیت کی ہے اور اتباعِ سبل سے ممانعت فرمائی ہے۔[2]

اہلِ تفرقہ کہاں ہیں! ذرا اس آیت و وصیت میں غور کریں اور اپنے عقائد و اعمال کو اہلِ جماعت و سنت کے میزان میں تولیں۔ آیا وہ اس امرِ الٰہی کے فرماں بردار ہیں؟

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کی راہ اختیار کرنا ہی سیدھی مضبوط شاہراہ پر چلنا ہے۔ اس راہ پر آدمی بے خطر اللہ کی طرف پہنچ جاتا ہے۔ جو شخص پگ ڈنڈی راہوں اور گلی کوچوں پر چلتا ہے وہ منزل مقصود تک نہیں پہنچتا۔ وہ راہیں خواہ اگلے کافروں، مشرکوں اور فاسقوں کی ہوں، خواہ موجودہ زمانے کے لوگوں کی ہوں، خواہ اگلے مولوی درویشوں کی راہ ہو، خواہ عہدِ حاضر کے جاہلوں، بدعتیوں کی راہ ہو۔ وہ چال خواہ دہریوں نیچریوں کی ہو اور خواہ فلسفیوں سوفسطائیوں کی ہو۔ خواہ وہ قانون کسی بادشاہ کا ہو یا دستور العمل کسی امیر و فقیر کا ہو۔ خواہ وہ مذاق باطنی کسی پیر و مرشد کا ہو یا کسی مجتہد مذہب کا اجتہاد ہو۔ غرض کہ جو چیز واضح سنت اور ظاہر کتاب کے صراحتاً موافق نہیں ہے، وہ شاہراہِ الٰہی سے علاحدہ ہے اور اپنے چلنے والے کو جہنم تک پہنچانے والی ہے۔ قران مجید میں ہے:

﴿ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴾ [الصافات: ٢٣]

[تو ان سب کو جمع کر کے انھیں دوزخ کی راہ دکھا دو]

اسی طرح جو عقیدہ و عمل اپنی مرضی و رائے کے موافق ہے، اس کو اختیار کرنا اور جو اپنی رائے کے خلاف ہے، اس سے دل چرانا یہ بھی ہلاکت کی راہ اور نفاق کا ایک شعبہ ہے، جیسے قبروں کو پختہ بنانا اور ان پر اونچے اونچے گنبد بنانا، قبر کو مسجد ٹھہرانا اور وہاں چراغ جلانا، چادر ڈالنا، پھول چڑھانا،

---

[1] مسند أحمد (١/٤٣٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١) سنن الدارمي (١/٧٨) صحيح ابن حبان (١/١٨٠) سنن النسائي الكبرى (٦/٣٤٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٠٧٠)

عرس کرنا، دور سے چل کر قبر پر آنا، اپنے پیروں درویشوں کی بات کو ارشادِ رسول ﷺ سے بڑھ کر ماننا، ان کی تعظیم میں مبالغہ اور پیر بھائی کو عاملین بالحدیث ومتبع سنت سے زیادہ عزیز رکھنا، پیر کے کہنے سے تقلید کو اچھا اور اتباع کو بُرا سمجھنا۔ یہ سب راستے صراطِ مستقیم اور قرآن وحدیث کے خلاف ہیں۔ پھر ان میں سے کوئی راہ کافر کر دیتی ہے اور کوئی بدعتی اور کوئی فاسق اور کوئی جاہل بنا دیتی ہے۔ اللہ کی ناپسندیدہ ان تمام باتوں سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

اطاعتِ رسول کی اہمیت وفرضیت:

یہ بہت بڑی نعمت ہے کہ بندہ اللہ کا دوست دار ہو اور اللہ بندے کا دوست دار ہو۔ یہ نعمت اس کے بدوں نہیں مل سکتی ہے کہ بندہ رسول اللہ ﷺ کا متبع ہو۔ اس کی دلیل قطعی یہ ہے:

﴿ قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ٣١]

[آپ کہہ دیجیے اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو، خود اللہ تم سے محبت کرے گا]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو شخص محمد ﷺ کی سنت کی پیروی نہ کرے اور پھر اللہ کی محبت کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے، اور جو سنت کے موافق کام کرے اور اعتقاد رکھے، اس کی محبت اللہ سے سچی ہے اور وہ اللہ کا محبوب ہے۔ اس آیت میں اتباع کرنے کا صریح امر ہے۔ اتباع حدیث پر عمل کرنے کو کہتے ہیں اور تقلید دوسرے کی رائے پر چلنے کو کہتے ہیں۔ اس اتباع کو دوسری آیت میں بہ لفظ اطاعت تعبیر کیا اور فرمایا ہے:

﴿ أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ﴾

[آل عمران: ٣٢]

[اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، اگر یہ منہ پھیر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں کرتا ہے]

اس آیت میں وہ وعید شدید ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے، کیونکہ اطاعتِ رسول ﷺ ترک کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اس کے سوا نہیں ہو سکتی ہے کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے جس طرح پر فرمایا ہے اس کو قبول کرے اور اس کے خلاف کوئی قول صادر نہ ہو، کیونکہ اس اطاعت سے اعراض کرنا کفار کی شان ہوتی ہے نہ کہ اہلِ ایمان کی۔ جب حکمِ رسول علیہ الصلاۃ والسلام

سے دل تنگ ہوا اور حکم رسول ﷺ کے سوا دوسرے کی رائے پسند آئی تو اب ایمان کا خدا حافظ ہے۔ اسی لیے دوسری آیت میں قسم کھا کر ایسے شخص سے ایمان کی نفی کی ہے جو محمد ﷺ کو اپنا حاکم تسلیم نہیں کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴾ [النسآء: ٦٥]

[سو قسم ہے تیرے پروردگار کی یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ آپس کے تمام اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں]

یہ ذکر تو زمانۂ حیاتِ نبوی کا تھا، اب ممات کے بعد وہی کتاب وسنت کی تحکیم تا قیامِ قیامت ونفخِ صور باقی ہے۔

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ظاہر آیت اس بات کی دلیل ہے کہ نص کی تخصیص قیاس سے جائز نہیں ہے، کیونکہ یہ آیت قول وحکم نبوی کے وجوبِ متابعت پر علی الاطلاق دال ہے، تو اب اس سے غیر کی طرف عدول کرنا ہر گز جائز نہیں ہو سکتا ہے۔ یہ مبالغہ جو اس آیت میں ہے شاید کسی اور امر میں نہ ہوگا۔ اس عمومِ قرآن کو حکمِ قیاس پر مقدم کرنا واجب کرتا ہے۔[1]

اس کلام کو "فتح البیان" میں قوی وحسن کہا ہے۔[2]

اب دیکھو کہ علمِ فروع میں جتنی کتب موجود اور متداول ہیں، ان کی غالب بنیاد ان ہی قیاسات پر ہے۔ ان کا ماننا، ان پر چلنا اور کتاب وسنت سے حکم نہ لینا کیسی بات ہے؟ یہ فعل اس آیت کا مصداق ہے یا نہیں؟ یہی حکم اُن رسوم کا ہے جو ولادت وشادی اور ممات میں مروج ہیں، جیسے بیٹے کی ولادت کے وقت بندوقیں چھوڑنا اور بسم اللہ کے لیے چار سال چار ماہ کی قید کرنا۔ بسم اللہ کی شادی کی محفل کرنا، ختنے کی شادی کرنا، منگنی کی رسوم بجا لانا، صفر کے تیرہ دن کو نامبارک سمجھنا، آخری چہار شنبے کو سیر کے لیے جانا، ربیع الاول میں محفل مولود کرنا، ربیع الثانی میں گیارھویں کرنا، جمادی الاولیٰ میں عرس کے لیے مکّن پور جانا، شعبان میں آتش بازی چھوڑنا، خطبہ وداع رمضان

---

[1] التفسير الكبير (١٠/ ١٢٤)

[2] فتح البيان (٢/ ٤٦١)

پڑھنا، نماز عید کے بعد معانقہ ومصافحہ کرنا، نعش کی چارپائی کو منحوس سمجھنا، کفن کے ساتھ جانماز لے جانا۔ اس کے علاوہ بے شمار رسوم ہیں۔

احداث فی الدین کی ممانعت:

⑤ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ أَحْدَثَ فِي أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ»[1]

[جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات ایجاد کی جو اس میں سے نہیں ہے تو وہ مردود ہے]

''نیل الاوطار'' میں کہا ہے کہ اس جگہ امر سے مراد وہ کام ہے جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے اور رد کا معنی مردود ہے۔ یہ حدیث من جملہ قواعدِ دین کے ہے۔ اس کے نیچے اتنے احکام مندرج ہیں جن کا حصر نہیں ہوسکتا۔ یہ حدیث بدعت کی کئی اقسام بنانے والے فقہا کے فعل باطل کے خلاف واضح اور روشن دلیل ہے اور بلا تخصیص ہر بدعت کا رد کرتی ہے یہاں نہ کوئی تخصیص عقلی ہے نہ نقلی۔[2]

امام نووی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو یاد رکھنا اور ابطالِ منکرات میں استعمال کرنا چاہیے۔ اس استدلال کی اشاعت بڑی مناسب ہے۔ طوفی نے کہا ہے کہ اس حدیث کا نام اگر نصف ادلہ شرع رکھا جائے تو نہایت مناسب ہے۔ انتھیٰ۔[3]

اس حدیث میں احداث کو مردود فرمایا ہے۔ یہ احداث اہلِ علم کے نزدیک دو طرح پر ہے۔ ایک وہ جس کی حاجت زمانہ سلف میں نہ تھی، لیکن اس کے بعد اس کی ضرورت پڑی اور وہ اشارۃ النص کے ساتھ ثابت ہے، جیسے صرف ونحو، اعرابِ قرآن کا حدوث اور علم فقہ واصول وغیرہ کی تالیف۔ یہ چیزیں اپنی نظیر وغیرہ کے وجود کے سبب بدعت نہیں ہیں اور نہ ان سے دین کی کوئی خرابی اور کسی سنت کا رفع پایا گیا ہے۔

دوسرا وہ احداث ہے جو اس زمانے میں بے انکار جاری نہ ہوا، جیسے اس وقت بھی لوگ مرتے تھے مگر تیجا، دسواں، چالیسواں، فاتحہ وغیرہ نہ ہوتا تھا یا نکاح ہوتے تھے مگر ساچق،[4] آتش بازی،

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧١٨)

[2] نيل الأوطار (٢/٦٩)

[3] رياض الصالحين (ص:٨٧) ابن علان (١/٤٢٥)

[4] ساچق: شادی کے ایک دن پہلے کچھ میوہ، شیرینی کی ٹھلیاں اور دلہن کا لباس، سامانِ زینت اور نُقل (شیرینی) وغیرہ دولہا کے گھر سے دلہن کے گھر لے جاتے ہیں، اس کو ''ساچق'' یا ''بری'' کہا جاتا ہے۔ (کریم اللغات، ص: ٨٦)

مصحف آرسی[1] وغیرہ رسوم کا وجود نہ تھا، سو اس طرح کا احداث، خواہ عمل میں ہو یا قول میں یا عقیدے میں، بدعت اور مردود ہے۔ یہی حدیث حسنہ وسیہ کی طرف تقسیمِ بدعت کے رد پر دلیل ہے۔ نیل وغیرہ میں یہی استدلال مذکور بسط کے ساتھ مسطور ہے، وللہ الحمد۔[2]

ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے:

⑥ جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«أَمَّا بَعْدُ فَإِنَّ خَيرَ الْحَدِيثِ كِتَابُ اللّٰهِ، وَخَيرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ، وَشَرَّ الْأُمُورِ مُحْدَثَاتُهَا، وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[3] (رواه مسلم)

[اما بعد! یقیناً بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین راستہ محمد ﷺ کا راستہ ہے اور بدترین کام دین میں نئے پیدا کردہ ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے]

اس حدیث میں کتاب وسنت کو خیر ٹھہرایا ہے اور محدثات کو شر بتایا ہے۔ یہ محدثات ہر اعتقادی، قولی اور فعلی امر کو شامل ہیں۔ پھر ہر بدعت کو کسی نوع کی تخصیص کے بغیر ضلالت کہا ہے۔ یہ بدعات کی عدم تقسیم پر دلیل بین ہے۔ اگر کوئی فردِ بدعت ضلالت نہ ہوتی تو یہ کلیہ مطلقہ ارشاد نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلیہ ہر بدعت کو عام وشامل ہے، خواہ اس کو حسنہ کہیں یا سیہ۔ اس عام کی تخصیص کسی دلیل مقدم یا مساوی کے بغیر نہیں ہوسکتی ہے اور ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ فقہاے فروع کے ایک گروہ نے بدعات کی تقسیم کی ہے، لیکن ان کے مقابلے میں دوسری جماعتِ فقہا عدمِ تقسیم کی قائل ہے، جیسے شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانی، صاحب رد الاشراک [شاہ اسماعیل شہید]، سید حسن قنوجی، سید احمد قنوجی، سید محمد بن امیر یمانی اور علامہ قاضی شوکانی رحمہم اللہ وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ حدیث صحیح مسلم کی ہے اور دیگر کتبِ سنن کی احادیث حدیثِ مسلم کے ساتھ معارضے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں جمع کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو ہر محدث کو شامل ہے اور

---

[1] مصحف آرسی: عقدِ نکاح کے بعد دولہا اور دلہن کو آئینہ اور قرآن دکھانے کی رسم کا نام ہے۔

[2] نيل الأوطار (٢/ ٦٩)

[3] صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

محدثات پر شر کا اطلاق کیا ہے، لہٰذا شر میں خیر نہیں ہوتی ہے۔ پھر کس طرح کوئی محدث و بدعت خیر یعنی حسنہ ہوسکتا ہے۔ ہر بدعت کو گمراہی قرار دینا اس بات کی علانیہ دلیل ہے کہ کسی بدعت میں ہدایت نہیں ہے۔

غرض کہ یہ حدیث اپنے اطلاق وعموم پر ہے، اس میں ہرگز تخصیص کا شائبہ نہیں ہے۔ بدعت اور اہلِ بدع کی مذمت میں جتنی احادیث آئی ہیں، ان میں حسن وخیر کا کہیں اتا پتا نہیں ہے۔ کسی حدیث میں بدعت کو نار میں فرمایا ہے،[1] کسی جگہ مبتدع کو ہادمِ اسلام ٹھہرایا ہے اور بدعتی کی توقیر سے منع کیا ہے،[2] کسی مقام میں بدعت کو رافعِ سنت کہا ہے۔[3] یہ سب الفاظ وعبارات تحسینِ بدعات کا استیصال کرتی ہیں، بلکہ بدع کی مذمت خود قرآن میں آئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ [الحدید: ۲۷]

[اور رہبانیت تو ان لوگوں نے ازخود ایجاد کر لی تھی ہم نے ان پر اسے واجب نہیں کیا تھا]

معلوم ہوا کہ بدعت کا حکم اللہ کا نہیں ہوتا ہے۔ اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دین میں نئی بات نکالنا گویا اپنی ایک جدا شرع مقرر کرنا ہے یا قرآن وسنت میں کمی ثابت کرنا ہے۔ گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ یہ بات نہ اللہ نے قرآن میں کہی ہے اور نہ رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوئی کہ وہ کہہ جاتے، اب ہم نے نکالی۔ پس جو دعویٰ ایسا ہو کہ جس میں ایسی بری بات نکلے تو وہ صریح گمراہی ہے۔ اسی لیے جو بدعت کو نیک کام جان کر کرتا ہے اس کو توبہ کا خیال کیوں آنے لگا؟ لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سب بدعتیں گمراہی ہیں اور ان میں شر ہی شر ہے، خیر کی ہوا بھی نہیں۔ اس صورت میں اہلِ بدعت کو استعمالِ بدعت میں خیر کی امید رکھنا عکس القضیۃ ہوتا ہے۔

کسے در صحن کاچے قلیہ جوید

أضاع العمر في طلب المحال

---

[1] سنن النسائي، رقم الحدیث (۱۵۷۸)

[2] المعجم الأوسط (۷/ ۳۵) نیز دیکھیں: السلسلۃ الضعیفۃ (۱۸۶۲) مشکاۃ المصابیح (۱۸۹) تحقیق حافظ زبیر علی زئی۔ مکتبہ اسلامیہ لاہور۔

[3] مسند أحمد (۴/ ۱۰۵) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواہ أحمد والبزار، وفیہ أبو بکر بن عبد اللہ بن أبي مریم، وھو منکر الحدیث" (مجمع الزوائد: ۸۹۲)

[جو شخص چاہِ ذقن میں بھنا ہوا گوشت تلاش کرتا ہے، اس نے گویا ایک محال چیز کی تلاش میں اپنی زندگی گنوا دی]

ہر بدعت جاہلیت ہے:

⑦ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

«أَبْغَضُ النَّاسِ إِلَى اللّٰهِ ثَلَاثَةٌ: مُلْحِدٌ فِي الْحَرَمِ، وَمُبْتَغٍ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ، وَمُطَّلِبُ دَمِ امْرِئٍ بِغَيْرِ حَقٍّ لِيُهْرِيقَ دَمَهُ» [1] (رواه البخاري)

[لوگوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اللہ کے نزدیک تین لوگ ہیں: پہلا شخص حرم میں الحاد کرنے والا، دوسرا اسلام میں جاہلی طریقے کو چاہنے والا اور تیسرا شخص کسی آدمی کے ناحق خون کو ڈھونڈنے والا تاکہ اس کے خون کو بہائے]

اہلِ علم کہتے ہیں کہ ہر محدث وبدعت سنتِ جاہلیت ہے۔ اہلِ کتاب اسی وجہ سے گمراہ ٹھہرے کہ انھوں نے دینِ اسلام میں بدعات نکالی تھیں۔ ایسا شخص اللہ کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے۔ جس کو یہ منظور ہو کہ اس کا رب دشمن ہو جائے تو وہ بدعت نکالے یا کسی بدعت پر چلے۔ یہ بات اس کو بے تکلف حاصل ہو جائے گی۔ اس حدیث سے یہ بھی نکلا کہ بدعت کی ایک قسم یہ بھی ہوتی ہے کہ اگلے کافروں کے رسوم وعادات کو اسلام میں جاری کرے، گویا وہ رسم وعادت اسلام میں نئی نکلی ہے۔ بعض جاہل کہتے ہیں کہ جس کام کی قرآن وحدیث میں صریح برائی نہیں آئی ہے، ہم اس کو کیوں برا جانیں؟ سو یہ بات غلط ہے، جس کام کی ہم کو اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اجازت نہیں ہوئی، وہ کام ہمارے لیے ممنوع ہے، خصوصاً جب کہ اصولِ اسلام کے بر خلاف ہو، لیکن اگر کسی امر سے متعلق شریعت خاموش ہو اور وہ شرعی اصولوں کے خلاف نہ ہو تو وہ معاف ہوتا ہے۔

اہلِ بدعت سے جہاد:

⑧ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ نے کسی امت میں کوئی نبی نہیں بھیجا، لیکن اس کی امت میں اس کے کچھ خالص دوست تھے، پھر ان کے بعد ایسے لوگ آئے جن کا قول ان کے فعل کے موافق نہ تھا۔ وہ ایسے کام کرنے لگے جن کا ان کو حکم نہ تھا۔ جو کوئی ان سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨٢)

ہاتھ سے لڑے گا وہ مومن ہے اور جو کوئی زبان سے لڑے گا وہ مومن ہے اور جو کوئی دل سے لڑے گا وہ مومن ہے اور اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

اس حدیث میں حکم ہے کہ اہلِ بدع سے جہاد کرنا چاہیے۔ ہاتھ سے جہاد کرنا ائمہ کا کام ہے، زبان سے جہاد کرنا علما کا کام ہے اور دل سے جہاد کرنا عوام اہلِ اسلام کا کام ہے۔ معلوم ہوا کہ جو شخص ان تینوں قسم کے مجاہدے سے خالی ہے، وہ مومن نہیں ہے، کیونکہ اس جگہ بقاے ایمان کے واسطے کوئی چوتھی شق ذکر نہیں فرمائی۔ یہ ایسی نفی ہے جس سے بدن لرز اٹھتے اور دل کانپ جاتے ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بدعت کے خلاف جہاد نہ کرنے والے کا ایمان باقی نہیں رہتا تو پھر جو خود بدعت کا موجد ہوگا، اس کے ایمان کا اللہ حافظ ہے۔ وہ تو کسی طرح مومن نہیں رہ سکتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ ازالۂ بدعت میں جہاں تک کوشش ہو سکے بجا لائے اور بدعت کے کام کو مٹائے۔ زبان سے اہلِ بدع کو نصیحت اور بدعت کی فضیحت کرے اور بدعتیوں سے دوستی نہ رکھے۔ مجاہدے کے برابر اس کا ایمان قوی وکامل اور مداہنت کے بقدر ضعیف ومفقود ہوگا۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ جس کام کا حکم نہ ہوا اگرچہ منع بھی نہ کیا ہو تو وہ کام بھی کرنا بدعت ہے۔ جیسے اذان میں چار تکبیر کے بجائے پانچ تکبیر کہنا یا فجر کی دوسنت کی جگہ پر چار رکعت پڑھنا کہ ایسے کام سے بھی منع کرنا ضروری ہے۔ اس جگہ فقط یہی دلیل کافی ہے کہ اس کا حکم شرع میں دلالتاً یا اشارتاً نہیں آیا۔ اس کے فاعل و قائل کے لیے البتہ دلیل چاہیے، خواہ آیت ہو یا حدیث۔ غرض کہ اس حدیث میں زمانۂ نبوت کے بعد حدوثِ بدع کی خبر دی ہے اور مبتدعینِ خلف کی مذمت کی ہے۔

⑨ اس سے زیادہ صریح حدیثِ عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ ہے، جس کے الفاظ ہیں:

«فَإِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَىٰ اخْتِلَافاً كَثِيْراً، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا، وَعَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ»[2]

[تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا وہ بہت زیادہ اختلاف دیکھے گا، پس تم لوگ میری

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٠)

[2] سنن أبي داود (٤٦٠٧) سنن الترمذي (٢٦٧٦) سنن ابن ماجه (٤٢)

سنت اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کے طریقے کو لازم پکڑنا اور اس کو تھام لو اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو]

اس سے معلوم ہوا کہ کثرتِ اختلاف کا وقوع زمانۂ نبوت کے قریب وفات نبوی کے بعد ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ اس اختلاف کا حال ہم نے اپنے رسالے "كشف الغمة" میں لکھا ہے۔

زمانۂ صحابہ رضی اللہ عنہم میں نبی علیہ الصلاۃ والسلام کے بعد بدعتِ قدر، بدعتِ خروج اور بدعتِ اعتزال وغیرہ ظاہر ہوئیں، پھر بدع کا حدوث روز افزوں ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب خیر القرون گزر گئے اور چوتھی صدی آئی تو جماعت اہلِ سنت میں رجال و مذاہب کی بدعتِ تقلید پیدا ہوئی، لیکن اس کا شیوع اتنا عام نہ تھا، جو جو د اب چھے سو سال کے بعد ظاہر ہوا ہے۔ اسی حدیث میں اختلافِ کثیر کے وقوع کے ذکر کے بعد یہ بھی فرمایا ہے:

«وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُورِ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1]

[اور دین میں نئے نئے کام (بدعات) ایجاد کرنے سے بچو، اس لیے کہ ہر بدعت گمراہی ہے]

محدثات امور سے مراد وہ کام ہیں جو زمانۂ نبوت اور زمانۂ صحابہ وتابعین میں نہ تھے۔ اس حدیث کو احمد، ابوداود، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔

اختلاف و بدعات کا ظہور:

یہ حدیث دو امور پر دلالت کرتی ہے۔ ایک وجودِ اختلاف پر، دوسرے حدوثِ بدع پر۔ پہلے اختلاف سے تحذیر فرمائی، پھر بدعت کی مذمت کی۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں کام خلافِ سنت ہیں۔ بدعت سے بہتر (۷۲) فرقے نکلے، اختلاف سے چار فرقے بنے۔

⑩ اس کثرتِ سبل کا ذکر ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں مرفوعاً مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لکیر کھینچی، پھر کہا کہ یہ اللہ کی راہ ہے۔ پھر اس لکیر کے دائیں بائیں دیگر لکیریں کھینچ کر کہا کہ یہ ایسی راہیں ہیں کہ ان میں سے ہر راہ پر ایک شیطان ہے جو اس راہ کی طرف بلاتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٥٣]

---

[1] مسند أحمد (٤/١٢٦) سنن أبي داود (٤٦٠٧) سنن الترمذي (٢٦٧٨) سنن ابن ماجه (٤٢)

[اور یہ دین ہی میرا سیدھا راستہ ہے تم اسی پر چلو اور دوسری راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی۔ اس کا تم کو اللہ تعالیٰ نے تاکیدی حکم دیا تاکہ تم پرہیز گاری اختیار کرو]

اس حدیث کو احمد، نسائی اور دارمی نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی اللہ کی راہ سیدھی شاہراہ ہے، اس پر چلو اور دیگر راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تم کو میری راہ سے بہکا دیں گی۔ پھر آپ ﷺ نے اس کی مثال بنا کر سمجھا دیا کہ شرع کی راہ سیدھی اللہ کی طرف گئی ہے اور اس راہ کے آس پاس لوگوں نے بدعت کی راہیں نکال کر اس راہ میں ملا دی ہیں، سو ان راہوں میں سے ہر ایک راہ پر ایک ایک شیطان بیٹھا ہے جو اپنی طرف بلاتا ہے اور اس بدعت کی خوبیاں اور تاویلیں اور حیلے حوالے سمجھاتا ہے، سو تم ان راہوں پر نہ چلو۔

معلوم ہوا کہ ایمان کا مقتضا یہی ہے کہ قرآن وحدیث کی سیدھی راہ اختیار کرے اور دوسری راہوں پر نہ چلے۔ جو کوئی متعدد راہوں پر چلتا ہے اور شریعت میں نئی راہ نکالتا ہے تو وہ شیطان کی راہ پر جاتا ہے۔

اس حدیث میں جس طرح آپ ﷺ سے قرآن شریف کی تائید اور اتباعِ سبل کی نہی آئی ہے، اسی طرح ائمہ اربعہ مجتہدین نے بھی اپنی اپنی تقلید سے نہی فرمائی ہے۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ چار مصلوں کا مکے میں ہونا اور اہلِ سنت کا چار مذہبوں پر متفرق ٹھہرنا، اللہ و رسول اللہ ﷺ کے مقصود کے خلاف بلکہ ممنوع ہے۔

الحاصل سبیل واحد مستطیل سے مراد کتاب وسنت والا صراطِ مستقیم ہے، جس پر تیرہ سو برس سے اہلِ حدیث گامزن ہیں۔ لکیروں سے مراد محدثاتِ امور اور طرقِ بدع ہیں جو سب کج مج ہیں، اسی لیے ان میں سے ہر راہ پر شیطان کا موجود اور داعی ہونا بتایا ہے۔

معلوم ہوا کہ سارے محدثات وبدع خطواتِ شیطان ہیں نہ کہ سبیلِ رحمٰن۔ ان خطوط کی تعداد کسی حدیث میں نہیں آئی ہے، مگر تفسیر مدارک میں ایک حدیث کے حوالے سے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ ایک تو سیدھا خط تھا اور باقی اس کے دائیں بائیں چھے چھے خط تھے، پھر جب ہر خط کو ان میں سے چھے چھے بار لیا گیا تو یہ سب بہتر (۷۲) راہیں ہوئیں۔[2] انتھیٰ

---

[1] مسند أحمد (۱/۴۳۵) سنن النسائي الكبرى (۶/۳۴۳) سنن الدارمي (۱/۷۸)

[2] تفسير مدارك التنزيل للنسفي (۲/۴۰، ۴۱)

فرقوں کی تعداد:

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اگر چہ یہ بہتر (۷۲) فرق کا عدد صحیح حدیث میں آیا ہے، لیکن اس طرح پر نہیں جس طرح کہ صاحبِ مدارک نے ذکر کیا ہے، بلکہ اس طرح واقع ہے جس طرح کہ مواقف میں کہا ہے کہ بڑے فرق اسلامیہ آٹھ ہیں۔ معتزلہ، شیعہ، خوارج، مرجیہ، جبریہ، مشبہہ، نجاریہ، ناجیہ۔ پھر کہا ہے کہ معتزلہ بیس (۲۰) فرقے ہیں، شیعہ بائیس (۲۲) خوارج بیس (۲۰) مرجیہ پانچ (۵) نجاریہ تین (۳) اور جبریہ ومشبہہ وناجیہ کے فرق ذکر نہیں کیے، پھر ناجیہ فرقہ اہلِ سنت وجماعت کو بتایا ہے، یہ سب تہتر (۷۳) فرقے ہوئے۔ انتہی[1]

لیکن علماے حدیث کی تحقیق کے موافق صحیح تقسیم وہی ہے جو ہم نے رسالہ ”كشف الغمة“ میں مقریزی سے نقل کی ہے۔

فرقہ ناجیہ:

رہی یہ بات کہ فرقۂ ناجیہ یہی اہلِ سنت وجماعت ہیں اور ان ہی کی صراطِ مستقیم اور سبیلِ خدا ہے، باقی سارے سبل جو اس راہ کے سوا ہیں، وہ سبلِ نار ہیں، تو ان کی کیا شناخت ہے؟ کیونکہ ہر فرقے والے اپنے آپ کو راہِ راست پر جانتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی شے محض دعوے سے ثابت نہیں ہوتی، جب تک اس پر کوئی برہان نہ ہو اور ہماری برہان یہ ہے کہ دینِ اسلام نقلاً آیا ہے، مجرد عقل یہاں وافی نہیں ہے۔ اخبارِ متواترہ، احادیثِ متکاثرہ اور آثارِ متوافرہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس امت کے سلف یعنی صحابہ وتابعین اور ان کے بعد محدثین اور مجتہدین اسی عقیدے وطریقہ اہلِ سنت پر گامزن تھے۔ یہ سارے بدع واہوا صدرِ اول کے بعد حادث ہوئے ہیں۔ سلف نے اہلِ احداث وبدعات سے کلیتاً رابطہ محبت وصحبت قطع کر دیا تھا اور وہ ان پر رد کرتے تھے۔ سارے محدثینِ ملت جیسے اصحابِ صحاح ستہ وغیرہ اسی منہج اعدل پر گزرے ہیں۔ ائمہ اربعہ فقہا بھی اسی چال ڈھال پر تھے۔ اشعریہ وماتریدیہ کا بھی یہی رنگ ڈھنگ تھا۔ اس وجہ سے ان لوگوں کا نام اہلِ سنت وجماعت ٹھہرا۔

یہ مبارک نام سنت وجماعت سے ماخوذ ہے۔ یہ ویسا لقب نہیں ہے جو اہلِ بدع نے اپنے لیے

---

[1] المواقف للإيجي (٣/ ٦٤٩)

یا اہلِ سنت نے ان کے لیے ان کے احداث کی مناسبت سے رکھا ہے، جیسے معتزلہ، شیعہ، مرجیہ وغیرہ۔ جو کوئی کسی فقہی اجتہاد یا فرعی قیاس یا فلسفی رائے یا ہوائے بدعی یا شرکی اعتقاد یا لطیفۂ تصوف کو کسی ادنا سنتِ صحیحہ پر مقدم کرتا ہے وہ فرقۂ ناجیہ سے خارج ہو جاتا ہے اور وہ ترکِ سنت و مفارقتِ جماعت کے سبب کسی طرح اہلِ سنت و جماعت میں نہیں ٹھہر سکتا ہے۔ اس نام کا مصداق تو وہی شخص ہوگا جو سرِمو سنت کے مخالف نہیں ہے اور سیرتِ سلف کا تابع ہے۔ وہ سیرت ان کی یہی اتباعِ قرآن وحدیث تھا۔ اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے بارے میں دشمنی ان کا بانا تھا۔ وہ ذاتِ الٰہی میں نہ کسی ملامت گر کے لوم سے ڈرتے تھے اور نہ کسی لایعنی امر میں خوض کرتے تھے، نہ دینِ حق میں کسی کے ایسے مقلد تھے کہ نصِ کتاب وسنت کے واضح ہونے کے باوجود اس کی بات پر چلیں اور اللہ ورسول اللہ ﷺ کی طرف التفات نہ کریں۔

ان کے مدینۂ دل میں ''رَأَیْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ'' کے سوا کسی کی رائے کی رعایت نہ تھی اور نہ کوئی نشان قرآنِ عظیم الشان کے نشان کے سوا تھا، لہٰذا اس نام کا سب سے زیادہ استحقاق انھیں کو ہے۔

تجدیدِ دین اور احیائے سنت:

⑪ اسی لیے حدیثِ بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''جس نے میری سنت کو زندہ کیا جو میرے بعد مرگئی ہے، اس کو اس حدیث کے عاملین کے مثل ان کے اجر کے نقصان کے بغیر اجر ہوگا اور جس نے کوئی بدعتِ ضلالت نکالی جس کو اللہ ورسول ﷺ پسند نہیں کرتے ہیں تو اس پر عاملین کے مثل ان کے گناہوں کے نقصان کے بغیر گناہ ہوگا۔'' اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

یہ حدیث یہ بات سمجھاتی ہے کہ آپ ﷺ کے بعد سنن مرجائیں گی اور بدع ظاہر ہوں گی۔ سنت زندہ کرنے والے کو جملہ عمال کے برابر اجر ملے گا اور مبتدع کو جملہ عمال کے برابر گناہ ہوگا۔

⑫ اس کا ایضاح عمرو بن عوف رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی حدیث سے یوں ہوتا ہے:

« إِنَّ الدِّیْنَ بَدَأَ غَرِیْباً، وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ، فَطُوْبیٰ لِلْغُرَبَاءِ، وَھُمُ الَّذِیْنَ یُصْلِحُوْنَ مَا أَفْسَدَ النَّاسُ مِنْ بَعْدِيْ مِنْ سُنَّتِيْ »[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۶۷۷) یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔ اس کی سند میں ''کثیر بن عبداللہ'' متروک ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۶۲۹)

[دینِ اسلام کا آغاز اجنبی کی صورت میں ہوا اور آغاز کی طرح ہی وہ عنقریب لوٹے گا، پس غربا کے لیے بشارت ہے اور وہ یہ لوگ ہیں جو میرے بعد میری اس سنت کو درست کریں گے جس کو لوگوں نے خراب کر دیا ہے]

اس حدیث کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

⑬ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے صرف اتنے الفاظ مروی ہیں:

«بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيباً، وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ، فَطُوبىٰ لِلْغُرَبَاءِ»[1]

[اسلام کی ابتدا اجنبیت کے ماحول میں ہوئی اور ابتدا ہی کی طرح عنقریب وہ لوٹ جائے گا، پس غربا کے لیے بشارت ہے]

غربتِ اسلام:

یعنی آخر زمانے میں دینِ اسلام کی باتیں ایسی ہو جائیں گی جیسے کوئی مسافر ہوتا ہے کہ اس کو کوئی نہیں پہچانتا اور اس کو لوگ بیگانہ جانتے ہیں۔ ابتدا میں بھی اسلام کو کوئی نہیں جانتا تھا اور عرب کے کافر مسلمانوں پر انگشت نمائی کرتے تھے، ویسے ہی اخیر زمانے میں دینِ اسلام کی اصل باتوں کو کوئی نہیں پہچانے گا اور مسلمانوں پر لوگ انگشت نمائی کریں گے۔

غرض کہ یہ حدیث غربتِ اسلام پر دلیل ہے اور ان غربا کے واسطے بشارت ہے جو سنت کو جاری کریں اور بدعت کو مٹائیں۔ ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ اور یہ بات دین داری کی ہے۔ اگر ان بدع واہوا اور تقلیداتِ رجال کو غربت کا موجب نہ سمجھا جائے تو پھر کون سی شے اس غربت کی مصداق ٹھہرے گی؟ اگر یہی مفاسدِ دین کے مصلح غربا نہ ہوں گے تو پھر وہ کون غربا ہیں جن کا اس حدیث میں ذکر آیا ہے؟ رسالہ "کشف اللثام عن غربة أهل الإسلام" میں اس اجمالی غربت کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بنو اسرائیل کی تقلید اور راہِ نجات:

⑭ سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ میری امت پر وہ حال آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا، جیسے ایک جوتا دوسرے جوتے کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان میں سے کسی نے اپنی ماں سے علانیہ زنا کیا ہوگا تو میری امت میں بھی وہ شخص ہوگا جو یہ کام کرے گا۔ بے شک بنی اسرائیل

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٥) سنن ابن ماجه (٢/ ٣١٩)

بہتر (۷۲) فرقے ہو گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقے ہو جائے گی۔ وہ سب آگ میں جائیں گے، مگر ایک ملت والے۔ کہا گیا کہ وہ کون ہیں اے رسول اللہ ﷺ؟ آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا أَنَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِيْ»[جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں] اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

مسند احمد اور سنن ابوداؤد میں معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ''بہتر (۷۲) نار میں ہوں گے، ایک جنت میں ہوگا اور یہ جماعت ہے۔''[2]

یعنی ناجی یہی اہلِ سنت و جماعت کا گروہ ہے، پس لفظ «مَا أَنَا عَلَيْهِ» سے سنت مراد ہے اور «هِيَ الْجَمَاعَةُ» سے جماعت اہلِ سنت۔ ان کو جماعت اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سب کلمہ حق پر مجتمع ہیں اور اہلِ سنت اس لیے کہتے ہیں کہ سنت بہ معنی حدیث ہے۔ یہ لوگ حدیث پر عمل کرتے ہیں، جس طرح کہ سلفِ امت کا طریقہ تھا۔ سلف زمانہ صحابہ کو کہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا نام ان کے انتقال کے وقت سلف صالح رکھا تھا۔ یہ روایت کتاب زواجر میں مروی ہے۔[3]

⑯ سنن ابو داؤد، نسائی، ترمذی اور ابن ماجہ میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''یہود اکہتر (۷۱) فرقے ہو گئے، نصاریٰ بہتر (۷۲) فرقے ہو گئے اور میری امت تہتر (۷۳) فرقے ہو جائے گی۔''[4] اس کو حاکم نے صحیح کہا ہے۔

⑰ امام احمد، ابو داؤد اور حاکم نے اس کو معاویہ رضی اللہ عنہ سے بھی روایت کیا ہے۔ اتنا لفظ حاکم کے نزدیک زیادہ ہے:

«كُلُّهَا فِي النَّارِ إِلَّا وَاحِدَةً وَّهِيَ الْجَمَاعَةُ»[5]

[ایک کے سوا سب کے سب جہنم میں ہیں اور یہ ایک جماعت ہے]

⑱ سنن ابن ماجہ میں عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یہ الفاظ مروی ہیں:

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

② مسند أحمد (١٠٢/٤) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٥٩٧)

③ دیکھیں: سیر أعلام النبلاء (١٦٠/١) الإصابة (٤٥٧/٢) الزواجر للهيتمي (ص: ٤٥)

④ سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٥٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٩١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٩٩١) المستدرك للحاكم (١٢٨/١)

⑤ مسند أحمد (١٠٢/٤) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٥٩٧) المستدرك للحاكم (١٢٩/١)

''ایک فرقہ جنت میں ہے اور بہتر فرقے نار میں ہیں۔ کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ جنتی فرقہ کون ہے؟ فرمایا: جماعت ہے۔''[1]

⑲ مسند احمد میں انس رضی اللہ عنہ سے یہ الفاظ مروی ہیں:

''پوچھا اے اللہ کے رسول ﷺ! وہ فرقہ کون ہے؟ فرمایا: جماعت ہے۔''[2]

یہ حدیث متعدد الفاظ وطرق سے مروی ہے۔ یہ محل نزاع میں نص ہے، کیونکہ یہ اس بات کا افادہ کرتی ہے کہ جماعت سے مراد جماعت صحابہ ہے اور یہ بات بھی سمجھاتی ہے کہ یہ نام ہمارا مسنون نام ہے نہ کہ اسم مبتدع۔ خود یہ لقب ہم کو شارع علیہ السلام نے بخشا ہے جس طرح کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے ہمارا نام مسلمان رکھا تھا۔ فرمایا:

﴿هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ﴾ [الحج: ۸۷]

[اسی نے تم لوگوں کا نام مسلمان رکھا ہے]

فرقہ ناجیہ کی پہچان:

یہ حدیث اس پر بھی دلیل ہے کہ فرقہ ناجیہ اب رسول اللہ ﷺ اور عہد صحابہ کے بعد وہ ہے جو انھی کی سیرت وصورت پر ہے۔

⑳ اس کی صراحت دوسری حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مرفوعاً حاکم کے نزدیک یوں مروی ہے:

«فَقِيْلَ لَهُ: مَا الْوَاحِدَةُ؟ قَالَ: مَا أَنَا عَلَيْهِ الْيَوْمَ وَأَصْحَابِيْ»[3]

یعنی جب آپ ﷺ سے یہ کہا گیا کہ وہ ایک فرقہ ناجیہ کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ آج کے دن میرے اور میرے اصحاب کے چال ڈھال پر ہے۔

«الیوم» کی قید محل نزاع میں نص ہے۔ معلوم ہوا کہ شرائع دین میں معتبر وہی چیز ہے جو زمانہ نبوت میں اصحابِ نبوت کے سامنے موجود ومعمول تھی، نہ کہ وہ چیز جو اس زمانے کے بعد حادث ہوئی ہے۔ ہر شخص اپنے حال وقال اور افعال کو اس حدیث پر عرض کر کے اور اس وقت کی سیرت و ہُدیٰ

---

① سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۳۹۹۲)

② مسند أحمد (۱۲۰/۳)

③ المستدرك للحاكم (۱۲۹)

سے ملا کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ ان کے طریقے پر ہے یا نہیں ہے۔ اگر وہ اس میزانِ عدل میں اعتقاداً و عملاً پورا نکلا تو بلا شبہہ وہ فرقہ ناجیہ میں داخل ہے، گو عمل میں ان کے بہ نسبت قاصر ہو اور جو اس سے کم ہو وہ جان لے کہ وہ فرقہ ناجیہ میں نہیں ہے۔ تمام احوال و اقوال و افعالِ نبوت کے کتب سنت و سیر میں ضبط ہونے کی وجہ سے یہ موازنہ بہت آسان ہے، کچھ مشکل کام نہیں ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ خود شارع علیہ السلام نے زمانہ آیندہ اور بدع پایندہ پر آگاہ کر دیا ہے۔

(۲۱) فرمایا:

"قریب ہے کہ میری امت میں وہ قومیں نکلیں گی جن میں اہوا داخل ہوں گے جس طرح کہ سگ گزیدہ میں اثر ہوتا ہے کہ کوئی رگ اور جوڑ نہ بچے گا مگر وہ ہویٰ اس میں داخل ہو گی۔"[1]

اہوا سے مراد بدعات و محدثاتِ امور اور بلا دلیل و برہان دین میں رائے کا دخول اور لوگوں کی تقلید ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ جو لوگ میرے اور اصحاب کے عقیدے اور طریقے اور رسم و عادت یعنی سنت کے موافق عمل کرتے ہیں اور کریں گے، وہ بہشتی ہوں گے اور باقی سب فرقے جو بدعت کی نئی نئی باتیں نکال کر متفرق گروہ ہو گئے ہیں وہ سب دوزخ میں جائیں گے، گو ان میں سے بعض کو بعض بدعات کے خفیف ہونے کے سبب خلود نہ ہو، لیکن ان کا نار میں دخول اس حدیث کے مطابق متعین ہے۔ فرقۂ ناجیہ میں اکثر لوگ جہنم سے دور رہیں گے، ان کو دخول بھی نہ ہوگا، اگرچہ بعض فساق ارتکابِ کبائر کے سبب ایک مدت کے واسطے نار میں داخل ہوں گے خواہ وہ مدت قلیل ہو یا کثیر۔ غرض کہ سلف کے عقائد و اعمال اور رسوم و عادات میں کمی بیشی کرنے والا مبتدع مستحق نار ہوتا ہے، جس طرح کہ ان کی راہ و رسم، عقیدہ و عمل اور قول و حال کا پابند جنتی اور ناجی ہوتا ہے۔ واللّٰہ أعلم.

سنت پر عمل کرنے والے کا مقام:

(۲۲) حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ جس نے میری سنت کو دوست رکھا، اس نے مجھ کو دوست رکھا اور جس نے مجھ کو دوست رکھا، وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۵۹۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۶۷۸) یہ حدیث ضعیف ہے۔ اس کی سند میں "علی بن زید بن جدعان" ضعیف ہے۔

معلوم ہوا کہ محبِ سنت، محبِ رسول ﷺ ہوتا ہے۔ اس کو جنت میں آپ ﷺ کی مرافقت ہاتھ آتی ہے، لہٰذا جب نری محبتِ سنت کا یہ ثمرۂ نافعہ ہے تو عامل بالسنۃ کا اللہ جانے کیا کچھ مرتبہ عالی ہو گا۔ اس حدیث سے یہ بھی سمجھا گیا کہ جو کوئی مخالفِ سنت ہو کر آپ ﷺ کی محبت کا مدعی ہے، وہ کاذب ہے۔ محمد ﷺ کی دوستی تو یہی ہے کہ سنت کے موافق عمل کرے۔ نیز یہ بھی ثابت ہوا کہ عامل بالسنۃ بڑے درجے کا بہشتی ہے کہ بہشت میں آپ ﷺ کے ساتھ ہو گا۔ آپ ﷺ کی ایک سنت یہ بھی ہے کہ صبح سے شام اور شام سے صبح تک کسی متبع سنت کا دل میں بغض و کینہ نہ ہو۔[1] سنت پر عمل کرنے کا اجر حدیث میں بے حساب آیا ہے۔

㉓ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے فسادِ امت کے وقت میری سنت کے ساتھ تمسک کیا تو اس کے لیے سو (۱۰۰) شہید کا اجر ہے۔ اس کو بیہقی نے کتاب الزہد میں ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث سے روایت کیا ہے۔[2]

اس حدیث میں عامل بالحدیث کے واسطے بشارتِ عظیمہ ہے، اس لیے کہ تمسک، سنت پر عمل کرنے سے عبارت ہے اور فساد سے مراد بدع و جہالت ہیں، جن میں اکثر لوگ مبتلا رہتے ہیں۔ جب ایک شہید کا اجر غیر شہید سے کہیں بڑھ کر ہے تو سو (۱۰۰) شہید کے اجر کا کیا حساب ہے؟ شہادت سے مراد اس جگہ اللہ کی راہ میں شہادت ہے نہ کہ شہادتِ صغریٰ، کیونکہ عمل بالحدیث میں وہ آفات و امتحانات ہوتے ہیں جن کی برابری جہاد فی سبیل اللہ میں مشقت و محنت کے سوا کوئی شے نہیں کر سکتی ہے۔

"تذکیر الإخوان" میں کہا ہے:

''اب اسی اختلاف و بدعات کا وقت ہے کہ ہر شخص اپنی ہی گاتا ہے اور جو جس کے جی میں آتا ہے بے دھڑک کرتا ہے۔ کوئی کسی بدعت کو فرض جانتا ہے اور کوئی واجب اور کوئی سنت اور کوئی مستحسن اور کوئی مصلحتِ وقت اور کوئی بزرگوں کی رسم۔ سو ایسے وقت میں جو کوئی سنت پر چلے گا اور اس بدعت سے کنارہ کرے گا، اس کو (۱۰۰) شہید کا ثواب ملے گا، اس لیے کہ ہزاروں بدعتی اس کے دشمن

---

[1] مصدر سابق

[2] الزهد للبيهقي (٢٠٩) یہ حدیث ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة (٣٢٦)

ہوں گے اور اس کو برا کہیں گے، بلکہ اس کی جان و آبرو کھونے کی فکر میں رہیں گے اور وہ سنت کے موافق صبر کرے گا، اس لیے اتنا بڑا ثواب پائے گا۔“[1] انتھیٰ

کتاب و سنت کی اتباع کے علاوہ ہر راستہ گمراہی ہے:

(۲۴) سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہم یہود سے کچھ باتیں سنتے ہیں وہ ہم کو اچھی معلوم ہوتی ہیں، کیا ہم ان کو لکھ رکھیں؟ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا تم متحیر ہو جس طرح کہ یہود و نصاریٰ متحیر ہیں؟ میں تو اس ملت کو تمھارے پاس صاف ستھرا لایا ہوں۔ اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو ان کو گنجایش نہیں ہوتی مگر میری پیروی کی۔ اس کو احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔[2]

یہ حدیث دو امر پر دلیل ہے۔ ایک اس شریعت کا واضح و ظاہر ہونا۔ اس میں قیاسات و تفاریع کے عدمِ احتیاج کی طرف اشارہ ہے اور دوسرے غیر کا اتباع جائز نہ ہونا، گو پیغمبر کیوں نہ ہو، چہ جائے کہ اتباعِ آحادِ امت اور تقلیدِ مجتہدین ملت کی ہو۔ آیتِ کریمہ: ﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ﴾ [النساء: ٥٩] میں اختلاف و تنازع کے وقت قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے، پھر اس رجوع کو ایمان باللہ اور یوم آخر پر معلق کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ جو شخص باہمی نزاع کا فیصلہ کتاب و سنت کی طرف نہیں لوٹاتا وہ اللہ اور قیامت کا منکر ہے۔

نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اختلاف کے وقت کسی امر کو انھیں دو اصل اصیل کی طرف لوٹانا ہے نہ کہ بے دلیل قیاس و تفریع کی طرف لوٹانا۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جس دین میں نقصان ہوتا ہے اور اس کے سب احکام واضح نہیں ہوتے تو اس دین کے علما اور امت والے حیران ہوتے ہیں کہ فلاں کام میں کیا حکم کیا جائے اور کس مسئلے میں کیسا فتویٰ ہونا چاہیے تو وہ دوسرے دین والوں سے سیکھ کر کام کرتے ہیں، سو اس دین اسلام میں سب احکام عموماً و خصوصاً بیان ہو چکے ہیں، کوئی کسر باقی نہیں ہے اور نہ کسی طرح کا دھوکا و شبہہ ہے۔ اس دین سے سب اگلے دین منسوخ ہو چکے ہیں۔ اس وقت میں اگر یہودیوں کے پیغمبر بھی زندہ ہوتے تو وہ بھی اسی شریعتِ غرا اور ملتِ بیضا پر عمل کرتے، پھر یہود و نصاریٰ کس قطار و شمار میں ہیں اور ملا، مولوی، شیخ، مجتہد، پیر مُرشد کی کیا گنتی و ہستی ہے کہ کوئی ان سے ان کی

---

[1] تذکیر الإخوان (ص: ٢١)

[2] مسند أحمد (٣/٣٨٧) شعب الإیمان للبیہقي (١٧٥) اس کی سند میں ”مجالد بن سعید“ راوی ضعیف ہے۔

رائے وقیاس کی باتیں سیکھے؟ ہم اگر ان سے دین کی باتیں لیں تو گویا ہم نے اپنے دین کو ناقص اور ان کے دین یا اجتہاد کو کامل جانا، سو اس بات سے ایمان میں نقصان آتا ہے۔

دینِ حق میں جھگڑا کرنے کی مذمت:

㉕ ابو امامہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں فرمایا ہے کہ کوئی قوم ہدایت کے بعد گمراہ نہیں ہوئی جس پر وہ پیشتر تھی لیکن جھگڑا دی گئی۔ پھر یہ آیت پڑھی:

﴿مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ إِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ﴾ [الزخرف: ٥٨]

[تجھ سے ان کا یہ کہنا محض جھگڑے کی غرض سے ہے بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو]

اس کو احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[1]

اس جگہ ہدایت سے مراد قرآن وحدیث ہے۔ جو کوئی ان کو چھوڑ دیتا ہے وہ گمراہ ہو کر جھگڑے میں پڑ جاتا ہے۔ اس حدیث سے علم جدل کی مذمت بہ خوبی ثابت ہوتی ہے اور آیتِ شریفہ بھی اس کی موید ہے۔ یہ جدل ایک عمر دراز سے سارے فرق اسلام میں جاری وساری ہے، جتنے بدعات ومحدثات اس ملتِ حقہ میں زمانۂ صدر اول سے اب تک حادث ہوئے ہیں، یہ سارا اسی جدل کا نتیجہ ہے، فقط ایک گروہ اہلِ حدیث اس جنگ سے عافیت میں رہا ہے۔ وللہ الحمد.

رسول اللہ ﷺ کے وقت میں اکثر کافر لوگ حق بات کو جانتے تھے، مگر پھر جھگڑتے اور بحث کرتے تھے۔ اللہ نے قرآن میں کہا کہ یہ نرے جھگڑالو ہیں۔ یہ گفتگو تحقیقِ حق کے واسطے نہیں کرتے، بلکہ اس لیے کہ حق کو مکرا لیں۔ سبحان اللہ! ایک مسلمان تو قرآن وحدیث سے یہ بات ثابت کرتا ہے کہ فلاں کام ناجائز یا بدعت ہے، اس کو نہ کرنا چاہیے اور دوسرا اس کے مقابلے میں یہ کہتا ہے کہ میں تو اس کام کو جائز اور نیکی سمجھوں گا، کیونکہ یہ کام میرے باپ دادے یا شہر کے لوگ یا میرے پیر یا شیخ یا استاذ کرتے ہیں!!

غرض کہ اللہ ورسول ﷺ کا حکم بزرگوں کی نکالی ہوئی بدعت سے کم تر اور حقیر تر ٹھہرا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا گمراہی اور ہلاکت ہوگی؟!

گمراہی سے سلامتی کیسے؟

㉖ امام مالک بن انس رحمہ اللہ مرسلاً کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ نے فرمایا ہے:

[1] مسند أحمد (٥/٢٥٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٥٣) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٨)

«تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ لَنْ تَضِلُّوا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا: كِتَابُ اللّٰهِ وَسُنَّةُ نَبِيِّهِ»
[میں نے تمھارے اندر دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ جب تک تم لوگ ان کو پکڑے رہو گے، ہرگز گمراہ نہ ہو گے: اللہ کی کتاب اور اس کے نبی ﷺ کی سنت]
اس کو موطا میں روایت کیا ہے۔[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ عدمِ ضلال قرآن وحدیث کے ساتھ تمسک پر معلق ہے اور آپ ﷺ نے یہی دو چیزیں امت کے واسطے قیامت تک چھوڑی ہیں۔ جس نے ان کو نہ لیا، وہ گمراہ ہوا۔ یہ حدیث ردِ قیاس وغیرہ کے واسطے حجت ہے۔

ترکِ سنت کا انجام:

㉗ حدیثِ غضیف ثمالی رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ کسی امت نے کوئی بدعت نہیں نکالی لیکن اس کے مثل ایک سنت اٹھ گئی۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[2]

معلوم ہوا کہ ہر بدعت رافعِ سنت ہوتی ہے، خواہ عقائد میں ہو یا اعمال میں۔ مثلاً جب سے تقلید کی بدعت نکلی ہے، کتاب وحدیث سے تمسک کی سنت مرفوع ہوگئی ہے۔ وعلی هذا القياس.

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ میری امت بہشت میں جائے گی مگر وہ شخص جس نے انکار کیا۔ پوچھا گیا: کس نے انکار کیا؟ فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا اور جس نے میری نافرمانی کی وہ منکر ہوا۔" اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔[3]

اس جگہ نافرمانی سے مراد سنن پر بدعت کو اختیار کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہلِ بدعت جنت میں نہیں جائیں گے۔

㉘ انس رضی اللہ عنہ کا مرفوع لفظ یہ ہے:

«فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي»[4] (متفق عليه)

---

① الموطأ للإمام مالك (٢/ ٣٢١) یہ حدیث موصولاً بھی مروی ہے، دیکھیں: المستدرك للحاكم (١/ ١٧٢)

② مسند أحمد، رقم الحديث (١٦٣٥٦) اس میں "ابوبکر بن عبداللہ بن ابی مریم" راوی ضعیف ہونے کی وجہ سے ضعف پایا جاتا ہے۔

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٢٨٠)

④ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠٦٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٠١)

[جو شخص میری سنت سے بے رغبت ہے وہ مجھ سے نہیں ہے]

اہلِ بدعت ہمیشہ اتباعِ سنت سے بے پروا رہا کرتے ہیں۔ دلالتِ حدیث کے بہ موجب یہ زمرۂ اسلام سے الگ ہیں۔

عمل بالسنۃ کی اہمیت وفضیلت:

㉙ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے طیب کھایا یعنی رزق حلال اور سنت کے مطابق عمل کیا اور لوگ اس کے بوائق یعنی شرور سے امن میں رہے، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ایک آدمی نے کہا: یہ بات آج کے دن لوگوں میں بہت ہے۔ فرمایا: بہت جلد میرے بعد کی صدیوں میں ہوگی۔''[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ عامل بالحدیث مستحقِ جنت ہوتا ہے اور جس طرح کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ سعادت میں لوگ سنت پر عمل کرتے تھے، اسی طرح آخر زمانے میں بھی ایک جماعت طریقہ نبویہ پر قائم رہے گی۔ یہ بشارت ہم جیسے غربا وضعفا کے واسطے ہے۔

㉚ دوسری حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ تم لوگ ایسے زمانے میں ہو کہ جو کوئی مامور بہ کا دسواں حصہ چھوڑ دے گا وہ ہلاک ہو جائے گا۔ پھر ایک زمانہ آئے گا کہ جو کوئی دسویں مامور بہ حصے پر عمل کرے گا وہ نجات پائے گا۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[2]

اس دوسرے زمانے سے مراد فتنوں کا زمانہ ہے کہ اس وقت میں تھوڑا عمل کرنا بھی غلبۂ بدع وفساد کی وجہ سے نافع ہوگا۔ عمل سے مراد اس جگہ سنن ونوافل عبادات ہیں نہ کہ فرائض وواجبات، اس لیے کہ ان میں تو کسی وقت میں بھی کمی نہیں ہو سکتی ہے۔

التزام جماعت کی تلقین:

㉛ حدیثِ ابوذر رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے جماعت کو ایک بالشت چھوڑا، اس نے اپنی گردن سے اسلام کی زنجیر کو نکال ڈالا۔ اس کو احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔[3]

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٢٠) اس کی سند میں ''ابو بشر'' مجہول ہے۔

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٦٧) السلسلة الصحيحة (٢٥١٠)

③ مسند أحمد (٥/ ١٨٠)، سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٥٨)

جماعت سے مراد اصحاب وتابعین وتبع تابعین کی جماعت ہے نہ کہ مقلدین مذاہب کی جماعات۔

(۳۲) ابراہیم بن میسرہ رحمہ اللہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ جس نے صاحبِ بدعت کی توقیر کی، اس نے ہدمِ اسلام پر اعانت کی۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں مرسلاً روایت کیا ہے۔[1]

یہ اس لیے ہے کہ مبتدع کی توقیر کرنے میں سنت کی استہانت ہے اور سنت کی حقارت اسلام کو مٹانے کی طرف لے جانے کا سبب بنتی ہے۔ یہ حدیث ہر بدعت وبدعتی کو شامل ہے، خواہ وہ بدعت بڑی یا چھوٹی ہو، خواہ اچھی ہو یا بری، خواہ عقائد میں ہو یا اعمال میں اور خواہ اقوال میں ہو یا احوال میں۔ سلف میں انکارِ بدع اور تذلیل اہلِ بدع میں بڑا اہتمام تھا۔ جب سے وہ انتظام جاتا رہا اور حبِ جاہ ومال نے مسلمانوں کے دل پر تسلط پایا اور اشخاص کی تعظیم وتوقیر دنیا کے واسطے ہونے لگی اور ذمِ بدعت وتغییرِ منکر سے آنکھ بند کر لی گئی، تب سے اسلام منہدم ہو گیا۔ بنابریں اب مسلمان گور میں ہیں اور مسلمانی کتب میں رہ گئی ہے۔ وہ بھی ان لوگوں کی کتابوں میں جو خوش عقیدہ اصحابِ توحید واہلِ سنت والجماعت ہیں، ورنہ لاتعداد کتابیں اس زمانے میں اثباتِ بدعت ومحدثات ومنکرات کے واسطے تالیف ہوتی رہتی ہیں۔

﴿وَ كَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا﴾ [الأحزاب: ۳۸]

[اور اللہ کے کام اندازے پر مقرر کیے ہوئے ہیں]

ترکِ دنیا کی بدعت:

(۳۳) حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

''تم اپنی جانوں پر تشدد نہ کرو کہ اللہ تم پر تشدد کرے۔ ایک قوم نے اپنی جان پر تشدد کیا تو اللہ نے ان پر تشدد کیا۔ یہ گرجوں اور بت خانوں میں ان کا بقیہ ہے۔ ﴿وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ﴾ [الحدید: ۲۷] ''اور رہبانیت تو ان لوگوں نے ازخود ایجاد کر لی تھی ہم نے اس کو ان پر واجب نہیں کیا تھا۔''[2]

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

اس تشدد سے مراد ریاضاتِ شاقہ اور مجاہداتِ صعبہ کا اختیار کرنا ہے جس طرح نصاریٰ وہنود

(1) شعب الإیمان (۹٤٦٤) یہ روایت موصولاً بھی مروی ہے۔ دیکھیں: المعجم الأوسط (۷/ ۳۵)

(2) سنن أبي داود، رقم الحدیث (٤۹۰٤)

میں مروج ہے۔ اسلام میں اس کو بدعت ٹھہرایا اور منع کیا ہے۔ ہم نے رسالہ "اختیار السعادۃ في إیثار العلم علی العبادۃ" میں اس کی بحث لکھی ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ ورسول نے جو عبادت جتنی اور جس کے لیے جس وقت بتا دی ہے، اس پر زیادتی نہ کرے اور حلال ومباح کو حرام ومکروہ نہ کر لے، جیسے عامل لوگ یا درویش حلال حیوانات ترک کر دیتے ہیں کہ یہ بدعت وحرام ہے۔ اسی تشدد میں وسوسۂ طہارت ونیتِ نماز بھی داخل ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اعلام ہدایت ہیں:

۳۴ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح کرتے ہوئے کہا تھا:

"فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم على أثرهم، وتمسكوا بما استطعتم من أخلاقهم وسيرهم، فإنهم كانوا على الهدى المستقيم"[1]

[ان صحابہ کے فضل کو پہچانو اور ان کے پیچھے قدم بہ قدم چلو اور جس قدر ہو سکے ان کے اخلاق وعادات مضبوط پکڑ لو، اس لیے کہ وہ لوگ سیدھی راہ پر تھے]

اس کو رزین نے طویل سیاق کے ساتھ روایت کیا ہے۔

یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کا رتبہ پہچانو، ان کی پیروی کرو، ان کی چال پر چلو کہ وہ راہِ راست پر تھے، تم ان کو چھوڑ کر نئی نئی راہیں اور رسمیں بدعتیں نہ نکالو کہ وہ گمراہی کے راستے ہیں۔

اہلِ بدعت کا انجام:

۳۵ حدیثِ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ حوض کوثر پر کچھ لوگ میرے پاس آئیں گے تو میں ان کو اور وہ مجھ کو پہچانیں گے۔ پھر میرے اور ان کے بیچ میں ایک پردہ پڑ جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ تو میرے ہیں۔ مجھ سے کہا جائے گا: تو نہیں جانتا کہ انھوں نے تیرے بعد کیا کیا نئی نئی باتیں نکالی ہیں۔ تب میں کہوں گا کہ جس نے میرے بعد میرے دین کو بدل ڈالا وہ دور ہو۔

اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[2]

---

[1] جامع بیان العلم (۲/ ۱۹۸) مشکاۃ المصابیح (۱/ ٤۲)

[2] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٦٥٨٣) صحیح مسلم (٧/٦٦)

یہ حدیث دلیل ہے کہ اہلِ بدعت کو آبِ کوثر نہ ملے گا اور خود آپ ﷺ ان کو وہاں سے نکال دیں گے اور ان سے سخت ناراض و بے زار ہو جائیں گے، کیوں نہ ہوں کہ اللہ نے تو اس دین کے کامل ہونے کی خبر دی ہے اور ان لوگوں نے بدعتیں نکال کر گویا اس کو ناقص ٹھہرایا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا﴾ [المائدة: ۳]

[آج میں نے تمھارے لیے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمھارے لیے اسلام کے دین ہونے پر رضا مند ہو گیا]

اس آیت کے بعد اب کسی کو کم وبیش کرنے کی گنجایش باقی نہیں رہی۔ جو کمی یا بیشی کسی طرف سے ہوگی، وہ خواہی نخواہی بدعت سے خالی نہ ہوگی۔ ہم اس سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔

باب دوم

حقیقتِ ایمان کا بیان

ایمان کی پہلی علامت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾ [النساء: ٦٥]

[سو قسم ہے تیرے پروردگار کی یہ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام آپس کے اختلاف میں آپ کو حاکم نہ مان لیں، پھر جو فیصلے آپ ان میں کر دیں ان سے اپنے دل میں کسی طرح کی تنگی اور ناخوشی نہ پائیں اور فرمانبرداری کے ساتھ قبول کر لیں]

اس آیتِ شریفہ میں حق عزوجل نے اپنی قسم آپ کھا کر یہ ارشاد فرمایا ہے کہ مومن کا ایمان تب ہی ٹھیک ہوتا ہے کہ وہ ہر جھگڑے میں رسول اللہ ﷺ کو حَکَم ٹھہرائے، پھر ان کے حُکم سے اس کا دل تنگ نہ ہو، بلکہ مضبوطی سے اس کو مان لے۔ یہ بات آپ ﷺ کی حیات میں یوں تھی کہ آپ کے پاس آ کر حکم حاصل کرتے تھے اور وفات کے بعد اس طرح پر ہے کہ سنتِ مطہرہ کی طرف رجوع کریں، جس طرح کہ اہلِ تقلید اقوالِ رجال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان کی علامت اور دستاویز یہی ہے کہ دین و دنیا کے جس کام کی بابت آپس میں جھگڑا اٹھے، اس کے فیصلے کے لیے آپ ﷺ کو منصف ٹھہرائے، پھر جو حکم حدیث سے ثابت ہو، اس میں چون وچرا کرے اور نہ اس سے ناخوش اور دل میں تنگ ہو، بلکہ بہ سر و چشم اس حکم کو تسلیم کر لے۔ اگر مان لے تو ایمان ہے، وگرنہ نہیں۔

دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿ إِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ إِذَا دُعُوٓا إِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ أَنْ يَّقُولُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾ [النور: ۵۱]

[ایمان والوں کی یہ بات ہوتی ہے کہ جب ان کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلاؤ تا کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دے تو اللہ ورسول کے حکم کو سنتے ہی مان لیتے ہیں۔ یہی لوگ مراد کو پہنچے ہیں]

اس جگہ اللہ ورسول کے حکم سے مراد حکم کتاب وسنت ہے۔ معلوم ہوا کہ قبولِ دعوت صحتِ ایمان کی امارت ہے اور اجابتِ دعا فلاح کی دلیل ہے۔ اس زمانہ پُر آشوب میں یہ حالت طاری ہے کہ جس نام کے مسلمان سے کہو کہ آؤ قرآن وحدیث پر چلیں، قبول کرنا تو کجا وہ اس داعی کا جانی دشمن ہو جاتا ہے اور جتنی آیتوں وحدیثوں میں اہلِ بدعت وشرک کی مذمت آئی ہے، ان کا مصداق اسی موحد ومتبع کو ٹھہرا کر اپنے بدعات ومحدثات کو سنتِ صحیحہ جانتا ہے۔ سو یہ عکس القضیہ قربِ ساعت کی بہت بڑی علامت ہے، اس لیے کہ معروف کا منکر ہو جانا اور منکر کا معروف ٹھہرا لینا ایمان سے باہر ہونا اور اسلام سے خروج کرنا قیامتِ کبریٰ کی آمد کی تمہید ہے، اگرچہ یہ ایک ہزار سال ہجری کے بعد سے شروع ہے اور ۱۳۰۰ھ میں اشراطِ ساعتِ صغریٰ کی تکمیل ہوگئی، مگر اب چودھویں صدی سے اماراتِ کبریٰ کے طلائع بھی ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ اے دلوں کو پھیرنے والے ہمارے دلوں کو اپنے دین پر ثابت رکھ!

فلاح کی راہ:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ۝ إِلَّا عَلٰٓى أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَلٰى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ۝ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ ۝ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ﴾

[المؤمنون: ۱-۱۱]

[کام نکال لے گئے وہ ایمان والے جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں اور نکمی بات پر توجہ نہیں کرتے اور زکات دیا کرتے ہیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں پر یا اپنی ملکیت کی لونڈیوں پر سو ان پر الزام نہیں پھر جو اس کے سوا ڈھونڈے سو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کی پاسداری کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے ہیں یہی ہیں میراث لینے والے جو فردوس بہشت کی میراث لیں گے یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے]

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وارثانِ فردوس کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ یہ سب پانچ وصف ہیں۔ ان وصف والوں کو ایمان والا فرمایا۔ خشوع سے مراد اخلاص ہے کہ تہہ دل سے نماز میں خاشع اور اللہ کی طرف دل لگائے ہوئے ہیں۔ اللہ کے ڈر سے دبے جاتے ہیں اور کسی طرف اپنا وہم وخیال جانے نہیں دیتے اور نکمی بات پر کہ جس سے دنیا و دین کا کچھ فائدہ نہیں ہے، توجہ نہیں رکھتے اور مال کی زکات سال تمام ہونے پر ادا کرتے ہیں۔ اس کے دینے سے دل نہیں چراتے اور نہ تاخیر کرتے ہیں اور بی بی یا شرعی کنیز کے سوا کسی اور عورت سے آگاہ نہیں ہوتے۔ متعہ زنا، دوستی، جبر، جلق و اغلام اور نہ سحق کرتے ہیں۔ اپنی امانت اور بات کے پکے سچے ہیں اور نماز وقت پر بلا تاخیر ادا کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اعلا درجے کی بہشت میں جائیں گے جس کو فردوس کہتے ہیں۔ غرض کہ حصولِ مراد اور وصولِ فلاح ان اوصافِ پنج گانہ کے وجود پر موقوف ہے۔ اس جگہ روزہ وحج کا ذکر نہیں آیا، کیونکہ ان کا ذکر دوسری آیت سے ثابت ہے اور لفظِ ایمان میں یہ سب کام داخل ہیں۔

ایمان کی دوسری علامت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ۝ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ﴾ [الأنفال: ٢-٤]

[ایمان والے وہی ہیں کہ جب اللہ کا نام آئے تو ان کے دل ڈر جائیں اور جب ان پر

اس کی آیتیں پڑھی جائیں تو ان کا ایمان زیادہ ہو جائے اور وہ اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں اور نماز قائم رکھتے ہیں اور ہمارا دیا کچھ خرچ کرتے ہیں۔ یہی سچے ایماندار ہیں ان کے لیے ان کے رب کے نزدیک درجے ہیں اور بخشش اور آبرو کی روزی ہے]

یعنی ایمان کی نشانیاں اور سچے یہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر آئے تو جی ڈر جائے اور دل مارے ہیبت و خوف کے کانپ اٹھے۔ جب کلام اللہ پڑھا جائے تو شوق سے دل لگا کر سنے، ہر حکم مانے، ہر بات کو سچا جانے اور اس پر یقین لائے۔ ہر بار کے سننے سے ایمان مضبوط ہو اور یقین بڑھے۔ رب کے سوا کسی کی پروا نہ کرے اور نماز اچھی طرح درست طور پر ہمیشہ پڑھتا رہے۔ جو مال و متاع اللہ نے دیا ہے، اس کو اللہ کی راہ میں اس کے حکم کے بہ موجب خرچ کرے نہ کہ اپنے جی کے موافق، تو ایسا ہی مسلمان سچا مومن ہوتا ہے اور جوں جوں اس کی یہ باتیں زیادہ ہوتی جائیں گی اتنا ہی اللہ کے نزدیک اس کا مرتبہ بڑھتا جائے گا۔ ایسے شخص سے اگر بھولے بھٹکے کچھ گناہ بھی ہو جاتا ہے تو اللہ معاف کر دیتا ہے اور اس کو بہشت میں عزت و آبرو کے ساتھ رزق دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس کسی شخص میں یہ باتیں نہ ہوں اور پھر وہ مسلمانی کا دعویٰ کرے تو وہ جھوٹا ہے، اس کا دعویٰ تب سچا ہوگا کہ اس کے پاس یہ گواہ ہوں جن کا ذکر اس آیت میں ہوا ہے۔ سابق الذکر آیت کے علاوہ اس میں مزید تین وصف ذکر کیے گئے ہیں۔ اب پانچ اور تین آٹھ وصف ہوئے۔

ایمان کی تیسری علامت:

تیسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ [الأنفال:٧٤]

[جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑ آئے اور اللہ کی راہ میں لڑے اور جنھوں نے جگہ دی اور مدد کی وہی حقیقی مسلمان ہیں ان کے لیے بخشش اور عزت کی روزی ہے]

اس آیت میں چار وصف اور بتائے ہیں۔ ایک ہجرت، دوسرا جہاد، تیسرا جگہ دینا، چوتھا مدد کرنا۔ یہ سب بارہ وصف ہوئے۔ معلوم ہوا کہ مسلمانی کے یہ کام ہیں کہ کافروں کے ملک سے نکل جائے اور

جہاد کرے اور مجاہدوں کو اپنے بیچ میں جگہ دے اور مال وہتھیار اور کھانے پینے سے ان کی مدد کرے۔

یہ آیت انصار کے حق میں اتری تھی۔ انھوں نے مہاجرین مکہ کے ساتھ یہی برتاؤ کیا تھا۔ اسی طرح جس زمانے میں پھر ایسا موقع ملے اور کوئی مسلمان یہ کام کرے تو یہ اس کے پکے مومن ہونے کی علامت ہے۔ یہ اس لیے کہ عمومِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، خصوص سبب کا نہیں۔

ہجرت وجہاد کے لیے آداب وشروط ہیں۔ جب وہ پائے جائیں تب کہیں یہ حکم ثابت ہوگا۔ بہت سے نام کے مسلمان مکے کو ہجرت کر کے جاتے، پھر وہاں سے تنگیِ معاش وغیرہ امور کے سبب بھاگ آتے، اسی طرح اکثر لوگ ملک گیری کے واسطے قتال کرتے ہیں اور اس کا نام جہاد رکھ دیتے ہیں، حالانکہ وہ فتنہ ہوتا ہے نہ کہ جہاد۔

یہ بات معلوم رہے کہ دین کا جو کام ہدایتِ دین اور امرِ شارع کے موافق نہیں ہوتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ قبول کرتا ہے نہ وہ کام دین کا کام ٹھہرتا ہے اور نہ اس کا فاعل دیندار وایماندار سمجھا جاتا ہے، گو وہ اپنے خیال مختل میں اس کو ایمانداری سمجھے۔ اس جگہ اللہ ورسول ﷺ کی مراد کا اعتبار ہے نہ کہ غیر کی خیال بندی کا۔ ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ﴾ [المائدة: ٢٧] [اللہ تعالیٰ تقویٰ والوں ہی کا عمل قبول فرماتا ہے]

ایمان کی چوتھی علامت:

چوتھی آیت میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾ [الحجرات: ١٥]

[ایماندار وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر یقین لائے پھر شبہہ نہ لائے اور اپنے مالوں اور جانوں سے اللہ کی راہ میں لڑے وہی لوگ سچے ہیں]

یعنی یہ بھی ایمان کا ایک پتا ہے کہ اللہ ورسول ﷺ کے کسی حکم وارشاد میں شک وشبہہ کو جگہ نہ دے، اس لیے کہ شبہہ لانا، یقین کرنے کے مخالف ہوتا ہے۔ جب یقین میں دھوکا ہوا تو پھر ایمان کہاں قائم رہ سکتا ہے؟ یہ اہلِ ایمان کا تیرھواں وصف فرمایا۔ اس وصف کا تحقق اس وقت ہونا چاہیے کہ جب لڑائی کا موقع ہاتھ آئے اور فتنہ نہ ہو۔

ان آیتوں سے یہ بات بھی ثابت ہوئی کہ عمل ایمان میں داخل ہے اور ہر انسان کا ایمان بڑھتا گھٹتا رہتا ہے۔ طاعت سے زیادتی ہوتی ہے اور وہ زیادتی جنت الفردوس میں لے جاتی ہے اور معصیت سے کمی ہوتی ہے اور وہ کمی دوزخ کی سیر کراتی ہے۔ اے اللہ! ہم تجھ سے جنت کے طلب گار ہیں اور جہنم سے تیری پناہ مانگتے ہیں۔

اسلام کی بنیاد:

① حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے:

«بُنِيَ الْإِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ شَهَادَةِ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَالْحَجِّ وَصَوْمِ رَمَضَانَ»[1]

اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

یعنی اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ ایک اللہ کے اکیلے معبود ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بندے اور رسول ہونے کی گواہی دینا، دوسری نماز قائم کرنا، تیسری زکات دینا، چوتھی حج کرنا، پانچویں رمضان کا روزہ رکھنا۔

ان کاموں کو کرنے سے آدمی مسلمان ٹھہرتا ہے جبکہ سچے دل سے کرے اور بلا عذر ان کے بجا نہ لانے سے مسلمان نہیں رہتا خواہ ان میں ایک بجا نہ لائے یا دو یا تین یا چار۔ اس حدیث کی مستقل شرح رسالہ "ضوء الشمس" میں ہے۔[2] اس جگہ مطلب یہ ٹھہرا کہ شہادت یہ ہوتی ہے کہ جو بات آدمی کے نزدیک بلا شک وشبہہ یقین کامل سے ثابت ہو، اس کی خبر دے تو وہ سچا گواہ ہے، ورنہ جھوٹا، گو وہ بات حقیقت میں سچی ہو۔

منافقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا: ﴿نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ﴾ [المنافقون: ١] [ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ یقیناً اللہ کے رسول ہیں]، لیکن وہ دل سے اس بات پر یقین نہیں لاتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦)

② یہ مولف رحمہ اللہ کا تالیف کردہ رسالہ ہے، جس کا نام "ضوء الشمس على شرح حديث بني الإسلام على خمس" ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ [المنافقون: ١]

[اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافق قطعاً جھوٹے ہیں]

حالانکہ نفس الامر میں یہ بات ٹھیک تھی۔ معلوم ہوا کہ زبان سے کہنا جب سچا ٹھہرتا ہے کہ دل میں بھی یقین ہو اور اگر زبان سے کہا اور دل میں وہ بات نہیں ہے تو یہ نفاق ہوا نہ کہ اسلام۔ اور اگر دل سے سچا جانا اور زبان سے نہ کہا تو بھی مسلمان نہیں ہے، ہاں اگر گونگا ہے تو یہ اور بات ہوئی۔ پھر جس نے دل اور زبان دونوں سے بلاشک کہا تو گویا اس نے یہ بات کہی کہ میں مشرک، بت پرست، ستارہ پرست، پیر پرست، گور پرست اور امام پرست نہیں ہوں اور مجوس، صابئین، ہنود، یہودیت اور نصرانیت وغیرہ سب دینوں سے دست بردار ہوں، کیونکہ اس نے یہ اقرار کر لیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور نہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت کروں گا۔

عبادت یہ ہے کہ کسی کی بے حد تعظیم کے لیے اپنے آپ کو ذلیل کرے۔ سو عبادت اسی کے لیے زیبا ہے جو کسی کا محتاج نہ ہو، بلکہ سب اس کے محتاج ہوں، ورنہ پھر محتاج محتاج برابر ہوئے۔ ایک محتاج دوسرے محتاج کی عبادت کیوں کرے؟ جو شخص کلمہ کہے اور اس کے معنی نہ جانے تو اس کا ایمان نہیں ہے۔ اسی طرح جو شخص توحید کا اقرار کرے اور "محمد عبدهٗ ورسوله" کا مطلب نہ سمجھے یا سمجھے اور انکار کرے تو وہ بھی مسلمان نہیں ہے۔ اس کلمے سے معلوم ہوا کہ پیغمبر بھی بندہ ہی ہوتا ہے نہ کہ خدا، اگر خدا ہوتا تو پیغام کس کی طرف سے لاتا؟ پھر جب بندہ ٹھہرا تو اس پر خدا کی بندگی بھی فرض ٹھہری۔ اس کو سب مخلوق سے چن کر اس لیے بھیجا کہ وہ اوصافِ کمال اور اخلاقِ حسنہ کا جامع ہے۔ رسول ہو کر آنے سے یہ بات ثابت ہوئی کہ سارے بشر مکلف ہیں۔ ان کو حکمِ خدا کے بہ موجب کام کرنا چاہیے، وہ خود مختار نہیں ہیں۔

اللہ نے انسان کو کاسب بنایا ہے، اگر بالکل بے اختیار و مجبور ہوتا تو محل امر و نہی کیوں ٹھہرتا؟ پیغمبر کے لیے ضروری ہے کہ معجزہ لائے جس سے اس کی تصدیق ہو اور سچا ہو، کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو، گناہ سے معصوم ہو، چپ چاپ نہ بیٹھے بلکہ اللہ کا حکم اس کی خلق کو پہنچائے۔ جو باتیں بشریت سے متعلق ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا جاگنا، نکاح کرنا، بول و براز کا ہونا، یہ پیغمبر کے حق میں نقصان نہیں۔ اگر یہ باتیں اس میں نہ ہوں تو پھر وہ کاہے کو آدمی ٹھہرے؟

اس اقرار میں کہ محمد ﷺ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں، گویا اس بات کا اقرار ہے کہ اللہ کا جو حکم وہ لائے ہیں، اس کی اطاعت ساری امت پر واجب ہے نہ کسی اور کی، اس لیے کہ رسول کے سوا اور کوئی معصوم نہیں ہے جس کی بات واجب الاتباع سمجھی جائے۔ اب جو کوئی غیر کی اطاعت کرے گا اور اس کی نئی بات کو مانے گا تو گویا وہ محمد رسول اللہ ﷺ کا منکر ہے اور اس کی گواہی رسالت کی بابت بالکل جھوٹی ٹھہرے گی۔

اسی طرح جو آپ ﷺ کو رسول مانے اور شرع کا حکم نہ مانے یا بعض مانے اور بعض نہ مانے یا امام یا پیر کہیں تو مانے اور اگر قرآن وحدیث سے کوئی دوسرا عالم باللہ نکال کر بتائے تو نہ مانے تو وہ شخص بھی مسلمان نہیں ہے۔ جب اس کلمے کے معنیٰ سمجھ لیے تو اب باقی چار رکن کا مطلب اور ان کے بجالانے کی صورت رسالہ "بذل المنفعة" سے معلوم کرنا چاہیے۔[1]

ایمان کے شعبہ جات:

② حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«اَلْإِيْمَانُ بِضْعٌ وَّسَبْعُوْنَ شُعْبَةً، أَفْضَلُهَا قَوْلُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيْقِ، وَالْحَيَاءُ شُعْبَةٌ مِّنَ الْإِيْمَانِ»[2] اسے شیخین نے روایت کیا ہے۔

یعنی ایمان کی ستر (۷۰) سے اوپر کچھ راہیں ہیں۔ ان میں افضل کلمہ لا الہ الا اللہ کہنا ہے اور ان میں سے سب سے کم تر راستے سے تکلیف دہ چیز کا دور کرنا اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ ایمان قول وعمل دونوں سے عبارت ہے اور ایمان کی ایک شاخ خالق ومخلوق دونوں سے شرم کرنا ہے۔ بیہقی نے ایمان کے ان شعبہ جات کا بیان کتاب "شعب الایمان" میں کیا ہے اور ہم نے اپنے بعض رسائل میں ان کی گنتی لکھی ہے۔[3] اس جگہ فقط یہ بات بتانا مقصود ہے کہ کلمہ پڑھنا، شرم کرنا اور مخلوق کی ایذا کا روادار نہ ہونا ایمان کا مقتضا ہے۔ ایمان کی ستر (۷۰) شاخیں، اگرچہ شارع علیہ السلام کی طرف سے متعین ہو کر نہیں بتائی گئی ہیں، لیکن یہ احادیثِ صحیحہ سے ثابت

---

① یہ مولف رحمہ اللہ کا رسالہ ہے، جس کا نام "بذل المنفعة في إیضاح الأرکان الأربعة" ہے

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۹) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳۵)

③ دیکھیں: الروض الخضیب من تزکیة القلب المنیب (فصل اول)

ہیں۔ مسلمان کو لازم ہے کہ ان کا علم حاصل کر کے جہاں تک بن سکے، انھیں عمل میں لائے، معلوم نہیں کہ کون سا شعبہ نجات کا سبب ہو جائے؟ پھر جو کوئی جس قدر شعب کو بجا لائے گا، وہ اتنا ہی مغفرت و جنت کا استحقاق حاصل کرے گا، اب چاہے سب بجا لائے یا بعض، یہ اس کی ہمت ہے۔

محبتِ رسول ﷺ:

③ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے:

«لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتّٰى أَكُوْنَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ»[1]

[تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اس کے باپ اور بیٹے اور سارے لوگوں سے دوست تر ہوں] اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

یعنی جب کوئی آدمی رسول اللہ ﷺ کو جہاں بھر سے زیادہ چاہتا ہے، سب کی مرضی پر آپ ﷺ کی مرضی کو مقدم رکھتا ہے، آپ ﷺ کی حدیث کو سب کے قول سے بڑھ کر جانتا ہے اور کسی کی بات اور فعل کو آپ کی سنت پر مقدم نہیں رکھتا ہے، تب کہیں وہ مسلمان ٹھہرتا ہے، وگرنہ نہیں۔ محبت باتفاق اہلِ علم و معرفت اسی کا نام ہے کہ محبوب کی مرضی کے موافق سب کام کرے۔ اس کا نام محبت نہیں ہے کہ فقط زبان سے کہہ لیا کہ ہمیں محبت ہے اور ہم دل سے دوست دار ہیں، مگر محبوب کا کہا نہ مانا یا اس کی مرضی کے خلاف کام کیا۔

اس سے ثابت ہوا کہ اگر کسی فقیر، پیر، درویش، عالم، مولوی، ملا، ماں باپ، امیر، وزیر، رئیس اور بادشاہ کا کام یا قول یا حال حدیث کے خلاف معلوم ہو تو اس کو رد کر دے، پھر اگر کوئی اس کو مانے اور حدیث کو نہ مانے تو وہ مومن نہیں، کیونکہ حدیث میں اس شخص سے ایمان کی صریح نفی کی گئی ہے۔ جس کو آپ ﷺ کہیں کہ وہ بے ایمان ہے، اس کو کون کہہ سکتا ہے کہ وہ مسلمان ہے؟!

ایمان کی مٹھاس:

④ انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيْمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَأَنْ يُحِبَّ الْمَرْءَ لَا يُحِبُّهٗ إِلَّا لِلّٰهِ، وَأَنْ يَكْرَهَ أَنْ يَعُوْدَ فِيْ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٤٤)

الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقىٰ فِي النَّارِ»[1]

[جس میں یہ تین باتیں ہیں اس نے ایمان کا مزہ پایا ہے:

① اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس کو ان کے ماسوا سے سب سے زیادہ دوست ہوں۔

② آدمی جس کو دوست رکھے اس کو خالص اللہ کے لیے ہی دوست رکھے نہ کسی اور وجہ اور غرض سے۔

③ کفر سے رہائی پانے کے بعد پھر کفر میں جانے کو ایسا بُرا جانے جیسے آگ میں ڈالے جانے کو ناپسند کرتا ہے]

ہم نے اس حدیث کی شرح میں مستقل ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام "تقویة الإیقان"[2] ہے۔ اس لیے اس جگہ اس پر زیادہ کلام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت سارے جہاں سے زیادہ ہونی چاہیے۔ جس میں اس محبت کی زیادتی نہیں ہے، گو اسے کچھ محبت ہو تو وہ لذتِ ایمان سے بے نصیب ہے۔ اس محبت کی شناخت یوں ہوتی ہے کہ ایک طرف مثلاً اللہ یا رسول یا دونوں کا حکم ہو اور دوسری طرف نفس یا اہل یا مال یا دنیا یا اولاد یا والدین یا اقارب یا وطن یا احباب کی محبت مقابلہ کرے اور یہ شخص ان سب کی محبت پر خاک ڈال کر اس حکم کو نہایت بشاشت کے ساتھ مان لے اور کر گزرے تو جانو کہ وہ اللہ و رسول ﷺ کو سب سے زیادہ چاہتا ہے، لیکن اگر ان دونوں کے مقابلے میں دوسروں کی طرف رخ کیا تو سمجھو کہ احبیت سے اس کو بالکل اجنبیت ہے، خصوصاً جب اس کے دل میں اس ترجیح بلا مرجح کا کچھ دھڑکا بھی نہ ہو کہ اس وقت تو اصل محبت کے وجود میں بھی، اگرچہ قدر قلیل ہو، شک پڑتا ہے۔

اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مسلمان کی محبت کسی شخص کے ساتھ اللہ کے لیے ہوتی ہے نہ کہ قرابت یا دوستی یا کسی نفسانی غرض کے لیے۔ اگر یہ محبت اللہ کے لیے نہیں ہے، بلکہ کسی اور مطلب سے ہے تو اس محبت کا کچھ نفع نہیں ہے، بلکہ غیر اللہ کی یہ محبت آخرت میں وبال جان ہو جائے گی اور اگر اللہ کے لیے ہے تو پھر پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ عرش کے نیچے سایہ ملے گا اور نور کے منبر بیٹھنے کے لیے ہوں گے۔[3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۶۱) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۴۳)

[2] اس کا مکمل نام "تقویة الإیقان بشرح حدیث حلاوة الإیمان" ہے

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۳۹۰)

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کفر میں واپس جانے کی نفرت وکراہت حصول حلاوتِ ایمان پر دلیل ہے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو اس کا ایمان بدمزہ ہے اور اسلام تلخ کام۔

اسلام کا ذائقہ:

⑤ حدیثِ عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«ذَاقَ طَعْمَ الْإِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا، وَبِالْإِسْلَامِ دِيْناً، وَبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلاً»[1] (رواہ مسلم)

[جو شخص اس پر خوش ہوا کہ اللہ اس کا رب ہو اور اسلام اس کا دین اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پیغمبر تو اس نے ایمان کا مزہ پایا]

یہ مزہ جب ہی ملتا ہے کہ دل میں یہ بات خوب اچھی طرح سے جم جائے اور پھر نہ نکلے۔ جس کے دل میں یہ بات سما گئی اور اس کو اطمینان ہو گیا تو پھر وہ اللہ کے سوا کسی طرف رجوع کرے گا، کسی اور دین کو دینِ اسلام پر اختیار کرے گا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو واجب الاتباع جانے گا خواہ وہ کوئی امام ہو یا مجتہد، مولوی ہو یا فقیہ، پیر ہو یا فقیر، بلکہ وہ قرآن وحدیث ہی پر اقتصار کرے گا اور ہر امر میں، دینی ہو یا دنیاوی، عقیدے سے علاقہ رکھتا ہو یا حلال وحرام سے یا سلوک ومعرفت سے، وہ کتاب وسنت ہی پر دار ومدار رکھے گا، جس طرح ہمارے سلف صلحا کرتے تھے۔ پھر اس کو ہزار بہکاؤ وہ کسی کی راہ ورسم پر نہ چلے گا اور کسی کا حکم اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف نہ مانے گا، سو ایسا ہی شخص ایمانی لذت اٹھانے والا اور اسلامی حلاوت پانے والا ہوتا ہے۔ جو کوئی اس کے برخلاف ہے، وہ گویا سچے دل سے اللہ سے راضی ہے نہ اسلام سے خوش اور نہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے موافق ہے۔ ولا حول ولا قوۃ إلا باللہ.

اس کا اسلام گویا مکڑی کا جالا ہے۔ کیا کرے؟ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا ہے خود کو مسلمان نہ کہے تو پھر کہاں جائے؟ کوئی دوسرا دین بھی تو خاطر خواہ میسر نہیں آتا ہے!!

علاماتِ اسلام:

⑥ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٣٤)

«مَنْ صَلّٰی صَلَاتَنَا، وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَأَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذٰلِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِيْ لَهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهِ»[1]

[جس نے ہماری طرح نماز پڑھی اور ہمارے قبلے کی طرف منہ کیا اور ہمارا ذبح کیا ہوا کھایا تو وہ مسلمان ہے اور اللہ ورسول کے امان میں ہے]

یعنی اس کے عہد کو نہ توڑو۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔

نماز گویا اسلام کی وردی ہے کہ اس کے بغیر آدمی مسلمان معلوم نہیں ہوتا۔ ہماری نماز اس لیے کہا ہے کہ یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا اور نصاریٰ کے یہاں سجدہ نہیں ہے۔ وہ دونوں بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے ہیں اور ہماری نماز میں رکوع وسجدہ اور منہ کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس سے اس شخص کا محمدی ہونا نکلا۔ ذبیحہ کھانے سے ثابت ہوا کہ وہ سب مسلمانوں کو اپنا بھائی جانتا ہے اور اللہ ورسول کی امان میں ہونے سے اس کی جان ومال وآبرو کی حرمت ثابت ہوتی ہے۔

ہماری سی نماز کہنے سے وہ لوگ نکل گئے جو طریقہ مسنونہ صحیحہ کے خلاف نماز پڑھتے ہیں، جیسے شیعہ وغیرہ فرق مبتدعہ، اسی طرح وہ منافق جو ہمیشہ آخر وقت میں چار وناچار اٹھ کر ٹکریں لگاتے ہیں، اسی طرح وہ جو ارکانِ نماز میں تعدیل نہیں کرتے یا کسی کی ضد وبغض سے تارک سنن ہوتے ہیں، بہر حال اس حدیث میں بعض علاماتِ اسلام پر اطلاع دی ہے جو دین کے اصول ہیں۔ اس کے سوا اور بھی علامات ہیں۔

⑦ جیسے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعا کہا ہے:

«اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالْمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ»[2]

[مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان بچے رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگ اپنی جانوں اور مالوں میں امن سے ہوں]

اس کو ترمذی، نسائی اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۹۱)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۷۷۵) سنن النسائي الکبریٰ (۶/ ۵۳۰) شعب الإیمان للبیهقي (۱۱۱۲۳)

زبان سے سلامت رہنا یوں ہوتا ہے کہ اپنی زبان سے کسی مسلمان کی غیبت نہ کرے، چغلی نہ کھائے، استہزا وتحریہ نہ کرے، تہمت، بہتان وافترا نہ باندھے، گالی نہ دے، لعنت نہ کرے، طعن وتشنیع نہ فرمائے، کسی کے ساتھ جھگڑا نہ کھڑا کرے، کسی کا راز فاش نہ کرے، سخت، درشت نہ کہے، بددعا نہ دے، برا نام لے کر نہ پکارے، بات نہ کاٹے اور کسی کے حق میں جھوٹی گواہی نہ دے۔ ہاتھ سے سلامت رہنا یہ ہے کہ ناحق کسی کو نہ مارے، زخمی نہ کرے، قتل نہ کرے، کسی کا مال نہ لے، ہتھیار اٹھا کر نہ دھمکائے، کسی کے گھر میں آگ نہ لگائے، کسی کی اولاد کو نہ چرائے، کسی کی برائی، غیبت اور چغلی ہاتھ سے نہ لکھے، پھر جس کو لوگ اپنی جان ومال کا امین جانیں تو وہ مومن کامل ہے۔

⑧ اسی لیے دوسری روایتِ انس رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

''جس کو امانت کا پاس نہیں، اس کا ایمان نہیں اور جس کا قول مضبوط نہیں، اس کا دین نہیں۔''[1]

معلوم ہوا کہ امانت داری اور قول پروری ایمان کامل کی علامت ہے۔

⑨ ابو امامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ''جب تجھ کو اپنی نیکی اچھی لگے اور تجھ کو اپنی بدی بری لگے تو تو مومن ہے۔''[2] اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔

یعنی جب تک اچھا کام اچھا اور برا کام برا لگتا ہے، تب تک ایمان باقی ہے۔ جب اچھے برے کی تمییز نہ رہے تو پھر ایمان بھی نہیں ہے۔

⑩ عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا کہ اسلام کیا ہے؟ فرمایا: ''اچھی بات بولنا اور کھانا کھلانا۔'' پھر پوچھا: ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ''صبر وسماحت کا مظاہرہ کرنا۔'' اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[3]

اچھی بات میں نرمی کرنا، خوش خلقی سے پیش آنا اور السلام علیکم کرنا وغیرہ آ گیا اور صبر وسماحت میں مشکل عبادت سے دل نہ چرانا، مصیبت میں نہ گھبرانا، دینداری نہ چھوڑنا، زنا اور لواطت اور سحق سے بچنا، شبہات ومکروہات سے دور رہنا، غصہ روکنا، بڑے بڑے کاموں میں تنگ دل نہ ہونا،

---

[1] مسند أحمد (۳/۱۳۵)

[2] مسند أحمد (۵/۲۵)

[3] مسند أحمد (٤/ ۳۸۵)

امانت پناہ اور دیانت دستگاہ رہنا، لذاتِ فانیہ کا ترک کرنا وغیرہ داخل ہیں۔

⑪ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں دو چیزوں کو ''موجب'' فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ مشرک نار میں جائے گا، دوسرے یہ کہ غیر مشرک جنت میں داخل ہوگا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی جو شرک پر مرتا ہے، اس کے لیے دوزخ واجب ہو جاتی ہے اور توحید بہشت کو واجب کرتی ہے، گو عقاب کے بعد ہو۔

احیائے سنت کا ثواب اور ابتداع فی الدین کا عذاب:

⑫ حدیثِ بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«مَنْ أَحْيَا سُنَّةً مِّنْ سُنَّتِي قَدْ أُمِيْتَتْ بَعْدِي، فَإِنَّ لَهُ مِنَ الْأَجْرِ مِثْلَ أُجُوْرِ مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يُّنْقَصَ مِنْ أُجُوْرِهِمْ شَيْئاً، وَمَنِ ابْتَدَعَ بِدْعَةً ضَلَالَةً لَا يَرْضَاهَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلَ آثَامِ مَنْ عَمِلَ بِهَا، لَا يَنْقُصُ ذٰلِكَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئاً»[2] (رواه الترمذي)

[جس شخص نے میری سنتوں میں سے کوئی سنت زندہ کی جو میرے بعد متروک ہو چکی تھی تو اسے اس سنت پر عمل کرنے والوں کے برابر، ان کے اجروں کو کم کیے بغیر، اجر ملے گا اور جس نے کوئی گمراہ کن بدعت ایجاد کی جس پر اللہ اور اس کا رسول راضی نہ ہو تو اسے اس بدعت پر عمل کرنے والوں کے برابر، ان کے گناہ کم کیے بغیر، گناہ ملے گا]

اس حدیث میں دلیل ہے کہ سنت زندہ کرنے کا بہت بڑا اجر ہے، جس طرح بدعت جاری کرنے کا بہت بڑا گناہ ہے۔ یہ سنت کو زندہ کرنا ایمان کامل کی علامت ہے۔ مطلب یہ ٹھہرا کہ جو شخص کسی سنت کو رائج کرتا ہے جو مٹ گئی تھی اور لوگ اس سنت پر چلتے ہیں تو جتنا ثواب ان عمل کرنے والوں کو ہوتا ہے، اتنا ہی ثواب اس سنت کے جاری کرنے والے کو ہوتا ہے اور اس سے عامل کا ثواب کم نہیں ہوتا، بلکہ اللہ الگ الگ ہر ایک کو مکمل ثواب دیتا ہے، پھر جب تک جتنے آدمی اس پر عمل کرتے جائیں گے، اتنا ہی ثواب اس کو زیادہ ہوتا جائے گا، اسی طرح جو شخص مٹی ہوئی بدعت کو پھر

[1] صحیح مسلم (۱/ ٦٥)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٨٣٠)

جاری وشائع کرتا ہے یا کوئی نئی بدعت خود نکالتا ہے اور لوگ اس کے موافق عمل کرتے ہیں تو جتنا اس بدعت کرنے والے کو گناہ ہوگا، اتنا ہی اس بدعت کو جاری کرنے والے کو گناہ ہوتا جائے گا، پھر جس قدر لوگ اس بدعت پر عمل کرتے جائیں گے، اسی قدر اس مروجِ بدعت کو گناہ ہوتا جائے گا، مثلاً جس قدر تراویح پڑھنے والوں کو ثواب ملے گا، اسی قدر اکیلے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو ثواب ملے گا یا جس قدر تعزیہ داروں کو ہر سال گناہ بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی گناہ اس پر ہے جس نے سب سے پہلے محرم کی تعزیہ داری نکالی تھی۔

اللہ تعالیٰ کے لیے محبت وعداوت کا مقام:

⑬ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ افضل ایمان کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ تو کسی کو اللہ کے واسطے محبوب رکھے اور کسی سے اللہ کے واسطے بغض رکھے اور تو اپنی زبان کو اللہ کے ذکر میں لگائے رکھے۔'' پوچھا: یہ کس طرح ہوتا ہے؟ فرمایا: ''جو چیز اپنے لیے اچھی جانے وہی لوگوں کے لیے اچھی جانے اور جو چیز اپنے لیے بری جانے وہی اوروں کے لیے بھی بری جانے۔'' اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[1]

اللہ کے لیے حب وبغض یوں ہوتا ہے کہ صحابہ واہلِ بیت اور سارے سلف صلحا اور دیندار علما اور تقویٰ شعار مشائخ کو دل سے دوست رکھے، اس لیے کہ وہ اللہ کے نیک بندے اور اس کے دین کے پہچاننے والے اور مددگار تھے اور اہلِ بدعت وفسق کو تہِ دل سے دشمن رکھے، کیونکہ وہ اللہ کے نافرمان اور دین میں ضعف وغربت لانے والے ہیں۔ یہ معاملہ تو خلق کے ساتھ ہوا اور اپنا برتاؤ خالق کے ساتھ یوں رکھے کہ اس کی زبان ذکرِ خدا سے ہر دم تر وتازہ رہے۔ ذکر سے بڑھ کر کوئی شے اللہ کے عذاب سے نجات دینے والی نہیں ہے جس طرح کہ حدیث میں آیا ہے۔[2]

⑭ ابوامامہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں:

«مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيْمَانَ»[3]

اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔

---

① مسند أحمد، رقم الحديث (٢١١١٣)

② دیکھیں: مسند أحمد (٥/ ٢٣٩) مصنف ابن أبي شيبة (١٠/ ٣٠٠) المعجم الكبير للطبراني (٢٠/ ١٦٦) صحيح الترغيب (٢/ ٩٦)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٨١)

یعنی جس نے کسی کو اللہ کے لیے دوست رکھا اور اللہ کے لیے دشمن رکھا اور اللہ کے لیے دیا اور اللہ کے لیے نہ دیا تو اس نے ایمان پورا کر لیا۔

جو کوئی کسی کو دوست رکھتا ہے تو کسی سبب سے رکھتا ہے، مثلاً باپ سے محبت اس لیے ہوتی ہے کہ اس نے پرورش کی اور استاذ سے اس لیے کہ انھوں نے راہِ نیک بتائی اور حاکم وبادشاہ سے اس لیے کہ ان کی حمایت ورعایت میں یہ شخص زندگی بسر کرتا ہے اور کسی سے اس لیے کہ وہ سخی ہے اور کسی سے اس لیے کہ اس کی صورت اچھی ہے اور کسی سے اس لیے کہ وہ دوست کا دوست یا دوست کے دشمن کا دشمن ہے، اسی طرح دشمنی کے اسباب ہوتے ہیں اور ایسے ہی کسی کو دینا یا نہ دینا کسی سبب سے ہوتا ہے۔

پھر بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ نے ان سے محبت رکھنے کا حکم دیا ہے، جیسے پیغمبر، اصحاب، اہلِ بیت، شہدا، دین دار علما، سارے مسلمان، فرشتے، اور بعض وہ ہیں جن سے بغض وعداوت رکھنے کا حکم دیا ہے یا وہ اللہ کی درگاہ سے راندے گئے ہیں، جیسے شیاطین انس وجن، سارے کفار، فساق اور اہلِ بدعت، تو جو شخص ایسا ہو کہ جس سے اللہ نے محبت رکھنے کا حکم دیا ہے، اس سے محبت رکھے اللہ کا مقبول سمجھ کر اور جس سے دشمنی رکھے تو بھی اسی سبب سے کہ یہ اللہ کے خلافِ مرضی کام کرتا ہے یا ضلالت کا سبب ہے، پھر دے تو ایسی ہی جگہ دے کہ جہاں اللہ نے دینے کا حکم دیا ہے اور نہ دے تو اسی سبب سے کہ اللہ نے اس جگہ دینے سے منع فرمایا ہے، تو ایسا شخص کامل الایمان ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے حب وبغض اور سخاوت وبخل کو خدا کی مرضی کے تابع رکھے، یہ نہ کرے کہ اپنی مرضی وغرض اور حمیت ومطلب دنیاوی کو مقدم کرے، کیوں کہ اس میں ایمان برباد ہو جاتا ہے اور اسی جگہ مسلمان کا امتحان ہوتا ہے کہ اگر شارع کی مرضی پر چلا تو کامل الایمان ہے ورنہ ناقص الایمان ہے۔ غربتِ اسلام کا ایک بڑا سبب اس زمانہ آخر میں یہی ہے کہ اس عمدہ قانون کی پیروی ترک ہو گئی ہے اور حب وبغض اور عطا ومنع ہر شخص کی اپنی مرضی پر موقوف ہو کر رہ گیا ہے۔

باب سوم

ایمان بالقدر کا بیان

اللہ تعالیٰ کے حکم اور اندازہ کرنے کو قضا وقدر کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ساری خلق کو پیدا کرنے سے پہلے ہر مخلوق کا اندازہ کر کے حکم لگا دیا کہ فلاں چیز ایسی ہو گی، فلاں شخص یہ کام کرے گا اور اس کا آغاز وانجام یوں ہو گا۔ جاندار چیز جو ارادہ کرتی ہے، وہ بھی اللہ ہی پیدا کرتا ہے اور ہر بے جان چیز کا خالق بھی وہی ہے۔ اس بات کو ماننے اور اس پر یقین لانے کو ''ایمان بالقدر'' کہتے ہیں۔

پھر جو شخص اس کے برخلاف جانے کہ بندہ اپنا کام آپ پیدا کرتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے وہ خود کرتا ہے یا کوئی کام اللہ کے ارادے کے خلاف کرتا ہے یا فلاں بات جو دنیا میں ہوئی اس کا حال پہلے اللہ کو معلوم نہ تھا، ایسے شخص کو ''قدریہ'' کہتے ہیں، یعنی وہ تقدیر کا منکر ہے، جو بندے میں خالقیت کی صفت بتاتا ہے، اسے اپنی تدبیر سمجھتا ہے اور تقدیر کو کوئی شے نہیں جانتا۔ اسی طرح جو شخص یہ بات جانے کہ آدمی کو اپنے کام کا مطلقاً کچھ ذرا بھی اختیار نہیں ہے، جو کچھ اس سے ہوتا ہے، نیک یا بد، وہ سب اللہ ہی کرتا ہے، بندہ اور ہر جاندار مجبور محض اور بے اختیار صرف ہے، یہاں تک کہ کفر اور گناہ بھی اللہ ہی کراتا ہے، ایسے شخص کو ''جبریہ'' کہتے ہیں، یعنی جبر کا معتقد ہے۔ یہ دونوں عقیدے غلط ہیں، بلکہ آدمی فی الجملہ اختیار رکھتا ہے، جس کے سبب سے بعض کام کرنا اور بعض نہ کرنا اس سے ظاہر ہوتا ہے۔

آدمی کے چلنے اور پتھر کے حرکت کرنے میں فرق ظاہر ہے کہ آدمی خود چل سکتا ہے اور ٹھہر سکتا ہے اور پتھر نہ خود چل سکے، نہ ٹھہر سکے، اسی طرح خود بہ خود ہاتھ ہلانے والے اور جس کے ہاتھ میں رعشہ ہے، دونوں میں تفاوت واضح ہے کہ رعشے والا اپنا ہاتھ ہلنے سے تھام نہیں سکتا اور دوسرا تھام سکتا ہے، اسی جگہ سے اور اسی ارادے کی بنا پر اللہ نے امر و نہی فرمائی، نیکی پر اجر، بدی پر سزا مقرر کی۔ اگر اتنا سا اختیار بھی نہ ہوتا تو دنیا میں چور اور خونی کی سزا کیوں مقرر ہوتی؟ اللہ کی طرف سے پیغمبر کیوں آتے؟ قرآن کیوں اترتا اور شرع کیوں معین ہوتی؟ سب کو مجبور سمجھ کر معذور کہا جاتا۔ یقیناً ہر کام اللہ

کے ارادے سے ہوتا ہے، لیکن ارادہ اور چیز ہے اور رضا اور چیز۔ پہلے سے بندے کے نصیب میں ہر کام کا لکھ دینا اور چیز ہے، اس لکھنے اور چاہنے سے اللہ کی کوئی رضامندی ثابت نہیں ہوتی ہے۔ اللہ نے نیکی کا حکم دیا ہے اور بدی سے منع کیا ہے، بکری کھانے کی اجازت دی ہے اور سور کھانے سے نہی فرمائی ہے۔ اب اگر کوئی سور کھائے تو اللہ پر کیا الزام؟ بلکہ کھانے والے کا قصور ہے۔ اس لیے کہ اللہ نے اس کو بچنے کا بھی اختیار دیا تھا، یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص خواب میں ہو اور اس کے منہ میں کوئی حرام چیز ڈال دے تو بلا شبہہ وہ بے قصور اور مجبور ہوگا، اللہ نے بھی مجبور، بے ہوش، سوئے ہوئے اور دیوانے پر حکم جاری نہیں کیا ہے۔

تقدیر کا بھید کوئی نہیں سمجھ سکتا، بلکہ ہمیں اس کو دریافت کرنے کا بھی حکم نہیں دیا ہے اور اگر فرضاً کوئی دریافت بھی کر لے تو اس میں دنیا و دین کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ بہشت میں جانا یا دوزخ سے بچنا اس کے دریافت کرنے پر موقوف نہیں ہے، بلکہ ہمیں تو اس گفتگو ہی سے منع فرمایا ہے، پھر اس میں بحث وخوض کرنا حماقت وضلالت کے سوا اور کیا ہے۔ قضا وقدر کا قرآن و حدیث میں جتنا ذکر آیا ہے، اس پر ایمان لا کر چپ رہے، کچھ چون و چرا نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ﴾ [القمر: ٤٩]

[یعنی ہم نے ہر چیز اندازے سے بنائی ہے]

حکیم جب کام کرتا ہے تو پہلے سے اس کا انجام سوچ لیتا ہے اور اول سے اپنے ذہن میں مالہ وماعلیہ ٹھہرا لیتا ہے۔ سو اللہ سب حکیموں کا حکیم اور سب داناؤں کا دانا ہے۔ اس نے آسمان و زمین کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے سب خلائق کے مقادیر کو لکھ رکھا ہے۔ جیسا کہ امام مسلم نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً روایت کیا ہے۔[1]

اب اسی تقدیر کے موافق ہر ایک چیز اپنے اپنے وقت پر ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اسی بنیاد پر مسلمان کو یہ چاہیے کہ اگر کسی سے کچھ نقصان وضرر پہنچے تو اس کا گلہ شکوہ نہ کرے۔ یہ جانے کہ اللہ نے پہلے ہی سے یہ بات مقدر کی تھی اور اس میں کچھ حکمت ہے جو میرے خیال میں نہیں آتی۔ اگر کسی سے کچھ فائدہ پہنچے تو اللہ کا شکر اصالتاً اور محسن کا شکر تبعاً بجا لائے کہ اس نے میری ولادت سے پہلے یہ

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٣)

فائدہ مقرر کیا تھا۔ اسی طرح اگر کسی کی صورت بری ہو تو اس پر مضحکہ نہ کرے، کیونکہ اس شخص کا کوئی قصور نہیں ہے، اللہ نے جیسا چاہا ویسا بنایا، پھر اس پر ہنسنا اور طعن کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کریہہ المنظر شخص کو دیکھ کر کہتے کہ اس کا خالق اور ابو الدرداء دونوں کا خالق ایک ہے۔ آدمی کے سارے اعمال کا خالق اللہ ہے نہ کہ آدمی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ [الصافات: ٩٦]

[حالانکہ تمھیں اور تمھاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے]

وہ اگر پیدا نہ کرے اور روک لے تو کسی بندے کی یہ مجال نہیں کہ اس کام کو کر سکے۔ آدمی بہت کام کرنا چاہتا ہے، مگر نہیں ہو سکتے اور بعض کام کرنا نہیں چاہتا اور وہ بے اختیاری میں ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اعمال کا خالق اللہ ہے نہ کہ بندے، اب اس کے ہاتھ سے جو کام اچھا بن پڑے یا اور کسی سے اس کے حق میں کچھ سلوک ہو تو اللہ کا شکر ادا کرے، باوجود یکہ خالقِ فعل وہ تھا لیکن ہم کو جزائے خیر کا وعدہ دیا، یہ اس کا سراسر احسان ہے۔ جب سب کا خالق اللہ ٹھہرا تو پھر کسی کے حرکات وسکنات پر ہنسنا اور عیب پکڑنا اللہ کے ساتھ سخت بے ادبی ہے۔ پیدا کرنا اور بات ہے اور بندے کا کاسب ہونا اور بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ قَلْبِهٖ﴾ [الأنفال: ٢٤]

[اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو]

معلوم ہوا کہ آدمی کا چاہا اللہ کے چاہے کے مقابلے میں نہیں چل سکتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [التكوير: ٢٩]

[تم جب ہی چاہو کہ اللہ چاہے جو سارے جہان کا رب ہے]

یعنی دل میں ارادہ ڈالنا بھی اسی کا کام ہے، کچھ اپنے بس کی بات نہیں ہے تو اب اسی اکیلے پر بھروسا کرنا چاہیے، اپنی ناقص عقل کو دخل نہ دے، ورنہ ایمان جاتا رہے گا۔

ایمان بالقدر کی اہمیت:

① حدیثِ علی مرتضی رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ کوئی بندہ مومن نہیں ہوتا ہے جب تک کہ چار چیزوں پر ایمان نہ لائے۔ اس بات کی گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، میں اس کا رسول

ہوں اور اس نے مجھ کو سچ مچ بھیجا ہے، مرنے پر ایمان لائے، مرنے کے بعد اُٹھنے پر اور قدر (تقدیر) پر ایمان لائے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ تقدیر کا منکر کافر ہوتا ہے، مومن نہیں، گو اپنے منہ سے ایمان کا دعویٰ کرے۔

② ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت میں مرفوعاً مروی ہے:

''میری امت میں دو قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ ان کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں ہے۔ ایک مرجیہ، دوسرے قدریہ۔'' اس کو بھی ترمذی نے روایت کیا ہے۔[2]

اس جگہ مرجیہ سے مراد جبریہ ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کام ہم سے ہوتے ہیں، ان کی آخرت میں پرسش نہ ہوگی اور اگر ہوئی تب بھی بخشے جائیں گے۔

③ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں خبر دی گئی ہے کہ اس امت میں خسف و مسخ ان میں ہوگا جو تقدیر کو جھٹلاتے ہیں۔ اس کو ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔[3]

خسف کہتے ہیں زمین میں دھنسنے کو اور مسخ صورت بدل جانے کو کہتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ قدریہ اس کا نام ہے جو تقدیر کا انکار کرے۔

④ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا:

''قدریہ اس امت کے مجوس ہیں۔ اگر وہ بیمار ہوں تو ان کی عیادت نہ کرو اور اگر مر جائیں تو ان کے جنازے پر حاضر نہ ہوں۔'' اس کو احمد اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔[4]

یہ حدیث قدر کے منکرین و مکذبین کے کفر پر دلیلِ صریح اور نصِ قطعی ہے۔ اس لیے کہ مجوس کافر تھے، جب ان کو مجوس ٹھہرایا تو وہ بھی ان کی طرح کافر ہوئے، بلکہ یہ تو مجوس سے بھی بدتر ہیں، اس لیے کہ مجوس دو خدا کے قائل ہیں اور یہ بے گنتی خدا ثابت کرتے ہیں، کیونکہ ہر بندے کو اس کے عمل کا خالق بتاتے ہیں اور بندے بے شمار ہیں۔

⑤ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم اہلِ قدر کے پاس مت بیٹھو اور ان سے سلام و کلام

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٤٦) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٣) سنن ابن ماجه (٧٣) اس کی سند میں ''علی بن نزار'' راوی ضعیف ہے۔

[3] مسند أحمد (٢/ ١٠٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦١٣) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٧)

[4] مسند أحمد (٢/ ٨٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩١)

شروع نہ کرو۔ اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[1]

اس حدیث سے بھی قدریہ کا کفر نکلتا ہے، اسی لیے ان کے ساتھ کفار جیسا معاملہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، بلکہ یہ تو کافروں سے بھی بدتر ہیں، اس لیے کہ صریح کافر کو ہر مسلمان کافر جانتا ہے اور اس کی بات نہیں مانتا، جبکہ قدری اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے اور بعض آیات اور احادیث واقوال واشعار کے معنی اپنے مذاق پر لگا کر جاہلوں کو گمراہ کرتا اور دھوکا دیتا ہے تو ایسے شخص سے ترکِ راہ و رسم، ملاقات کرنا چھوڑنا اور جدا رہنا بہتر ہے، تاکہ وہ لوگوں کو گمراہ نہ کرے اور شاید اپنے عقیدے کو برا سمجھ کر چھوڑ دے۔ یہ قدریہ کا فرقہ زمانہ صحابہ سے نکلا ہے اور سلف نے بھی ان پر بہت کچھ لے دے کی تھی، پھر وہ لوگ ختم ہو گئے تھے، لیکن اس زمانے میں پھر اس مذہب کے لوگ ہر جگہ، ہر ملک اور ہر شہر میں زیادہ ہو گئے ہیں جو خود کو مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان کے دین میں فساد ڈال کر اس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا نام دہریہ، نیچریہ اور طبیعیہ بھی ہے۔

⑥ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں چھ شخصوں کو ملعون فرمایا ہے، ان میں ایک مکذب بالقدر اور دوسرا سنت کا تارک ہے۔ اس کو رزین اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔[2]

"تذکیر الإخوان"[3] میں کہا ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی سنت کو بے عذر شرعی ترک کر دے تو اس کو آپ ﷺ پر ایمان نہیں اور جو شخص تقدیر کے برحق ہونے کا انکار کر دے اور تقدیر کے قائل کو جھٹلائے تو وہ ملعون ہے۔[4]

معلوم ہوا کہ تقدیر کے منکر اور سنت کے تارک پر اللہ کی طرف سے لعنت اور پھٹکار پڑتی ہے۔

⑦ حدیثِ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ اگر اللہ سارے آسمانوں اور زمین والوں کو عذاب کرے تو بھی وہ ظالم نہ ہوگا اور اگر ان سب پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے واسطے ان کے اعمال سے بہتر ہے۔ اگر تو احد پہاڑ کے برابر اللہ کی راہ میں سونا خرچ کرے گا تب بھی اللہ اس کو قبول نہ فرمائے گا یہاں تک کہ تو قدر پر ایمان لائے اور یہ بات جانے کہ جو کچھ تجھ کو

[1] مسند أحمد (۱/ ۳۰) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧١٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٥) شعب الإيمان للبيهقي (٣٧٢٢)

[3] تذكير الإخوان (ص: ٦٠)

[4] مسند أحمد (٥/ ١٧٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٧)

پہنچا وہ تجھ سے چوکنے والا نہ تھا اور جو تجھ سے چوک گیا وہ تجھ کو پہنچنے والا نہ تھا اور اگر تو اس کے خلاف پر مرا تو پھر تو جہنم میں جائے گا۔[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ آدمی کو جو رنج و تکلیف، راحت و جراحت، خوشی و غم، صحت و مرض، فتح و شکست اور مفلسی و امیری پہنچتی ہے، وہ سب تقدیر کے لکھے ہوئے کے موافق پہنچتی ہے اور کسی طرح نہیں ٹلتی۔ اگر ساری مخلوق چاہے کہ نہ پہنچے تو ممکن نہیں کہ نہ پہنچے اور اگر سب لوگ یہ چاہیں کہ پہنچے تو ممکن نہیں کہ پہنچے۔ اب جو کوئی اس کے خلاف سمجھے کہ فلاں سبب سے تقدیر پلٹ گئی اور تقدیر کا لکھا مٹ گیا اور تدبیر چل گئی، پھر وہ شخص بے توبہ مر جائے تو دوزخی ہوگا اور اس کی کوئی نیکی صدقہ، خیرات، نماز، روزہ، زکات اور حج قبول نہ ہوگا، کیونکہ اس نے اللہ کی تقدیر کا انکار کیا ہے۔ وہ مالک الملک شہنشاہ ہے، جیسا اس نے چاہا، ویسا ہر ایک کی قسمت میں آسمان و زمین کی پیدائش سے پچاس ہزار برس پہلے لکھ دیا۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ اگر سارے ملائکہ اور بنی آدم کو دوزخ میں بھیج دے تو بھی وہ ظالم نہ ٹھہرے، کیونکہ ساری مخلوق اس کی ملک و عبید ہے اور اگر سب کو بخش دے تو یہ اس کی مہربانی ہے، کسی کا اس پر کوئی حق نہیں ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ إِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدة: ١١٨]

[اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو ان کو بخش دے تو تو زبردست ہے حکمت والا ہے]

مسئلہ تقدیر میں جھگڑا کرنے کی ممانعت:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور ہم قدر کے بارے میں جھگڑ رہے تھے، آپ ایسا خفا ہوئے کہ چہرہ لال ہوگیا، گویا اس پر انار نچوڑ دیا گیا ہے، پھر فرمایا:

« أَبِهٰذَا أُمِرْتُمْ؟ أَمْ بِهٰذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ؟ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِيْنَ تَنَازَعُوْا فِيْ الْأَمْرِ، عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَنْ لَّا تَتَنَازَعُوْا فِيْهِ »[2]

اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٩٩)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٣٣)

یعنی کیا تم کو اسی بات کا حکم ہوا ہے؟ یا کیا میں اسی لیے تمھارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ تم سے اگلے لوگ یوں ہی تو برباد ہوئے کہ انھوں نے تقدیر میں نزاع کیا۔ میں تم کو تاکید کرتا ہوں کہ تم اس مسئلے میں بحث نہ کرو۔

اللہ نے جو باتیں بندوں کے لائق تھیں وہ بتا دیں اور جس میں دنیا و دین کا کچھ فائدہ نہ تھا، اس کو بیان نہ کیا یا جو ان کی سمجھ سے باہر بات تھی وہ نہ کہی، تاکہ لوگ لایعنی امور میں مشغول نہ ہوں، جیسے یہ بیان نہ کیا کہ چاند سورج کس چیز سے بنے ہیں؟ عرش کس چیز سے ہے؟ آگ و پانی کس شے سے اور ان کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ ان باتوں کے دریافت ہونے اور نہ ہونے سے کچھ نفع و نقصان نہیں ہے، یا شرع میں وحدتِ وجود، وحدتِ شہود اور اللہ کی ذات و آیات، متشابہات کی تاویل اور ہر عبادت کی خاص وضع کا بھید نہ بتایا، کیونکہ یہ باتیں اکثر آدمیوں کی عقل سے زیادہ ہیں۔ کوئی مطلق انکار کرے گا اور کوئی زیادتی کمی کرے گا تو دونوں گمراہ ہوں گے، چنانچہ اگلی امتوں کے لوگ ایسے گُن تاروں میں پڑ کر گمراہ ہو گئے، ویسا ہی جبر و قدر کا مسئلہ ہے کہ اس میں بحث و خوض کرنا درست نہیں، کیونکہ یہ آدمی کی عقل سے باہر ہے۔ کئی جاہل آدمی اس سے گمراہ ہو جائیں گے، اور ایسا ہی ہوا بھی ہے۔

⑨ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں فرمایا ہے:

«مَنْ تَكَلَّمَ فِيْ شَيْئٌ مِنَ الْقَدْرِ سُئِلَ عَنْهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، وَمَنْ لَّمْ يَتَكَلَّمْ فِيْهِ لَمْ يُسْئَلْ عَنْهُ»[1] (رواه ابن ماجه)

یعنی جس نے قدر کے بارے میں کچھ گفتگو کی، اس سے قیامت کے دن یہ محاسبہ ہوگا کہ تو نے اس مسئلے میں کیوں گفتگو کی اور جو اس کے متعلق بات نہیں کرے گا، اس کی کچھ باز پُرس نہ ہوگی۔

تقدیر پوری ہو کر رہتی ہے:

معلوم ہوا کہ ہمیں اس بحث سے منع کیا گیا ہے اور کیوں نہ ہو کہ یہ ہمارا خوض ایسے کام میں ہے جو مدت دراز سے طے ہو چکا ہے۔

⑩ حدیثِ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ سب سے پہلے اللہ نے قلم کو پیدا کیا اور کہا کہ لکھ۔ اس نے کہا: کیا لکھوں؟ فرمایا: قدر۔ اس نے جو کچھ ہوا اور ابد تک ہوگا، وہ سب لکھا۔

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٨٤)

اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

⑪ حدیثِ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ایک مُشتِ خاک سے بنایا جو ساری زمین سے لی تھی، سو ان کی اولاد اسی زمین کے انداز پر آئی۔[2]

کوئی لال، کوئی ہرا، کوئی کالا، کوئی اس کے درمیان، کوئی نرم، کوئی کڑا، کوئی ناپاک، کوئی ستھرا، یعنی رنگ وعادت میں آدمیوں کا تفاوت اسی اللہ کی تقدیر سے ٹھہرا۔

⑫ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا کہ اللہ نے خلق کو اندھیرے میں بنایا، پھر اس پر اپنا نور ڈالا، تو جس کو وہ نور پہنچا، اس نے سیدھی راہ پائی اور جس کو نہ پہنچا وہ گمراہ ہوا، اسی لیے میں یہ کہتا ہوں کہ قلم اللہ کے علم پر خشک ہو گئے۔[3]

یعنی جو کچھ اس کو لکھنا تھا وہ بموجب حکم خدا لکھ چکے، اب کچھ نہیں لکھتے۔ اسلام اللہ کا نور ہے، ازل میں جس پر چمکا، وہ مسلمان ہوا اور جس پر نہ چمکا وہ کافر رہا۔

⑬ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ اپنی مخلوق میں ہر بندے کی پانچ چیزوں سے فارغ ہو چکا ہے۔ اس کے اجل سے، اس کے عمل سے، اس کے رہنے کی جگہ سے، اس کی چال سے اور اس کے رزق سے۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[4]

یعنی فلاں روز، فلاں وقت، فلاں جگہ اس طور پر مرے گا اور زندگی میں فلاں فلاں کام کاج کرے گا۔ فلاں فلاں جگہ رہے گا اور فلاں چال ڈھال اختیار کرے گا، اس کو اتنا رزق ملے گا اور اتنا کھائے گا، سو یہ پانچوں باتیں جس طرح اللہ نے پہلے سے ٹھہرا دی ہیں ویسا ہی ہوتا ہے، اس سے کم وبیش نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ آدمی توکل پر رہے، نری تدبیر پر نہ جم جائے اور دنیا داری میں زیادہ دردسری نہ کرے۔ جو قسمت کا لکھا ہے، وہ آگے ہی مقرر ہو چکا ہے، اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔

تقدیر کا فیصلہ:

⑭ حدیثِ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

---

[1] مسند أحمد (٥/٣١٧) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٧٠٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٥٨)

[2] مسند أحمد (٢/١٧٦) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٢٦٩٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤٤)

[4] مسند أحمد (٥/١٩٧)

''جب اللہ نے آدم علیہ السلام کو بنایا تو ان کے داہنے کندھے پر مار کر ان کی سفید اولاد چیونٹیوں کی طرح نکالی اور بائیں کندھے پر مار کر کالی اولاد کوئلے کے مثل نکالی، پھر داہنی طرف کی اولاد کو کہا کہ یہ جنت میں جائے گی اور مجھے کچھ پروا نہیں، پھر بائیں طرف کی اولاد کو کہا کہ یہ دوزخ میں جائے گی اور مجھے کچھ پروا نہیں۔'' اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کے وقت ہی بہشتی اور دوزخی ٹھہرا کر کہہ دیا تھا:

« لا أبالي » یعنی میں مالک ہوں، جو چاہوں سو کروں۔

⑮ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں فرمایا ہے:

''اللہ نے جنت کے لیے کچھ لوگ بنائے جو اپنے باپوں کی پشت میں تھے اور کچھ لوگ دوزخ کے لیے بنائے جو اپنے باپوں کی پیٹھ میں تھے۔''

اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی دنیا میں پیدا ہونے سے پہلے جس کو جس لائق سمجھا ویسا ہی ٹھہرا دیا۔ اب اسی کے موافق ہوتا ہے۔ بہشتی سے اچھے کام اور دوزخی سے برے عمل ظہور میں آتے ہیں، اب دنیا میں جنتی اور ناری کی شناخت یہی ہے، وللہ الحمد.

پیدائش کا مرحلہ اور تقدیر:

⑯ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور وہ سچے سچائے تھے کہ ہر کسی کی خلقت اس کی ماں کے پیٹ میں اکٹھی کی جاتی ہے۔ چالیس دن تک نطفہ رہتا ہے، پھر چالیس دن تک خون بستہ، پھر اتنے ہی دن لوتھڑا، پھر اس کے پاس چار چیزوں کے ساتھ ایک فرشتہ آتا ہے، جو اس کا عمل واجل، اس کا رزق اور یہ کہ وہ بدبخت ہے یا نیک بخت، لکھ دیتا ہے، پھر اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔ سو قسم ہے اس کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ بے شک تم میں کوئی اہلِ جنت کا کام کیے جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور بہشت کے درمیان ایک ہاتھ کا فرق رہ جاتا ہے، پھر اس پر کتاب سبقت کرتی ہے تو وہ اہلِ نار سا کام کرنے لگتا ہے، پھر آگ میں جاتا ہے اور تم میں کوئی اہلِ نار کا کام کیے جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اور دوزخ کے درمیان فرق نہیں

---

[1] مسند أحمد (٦/٤٤١)

[2] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٦٢)

رہتا، مگر ایک ہاتھ کا، پھر اس پر کتاب بڑھ جاتی ہے سو اہلِ جنت کا کام کرنے لگتا ہے، پھر جنت میں جاتا ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ ہر بشر ایک سو بیس [۱۲۰] دن میں ماں کے پیٹ میں بن کر درست ہو جاتا ہے اور فرشتہ اس کی ہر چہار حالت لکھ جاتا ہے اور اسی کے موافق وہ دنیا میں ہوتا ہے، پھر اگر اس کی قسمت میں دوزخ لکھی ہے تو گو دنیا میں پہلے بہشتیوں کا کام کرتا ہے، یہاں تک کہ جنت کے لگ بھگ ہو جاتا ہے، پھر یکایک تقدیر کا لکھا زور مارتا ہے تو انجام کار وہ دوزخیوں کے کام کرتے کرتے مر جاتا ہے اور دوزخ کا کندہ ہوتا ہے۔

اسی طرح جس کا انجام بہشت ہے، وہ اگرچہ اتنے برے کام کرتا ہے کہ دوزخ سے نزدیک ہو جاتا ہے، لیکن پھر تقدیر کا لکھا زور مارتا ہے تو بہشتیوں کے کام کرتے کرتے مر جاتا ہے، پھر بہشت میں جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ شقاوت وسعادت کا اعتبار خاتمے پر ہے جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ﴾[2] [عملوں کا دار ومدار خاتموں پر ہوتا ہے]

آدمی اپنی عقل اور فعل وعمل پر مغرور ومعتمد نہ ہو، بلکہ اللہ ہی کے فضل وکرم پر بھروسا رکھے اور خاتمے سے ڈرتا رہے، اگر خاتمہ اچھا ہوا تو اچھا ہے اور اگر برا ہوا تو برا ہے۔

حکم مستوری ومستی ہمہ بر خاتمت ست
کس ندانست کہ آخر بچہ حالت گزرد

[ظاہر اور پوشیدہ تمام کا فیصلہ خاتمے پر ہوتا ہے، کوئی نہیں جان سکا کہ آخر وہ کس حالت سے گزرے گا]

ہم اللہ تعالیٰ سے بہ صد عاجزی وندامت بھیک مانگتے ہیں کہ ہمارا خاتمہ ایمان پر کرے اور ہمارا انجام عملِ اہلِ جنت پر ہو اور یہ اللہ پر کوئی دشوار نہیں ہے۔

پانچ باتیں:

⑰ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا اور پانچ باتیں بتائیں۔ ایک یہ کہ اللہ سوتا نہیں ہے اور اس کو یہی چاہیے کہ نہ سوئے۔ ترازو کو اونچا اور نیچا کرتا ہے۔ رات کا

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٣)

② صحيح ابن حبان (١٨١٨)

کام دن کے کام سے پہلے اور دن کا کام رات کے کام سے پہلے اس کے پاس پہنچ جاتا ہے۔ اس کا پردہ نور ہے، اگر اس کو اٹھا دے تو اس کی ذات کا نور جہاں تک اس کی نگاہ پہنچے خلق کو جلا دے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ کیا وہی ہوا اور ہوگا اور جو ہوتا ہے، سب پہلے سے تقدیر میں لکھ دیا ہے، پھر بھی اللہ غافل نہیں، اس کو اب بھی اختیار ہے۔ جو چاہے سو کرے، قسمت کا ترازو اس کے ہاتھ میں ہے، جس کا چاہتا ہے پلڑا اونچا کرتا ہے، جس کا چاہتا ہے نیچا کرتا ہے اور ہر ایک کام کی خبر رکھتا ہے۔ آگے سے پھر ویسا ہی ہوتا ہے۔ پاک ہے اللہ کی ذات اور اسی کے لیے تعریف ہے، وہ برتر ہے اس سے جس کو لوگ شریک ٹھہراتے ہیں۔

دعاے رسول اللہ ﷺ:

⑱ انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ یہ دعا بہت کیا کرتے تھے

«يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ»

[اے دلوں کے پھیرنے والے! اپنے دین پر میرے دل کو ثابت رکھ]

میں نے کہا: اے نبی اللہ ﷺ! ہم آپ پر ایمان لائے اور جو آپ لائے ہیں اس کا یقین کیا، کیا آپ کو ہم پر کچھ خوف ہے؟ فرمایا! ہاں، دل اللہ کی دو انگلیوں میں ہیں، وہ ان کو پھیر دیتا ہے جس طرح چاہتا ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[2]

سارے پیغمبر دنیا سے ایمان پر جاتے ہیں۔ اس دعا کا مطلب امت کو تعلیم دینا ہے کہ ایمان پر ثابت رہنے کی دعا کرتے رہا کریں، کیونکہ دل اللہ کے قابو میں ہے، جدھر وہ چاہے پھیرے۔ معلوم ہوا کہ اچھی بری راہ پر لگا دینا اللہ ہی کا کام ہے۔ آدمی اپنے دل پر اعتماد نہ رکھے۔ اللہ سے ہر وقت التجا کرے کہ اس کے دل کو نیک چال پر ثابت رکھے۔

دو کتابیں:

⑲ حدیثِ ابن عمرو رضی اللہ عنہما میں آیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ باہر آئے تو آپ کے دونوں ہاتھوں میں دو

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (۱۷۹)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۱٤۰)

کتابیں تھیں۔ فرمایا: بھلا تم جانتے ہو کہ یہ کیا ہیں؟ ہم نے کہا: آپ بتائیں! فرمایا: یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے آئی ہے، اس میں بہشتیوں کے نام اور ان کے باپ اور کنبے کے نام لکھے ہیں، پھر ان کے آخر پر مہر ہے، سو اب کچھ بڑھے اور نہ کم ہو گا۔ پھر بائیں ہاتھ کی کتاب سے متعلق کہا کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے ہے، اس میں دوزخیوں کے نام ہیں اور ان کے باپ اور کنبے کے نام ہیں، پھر ان کے آخر پر ختم ہے تو اب یہ زیادہ ہو گا اور نہ کم۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا: تو پھر عمل کس لیے ہے، اگر ایسی ہی بات ہے کہ اس سے فراغت ہو چکی ہے؟ فرمایا: تم سیدھی راہ پر چلو اور بندگی کرو، اس لیے کہ بہشتی کا خاتمہ بہشتیوں کے کام پر ہوتا ہے، اگرچہ وہ کچھ کام کرے اور دوزخی کا خاتمہ دوزخیوں کے کام پر ہوتا ہے اگرچہ وہ کچھ کام کرے، پھر ہاتھوں کی طرف اشارہ کیا اور ان دونوں کتابوں کو اپنے پیچھے پھینک دیا، پھر فرمایا: تمھارا رب بندوں سے فارغ ہو گیا۔ ایک گروہ جنت میں ہے اور ایک گروہ دوزخ میں ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی اللہ نے اہلِ جنت اور اہلِ نار کے نام الگ الگ ان کی ولدیت و ذات کے نشان سمیت لکھ کر سب ناموں کے آخر میں میزان دے کر جملہ کر دیا ہے کہ اب اس میں کچھ کمی وبیشی نہیں ہوتی، اللہ نے پہلے ہی سے ہر ایک شخص کا بہشتی اور دوزخی ہونا مقرر کر دیا ہے، وہ اسی کے موافق کام کرتا ہے، سو تم تو سیدھے چلے جاؤ۔

کیا کوئی چیز تقدیر کو بدل سکتی ہے؟

٢٠ ابو خزامہ کے باپ نے نبی مکرم ﷺ سے کہا: بھلا یہ دم اور دوا جو ہم کرتے ہیں اور یہ بچاؤ جس سے ہم بچتے ہیں، یہ کیا اللہ کی تقدیر پھیر دیتی ہیں؟ فرمایا: یہ خود اللہ کی تقدیر ہے۔ اس کو احمد و ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی تقدیر کی دو قسم ہے۔ ایک مبرم کہ جو مقرر کر دیا گیا ہے، ویسا ہی ہو گا۔ دوسری معلق کہ اگر یوں کرے گا تو ایسا ہو گا اور نہ کرے گا تو یوں ہو گا، مثلاً دعا مانگے تو بیمار اچھا ہو اور نہ مانگے تو نہ ہو، سو

---

[1] یہ حدیث صحیح مسلم میں ہے اور نہ صاحبِ مشکات ہی نے اس کو صحیح مسلم کی طرف منسوب کیا ہے، بلکہ اس کو ترمذی نے کتاب القدر (۲۱۴۲) میں اور احمد نے مسند (۲/۱۶۷) میں روایت کیا ہے۔

[2] مسند أحمد (٣/٤٢١) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٠٦٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٤٣٧)

دعا، تعویذ، صدقہ وخیرات اور دوا علاج کا اثر اسی تقدیرِ معلق کے سبب سے ہوتا ہے، اگر یہ اثر ہونا بھی اس کی تقدیر میں لکھا ہے تو آدمی اپنی عقل کو اس میدان میں نہ دوڑائے۔ جس طرح فرما دیا ہے، اس پر یقین لائے، چوں و چرا نہ کرے۔

بڑے آدمیوں کے احکام وافعال کے بھید دیہاتی گنواروں کو معلوم کرنا مشکل ہوتا ہے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا، چہ جائے کہ اللہ کے حکموں اور کاموں کا بھید بندوں کی عقل سے دریافت ہو جائے؟ "ما للتراب ورب الأرباب" مٹی کو رب الارباب سے کیا نسبت!

تقدیر پر بھروسا کرنا:

(۲۱) حدیثِ علی رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ تم میں ہر ایک شخص کی جنت ودوزخ میں جگہ لکھ لی گئی ہے۔ کہا: پھر ہم اپنے لکھے پر بھروسا نہ کریں اور عمل کرنا چھوڑ دیں؟ فرمایا: تم عمل کرو۔ ہر کسی کے لیے وہی کام آسان ہوتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو سعادت مند ہے اس کو سعادت کا کام کرنا آسان پڑ جاتا ہے اور جو بد بخت ہے، اس پر بدبختی کا کام کرنا سہل ہو جاتا ہے، پھر یہ آیت پڑھی:

﴿ فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ۝ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ﴾

[اللیل: ۵-۱۰]

[سو جس نے دیا اور ڈرا اور نیک بات کی تصدیق کرتا رہے گا تو ہم بھی اس کو آسان راستے کی سہولت دیں گے لیکن جس نے بخیلی کی اور بے پروائی برتی اور نیک بات کی تکذیب کی تو ہم بھی اس کی تنگی ومشکل کے سامان میسر کر دیں گے]

اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی نیک بخت کے لیے نیک بختی کے اسباب جمع ہو جاتے ہیں اور بد بخت کے لیے بدبختی کے اسباب۔ نیک کو نیکی کرنا آسان ہو جاتا ہے اور بد کو بدی کرنا سہل ہوتا ہے۔ جس کے لیے اسبابِ سعادت جمع ہو جائیں وہ شکر کرے اور جس کے لیے اسبابِ بدی جمع ہوں، وہ ڈرے اور

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (١٣٦٢) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٢٦٤٧)

جلدی سے اس کو ترک کرے، وہ اس بات پر بھروسا نہ کرے کہ بہشت یا دوزخ جو ہماری قسمت میں لکھی ہے ویسا ہی ہو گا، ہم بندگی کیوں کریں؟

خاتمے کا اعتبار ہوتا ہے:

۴۲ سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ بندہ اہلِ نار کا کام کرتا ہے اور وہ بہشتی ہو چکا ہے اور کوئی اہلِ جنت کا کام کرتا ہے اور وہ دوزخی ٹھہر چکا ہے۔ کاموں کا اعتبار خاتموں پر ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی مرنے کے نزدیک جیسا کام ہو ویسا ہی وہ شخص اچھا یا برا ہے۔ جو نیکی کی حالت میں مرا، ظن غالب یہ ہے کہ وہ بہشتی تھا اور جو کفر پر مرا وہ دوزخی تھا۔ غرض کہ تقدیر پر ایمان رکھنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ خاتمہ بالخیر کرے، آمین۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٩٣) صحيح مسلم (٤٩/٨)

باب چہارم

صحابہ واہلِ بیت کا بیان

صحابی کی تعریف:

صحابی وہ ہوتا ہے جس نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور وہ مسلمان تھا اور اسلام ہی پر وہ فوت ہوا۔ پھر اگر بہت دن صحبت میں رہا تو زیادہ افضل ہے بہ نسبت اس کے جو کم صحبت میں رہا۔ اہلِ بیت سے مراد نبی اکرم ﷺ کے گھر والے ہیں، جیسے بیویاں اور لڑکے بالے اور لڑکیوں کے سبب سے داماد اور نواسے نواسیاں بالخصوص اور غلام وباندی اور جس کو بیٹا کر کے پالا، بلکہ سارا کنبہ جو اپنے طریق پر ہوا اور ان کی اولاد، یہ سب اہلِ بیت میں داخل ہیں، جیسے خلفاے اربعہ وطلحہ وزبیر وعبدالرحمن وسعد وسعید وابو عبیدہ وابو ہریرہ وانس وبلال ومعاویہ وسلمان رضی اللہ عنہم۔ بلکہ سارے مہاجرین وانصار اور وہ لوگ جو غزوۂ احد وبدر وحدیبیہ وخیبر وغیرہ غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر راہِ خدا میں لڑے بالخصوص، اور جس مسلمان نے رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی اور اسی عقیدۂ اسلام پر فوت ہوا وہ صحابی ہے۔ صحابہ کی ثنا وصفت قرآن وحدیث سے بہ خوبی ثابت ہے۔ ان سے محبت رکھنا اور ان کی راہ پر چلنا ایمان کی نشانی ہے، پھر جو کوئی ان کو برا جانے یا ان کو نہ مانے تو اس نے گویا قرآن وحدیث کا انکار کیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اہلِ بیت کون ہیں؟

رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات، بنات طیبات، آپ کے داماد، اولادِ دختران اور زید و اسامہ رضی اللہ عنہم یہ سب آپ ﷺ کے اہلِ بیت وعترت میں داخل ہیں۔ جو شخص ان سے محبت نہ رکھے یا ان پر طعن کرے تو اس کے ایمان میں نقصان ہے، کیونکہ ان کی مدح وثنا عموماً وخصوصاً کتاب وسنت میں ثابت ہے تو جو کوئی معاذ اللہ ان کو برا جانے، اس نے گویا اللہ ورسول کی خبر کا انکار کیا۔ اس انکار

کا انجام جہنم کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ اللہ نے پیغمبر کے ساتھ محبت رکھنے کا حکم دیا ہے اور پیغمبر نے اپنے اصحاب واہلِ بیت سے دوستی کرنے کا ارشاد کیا ہے تو ان سے وہی شخص محبت رکھے گا جس نے پیغمبر ﷺ سے محبت رکھی ہے۔

حبِ صحابہ رضی اللہ عنہم محبتِ رسول ﷺ کا نتیجہ ہے:

اس میں کچھ شک نہیں کہ جو مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہتے تھے، صلاح ومشورے میں شریک ہوتے اور دین اسلام رسول اللہ ﷺ کے وقت میں اور آپ ﷺ کے بعد ان کی سعی وکوشش سے جاری ہوا تو گویا وہ پیغمبر ﷺ کی پیغمبری کے کام میں مددگار تھے۔ جو لوگ آپ ﷺ کے گھر کے تھے، جیسے بیویاں اور اولاد ونواسے وغیرہ، آپ ﷺ کو ان سب سے محبت تھی، بلکہ سارے مکے اور مدینے کے مسلمانوں سے بلکہ تمام ملک عرب سے محبت تھی تو جس شخص کو آپ ﷺ سے محبت ہوگی، وہ ان سب کے ساتھ بھی محبت رکھے گا، ان اصحاب واہل بیت کی تعظیم کرے گا، ہر امر میں انھیں کا طریقہ ظاہراً وباطناً اختیار کرے گا اور ہرگز ان کی راہ ورسم سے منحرف نہ ہوگا۔ پھر جس قدر اس کو آپ ﷺ سے زیادہ محبت ہوگی، اسی قدر ان سب سے بھی محبت زیادہ ہوگی اور جس کو ان سے محبت نہیں ہے تو وہ آپ ﷺ کی محبت میں بھی جھوٹا ہے، گو ظاہر میں محبت کا دعویٰ کرے، جس طرح کہ اہلِ بدعت کی محبت کا حال ہے کہ سنت صحیحہ پر تو چلتے نہیں اور اپنی بدعت کو اچھا سمجھ کر پکڑے ہوئے آپ ﷺ کی محبت کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ خود ان کا فعل ان کے قول کا مکذب ہے۔

اگر خدانخواستہ آپ ﷺ کے اصحاب اور اہلِ بیت برے ٹھہریں تو دینِ اسلام بھی جھوٹا ٹھہرے گا، اس لیے کہ قرآن وحدیث جو مسلمانی کی بنیاد ہے، انھیں کے واسطے سے پچھلے لوگوں کو پہنچا ہے، پھر اگر وہ برے تھے تو ان کے بتائے ہوئے قرآن وحدیث کا کیا اعتبار؟ جب قرآن وحدیث بے اعتبار ہو گیا تو دینِ اسلام سب جھوٹ ٹھہرا، لہٰذا جو شخص ان کو برا جانے، گویا وہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں جانتا اور اپنے ایمان کا انکار کرتا ہے، بلکہ دینِ اسلام ہی کا انکار کرتا ہے۔

صحابہ کرام کے مناقب:

اصحابِ کرام اور اہلِ بیت کی خوبیاں اور بزرگیاں جو کتاب وسنت میں آئی ہیں بہت ہیں، ذیل

میں ہم بعض آیات وغیرہ کا پتا دیتے ہیں۔ مسلمان کو عقیدہ درست کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔

① اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَ الْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَ عَزَّرُوْهُ وَ نَصَرُوْهُ وَ اتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٥٧]

[جو لوگ ایسے رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں جن کو وہ لوگ اپنے پاس تورات وانجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں وہ ان کو نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور پاکیزہ چیزوں کو حلال بتاتے ہیں اور گندی چیزوں کو ان پر حرام فرماتے ہیں اور ان لوگوں پر جو طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں سو جو لوگ اس نبی پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی حمایت کرتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں اور ان کا اتباع کرتے ہیں جو ان کے ساتھ بھیجا گیا ہے، ایسے لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں]

② اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الأنبياء: ١٠٥]

[اور ہم زبور میں پند و نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے]

پہلی آیت میں صحابہ کو صاحبِ فلاح فرمایا تھا اور اس آیت میں صالحین کہا۔ اب صلاح و فلاح کے بعد رتبہ نبوت کے سوا اور کوئی مرتبہ بشر کے واسطے ترقیِ مدارج کا نہیں ہے۔ صلاح وہ چیز ہے جس کی تمنا انبیا علیہم السلام نے کی تھی۔ یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ﴾ [يوسف: ١٠١]

[تو مجھے اسلام کی حالت میں فوت کر اور مجھے نیکوں میں ملا دے]

جب خلفاے اربعہ خلیفہ ہوئے، تب یہ وعدہ سچا اور پورا ہوا کہ پورب سے پچھم تک انھیں کا حکم

ساری زمین میں لوگوں پر ظاہراً وباطناً جاری ہوا اور آخر زمانے میں مہدی موعود کا دور ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے خاص نیک بندے تھے، اب جو ان کو فاسق ومنافق جانے، وہ اس آیت کا منکر ہے۔

◈ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ [الحج: ٤١]

[یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کے پاؤں جما دیں تو یہ پوری پابندی سے نماز قائم کریں اور زکات ادا کریں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں اور تمام کاموں کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے]

اس آیت میں اصحاب کی تعریف ہے کہ وہ حامیِ دین تھے۔ اب جو کوئی ان کو برا جانے وہ بد دین ہے۔

◈ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [الفتح: ٢٩]

[محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں کافروں پر سخت ہیں آپس میں رحم دل ہیں تو انھیں دیکھے گا رکوع سجدے کر رہے ہیں اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں ہیں ان کا نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے ان کی یہی مثال تورات میں ہے اور ان کی مثال انجیل میں ہے اس کھیتی کے مثل جس نے اپنا انکوا نکالا پھر اسے مضبوط کیا اور وہ موٹا ہوگیا پھر اپنے تنے پر سیدھا کھڑا ہوگیا اور کسانوں کو خوش کرنے لگا تاکہ ان کی وجہ سے کافروں کو چڑھائے، ان ایمان والوں اور نیک عمل والوں سے اللہ نے مغفرت اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے]

یہ آیت اس پر دلیل ہے کہ صحابہ کا ذکر دنیا میں ان کے وجود سے قبل موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کی کتابوں میں ہو چکا ہے کہ وہ لوگ بڑے خدا پرست، کامل الایمان ہوں گے اور ان پر غصہ انھیں کو آئے گا جو کافر ہیں۔ ہر چند اس آیت میں سب اصحاب کی تعریف ہے، مگر یہ چار باتیں جو یہاں بیان ہوئیں:

1. ایک ﴿اَلَّذِیْنَ مَعَهٗۤ﴾ یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ پر صادق ہے کہ حیات اور ممات کے بعد وہ ایک ہی جگہ غار میں اور دفن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔
2. دوسرے ﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ اس کے مصداق عمر فاروق رضی اللہ عنہ تھے۔ جس دن وہ مسلمان ہوئے، سب مسلمانوں نے باہر نکل کر نماز پڑھی، اس سے پہلے چھپ کر پڑھتے تھے۔
3. ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ﴾ کا مصداق عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔
4. ﴿تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا﴾ کا مصداق علی مرتضی رضی اللہ عنہ ہیں۔

الغرض جو شخص اصحاب واہلِ بیت کی تعریف وثنا سن کر ناخوش ہو وہ کافر ہے اور اللہ کی درگاہ سے راندہ ہوا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر کسی صحابی یا عترت سے کچھ گناہ کا کام بھی ہو گیا تھا تو وہ معاف ہو چکا ہے، کیونکہ اللہ نے مغفرت کا وعدہ فرما دیا ہے۔ یہ آیت رافضہ کے کفر پر حجت ہے۔ اس لیے کہ ان کو اصحاب پر غیظ آتا ہے اور وہ صحابہ کو گالی دیتے اور برا کہتے ہیں، نیز یہ آیت خوارج ونواصب کے کفر پر دلیل ہے، کیونکہ وہ اہلِ بیت کے دشمن ہیں۔

پھر آیت ﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِیْنَ﴾ [الحشر: ٨] میں مہاجرین کو صادقین اور انصار کو "مفلحین" فرمایا ہے اور تمام اہلِ اسلام کو دوسری آیت میں یہ ارشاد کیا ہے کہ ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ [التوبة: ١١٩] اس سے ثابت ہوا کہ ہم کو دین میں صحابہ کے ہمراہ رہنا چاہیے، پھر صحابہ میں ان کو فضیلت ہے، جنھوں نے فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور اللہ کی راہ میں لڑے۔ ان کے درجے کو "اعظم" فرمایا ہے، اگرچہ پچھلے لوگوں سے بھی جنت کا وعدہ ہے، لیکن سابقین واولین کے حق میں فرمایا:

﴿رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ وَ اَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ﴾ [التوبة: ١٠٠]

[اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ لوگ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات مہیا کر رکھے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ

بڑی کامیابی ہے]

بدر کی لڑائی تک جتنے لوگ مسلمان ہوئے وہ سب سابقین اولین ہیں اور جو لوگ بدر کے بعد اسلام لائے وہ ان کے تابع ہیں۔ مہاجر وہ اصحاب ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکے سے نکل آئے۔ انصار وہ ہیں جو مدینہ کے رہنے والے تھے اور انھوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور خاطر داری کر کے رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ان سب سے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا اور خلودِ جنت کا وعدہ فرمایا۔ اللہ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہے۔ اس کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اب جو کوئی رضائے الٰہی کے بعد ان سے ناراض ہو، گویا وہ اللہ کے وعدے کا مکذب ہے اور قرآن کا مکذب کافر ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے رافضی، خارجی اور ناصبی کافر ٹھہرتے ہیں۔ پھر اللہ نے بالخصوص اپنی رضا کا اظہار ان صحابہ سے کیا جنھوں نے درخت کے نیچے بیعت رضوان کی تھی۔ پھر یہ وعدہ فرمایا کہ ہم تم کو زمین میں خلیفہ بنا دیں گے، پھر خاص ابو بکر رضی اللہ عنہ کو لفظ "أتقی" و "یتزکی"[1] کے ساتھ یاد فرما کر یہ خبر دی کہ ﴿وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ [الليل: ٢١] [یقیناً وہ اللہ بھی عنقریب رضا مند ہو جائے گا]

سب سے اکرم اللہ کے نزدیک وہی ہوتا ہے جو زیادہ بڑا متقی ہو۔ یہ ویسا جملہ صالحہ ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے حق میں فرمایا ہے: ﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾ [الضحیٰ: ٥] [اور عن قریب آپ کا رب آپ کو دے گا تو آپ خوش ہو جائیں گے] اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک آپ ﷺ کے بعد کسی کا رتبہ صدیق رضی اللہ عنہ کے برابر نہیں ہے۔ اسی طرح عترتِ رسالت کے حق میں آیتِ تطہیر اتری ہے۔[2] اس سے ثابت ہوا کہ ان کو ہر عمل صالح کا دوہرا اجر ملے گا۔ ان کو دوسری آیت میں "امہات المومنین" ٹھہرایا ہے۔[3]

اسی طرح احادیث[4] میں صحابہ و اہلِ بیت کے فضائل و مناقب اور فواضل عموماً و خصوصاً کثرت

---

[1] اس سے سورۃ اللیل کی آیت (۱۷، ۱۸) کی طرف اشارہ ہے: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقٰى ۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى﴾ [اور جہنم سے ایسا پرہیز گار شخص دور رکھا جائے گا جو پاکی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال دیتا ہے]

[2] آیتِ تطہیر سے مراد سورۃ الاحزاب کی یہ آیت (۳۳) ہے: ﴿اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾

[3] اس سے سورۃ الاحزاب کی آیت نمبر (٦) مراد ہے: ﴿اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ﴾

[4] ان احادیث کو علامہ شاہ محمد اسماعیل شہید رحمہ اللہ نے "رد الإشراك" (ص: ۷۴-۱۱۱) میں ذکر کیا ہے۔

سے آئے ہیں جو کتبِ سنت مطہرہ میں معروف ہیں۔ وہ سب اس بات پر دلیل ہیں کہ مسلمان پر حقوقِ اصحاب وعترت کا حفظ بابت تعظیم ومحبت ودعا ومراقبہ فرض ہے۔ اب جو کوئی ان کی شان وعظمت میں کمی اور محبت میں فرق اور دعا میں تفاوت کرے گا اور اس سے کسی طرح کی لفظی ومعنوی بے ادبی صادر ہوگی تو اس کے اسلام میں فرق اور ایمان میں نقص ہے۔ وہ اپنے آپ کو ناحق مسلمان کہتا اور مومن سمجھتا ہے، بلکہ صحابہ وعترت کو تو جانے دو کہ ان کی فضیلت تو منطوقِ قرآن وحدیث ہے، رسول اللہ ﷺ نے تو عرب کے ساتھ محبت رکھنے کا مطلقاً حکم فرمایا ہے، گو وہ صحابی یا سادات نہ ہوں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں:

«أَحِبُّو الْعَرَبَ لِثَلَاثٍ: لِأَنِّي عَرَبِيٌّ، وَالْقُرْآنُ عَرَبِيٌّ، وَكَلَامُ أَهْلِ الْجَنَّةِ عَرَبِيٌّ»[1]

[عرب سے تین باتوں کی وجہ سے محبت کرو: اس لیے کہ میں عربی ہوں اور قرآن عربی ہے اور اہلِ جنت کی گفتگو عربی ہے]

اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔

یعنی دستور ہے کہ آدمی جس سے محبت رکھتا ہے تو اس کے ملک، بستی اور شہر کو بھی چاہتا اور دوست رکھتا ہے، بلکہ وہاں کا نام لینے اور ذکر کرنے سے خوش ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمانو! تم عرب کے ملک اور وہاں کے رہنے والوں کو دوست رکھو کہ میں جو تمھارا پیغمبر ہوں عربی ہوں اور اللہ نے جو کتاب تمھاری ہدایت کے لیے اتاری ہے، وہ بھی عربی زبان میں ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ قرآن میں عرب کے رسوم ودستور خوب بیان ہوئے ہیں۔ اگر آدمی کو عرب سے محبت ہو تو عربی زبان سیکھے اور لباس، خوراک وسواری میں عرب کا رویہ اختیار کرے کہ اس سے قرآن کا معنی اور مطلب خوب سمجھے اور بوجھے گا، پھر بہشت کے لوگ بھی عربی بولیں گے۔ ہر مسلمان کو عربی بول چال سے کام پڑے گا۔

عرب سے مراد ملکِ عرب کے قبائل واقوام ہیں نہ کہ وہ عجم جو اپنے ملک سے نکل کر وہاں جا بسے ہیں اور وہ اصلاً عرب ہیں نہ فرعاً، اسی طرح جو لوگ احیاے عرب کے ملکِ عرب سے نکل کر عجم

---

[1] المستدرك للحاكم (٤/٨٧) شعب الإيمان للبيهقي (١٣٦٤) یہ حدیث من گھڑت اور موضوع ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٦٠)

میں آ رہے ہیں وہ اب بھی حکمِ عرب میں ہیں، گو ان کی لغت اب عربی نہیں ہے، جیسے اکثر ساداتِ بنی فاطمہ اور شیوخِ قریش صحیح النسب۔ مسلمان کو ان سب سے دلی محبت اور مالی خدمت کرنا ضروری ہے۔

عرب کے لیے اگر کوئی بھی شرف نہ ہوتا مگر صرف اتنا کہ سید المرسلین، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین ﷺ اس قوم سے مبعوث ہوئے جو سارے جہان کے پیغمبر واجب الاتباع ہیں، بلکہ تمام ثقلین کے مخدوم ومطاع ہیں تو یہی کفایت کر جاتا، پھر جبکہ اس فضیلت عظمیٰ کے ماسوا اور فضائل وخصائص بھی ثابت ہیں تو پھر ان کی تعظیم وتکریم اور خدمت ومحبت میں اب دریغ کرنے کی کیا جگہ باقی ہے؟ جو کوئی مسلمان ہو کر عرب سے محبت اور لغتِ عرب سے الفت نہیں رکھتا ہے تو اس کو کچھ بھی ایمان کی حلاوت حاصل ہے نہ اسے رسولِ انس وجان ﷺ کی قدر وقیمت معلوم ہے۔ اللہ کے نزدیک اگر کوئی اور قوم بہتر ہوتی اور زبانِ عرب سے زیادہ اور لغت اشرف ٹھہرتی تو اللہ خاتم الرسل ﷺ کو اسی قوم اور اسی لغت میں مبعوث کرتا، لیکن جبکہ کارخانۂ نبوت ورسالت کا توڑ اور جملہ ادیان عالم کا خاتمہ عرب ولغتِ عرب پر کیا تو یہ کمالِ فضل وکرم شرفِ عرب پر واضح دلیل ہے، وللّٰہ الحمد.

باب پنجم

بدعاتِ قبور کا بیان

کسی دن، مہینے اور سال کی تعیین اور اجتماع کے بغیر زیارتِ قبر کے لیے جانا جائز بلکہ مستحب بلکہ سنت ہے، اس نیت سے کہ قبروں کے دیکھنے سے موت وآخرت یاد آئے، دنیا کی بے ثباتی وفنا پذیری ثابت ہو اور اس خاکدان فانی کی محبت دل سے نکل جائے۔ اس نیت کے سوا اور نیت سے قبروں کی زیارت کو جانا، دور دور سے سفر کر کے یا قیود مذکورہ لگانا یا قبروں پر ہجوم واجتماع کر کے آنا یا وہاں پر چراغ جلانا یا قبرستان میں مسجد بنانا یا عورت کا زیارتِ قبور کے واسطے نکلنا یا جنازے کے ہمراہ جانا یا قبروں پر چادر ڈالنا یا گچ کرنا، تاریخ وفاتِ موتی یا بعض آیاتِ قرآن وغیرہ کا مقبروں یا قبروں پر لکھ دینا یا مقبرہ وگنبد بنانا، ایک بالشت سے قبر کو اونچا رکھنا یا قبر کے پاس نماز پڑھنا، وہاں کا مجاور بننا، قبر کے ساتھ مسجد جیسا برتاؤ کرنا، سرور ولہو کے کام بجا لانا جو عید میں چاہیے یا قبر کے پاس مراقبہ کر کے فیض باطنی حاصل کرنا یا مُردوں کی خوشی جان کر یا ثواب کا کام سمجھ کر یہ سب افعالِ بد بجا لانا مکروہ وحرام اور بدعت وضلالت ہے۔

اس میں کچھ شک وشبہہ نہیں کہ وہ لوگ اس سبب سے یہ کام کرتے ہیں کہ مُردوں کو اپنا حاجت روا، مشکل کشا، دافع بلا اور معطی نعما جانتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے اور حاجتیں طلب کرتے ہیں، اگر ان کا یہ اعتقاد نہ ہوتا تو ان کو ان کاموں سے کیا واسطہ تھا؟ یہ تو مُردوں کی خوشامد کے لیے یہ کام کرتے ہیں اور گویا نذر ونیاز ومنت مان کر ان کو رشوت پہنچاتے ہیں، حالانکہ اللہ کے سوا کوئی حاجت روا، مشکل کشا، معطی ومانع نہیں ہے۔ وہ لوگ گو بزرگ ہوں، خود اللہ کے محتاج تھے۔ ہر امر میں اللہ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، یہی ان کی بزرگی تھی، خدا کے سوا غیر اللہ سے انکار رکھتے تھے اور سارے صفاتِ بشریت میں ان گور پرستوں، پیر پرستوں کے مثل شریک تھے۔ اب وہ مرنے کے بعد زندوں کے محتاج ہیں کہ زندے ان کے لیے دعا واستغفار کریں یا ان کی طرف سے کچھ خیرات اللہ کے نام پر دیں کہ ان کو حالتِ بے چارگی میں قبر کے اندر کچھ راحت ملے۔ بھلا وہ کیوں

کر ان مُردہ پرستوں کے حاجت روا اور مشکل کشا ہو سکتے ہیں؟ جو کوئی ان کو ایسا سمجھے، وہ بڑا پکا مشرک ہے، اس کو مسلمان نہ سمجھنا چاہیے۔

بدعاتِ قبور کی بنیاد:

ان کاموں کی بنیاد اہلِ کتاب سے ہے جو اپنے پیغمبروں اور بزرگوں سے جب کہ وہ مر جاتے تھے، ان کی قبریں پکی سنگین چونا کاری کی بنا کر ان کے ساتھ پرستش کے کام کرتے تھے۔ یہود نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا اور یہ جانا کہ وہ اللہ کے گھر کے کارندے مختار ہیں، جو چاہیں سو کریں۔ پھر انھوں نے ان کی روح کو پوجا اور ان سے منتیں مرادیں مانگیں، اسی طرح جو کوئی اچھا عالم یا درویش ان میں مرتا، اس کی روح وقبر کو پوجتے، قبر کے پاس مسجد بناتے، وہاں نماز پڑھنے کو زیادہ ثواب جانتے اور وہاں مراقب ہو کر بیٹھتے، اسی طرح نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ٹھہرایا اور جس مقام پر یہود نے مسیح علیہ السلام کو اپنی دانست میں سولی دی تھی، اس جگہ اور انطاکیہ میں جہاں عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھی یوحنا کی قبر ہے، وہاں پر میلہ کرتے تھے، جو ان میں عالم، مولوی، درویش مرتا، اس کی اونچی پکی قبر بناتے، وہاں مسجد تیار کرتے اور روشنی کرتے اور انبیا و اولیا کے قبور پر مراقب ہو کر بیٹھتے۔ یہ دونوں فرقے یہود ونصاریٰ اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کو خدا کا مختار کارندہ اور اپنا حاجت روا ومشکل کشا جانتے تھے اور ان کے مولوی اور درویش جو بات کہہ دیتے، اس کو اللہ کا حکم سمجھتے تھے اور اس کی کچھ تحقیق نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے ان عقیدوں کو شرک فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری کتاب قرآن اور ان کی کتاب تورات وانجیل کا ایک ہی بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴾ [آل عمران: ٦٤]

[آپ کہہ دیجیے کہ اے اہلِ کتاب! ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم مسلمان ہیں]

قبروں سے حاجت روائی شرک ہے:

معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی پیر و پیغمبر، زندہ و مردہ کو اس طرح ماننا اور ان کے ساتھ امور مذکورہ کا بجا لانا خلاف کتب آسمانی اور عین بدعت یا شرک ہے۔ اب اس وقت کے جاہل مسلمان یہی کام اپنے بزرگوں کی روح اور قبروں سے کرتے ہیں، پھر بھی مسلمان ہیں؟ فسبحان الله وبحمده.

حالانکہ کسی بشر کے لائق نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب و حکم و نبوت دے اور وہ لوگوں سے یہ بات کہے کہ تم اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ ہاں اس کو یہ چاہیے کہ وہ ربانی ہو، کیونکہ وہ کتاب سکھاتا اور پڑھتا ہے۔

سو جتنے انبیا و اولیا اور علما و صلحا گزرے ہیں، سب نے یہی کہا ہے کہ تم اللہ کی کتاب اور پیغمبر کے حکم پر چلو۔ کفر و شرک اور بدعت سے بچو اور پیر پرست، گور پرست، امام پرست رائے پرست نہ ہو جاؤ۔ ہم کو اللہ کا بندہ عاجز سمجھو اور بے قدرت و تصرف جانو۔ قیامت کے دن اللہ ان مشرکوں کو قائل کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام سے سوال کرے گا کہ کیا تو نے لوگوں سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کو چھوڑ کر مجھ کو اور میری ماں کو خدا سمجھو؟ وہ کہیں گے کہ بھلا جو بات حق نہ ہو میں کیسے کہتا؟[1]

سو جب عیسیٰ علیہ السلام جیسا شخص عبادت اور طلبِ حاجت کے لائق نہ ٹھہرے، باوجود یکہ ان کے ہاتھ سے مردے زندہ ہوتے، اندھا بینا ہوتا اور کوڑھی تندرست ہو جاتا تھا، تو کسی اور پیر شہید ولی اللہ کی کیا ہستی ہے کہ اس کی روح یا قبر سے مدد مانگی جائے، اس سے فیض حاصل کیا جائے اور کوئی کام نکل سکے یا زندگی سے بڑھ کر اس کی قبر سے معاملہ کیا جائے؟ یہ ایک طرح کا جاہل مسلمانوں کا غلو ہے اور اللہ نے غلو سے منع کیا اور فرمایا ہے کہ تم اگلے لوگوں کے خیال پر نہ چلو کہ وہ خود بھی گمراہ تھے اور دوسروں کو بھی گمراہ کر گئے اور سیدھی راہ سے بھٹک گئے۔[2]

ثواب کی نیت سے سفر کرنا:

① حدیثِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

« لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ إِلَّا إِلىٰ ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ: اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ، وَالْمَسْجِدُ

---

① سورة المائدة (١١٦)

② سورة المائدة (٧٧)

الْأَقْصىٰ، وَمَسْجِدِي هٰذَا»[1] (رواه البخاري و مسلم)

[سفر نہ کیا جائے مگر تین مسجدوں کی طرف۔ مسجد حرام، مسجد اقصی اور میری اس مسجد کی طرف]

یعنی زیارت کے لیے کسی متبرک مکان کو سفر کر کے جانا درست نہیں ہے، مگر ان تین مسجدوں کی زیارت کے لیے جانا درست ہے۔ اگلی امتوں کے لوگ کوہِ طور، مرقع عیسیٰ اور قبرِ یوحنا وغیرہ کی زیارت کرنے کے لیے دور دور سے سفر کر کے جاتے تھے۔ اس حدیث سے وہ منع ہو گیا۔ اب مکن پور، اجمیر، بہرائچ، بغداد، کربلا اور نجف کی طرف فقط قبروں کی زیارت کے لیے سفر کر کے جانا درست نہیں ہے، بلکہ ان قبور و مشاہد کا کیا ذکر ہے، رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی قبر پر جماؤ کرنے سے منع فرمایا ہے۔

② ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں:

«لَا تَجْعَلُوْا قَبْرِيْ عِيْدًا، وَصَلُّوْا عَلَيَّ فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ تَبْلُغُنِيْ حَيْثُ كُنْتُمْ»

[میری قبر کو عید نہ ٹھہراؤ اور مجھ پر درود بھیجو، کیونکہ تمھارے درود ہر جگہ سے مجھ کو پہنچ جاتے ہیں] اس کو نسائی نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی تم اگر میری زیارت کسی شرک یا بدعت کے واسطے نہیں کرتے ہو، بلکہ درود بھیجنے کی غرض سے سفر کر کے دور دور سے آتے ہو تب بھی یہ جماؤ درست نہیں، اس لیے کہ درود یہاں سے بھیجنا اور اندلس سے بھیجنا یکساں ہے۔[3] رسول اللہ ﷺ نے جب دیکھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے بزرگوں کی قبروں پر سال کے بعد میلہ اور جماؤ کرتے ہیں اور ہوتے ہوتے نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ان سے مرادیں مانگتے ہیں اور ان کی منتیں مانتے ہیں تو امت کو منع کر دیا کہ تم عید کی طرح ہر برس اچھی اچھی پوشاک پہن کر اور خوشی خوشی تاریخ معین میں جمع نہ ہو، بلکہ اگر تم کو اپنے اور میرے لیے ثواب منظور ہے تو مجھ پر درود بھیجو کہ مجھ کو اور تم کو دونوں کو ثواب ملے۔ درود کے لیے قبر سے نزدیک ہونا

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (١١٦٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٢٧)

② اس کو خطیب تبریزی نے "مشكاة المصابيح" (٩٢٦) میں نسائی کی طرف منسوب کیا ہے اور شارح مشکات نے بیان کیا ہے کہ نسائی کی طرف یہ انتساب مصنف کے اوہام میں سے ہے، اس لیے کہ اس کو نسائی نے روایت نہیں کیا، بلکہ اس کو ابوداود نے اپنی سنن (٢٠٤٢) میں اور احمد نے مسند (٢/ ٣٦٧) میں روایت کیا ہے، علامہ نووی رحمہ اللہ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ دیکھیں: کتاب الأذکار (٣٠٦) مرعاة المفاتيح (٣/ ٢٧٥-٢٧٦)

③ دیکھیں: سنن سعید بن منصور بحوالہ اقتضاء الصراط المستقيم (١/ ١٠٩) و إغاثة اللهفان (١/ ١٩١)

کچھ ضروری نہیں، بلکہ لاکھوں منزلوں سے اللہ تعالیٰ تمھارے درود مجھ کو پہنچا دے گا۔

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر پر معین تاریخ میں جماؤ کرنا درست نہیں ہے، جس طرح لوگ حج کے بعد سال حج میں یا حج کے قبل ماہ معین میں اطرافِ عالم سے چل کر اجتماع کرتے ہیں یا مجرد مدینے کا مستقل سفر بلا حج وعمرہ اختیار کرتے ہیں، پھر جب آپ علیہ السلام کی قبر شریف کے لیے یہ بات بہ نص قطعی منع ہے تو اور کسی کی قبر پر عرس اور میلہ کرنا اور تاریخ مقرر میں قبر کی زیارت کو جانا بالاولیٰ منع ٹھہرا۔ اگر یہ بات جائز ہوتی تو سب سے زیادہ اس بات کا استحقاق آپ ﷺ کے لیے ہوتا۔

دوسرے یہ کہ خوشی کے آلاتِ قبر کے سبب سے جمع کرنا درست نہیں ہے، جیسے جو راگ وغیرہ لوگ عرس میں کرتے ہیں۔

تیسرے یہ کہ مردے کو ثواب پہنچانا ہے تو دور سے دعا و استغفار کرے، قربِ قبر کیا ضروری ہے؟ پھر لوگوں کا یہ خیال کہ جہاں درود پڑھا جاتا ہے یا مولد کا ذکر ہوتا ہے، وہاں آپ ﷺ کی روح مبارک آتی ہے، بالکل غلط ہے۔ اسی بنیاد پر جاہل مسلمان مشرک وضع وہاں جو کھانے وغیرہ پر فاتحہ پڑھتے اور عطر و پان و پانی رکھتے ہیں، یہ سب لغو اور باطل عقیدہ ہے۔

عورتوں کے لیے زیارتِ قبور کا حکم:

③ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ»

[اللہ نے کثرت سے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت کی ہے]

اس کو احمد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ عورتوں کو قبر کے پاس قبر کی زیارت کے لیے جانا حرام ہے۔

قبروں کو سجدہ گاہ بنانا:

④ عطا بن یسار رحمہ اللہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَناً يُّعْبَدُ، اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»[2] (رواه مالك)

① مسند أحمد (۲/۳۳۷) سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۶۷) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (۱۵۷٦)

② الموطأ للإمام مالك (٤١٤) التمهيد لابن عبد البر (٥/ ٤٣)

[اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنانا جو پوجی جائے۔ اللہ کا ان لوگوں پر شدت سے غضب ہو جنھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی قبر کے ساتھ ایسا کام کرنا جو مسجد کے ساتھ ہونا چاہیے حرام ہے، جیسے جھاڑو دینا، فرش بچھانا، اعتکاف کرنا، پانی کا برتن رکھنا، عمارت بنانا، چراغ جلانا اور غلاف پہنانا وغیرہ۔ جو کوئی یہ کام کرے تو اس پر اللہ کا غضب نازل ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جس قبر کے ساتھ لوگ ایسے کام کریں وہ قبر نہیں رہتی، بت ہو جاتی ہے، جیسے ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور لات وغیرہ کی تصویریں اور قبریں لوگوں کے پوجنے کے سبب بت ٹھہر گئی تھیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ابرہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تصاویر کو، جو کعبے کے اندر تھیں، اپنے ہاتھ سے ایک چوب دستی سے توڑ ڈالا تھا اور ان تصاویر کا کوئی احترام نہ کیا۔

5 پھر آپ علیہ الصلاۃ والسلام نے مرض وفات میں فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارىٰ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ»[1]

[اللہ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے، کیونکہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجدیں بنا لیا]

اس کو شیخین نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ لعنت ملنے والا کام ہے۔ اس سے ہم اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اب یہی کام بلکہ اس سے ہزار چند زیادہ کام اس امتِ اسلام کے جہال و عوام، بعض پیرزادے اور پیر پرست و گور پرست کرنے لگے ہیں، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ قبروں کو منقش بناتے ہیں اور مجاوروں کو حلوے اور مٹھائی کھلاتے ہیں، لیکن کسی شکستہ مسجد کی مرمت کریں گے نہ موذن کو سوکھی پھیکی روٹی دیں گے، مسجد میں تو وضو و غسل کے لیے مٹی کے برتن بھی نہ دیں اور قبروں پر نقارے بجائیں۔ مسجد میں نماز کے لیے بوریا بھی نہیں اور قبروں پر زربفت و کمخواب کی چادریں پڑی ہیں اور اطلس کے شمگیرے تنے ہیں۔ پھر کیوں نہ اللہ کی لعنت برسے؟ اللہ کے گھر کی بلکہ اس کی ذات پاک کی تعظیم کم اور بندوں کی زیادہ یا اس کے برابر تو اب لعنت کے سوا اور کیا کچھ چاہیے؟ جب سب پیروں کے پیر اور سب بزرگوں کے بزرگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر کے ساتھ ایسے کام کرنے پر بد دعا کریں اور لعنت بھیجیں تو اور بزرگ جن کی ساری بزرگی آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی فرماں برداری کرنے میں تھی، اپنی قبروں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنے پر کب راضی ہوں گے؟

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۳۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۲۹)

⑥ حدیثِ جندب رضی اللہ عنہ میں بھی قبورِ انبیا و صلحا کو مساجد ٹھہرانے سے منع کیا ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

قبر پر بیٹھنا اور نماز پڑھنا:

⑦ حدیثِ ابی مرثد غنوی رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ قبروں پر بیٹھو نہ ان کے پاس نماز پڑھو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[2]

قبر کی طرف نماز اگر معاذ اللہ تعظیم میت کے واسطے ہے تو کفر ہے اور اگر اس قبر یا مقبور کو قبلہ ٹھہرایا تو حرام ہے، لیکن اگر یہ نیت نہیں ہے تو مکروہ تحریمی ہے۔ قبر پر بیٹھنا کئی طرح پر ہے۔ ایک ذرا بیٹھ جانا، دوسرے اس پر جائے ضروری کرنا، تیسرے اس کے بھروسے پر خادم یا مجاور بن کر بیٹھ رہنا اور اس میں قبر پر جلسہ کرنے کی ممانعت ہے۔ اس حکم میں عرس بھی داخل رہے گا۔

قبروں کو برابر کرنا:

⑧ علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ابوالہیاج اسدی رحمہ اللہ سے کہا تھا کہ کیا میں تجھ کو ایسے کام پر نہ بھیجوں جس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو بھیجا تھا؟ وہ کام یہ ہے کہ تو کسی مورت کو توڑے بغیر اور کسی قبر کو برابر کیے بغیر نہ چھوڑ۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[3]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ قبر کا زمین سے اونچا بنانا گناہ ہے۔ ہم نے اس کو گناہ اس لیے کہا ہے کہ اگر قبر کی بلندی گناہ نہ ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بلند قبور کو پست کراتے اور ان کا ذکر مورتیوں کے ہمراہ کیوں فرماتے؟

قبر کو پختہ کرنا اور اس پر لکھنا:

⑨ حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں قبر کو گچ کرنے، اس پر عمارت تعمیر کرنے اور قبر پر بیٹھنے سے نہی فرمائی ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[4] اس سے معلوم ہوا کہ قبر پختہ بنائے نہ اس پر قبے وغیرہ کی

---

① صحیح مسلم، رقم الحدیث (۵۳۲)

② صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۲)

③ صحیح مسلم (۳/۶۱)

④ صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۷۰)

عمارت کھڑی کرے۔ نیز قبر پر مراقبہ کرنا یا خادم و مجاور بن کر بیٹھنا حرام ہے، خواہ کسی کی قبر ہو۔

⑩ دوسری روایت میں یہ ہے کہ قبر پر لکھنے اور اس کے پامال کرنے سے نہی کی ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ قبر پر تاریخ، نظم یا آیت یا حدیث لکھنا یا تختی وغیرہ پر لکھ کر لٹکانا اور قبر پر پاؤں رکھ کر چلنا حرام ہے۔

قبر پر تصویر بنانا:

⑪ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں کنیسۂ حبشہ کے ذکر کے ساتھ مرفوعاً آیا ہے کہ ان لوگوں میں جب کوئی نیک مرد مر جاتا تو وہ اس کی قبر پر مسجد بناتے اور اس میں ان کی تصویریں قائم کرتے۔ یہ لوگ ساری خلق سے بدتر ہیں۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[2]

اہلِ حبشہ نصرانی تھے۔ وہ قبر کے پاس مسجد بنا کر اس مُردے کی تصویر بنا دیتے، اس لیے حضرت علیہ الصلاۃ والسلام نے ان کو بدترین خلق فرمایا۔

قبروں پر کپڑے ڈالنا:

⑫ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک لڑائی میں گئے تو میں نے آپ کے پیچھے گھر کے دروازے پر ایک پردہ لٹکایا۔ جب آپ آئے تو اس کو دیکھ کر ایسا کھینچا کہ پھاڑ ڈالا۔ پھر فرمایا: ''اللہ نے ہم کو یہ حکم نہیں دیا ہے کہ ہم پتھر اور مٹی کو کپڑا پہنائیں۔'' اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[3]

جب کپڑے کی دیوار گیریاں اور چھتیں لگانا درست نہیں ہے، تو قبر پوش ڈالنا، مقبرے کو غلاف اوڑھانا اور جھنڈی یا کسی بزرگ کے نام کی چھڑی پر غلاف چڑھانا بالاولیٰ منع ہے۔ مسلمان کو چاہیے کہ جہاں کہیں ایسا دیکھے تو اس کو دور کر دے اور پھاڑ ڈالے۔

قبروں پر چراغاں کرنا اور اسے سجدہ گاہ بنانا:

⑬ حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ اللہ ان عورتوں پر لعنت کرے جو قبر کی زیارت کریں اور

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٥٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٢٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٥٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٠٧)

ان لوگوں پر جو قبروں پر مسجد بنائیں اور چراغ جلائیں۔ اس کو ابوداؤد، ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[1]

قبر پر شمع جلانا اور روشنی کرنا خواہ خود کرے یا اس کے لیے اپنا پیسہ خرچ کرے، لعنت کا موجب ہے۔ مردہ اگر اللہ کا مقبول بندہ ہے تو اس کے لیے اللہ کی طرف سے روشنی ہے اور اگر مردود ہے تو حساب کتاب میں گرفتار ہے۔ پھر باہر کی روشنی سے اندر کا اندھیرا جانا ممکن نہیں۔ روشنی جلانے والا اور جلوانے والا دونوں پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے اور دونوں روسیاہ ہیں۔ مسجد بنانا اگر نماز کے لیے ہے تو جہاں قبر زیر نگاہ ہو وہاں نماز درست نہیں ہے اور نماز اگر مردے کی تعظیم کے لیے ہے تو کفر ہے۔ اگر وہ مسجد نام کے لیے بنائی ہے تو حرام اور داخل اسراف ہے اور اگر مردے کی تعظیم کے لیے ہے تو اللہ کا مکان مخلوق کے لیے بنانا شرک ہے۔ اس لعنت میں معمار ومزدور بھی شریک ہیں اور جو عورت خاوند کی مرضی سے زیارت کو جائے تو وہ خاوند بھی ملعون ہے۔ ہاں قبر کے پاس جا کر بیٹھ جانا یا اتفاقاً تکیہ لگا لینا مرد کے لیے جائز ہے۔ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے ایسا کیا تھا۔ اس کو مالک نے بلاغاً روایت کیا ہے۔[2]

قبرستان میں نماز پڑھنا:

⑭ قبرستان اور حمام میں نماز پڑھنا درست نہیں ہے اس کو ابوسعید رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً بیان کیا ہے۔ اس کو ترمذی و ابوداود اور دارمی نے روایت کیا ہے۔[3]

زیارتِ قبور کا مقصد:

حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ تم قبروں کی زیارت کرو، کیونکہ یہ دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں اور آخرت کی یاد دلاتی ہیں۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[4]

معلوم ہوا کہ جس زیارت میں یہ فائدہ نہ ہو وہ منع ہے۔ جاہل لوگ زیارت میں طواف کرتے

---

① سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٢٣٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٠) سنن النسائي (٤/ ٩٤)

② موطأ الإمام مالك (١/ ٢٣٣)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٧) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٧٤٥) سنن الدارمي، رقم الحديث (١٣٩٠)

④ سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٧١)

ہیں، قبر کا بوسہ لیتے ہیں، رخسار یا سینہ قبر پر ملتے ہیں، مُردوں سے حاجت مانگتے ہیں یا چادر پھول چڑھاتے ہیں۔ مشائخ اور پیر زادے وہاں مراقبہ کرتے ہیں، عرس کا میلہ جماتے ہیں۔ ریوڑی، گٹا، حلوہ، شیر مال اڑاتے ہیں، نذر و نیاز کا روپیا پیسا لیتے ہیں؛ یہ سب شرک و بدعت اور حرام ہے۔ عوام جاہلوں کو خراب کرنے کے لیے ادھر ادھر کے قصے کہانی اور دو چار جھوٹی روایتیں بنا رکھی ہیں۔ اپنی دنیا کو تباہ کیا، ان کی عاقبت تباہ کی، بلکہ اپنا رو سیاہ کیا۔

بابِ ششم

بدعتِ تقلید کی تردید

اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے کلام اور کام کو سند پکڑتے ہیں اور ان کے قول وعمل کی پیروی کرتے ہیں۔ وہ ان کے حق میں یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ جو کچھ انھوں نے کیا اور کہا ہے وہی ٹھیک ہے اور اللہ کی وہی راہ ہے خواہ وہ کلام اور عمل قرآن وحدیث کے موافق ہو یا مخالف، اور کہیں سے اس کی سند ہو یا نہ ہو۔ گویا ان کو شرع کا حاکم اور شارع جانتے ہیں، پھر جو کوئی ان کے قول وفعل کے خلاف کوئی آیت یا حدیث پڑھے تو اس کا انکار اور اس کے مطلب میں تکرار کرنے کو تیار ہیں اور ایمان جانے اور رہنے کا کچھ لحاظ نہیں، حالانکہ اصل حاکم اللہ ہے۔ اس کے حکم کے سوا کسی کا حکم نہیں ماننا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا حکم ماننا بھی اللہ ہی کا حکم ہے، خود پیغمبر بھی حاکم نہیں ہے، پھر کوئی اور مجتہد، فقیہ، مولوی، مفتی، قاضی، ملا، طالب علم، غوث، قطب، ولی، پیر، مرشد، خادم، مجاور، مرید کس قطار وشمار میں ہیں؟ ہاں قرآن وحدیث کی بات جو نہ جانتا ہو، وہ واقف کار لوگوں سے دریافت کر لے، کیونکہ یہ بھی اللہ کا حکم ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ٤٣]

[پس اگر تم نہیں جانتے تو اہلِ علم سے دریافت کرلو]

ذکر نام ہے قرآن کا۔ قرآن میں ہر امر ونہی میں اطاعت واتباعِ رسول کا حکم ہے تو اہلِ ذکر سے مراد علماے کتاب وسنت ٹھہرے، نہ کہ اہلِ رائے وقیاس وفقہ اصطلاحی ومشائخِ طریقت۔ جو مسئلہ قرآن میں مفصل مذکور نہ ہو، وہ حدیث سے دریافت کرے۔ اگر اس کا بیان صریح حدیث میں نہ ملے تو اجماعِ صحابہ سے معلوم کر لے، اگر یہ بھی نہ ملے تو پھر اگر خود عالم ہے تو اجتہاد کرے یا دوسرے مجتہد کے قیاس جلی پر چلے، پھر وہ مجتہد بھی ایسا ہو جس کو اکثر علماے اسلام نے قبول کیا ہو، جیسے ائمہ اربعہ اور وہ قیاس بھی فاسد اور نص ودلیل کے مخالف نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح رہے کہ صحابہ اور مجتہدین معصوم نہ تھے۔ اجماع کے مسئلے میں فی الجملہ ان کی عقل کو کچھ دخل ہے، اس لیے وہ اجماعی مسئلہ صریح

حکمِ خدا و رسول کے درجے کو نہ پہنچے گا، پھر ان تینوں طرح کے مسائل میں ضعیف وہ مسئلہ ہے جو مجتہدوں نے اپنے قیاس سے بہ حکم ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ۲] [پس آنکھ والو! عبرت حاصل کرو] نکالا ہے۔

قیاس میں عقل کو دخل ہے، اسی وجہ سے بھول چوک بھی ہو جاتی ہے، لہٰذا اکثر مسائل میں خود ابو حنیفہ وشافعی وغیرہ رحمہم اللہ نے رجوع کیا ہے۔ غرض کہ اصل چیز جو واجب الاتباع ہے وہ قرآن وحدیث ہے۔ جن کو اللہ نے کتاب وسنت میں کامل مہارت عطا کی ہے، وہ ہر مسئلہ قرآن وحدیث سے نکال کر بتا سکتے ہیں، انھیں اجتہاد کی حاجت ہوتی ہے نہ قیاس کی، کیونکہ کتاب وسنت جملہ احکام کے لیے کفایت کرتے ہیں، تا قیام قیامت کلیات وعمومات ادلہ ونصوص جملہ مسائل کے واسطے کفایت کرتے ہیں۔ کتب فتاویٰ فقہ میں جو لاکھوں مسئلے عقل سے نکال کر لکھ رکھے ہیں، اکثر بے دلیل، محض قال وقیل یا اغلوطات ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے کاموں سے منع فرمایا ہے۔[1] جب قرآن وحدیث سے مجتہد کا خلاف ثابت ہو جائے تو کتاب وسنت کے موافق عمل کرے، پھر تقلید حرام بلکہ شرک فی الرسالہ ہے۔

تقلید کا معنی اور حکم:

تقلید کے معنی یہ ہیں کہ دلیل دریافت کرنے کے بغیر کسی کے حکم کو مان لینا اور یہ نہ معلوم کرنا کہ اس نے یہ حکم کس سبب سے اور کس دلیل سے کیا ہے۔ اکثر لوگ مولویوں اور درویشوں کے بے سند کام اور کلام کو سند پکڑتے ہیں اور اس کی تحقیق نہیں کرتے، گویا ان کو حاکم شرع جانتے ہیں، سو ایسی تقلید بدعت وحرام ہے اور جو شخص قرآن وحدیث کی دلیل واضح ہونے کے بعد تقلید کو واجب کہتا ہے، اس کے ایمان کا کچھ ٹھکانا نہیں ہے، وہ خالص مشرک ہے۔ اس نے اللہ کے سوا اور حاکم ٹھہرائے، حالانکہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [الأنعام: ۵۷] [اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں ہے] عالم فاضل ہو یا ملا مخدوم مشائخ۔ ہاں رسول اللہ ﷺ معصوم ہیں وہ حکمِ خدا کے خلاف نہیں بتاتے، بلکہ جو حکم پیغمبر مشورے کی راہ سے بتائیں، اس میں بھی آدمی کو اختیار ہے، چاہے تو نہ کرے، پھر کسی اور بادشاہ، امیر، مولوی، مشائخ، پیر، شہید، فقیہ کی کیا ہستی ہے جو حکمِ خدا کی مخالفت کے باوجود اس کو مانے؟ اللہ کے حکم کو نہ ماننا اور کسی مولوی، درویش کا حکم ماننا شرک جلی ہے اور اللہ

[1] دیکھیں: ضعیف الجامع الصغیر (۶۰۳۵)

ہرگز شرک کو نہ بخشے گا۔ یہ آیت اس پر دلیل ہے:

﴿ اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ﴾

[التوبۃ: ۳۱]

[ان لوگوں نے اپنے عالموں اور عابدوں کو اللہ کے بجائے معبود بنا لیا اور مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ انھیں تو صرف ایک اللہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وہ مشرکوں کے شرک سے پاک ہے]

نیز فرمایا:

﴿ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا لَمْ یَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِیْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴾ [الشوریٰ: ۲۱]

[کیا ان لوگوں نے اللہ کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جنھوں نے ایسے کام احکام دین مقرر کر دیے ہیں جو اللہ کے فرمائے ہوئے نہیں ہیں اور اگر فیصلے کے دن کا وعدہ نہ ہوتا تو ان میں بھی فیصلہ کر دیا جاتا، یقیناً ان ظالموں کے لیے دردناک عذاب ہے]

اس سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اپنی طرف سے دین میں کوئی راہ نکالے، پھر جو شخص اس پر عمل کرے وہ شرک کی راہ پر چلتا ہے اور ایسا ظالم قیامت کے دن عذابِ الیم میں گرفتار ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا ﴾ [النساء: ۵۹]

[پھر اگر کسی چیز میں اختلاف کرو تو اسے اللہ کی طرف اور رسول کی طرف لوٹاؤ، اگر تمھیں اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان ہے، یہ بہت بہتر ہے اور باعتبار انجام اچھا ہے]

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اختلافی مسائل میں قرآن و حدیث کی طرف رجوع کرنا واجب ہے۔ جو اس سے ثابت ہو وہی واجب الاتباع ہے اور کوئی مطاع نہیں ہے۔

علم کیا ہے؟

① حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ علم تین ہیں: آیت محکمہ، سنت قائمہ اور عادلانہ فرض میراث۔

جو اس کے سوا ہے وہ فضول اور لا یعنی ہے۔ اس کو ابوداؤ د اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[1]

② حدیثِ ابراہیم عذری رحمہ اللہ میں فرمایا ہے کہ علم دین کو پچھلوں میں سے وہ لوگ اٹھائیں گے جو عادل ہیں۔ وہ اس سے مبالغہ کرنے والوں کا بگاڑنا اور جھوٹوں کا جھوٹ باندھنا اور نادانوں کی تاویل مٹاتے ہیں۔ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔[2]

اس حدیث میں علمائے قرآن وحدیث کی تعریف کی ہے اور جو لوگ کتاب وسنت کے برخلاف ہیں، ان کو غالی، مبطل اور جاہل فرمایا ہے۔ اسی وجہ سے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے زیاد بن حدیر سے کہا تھا کہ تو جانتا ہے کہ کون سی چیز اسلام کو ڈھاتی ہے؟ کہا: نہیں۔ فرمایا:

"يهدمه زلة العالم، وجدال المنافق بالكتاب، وحكم الأئمة المضلين"[3]

[عالم کی لغزش اور منافق کا قرآن سے جھگڑا کرنا اور گمراہ کرنے والے حاکموں کا حکم کرنا]

اس کو دارمی نے روایت کیا ہے۔

یعنی جب کوئی عالم مولوی پھسل جاتا ہے اور غلطی میں پڑ جاتا ہے تو ایک عالَم اس کے پیچھے غلطی پر چل کر برباد ہوتا ہے اور دینِ اسلام میں خلل آ جاتا ہے، پھر جو شخص اس غلطی کو واقفیت کے باوجود نہ مٹائے تو گویا وہ دینِ اسلام کے خلل کا روادار ہے۔ اسی طرح جب حاکم، امیر اور قاضی خود گمراہ ہو جائیں اور لوگوں کو حکم کریں تو ہزارہا مخلوق خوف ورجا میں آ کر گمراہ ہو جاتی ہے۔ دیندار کو چاہیے کہ ایسے علما وامرا اور جھوٹے مسلمانوں کی بات پر دھیان نہ کرے، بلکہ ان پر ہاتھ سے یا زبان سے یا دل سے رد کرے اور یہ ایمان کا ادنا درجہ ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان باقی نہیں رہتا ہے۔

مخلوق کی اطاعت کب جائز ہے؟

③ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں مرفوعاً آیا ہے کہ مسلمان پر ہر پسند وناپسند امر میں امیر کی اطاعت وہاں تک ہے کہ کسی معصیت کا مامور نہ ہو، پھر جب اس کو معصیت کرنے کا حکم دیا جائے تو پھر سننا ہے نہ ماننا۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[4]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٨٨٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٥٤)

[2] سنن البيهقي (١٠/ ٢٠٩)

[3] سنن الدارمي (١/ ٧١)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١٤٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٨٣٩)

یعنی جب قرآن وحدیث سے ایک بات کا منع ہونا معلوم ہو گیا تو اب اس کے خلاف اگر کوئی حاکم، مفتی، قاضی، ملا، مشائخ، امیر، بادشاہ اس امر کو جائز کہے یا کسی کتاب میں کسی کا قول وفعل لکھا ہو تو اس کا ماننا حرام ہے۔

④ ''شرح السنہ''[1] میں نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ «لَاطَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ» یعنی خالق کی نافرمانی جس میں ہو، اس میں کسی مخلوق کی فرماں برداری نہیں ہے۔

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن وحدیث کے خلاف کوئی کہے اور کیسی ہی تقریر بنائے نہ مانے، بلکہ اگر تمام مخلوقِ دنیا کی کہے تب بھی نہ سنے۔

تقلید شرک ہے:

⑤ حدیثِ عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ میں آیتِ کریمہ: ﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَ رُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [التوبة: ٣١] کی بابت فرمایا تھا:

«أَمَا إِنَّهُمْ مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَهُمْ، وَلٰكِنَّهُمْ كَانُوْا إِذَا أَحَلُّوْا لَهُمْ شَيْئاً اِسْتَحَلُّوْهُ، وَإِذَا حَرَّمُوْا عَلَيْهِمْ شَيْئاً حَرَّمُوْهُ»[2]

[یعنی وہ اپنے مولویوں اور درویشوں کو پوجتے نہ تھے، بلکہ جس چیز کو وہ ان کے لیے حلال بتاتے اس کو یہ حلال اور جس چیز کو وہ ان پر حرام کہہ دیتے اس کو یہ حرام مانتے تھے]

اس تقلید کو اللہ نے ان کا رب ٹھہرانا فرمایا ہے۔ یہ تقلید یہود ونصاریٰ کی راہ تھی۔ اس امت کے جھوٹے مسلمان اب یہی کام کرتے ہیں کہ بلا تحقیق ہر مولوی اور درویش کے کہنے پر حرام حلال اور جائز ناجائز کا اعتقاد کر لیتے ہیں۔ جس بدعت کو کسی مولوی نے حسنہ کہہ دیا یا جس خواب وکشف کو کسی مشائخ نے بہتر بتا دیا، ان احمقوں نے اس کو اپنا دین سمجھ کر اس پر عمل کیا۔ یہی تقلید بہ نصِ قرآن شرک ہے۔ اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کے ہوتے ہوئے دوسرے کے کلام وکام کو ماننا اگر شرک نہیں ہے تو پھر شرک کیا ہے؟

---

[1] شرح السنة (٤٤/١٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٧١)

باب ہفتم

رسوم و رواج کی تردید

رسم کیا ہے؟

جو چیز خواص وعوام اکثر لوگوں میں رائج ہو اور لوگ اس کو برا نہ سمجھیں، اگر چہ اس کا کرنا ثواب یا نہ کرنا عذاب نہ جانیں، مگر اس کے کرنے والے کو ان میں کوئی مطعون نہ کرے، بلکہ نہ کرنے والا مطعون ہو اور لوگ اس پر تعجب کریں، پھر خواہ وہ کام شرع کی رو سے جائز ومباح ہو، خواہ مکروہ وحرام، اس بات کا اس میں کچھ لحاظ نہ ہو، صرف زمانے کے رواج کا لحاظ ہو، ایسے کام کو ''رسم'' کہتے ہیں۔

پھر ایسے کام اصل شرع کی رو سے اگر چہ جائز ومباح ہوں، مگر جب ان کاموں کو شرعی کاموں کی طرح لوگ کرنے لگیں اور کرنے والے کی تعریف ومدح اور نہ کرنے والے کی ہجو ومذمت ہونے لگے اور ایسے کاموں میں ہوتے ہوتے آخر کو یہ نوبت پہنچی کہ مکروہ وحرام بلکہ کفر وشرک اس کام کے سبب سے ہونے لگے تو ایسے سب کام کبھی بدعت، کبھی مکروہ، کبھی حرام، کبھی شرک اور کبھی کفر میں شمار ہو کر شرع کی رو سے منع ہو جاتے ہیں، مثلاً جب عورت کا خاوند مر جائے، باوجود یکہ اس کو مرد کی خواہش ہے، بے وارثی کے سبب محتاجی بھی لاحق حال ہے، کوئی باہر کا کام کرنے والا بھی نہ ہو اور اکیلے گھر میں اداس بیٹھی رہے اور شرعاً دوسرا نکاح بھی جائز جانتی ہو مگر وہ فقط رسم ورواج کے سبب اور خاوند نہ کرے گی تو لوگ اس کو اچھا کہیں گے اور اگر کرے گی تو مطعون ہو گی یا نکاح وختنہ وبسم اللہ وغیرہ میں فقر واحتیاج وغیرہ کے باوجود اگر چہ سودی قرض لینا یا بھیک مانگنا پڑے، مگر برادری کا کھانا اور کپڑا اور چھٹی معمولی وغیرہ رسمیں خاندانی بلکہ اور خرافاتیں ناچ رنگ راگ ضرور ہی ہوں۔ اگر چہ وہ لوگ ان رسموں کو فرض، واجب، سنت اور مستحب نہ جانیں، مگر رسم ورواج کے سبب کرتے ہوں، نہ کریں تو مطعون ہوں اور کریں تو تعریف ہو۔

رسوم کا آغاز کیسے ہوا؟

اصل بات یہ ہے کہ بعضے اگلے نیک لوگوں نے بعضے مباح کام اس وقت میں مصلحت سمجھ کر کسی فائدے کے واسطے کرنا تجویز کیا تھا، پھر لوگ اس فائدے کے سبب ان کاموں کو کرنے لگے، پھر ہوتے ہوتے خواص وعوام میں ان کاموں کا رواج ہوگیا، عوام کے نزدیک اس فائدے کا لحاظ نہ رہا اور وہ کام باقی رہ گئے، پھر رواج کے سبب رسم پڑ گئی، پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اگر کوئی شخص اس سے بہتر طریقہ اسی کام میں زیادہ فائدے کا نکالے تو کوئی اس کو نہ مانے۔ مثلاً اگلے عقل مندوں نے مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکا کر خیرات کرنا مقرر کیا تھا، اصل مسئلے کے مطابق صدقہ خیرات رشتہ مند محتاجوں کو پہلے دینا چاہیے، سو وہ لوگ محتاج ناتے والوں کو وہ خیرات کا کھانا اول دیا کرتے تھے، کیونکہ بھوکے کو کھانا کھلانا بڑا ثواب ہے اور قرابت والے کو کھلانا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی ہے، پھر رفتہ رفتہ یہ نوبت پہنچی کہ اس کھانے میں اب خیرات وثواب کا لحاظ مطلق نہ رہا، لوگ فقط رسم ورواج کے سبب کھانا پکا کر برادری میں حصے مقرر کر کے تقسیم کرتے ہیں۔ وہ رشتہ دار گو غنی اور دولت مند ہو، مگر کھانے کا حصہ نہ پہنچنے پر شکوہ کرتا ہے۔ پھر اگر کوئی خیرات صدقے کا نام لے کر کرے تو بعض غیرت دار قبول نہ کریں اور وہ کھانا نہ لیں تو اب یہ رسم ٹھہر گئی، خیرات صدقہ نہ رہا۔

غیر شرعی رسوم:

پھر اب اگر کوئی نقد یا کپڑا خیرات کر کے یا اور طرح سے مُردے کو ثواب پہنچائے اور رسم کے طور پر کھانا نہ کرے تو اتنا مطعون ہو کہ نہ کرنے پر اتنا مطعون نہ ہو۔ اسی طرح کھانے پر فاتحہ پڑھنا اور شادی وغمی میں رسوم کرنا رائج ہوگیا ہے، مثلاً اگر کوئی فرنگی یا چمار یا بھنگی کے گھر کا کھانا کھائے یا پانی پی لے تو مطعون ہو اور ہنود کے گھر کا کھانا پانی کوئی برا نہیں سمجھتا، سبب یہ ہے کہ اُس کا رواج نہیں اور اس کی رسم پڑ گئی ہے، حقیقت میں دونوں ایک ہیں، یا اگر کوئی مسلمان دکان دار کنہیا کا جنم کرے تو مطعون ہو، جب کہ دوسری طرف مسلمان کہلاتے ہوئے اپنے گھر دیوالی ہولی کرتے ہیں تو کوئی برا نہیں سمجھتا، اس کا سبب یہ ہے کہ اس کا رواج نہیں اور اس کی رسم پڑ گئی ہے، حقیقت میں دونوں ایک ہیں، یا اگر کوئی اپنے لڑکے کو جنیو[1] پہنائے تو مطعون ہو اور لڑکوں کی چوٹیاں رکھتے ہیں،

[1] جنیو یا زُنّار: یہ اس دھاگے کو کہتے ہیں جس کو ہندو برہمن اپنے گلے میں لگاتے ہیں اور مجوس اپنی کمر میں باندھتے ہیں۔ (کریم اللغات، ص: ۸٤، فیروز اللغات، ص: ۳۷۰)

لیکن کوئی برا نہیں سمجھتا، یا اگر کوئی عیسیٰ علیہ السلام کے تولد کے دن محفل کرے تو مطعون ہو اور مولود شریف کی محفلیں کرتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے۔ وجہ یہی ہے کہ اُس کا رواج نہیں اور اِس کی رسم پڑ گئی ہے، حقیقت میں دونوں ایک ہیں، یا اگر کوئی خچر اور گدھے پر چڑھے تو مطعون ہو اور چھوٹے ٹٹو پر سوار ہو تو کوئی برا نہ سمجھے، یا اگر کوئی کسی مرد کے لیے ایک کسبی علاحدہ مکان میں بلائے تو بھڑوا ٹھہرے اور مطعون ہو اور یہ جو یار لوگ سیکڑوں مردوں کے لیے طائفے کے طائفے ایک مکان میں جمع کرتے ہیں ان کو کوئی برا نہیں سمجھتا، یا اگر کوئی عورت کسی مرد کو زنا کرنے کے لیے نوکر رکھے تو تعجب آئے اور مطعون ہو اور اگر کوئی مرد کسی عورت کو زنا کے لیے نوکر رکھے تو کوئی ویسا برا نہ سمجھے یا اگر کوئی عورت اپنا سر منڈوائے تو تعجب آئے اور مطعون ہو اور مرد ڈاڑھی منڈوائے تو اتنا تعجب نہ ہو، یا اگر کوئی عورت گھوڑے پر سوار ہو اور ہتھیار باندھے تو انگشت نما اور مطعون ہو اور مرد جو مہندی مِسّی لگائے، سرخ کپڑے، انگوٹھی، چھلّے پہنے، کلی دار پاجامہ پہنے تو کوئی اس کو برا نہ سمجھے، یا اگر کوئی سور یا گدھا یا کتا کھائے تو مطعون ہو اور لوگ شراب، سود اور رشوت کا مال کھاتے پیتے ہیں کوئی برا نہیں سمجھتا، یا مسلمان اپنے آپ کو پنڈت و دیوتا کہلائے تو مطعون ہو اور ٹھاکر و کنور کہلائے تو کوئی برا نہ سمجھے، یا اگر کوئی آدمی کے چرکین سے گھر لیپے پوتے تو مطعون ہو اور ڈھوروں کے چرکین سے مکان لیپتے بلکہ روٹی پکاتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے، یا اگر کوئی شخص بند کوٹھری میں سوتا ہو اور کوئی اس کوٹھری کی چھت پر بیٹھ کر اس کو راگ سنائے اور اس سے کچھ عرض معروض کرے اور جانے کہ اگرچہ وہ سوتا ہے مگر سنتا ہے تو لوگ اس کو احمق بتائیں اور مسخرہ بنائیں اور مطعون کریں اور مردوں کی قبروں پر گاتے ہیں اور ان سے عرض معروض کرتے ہیں تو اسے کوئی برا نہیں سمجھتا، یا اگر کوئی کسی کو مسجد یا بیت المقدس یا قرآن کہے تو مطعون ہو اور قبلہ و کعبہ کہتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے، یا اگر کوئی سلام کی جگہ عبادت یا پوجا کہے تو تعجب آئے اور مطعون ہو اور بندگی کہتے ہیں اور بعض عبودیت لکھتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے۔

اگر کوئی لکڑی یا کپڑے پر فاتحہ دلائے تو مطعون ہو اور کھانے اور مٹھائی پر فاتحہ دلاتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے، یا اگر کوئی غیر آدمی کسی کے گھر میں چلا آئے اور پردہ نشین عورت سامنے ہو تو مطعون ہو اور دیور و جیٹھ اور خاوند کے بھانجے بھتیجے جوان گھروں میں بے پردہ جاتے ہیں اور عورتیں ان کے سامنے ہوتی ہیں اور کوئی برا نہیں سمجھتا، یا اگر کوئی کسی فرنگی کو اپنی بیٹی دے تو مطعون ہو اور رافضیوں کو اپنی بیٹیاں دیتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے، یا اگر کوئی کسی انگریز کی نوکری کرے تو مطعون ہو اور ہندوؤں کی نوکری

کرتے ہیں اور برا نہیں جانتے۔ بعض جگہ اگر کوئی ہنود کی نوکری کرے تو مطعون ہو اور نصاریٰ کی نوکری کرتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے، یا اگر کوئی نجوم وانگریزی پڑھے تو مطعون ہو اور ریاضی، منطق، ہیئت پڑھتے ہیں اور برا نہیں سمجھتے۔ ان سب مواضع میں سبب یہی ہے کہ اُن کا رواج نہیں اور یہ رسمیں پڑ گئی ہیں۔

رسوم کی بنیاد:

الغرض اسی طرح کی ہزاروں رسمیں ہیں جن میں ایک جہان گرفتار ہے اور رواج کے سبب اس کی برائیاں خیال میں نہیں آتی ہیں، حالانکہ ان سب رسوم وعادات کی بنیاد سفاہت و بے عقلی اور عاقبت نااندیشی پر ہے۔ جس کو اللہ نے عقلِ مستقیم اور قلبِ سلیم بخشا ہے، وہ جانتا ہے کہ "ما أشبه الليلة بالبارحة" یہ رات، گذشتہ رات سے کتنی مشابہ ہے۔ پھر اگر کوئی عالم دیندار یا عارف تقویٰ شعار سمجھائے تو اس کو وہی جواب ملتا ہے جو اگلے کافر کہتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۷۰]

[اور جب کبھی ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو ان ہی رسموں پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، گو ان کے آبا واجداد نہ عقل رکھتے ہوں اور نہ راہ کی خبر]

کیسی مسلمانی؟

نبی اکرم ﷺ جب کافروں کو سمجھاتے کہ شرک وبدعت کی رسمیں جو تم میں رائج ہیں، ان کو چھوڑو اور قرآن پر چلو، جسے اللہ نے اتارا ہے تو وہ یہی عذر بدتر از گناہ پیش کرتے۔ اس بے عقلی کا کیا ٹھکانا ہے کہ دین میں تو باپ دادوں کی رسم و راہ کو سند پکڑیں اور دنیا میں ان کے فعل کو حجت نہ ٹھہرائیں؟ حالانکہ دنیا کا فائدہ کچھ چیز نہیں ہے اور دین کی تحقیق نہ کرنے میں ایمان برباد ہو جاتا ہے، مثلاً کسی بزرگ نے ایک بار کپڑے کی سوداگری میں نقصان اٹھایا ہو تو وہ راہ اس کی اولاد اختیار نہ کرے گی، یا کسی کا باپ بے راہ دریافت کیے چلا تھا اور بہک گیا تو اس کا بیٹا وہ راہ نہ چلے گا، تو جس مقام پر دنیا کا نقصان ہو، آدمی وہاں باپ دادے کی راہ چھوڑ دیتا ہے تو دین کے نقصان میں تو چاہیے کہ اور بھی زیادہ اس راہ کو چھوڑ دے۔ عجب مسلمانی ہے کہ اللہ و رسول کی راہ و رسم چھوڑ کر باپ

دادے کی راہ و رسم کو مقدم کرتے ہیں، اگرچہ باپ دادے کی رسم بے عقلی و گمراہی ہی کی ہو، مگر کبھی نہ چھوڑیں اور اس کے مقابلے میں اللہ و رسول ﷺ کی راہ کو جس میں دین و دنیا دونوں کا فائدہ یقینی ہے، کبھی اختیار نہ کریں اور پھر دعویٰ مسلمانی کا کیے جائیں؟!

جہالت کی نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ لڑکیوں کو قرآن و مسائل نہیں سکھاتے کہ ہمارے بزرگوں سے یوں ہی چلا آیا ہے کہ عورتوں کو کچھ پڑھاتے نہیں، یہ بات بعینہٖ ہنود والی ہے کہ ان کے یہاں بھی عورتوں کو مسائل پڑھنا منع ہے۔

باپ دادے کو حجت بنانا کفر ہے:

بالجملہ آیت مذکورہ سے معلوم ہوا کہ باپ دادوں کی رسمیں اختیار کرنا اور قرآن وحدیث کے مقابلے میں حجت پکڑنا کفر کی بات ہے، جس پر اللہ نے اگلے کافروں کو الزام دیا ہے اور فرمایا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوهَآ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَ نَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ﴾ [الزخرف: ٢٣]

[اور اسی طرح آپ سے پہلے بھی ہم نے جس بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا وہاں کے آسودہ حال لوگوں نے یہی جواب دیا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک دین پر پایا اور ہم تو انھیں کے نقوشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں]

معلوم ہوا کہ ہر پیغمبر کی امت کے بڑے اور آسودہ حال لوگ یہی کہتے چلے آئے ہیں اور ان پر باپ دادوں کے رسومات کا چھوڑنا ازبس دشوار اور ناگوار تھا۔ اسی سبب سے ان پر اللہ کا غضب اترا تھا، یہاں تک کہ ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا، یہی حال آج کل کے جھوٹے مسلمانوں کا ہے کہ آثارِ آبا کے پیروکار ہیں اور اللہ کے غضب سے بالکل بے خوف ہو گئے ہیں۔ ان میں اور اگلے کافروں میں اتحادِ کلمہ کی وجہ سے کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ نیز فرمایا:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيْطٰنٍ مَّرِيْدٍ ۝ كُتِبَ عَلَيْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَ يَهْدِيْهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيْرِ﴾ [الحج: ٣، ٤]

[اور بعض لوگ اللہ کے بارے میں بے علمی کے ساتھ باتیں بناتے ہیں اور ہر سرکش شیطان کی پیروی کرتے ہیں جس پر قضائے الٰہی لکھ دی گئی ہے کہ جو کوئی اس کی رفاقت

کرے گا وہ اسے گمراہ کر دے گا اور اسے آگ کے عذاب کی طرف لے جائے گا]

یعنی بعضے آدمی ایسے ہیں کہ اللہ کا حکم سن کر اس میں چوں و چرا کرتے ہیں اور حجت وتکرار اٹھاتے ہیں، حالانکہ ان کو خبر نہیں ہے کہ ہم کہاں سے کہتے ہیں اور کیا بکتے ہیں۔ سو وہ لوگ شیطان کے ساتھی ہیں۔ ان کا انجام دنیا میں گمراہی اور مرنے کے بعد دوزخ ہے۔ مسلمان پر فرض ہے کہ سارے ناجائز رسومات کو ترک کر دے اور کافروں کی راہ اختیار نہ کرے اور برادری کے لوگوں کے برا ماننے اور طعن کرنے کا لحاظ نہ رکھے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی طرف کی شاباشی لے، اگر برادری چھوٹے گی تو اللہ اور رسول کا ساتھ ہوگا۔

سات غیر شرعی رسمیں:

وہ رسمیں جو خواص وعوام میں مروج ہیں، ان سب کا اس جگہ ذکر کرنا مشکل ہے۔ ''تقویۃ الایمان'' حصہ دوم میں جس کا ترجمہ ''تذکیر الاخوان'' ہے، اس مقام پر سات رسموں کی برائی قرآن وحدیث سے نقل کی گئی ہے۔ ایک راگ باجا سننا۔ دوسرے اپنے نسب پر فخر کرنا۔ تیسرے آپس میں ایک دوسرے کی حد سے زیادہ تعظیم کرنا۔ چوتھے مہر گراں مقرر کرنا اور شادیوں میں بے جا صرف کرنا۔ پانچویں بیوہ عورت کا دوسرا نکاح نہ کرنا۔ چھٹے مصیبت میں چلانا اور مدت تک سوگ میں بیٹھنا۔ ساتویں بہت سی زینت کرنا۔ ان رسوم کا بیان ساڑھے چار جزو میں لکھا ہے۔ اس جگہ اشارتاً ایک دو آیت وحدیث پر اجمالاً اقتصار کیا جاتا ہے، تفصیل کے لیے ''تذکیر الاخوان'' دیکھیں۔ اس کتاب (تذکیر الاخوان) کے مولف و مترجم مولوی محمد سلطان مرحوم رحمہ اللہ بڑے موحد، اور خوش عقیدہ عالم دیندار تھے۔ میرے والد مغفور کے دوست اور ارادت مند تھے۔ بنا بریں کتاب مذکور میں چند اشعار والد مرحوم کے رسالہ سنت کے نقل بھی کیے ہیں۔ میں نے ان کے معتقدانہ ومحبانہ خطوط بنام والد ماجد گھر کے کتاب خانے میں بہت سے پائے۔ جزاهما الله تعالىٰ عنا خيرا.

بالجملہ پہلی رسم راگ باجا سننا ہے:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِغَيْرِ

عِلْمٍ وَّ يَتَّخِذَهَا هُزُوًا أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴾ [لقمان: ٦]

[اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو لغو باتوں کو مول لیتے ہیں کہ بے علمی کے ساتھ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہکائیں اور اس کو ہنسی کھیل بنائیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے رسوا کرنے والا عذاب ہے]

''لہو الحدیث'' کی تفسیر راگ ہے یا قصے کہانیوں کی کتابیں۔

① حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً فرمایا ہے:

«اَلْغِنَاءُ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الزَّرْعَ»[1]

اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔ یعنی راگ سے دل میں نفاق پیدا ہوتا ہے جس طرح پانی سے کھیتی اگتی ہے۔ جس کو پیغمبر نفاق کہیں اس راگ میں شوقِ الٰہی کہاں سے آ سکتا ہے؟ جو کوئی اس کا دعویٰ کرے وہ بڑا جھوٹا ہے۔

② ایک بار ابن عمر رضی اللہ عنہما نے راہ میں مزمار (باجے کی آواز) سنی تو اپنے کان میں انگلی ڈال کر راستے سے الگ ہو گئے اور کہا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا، آپ نے بانسری کی آواز سن کر ایسا ہی کیا تھا۔ اس کو ابو داؤد اور احمد نے طویل سیاق کے ساتھ روایت کیا ہے۔[2]

③ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ نے شراب، جوئے اور کوبہ کو حرام کیا ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔[3]

''کوبہ'' اس باجے کو کہتے ہیں جو دونوں طرف سے منڈھا ہو، جیسے ڈھول ڈھولک اور ہڑک، اس سے معلوم ہوا کہ ڈھولک جیسا باجا بجانا اور سننا حرام ہے۔

④ حدیثِ ابی امامہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«أَمَرَنِي رَبِّي بِمَحْقِ الْمَعَازِفِ وَالْمَزَامِيرِ وَالْأَوْثَانِ وَالصُّلُبِ وَأَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ»[4]

---

① شعب الإيمان للبيهقي (٤/ ٢٧٩) اس کی سند میں ''عبداللہ بن عبدالعزیز'' راوی ضعیف ہے، البتہ یہ روایت سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً صحیح مروی ہے۔ دیکھیں: شعب الإيمان (٤/ ٢٧٨) السلسلة الضعيفة (٢٤٣٠)

② مسند أحمد (٢/ ٨) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢٤)

③ شعب الإيمان للبيهقي (٩/ ٣٤٣) نیز دیکھیں: سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٦٨٥)

④ مسند أحمد (٥/ ٢٧٥) اس کی سند میں ''علی بن یزید'' راوی سخت ضعیف ہے۔

اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔ یعنی میرے رب نے مجھ کو تار اور نے کے باجوں کو مٹانے، بتوں اور صلیبوں کو توڑنے اور جاہلیت کے کاموں اور رسموں کے دفع کرنے کا حکم دیا ہے۔

تار کے باجے جیسے ستار، طنبورہ، سرود، سرنگی، چکارا، بین، رباب وغیرہ، اور نَے کے باجے جیسے بانسری، الغوزہ، شہنائی، سرنائی، قرنائی، ترئی وغیرہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو حکم چلیپا اور امورِ جاہلیت اور بتوں کا ہے حرمت اور فنا کرنے میں وہی حکم ان باجوں کا ہے۔ یہ دو لفظ ایک ''معازف'' دوسرا ''مزامیر'' جملہ انواعِ ساز وسرود کو شامل ہیں، کوئی باجا ان سے باہر نہیں رہتا ہے، جیسے نوبت، نقارے، تاشے، مرفی، دائرہ، ربانہ، مجیرے، جھانجھیں، سارنگی، طبلہ، بین، باجا، ارگن، مچنگ۔

بعض پیر زادے راگ سننا عبادت جانتے ہیں۔ وہ ذوق وشوق سے یہ کام کرتے ہیں اور شیطان ان کے اندر وسوسے ڈالتا ہے۔ یہ نادان اس کو نورِ الٰہی تصور کرتے ہیں۔ سبحان اللہ! شیطانی کام میں شوق و ذوقِ الٰہی کا کیا ذکر؟ چیل کے گھونسلے میں گوشت کی دھڑ دوڑ! اگر انوارِ الٰہی ہوتی تو نماز وتلاوتِ قرآن اور سماعتِ حدیث میں طاری ہوتی نہ کہ ان خرافات وممنوعاتِ محرمات میں۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون.

دوسری رسم:

نسب پر فخر کرنا ہے، خصوصاً شیخ، سید، مغل، پٹھان، علی الخصوص پیر زادے مولوی، حالانکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سارے سید، شیخ، مغل، پٹھان، جولاہے، ترکاری بیچنے والے، قسائی، موچی، تنبولی، چوڑے، چمار، دولت مند، مفلس، نیک، بد، کافر، مسلمان؛ سب لوگ ایک ماں باپ آدم وحوا علیہما السلام کی اولاد ہیں۔ کوئی نیک ہوا کوئی بد، پھر ہر کسی نے ایک پیشہ اختیار کر لیا، چنانچہ خود آدم علیہ السلام کپڑا بُنتے اور کھیتی باڑی کرتے تھے۔ ادریس علیہ السلام کپڑا سیتے اور نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ ابراہیم ولوط علیہما السلام کھیتی باڑی کرتے۔ صالح وہود علیہما السلام تجارت کرتے۔ حضرت داود علیہ السلام لوہاری کرتے اور زرہ بناتے۔ سلیمان علیہ السلام پنکھے بُنتے اور بوریا ٹوکرا بناتے۔ شعیب علیہ السلام بکریاں اور بھیڑیں پالتے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ بزازی کرتے، عمر رضی اللہ عنہ خشت پزی کرتے، اسی طرح سب لوگ گزران کے واسطے کوئی نہ کوئی پیشہ اختیار کر لیتے تھے۔ جب آدم علیہ السلام کی اولاد ملک ملک پھیلی تو ہر کنبے کے لوگ اپنے بزرگ کے نام سے مشہور ہوئے، پھر وہی ان کی ذات ٹھہر گئی۔

اب یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ اور قوم کے لوگ مفلس مسلمان کو اپنے برابر نہیں بیٹھنے دیتے اور اگر کوئی دُھنیا جولاہا السلام علیکم کرے تو ناخوش ہوتے ہیں کہ اس نے ہم کو اپنے برابر جانا۔ یہ نہ جانا کہ وہ بھی ہمارا بھائی ایک آدم وحوا کی اولاد ہے۔ سو یہ فخر کرنا، اپنی ذات کی بڑائی بیان کرنا اور اپنے آپ کو بڑا جاننا کافروں کی رسم ہے اور قرآن وحدیث کی رو سے ممنوع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ﴾ [الحجرات: ۱۳]

[لوگو! ہم نے تم کو ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تم کو قوموں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹ دیا ہے تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ تم میں پرہیز گار ہے]

یعنی ذاتیں فقط تعارف اور پہچان کے لیے ہیں۔ بزرگی اور بڑائی اللہ کے نزدیک محض تقویٰ میں ہے۔ جو بڑا متقی ہے، وہی بڑا بزرگ ہے، اگرچہ کم ذات ہو۔ جس کو اللہ کا ڈر نہیں ہے، وہ بدتر ہے، اگرچہ عالی ذات ہو۔ پرہیز گار موچی، دُھنیا، جولاہا، کسی فاسق شیخ، سید، پٹھان مغل سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ رہا نکاح میں کفاءت کا اعتبار تو وہ فقط اس لیے ہے کہ مرد عورت میں موافقت رہے اور گھر میں فساد نہ پڑے۔ بالغہ عورت اگر اپنا نکاح کسی غیر کفو سے آپ کر لے تو اس پر کسی کو اختیار نہیں کہ فسخ کرے، لہٰذا اس سے ذات کی کوئی بڑائی نہیں ثابت ہوتی۔ کفاءت میں جیسا ذات کا لحاظ ہے ویسا ہی دین داری و مال داری کا بھی لحاظ ہے، اس کے سوا ذات کا لحاظ مسئلے کی رو سے فقط عرب کے لوگوں کے لیے ہے، ان کے سوا کسی اور کے لیے نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ یَوْمَئِذٍ وَّلَا یَتَسَآءَلُوْنَ﴾

[المؤمنون: ۱۰۱]

[پس جبکہ صور پھونک دیا جائے گا اس دن نہ تو آپس کے رشتے رہیں گے اور نہ آپس کی پوچھ گچھ]

یعنی قیامت کے دن کسی کے نسب وذات کا کچھ لحاظ نہیں کیا جائے گا، بلکہ کم ذات متقی کی عزت صاحبِ نسب بدکار سے زیادہ ہوگی۔ غلام بہشت میں جائے گا اور آقا دوزخ میں ہوگا۔ فرمایا:

﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ﴾ [النجم: ٣٢] یعنی تم اپنے آپ کو اچھا نہ کہو۔ بڑائی نہ کرو، بے عیب ذات اللہ کی ہے، ورنہ ہر آدمی میں کچھ نہ کچھ تھوڑا بہت عیب لگا ہوا ہے۔

1 حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے:

«مَنْ بَطَّأَ بِهِ عَمَلُهُ لَمْ يُسْرِعْ بِهِ نَسَبُهُ»[1] (رواہ مسلم)

[جس کا عمل اسے پیچھے کر دے گا اس کا نسب اسے آگے نہ کرے گا]

یعنی دنیا و آخرت میں عمل کام آتا ہے، ذات کام نہیں آتی ہے۔

2 حدیثِ ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ میں فخر بالاحساب اور طعن فی الانساب کو امرِ جاہلیت فرمایا ہے۔[2] اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔ یعنی یہ کفر کی عادت ہے۔

3 حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«فَخِيَارُكُمْ فِي الْجَاهِلِيَّةِ خِيَارُكُمْ فِي الْإِسْلَامِ إِذَا فَقِهُوا»[3]

یعنی تم میں سے جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہ اسلام میں بھی اچھی حالت میں ہیں جب وہ دینی مسائل سے واقف ہو جائیں۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔

4 عیاض مجاشعی رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ نے مجھے وحی کی ہے کہ تم خاکساری اور عاجزی کرو، یہاں تک کہ کوئی شخص کسی شخص پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر بڑائی نہ کرے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[4]

یعنی جب سب کی اصل مٹی ٹھہرے تو اب بعض کا بعض پر فخر کرنا کیا ہے؟ جتنی خاکساری ہو وہی بہتر ہے۔

دیکھا تو خاکساری عالی مقام ہے
جوں جوں بلند ہم ہوئے پستی نظر پڑی

5 ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے مرے ہوئے باپ دادوں پر فخر

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٩٩)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٥٠٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٢٦)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٦٥)

کرنے سے باز آئیں۔ وہ تو جہنم کے کوئلے ہوں گے یا وہ اللہ کے نزدیک گبریلے سے خوار تر ہیں جو گوبر کو اپنی ناک سے لڑکاتا ہے۔ اللہ نے تم سے کفر کے وقت کی نخوت اور باپ دادوں پر فخر کرنے کو دور کر دیا۔ اب تو دو ہی طرح کے آدمی ہیں: متقی پرہیزگار یا گناہ گار بدبخت بدکردار۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس کو ترمذی اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے۔[1]

باپ دادوں میں کچھ اگلے کافر مشرک بھی گزرے ہیں۔ وہ دوزخ کے کوئلے ہو گئے، اب ان پر فخر کرنا حماقت ہے، بلکہ ایسے باپ دادوں کا نام لینا ہتک اور عار ہے۔ مومن کے لیے یہی فخر کی بات ہے کہ پرہیزگار ہو۔ گناہ گار کے لیے بدکاری بدبختی ہے۔

6 حدیثِ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ حسب مال ہے اور کرم تقویٰ ہے۔ اس کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی ساری بزرگی پرہیزگاری میں ہے نہ کہ ذات بھانت میں اور مال دنیا کی آبرو ہے۔ اگر آدمی مال دار ہے تو پھر کوئی اس کی ذات نہیں پوچھتا اور محتاج میں سو طرح کے عیب نکالتے ہیں۔

7 عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں فرمایا ہے کہ یہ تمھاری ذاتیں اس لیے نہیں ہیں کہ اوروں کو برا کہو۔ تم سب آدم کی اولاد نقصان میں ایک دوسرے کے برابر ہو، کسی کو کسی دوسرے پر بڑائی نہیں، مگر دینداری اور پرہیزگاری سے۔ آدمی کو برا ہونے کے لیے کفایت کرتا ہے بے ہودہ، بدزبان اور بخیل ہونا۔ اس کو احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔[3]

یعنی کسی کا نسب برا نہیں کہ اس پر طعن کیا جائے اور نہ کسی کا نسب افضل ہے جو وہ اپنے آپ کو بڑا جانے۔ سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ اگر ایک میں کچھ نقصان ہے تو دوسرے میں بھی وہی نقصان ہے، مگر ہاں جو لوگ متقی ہیں وہ فاسق سے بہتر ہیں۔ لوگ دو باتوں پر اکثر طعن کرتے ہیں۔ ایک کسی کی اگلی پشت میں اگر کوئی غلام تھا یا کسی کی نانی دادی لونڈی تھی تو اس کو ذلیل و حقیر جانتے ہیں، حالانکہ یہ بات محض بے ہودہ ہے۔ یوسف علیہ السلام کو لوگوں نے بیچا تو وہ ایک کافر کے غلام تھے، پھر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥١١٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٩٥٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٢٧١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٢١٩)

[3] مسند أحمد (١٥٨/٥) شعب الإيمان للبيهقي (٢٩٢/٤)

سات برس کا قحط پڑا، ساری مخلوق ایک دوسرے کے ہاتھ بک گئی اور ایک دوسرے کا غلام ہو گیا تھا۔ اس کے دادے سگو دادے غلام ہو چکے ہیں۔ اسماعیل علیہ السلام پیغمبر کی ماں ہاجرہ باندی تھیں، سو انھیں کی اولاد میں تمام قریش ہیں۔ شہر بانو حسین رضی اللہ عنہ کی زوجہ جہاد میں پکڑی آئیں، اکثر سادات انھیں کی اولاد ہیں۔ خلفاے عباسیہ کی مائیں غالباً امہات الاولاد تھیں۔ جو کوئی کسی کی لونڈی غلام ہونے پر طعن کرے، تو وہ گویا اپنے بزرگوں پر طعن کرتا ہے۔

طعن کا دوسرا سبب پیشہ ہے، حالانکہ اکثر پیشے انبیا اور اولیا سے چلے آتے ہیں۔ ہمارا رسالہ "رفو الخرقة بشرف الحرفة" اسی بیان میں ہے۔ پیشوں کو حقیر سمجھنا معاذ اللہ انبیا و اولیا کو حقیر جاننا ہے۔ اس مقام پر مولف "تذکیر الاخوان" نے بتیس (۳۲) شعر "راہِ سنت" سے لکھے ہیں۔[1]

تیسری رسم:

ایک دوسرے کی تعظیم میں افراط کرنا، حالانکہ بعضے تعظیم ایسی ہوتی ہے کہ اس کے کرنے میں اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے ادبی ہوتی ہے، جیسے بادشاہ یا پیر کو سجدہ کرنا، ہاتھ باندھ کر چپ چاپ کھڑے رہنا، کسی کے سلام میں جھکنا اور کسی کو بندگی کہنا، غریب پرور، عادل زماں، روشن لکھنا اور اسی طرح کے دیگر محرم یا مکروہ الفاظ کہنا یا اپنے آپ کو کسی کا بندہ یا پرستار کہنا اور خداوند خداے گان اور قبلہ وکعبہ دو جہاں کہنا۔ بہت سے لوگ یہ الفاظ کفار فجار اور فساق کے حق میں لکھتے بولتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة: ١١]

[اب بھی اگر یہ توبہ کریں اور نماز کے پابند ہو جائیں اور زکات دیتے رہیں تو تمھارے دینی بھائی ہیں]

اخوت اس برتاو کے خلاف ہوتی ہے، اس سے آگے بڑھنا گناہ یا شرک یا کفر یا بدعت میں قدم رکھنا ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ﴾ [التوبة: ٧١]

[1] تذکیر الإخوان (ص: ۱٦۸، دوسرا نسخه، ص: ۲۸۲) یہ منظوم کتاب "راہِ سنت" مولف رحمہ اللہ کے والد سید اولاد حسن رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔

[مومن مرد اور عورت آپس میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں]

نیز فرمایا:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ إِخْوَةٌ﴾[التوبة: ۷۱][سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں]

پھر جب مسلمان کے لیے یہ بات ہے تو کافر کو ایسا سمجھنا چاہیے، جیسے گدھے کتے کو جانتے ہیں یا چوڑے چمار کو سمجھتے ہیں۔

① حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں جھکنے اور بوسہ لینے سے منع کیا ہے اور مصافحہ کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ ملاقات کے وقت مصافحے کے سوا جھک کر سلام کرنا اور لپٹ جانا اور اس کے ہاتھ پاؤں یا پیٹھ کو بوسہ دینا درست نہیں ہے، پھر کافر، فاسق اور منافق کے لیے تو یہ کام بدر جہا بدتر اور ممنوع ہے۔

② سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی شخص محبوب نہ تھا، لیکن جب صحابہ کرام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آتا دیکھتے تو کھڑے نہ ہوتے، کیونکہ وہ یہ جانتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس قیامِ تعظیمی کو مکروہ رکھتے ہیں اور اس سے ناخوش ہوتے ہیں۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[2]

پھر جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بری لگے، اس بات کو کوئی مسلمان کیوں پسند کرے اور عادتِ صحابہ کے خلاف رسم کیوں جاری کرے؟ ہاں جگہ خالی کرنے یا استقبال کے لیے اٹھنا اور بات ہے۔

③ حدیثِ معاویہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ جس شخص کو یہ بات خوش آئے کہ لوگ اس کے روبرو تصویر کی طرح کھڑے رہیں، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں کر لے۔[3]

معلوم ہوا کہ کسی شخص کی محض تعظیم کے لیے اس کے روبرو کھڑے رہنا درست نہیں ہے اور جس کو یہ پسند ہو وہ دوزخی ہے۔

④ حدیثِ ابو امامہ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لاٹھی پر ٹیک لگائے ہوئے آئے تو ہم کھڑے ہو گئے۔ فرمایا: مت کھڑے ہو، جس طرح دوسرے ملکوں کے لوگ ایک دوسرے کے لیے

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۸۸۳)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۵۵) امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ''حسن صحیح'' کہا ہے۔

[3] مسند أحمد (۹۱/٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (۵۲۲۹) سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۷۵٤)

کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[1]

قیامِ تعظیم میں یہ ممانعت نص قطعی ہے۔

⑤ نیز حدیثِ عمر رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے:

«لَا تُطْرُوْنِي كَمَا أَطْرَتِ النَّصَارىٰ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهٗ فَقُوْلُوْا: عَبْدُ اللّٰهِ وَرَسُوْلُهٗ»[2] (رواه الشيخان)

یعنی مجھ کو مت بڑھاؤ جس طرح عیسائیوں نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو بڑھایا۔ میں تو اس کا بندہ اور مملوک ہوں۔ تم مجھ کو یہی اللہ کا بندہ اور رسول کہو۔

یہ اس لیے کہ بشر کے حق میں پیغمبری سے بڑا کوئی رتبہ نہیں ہے۔ سارے مرتبے اس سے نیچے ہیں۔ آدمی رسول ہو کر بھی آدمی ہی رہتا ہے اور بندہ ہوتا ہے، اس میں کچھ خدائی کی شان نہیں آ جاتی اور نہ وہ اللہ کی ذات میں مل جاتا ہے۔

معلوم ہوا کہ جو لوگ پیروں اور بزرگوں اور بڑے آدمیوں کی نظم ونثر میں یا گفتگو میں زیادہ تعریف کرتے ہیں، تو یہ سب نصاریٰ کے رویے پر چلتے ہیں، جو اَدب وشرع کے طریقے سے باہر ہے۔

⑥ اسی لیے حدیثِ مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ جب تم مدح کرنے والوں کو دیکھو تو ان کے منہ میں خاک بھر دو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[3]

یعنی جو لوگ بزرگوں اور امیروں کی تعریف میں خوشامد سے مبالغہ کرتے ہیں تو خود بھی دیدہ ودانستہ جھوٹ بولتے ہیں اور جس کی تعریف کرتے ہیں وہ بھی مغرور ہو جاتا ہے، پھر ایسے شخص کو کچھ دینا تو کیا ایسے شخص کے منہ میں خاک بھر دے، تاکہ پھر ایسی حرکت نہ کرے۔

⑦ ابوبکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دوسرے شخص کی تعریف کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا: تیری خرابی ہو، تو نے اپنے بھائی کی گردن کاٹی۔ پھر فرمایا کہ تم میں سے جس کو کسی کی تعریف کرنی ہو تو اتنا کہے: «أَحْسِبُ فُلَانًا وَاللّٰهُ حَسِيْبُهٗ» یعنی میں فلاں سے نیک گمان ہوں اور اللہ اس کا حال خوب جانتا ہے۔ اگر خیال کرے کہ وہ شخص ایسا ہی ہے

---

① سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤٨٠٦)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٥) یہ حدیث صحیح مسلم میں نہیں ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠٢)

اور کسی کی اللہ پر تعریف نہ کرے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

یعنی ہر کسی کی حقیقت اللہ ہی جانے کہ اچھا ہے یا برا اور اس کا انجام نیک ہے یا بد، ہم کیا جانیں؟ پھر جو شخص جانے بغیر کسی کی تعریف کرے یا تعریف میں مبالغہ کرے تو گویا اس نے اس کی گردن ماری، کیوں کہ اس کو مغرور کر دیا اور دنیا وآخرت دونوں سے کھو دیا۔

⑧ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ جب کسی فاسق کی تعریف کی جاتی ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کو غصہ آتا ہے اور عرش کانپ جاتا ہے۔ اس کو بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔[2]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ یہ جو لوگ ڈاڑھی مونڈنے والے، بے نمازی، تارکِ زکات وحج وروزہ، شرابی وزانی یا راگ باجے کو عبادت سمجھنے والے، قبروں کے پوجنے والے اور پیر پرستوں، گور پرستوں کی تعریفیں کرتے ہیں، کوئی قصیدہ کہتا ہے، کوئی رباعی بناتا ہے، کوئی نثر لکھتا ہے، کوئی ویسی ہی خوشامد کرتا ہے، سو یہ سب اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ان کی ایسی تعریف کرنے سے اللہ کا عرش کانپ جاتا اور زلزلے میں آجاتا ہے، پھر جو کوئی کسی کافر کی تعریف ومدح کرے تو اس کا کیا ذکر ہے؟

⑨ حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ اللہ کا قیامت کے دن اس آدمی پر سخت غصہ ہوگا اور نہایت خبیث ہے وہ آدمی جو ملک الاملاک یعنی شاہنشاہ کہلاتا تھا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[3]

یہی حکم لفظ جہاں پناہ، شاہجہاں، مہاراج اور ملک الملوک کا ہے۔ پھر جو شخص اس کو یہ الفاظ کہے وہ بھی بڑا خبیث اور مغضوبِ الٰہی ہے۔ لفظ صاحبِ عالم وعالمیان بھی اسی قبیل سے ہے۔

⑩ دوسری روایت میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ غلام اپنے میاں کو رب نہ کہے، بلکہ سید کہے اور مولیٰ نہ کہے، کیونکہ تم سب کا مولا اللہ ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[4]

اسی طرح لوگوں کو بندہ نواز، غریب پرور اور مالک کہنا ممنوع ہے۔

⑪ حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ یوں نہ کہو کہ اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم چاہے، بلکہ یوں کہو کہ جو صرف اللہ چاہے۔ اس کو شرح السنۃ میں روایت کیا ہے۔[5]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠٠٠)

② شعب الإيمان (٤٥٤٤) اس کی سند میں ''ابو خلف'' راوی سخت ضعیف ہے۔

③ صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٤٣)

④ صحيح مسلم (٤٧/٧)

⑤ شرح السنة للبغوي (٣٦١/١٢)

معلوم ہوا کہ یوں کہنا کہ جیسا آپ چاہیں گے ویسا ہی ہو گا یا اللہ کے کرنے سے ہو گا یا تمھارے کرنے سے ہو گا، شرک ہے۔

⑫ دوسری حدیث میں یہ مروی ہے کہ منافق کو سید نہ کہو، اگر وہ سید ٹھہرے گا تو تم اپنے رب کو غصے میں لاؤ گے۔[1]

یعنی نام کے مسلمان کو سردار کہنے سے اللہ نا خوش ہوتا ہے، پھر جو لوگ کافروں اور نام کے مسلمانوں اور فاسقوں کو عرضیاں لکھا کرتے ہیں، پھر اس میں غریب پرور، حاکم عادل، منصف زماں، فلک رتبہ، سلیمان جاہ اور سکندر طالع لکھتے ہیں، سو ایسے الفاظ خدا کے سخط وغضب کے موجب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ادب کی توفیق بخشے۔

چوتھی رسم:

زیادہ مہر مقرر کرنا اور شادیوں میں بے جا اسراف کرنا ہے۔ جو رسمیں نکاح سے متعلق ہیں، وہ ہر ملک اور فرقے میں جدا جدا ہیں، مگر بعض رسوم کا چھوڑنا لوگوں پر دشوار ہے، جیسے شادی سے پہلے برادری کا کھانا کرنا، یہ ایک رسم ہوئی۔ دوسرے یہ کہ اگرچہ برات اسی شہر بلکہ اسی محلے میں ہو، مگر لڑکے والے برادری کا کھانا اور جو لوگ نکاح میں جمع ہوں، ان کے لیے ضرور تیار کریں گے۔ تیسرے دولہا کی پوشاک نارنجی یا سرخ یا زرد ریشم کی ہو۔ چوتھے یہ کہ ناچ رنگ مع باجے کے ہو۔ پانچویں نقارے، روشن چوکی، تاشے آتش ڈھول ہوں۔ چھٹے آتش بازی، انار پھلجھڑیاں وغیرہ تیار کرائی جائیں۔ ساتویں آرایش ہو، پھول، کھٹولے، مٹکیاں اور گھڑے وغیرہ ہوں۔ آٹھویں روشنی، بہت سے پنج شاخے اور مشعلیں وغیرہ ہوں اور لٹے بنے۔ نویں بہت سے جوڑے لڑکی والوں کی طرف سے شوہر کے رشتہ داروں کو دیے جائیں۔ دسویں شادی کی شب میں دولہا کا دلہن کے گھر میں جانا، پھر وہاں جلوہ، آرسی مصحف[2] اور ٹونے وغیرہ کا ہونا۔ گیارھویں مہر کا زیادہ مقرر ہونا جس کی نوبت ہزاروں لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ بارھویں شادی کے چوتھے روز شوہر کا اس عورت کے گھر جانا اور چوتھی کھیلنا۔ تیرھویں مرد وعورت کے ہاتھ میں کنگن باندھنا۔ چودھویں سہرا باندھنا۔

---

① مسند أحمد (٥/٣٤٦) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٧٧)

② یہ عقدِ نکاح کے بعد دولہا اور دلہن کو آئینہ اور قرآن دکھانے کی رسمِ قبیح کا نام ہے۔

پھر ان رسوم میں بعض کفر کی رسمیں ہیں، جیسے کنگنا، سہرا اور بعض حرام ہیں۔ جو اس کو اچھا جان کر خوش ہو، وہ کافر ہے مسلمان نہیں، جیسے ناچ۔ بعض مکروہ تحریمی ہیں، جیسے مرد کی پوشاک سرخ یا زرد ہو، نقارے، ڈھول، آتش بازی اور مرد کا گھر کے اندر بے گانہ عورتوں میں جانا کہ وہ انھیں اور یہ اس کو دیکھتی ہیں، پھر ان عورتوں کے ساتھ کھیلنا اور بھی زیادہ حرام ہے۔ ان میں بعض کام خلاف سنت ہیں، جیسے شادی سے پہلے کھانا کرنا اور آرایش، چوتھی اور مہر کا زیادہ مقرر کرنا۔ اگر نیت مہر دینے کی نہیں ہے تو وہ نکاح حکم زنا میں ہے۔ پھر ان سب رسموں کو لوگ لوازماتِ نکاح سے سمجھتے ہیں کہ ان رسوم کے بغیر نکاح بے حقیقت ہے، حالانکہ نکاح میں دو گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول اور کچھ مہر کا تقرر چاہیے اور کچھ نہیں۔ یہ اسراف جو شادی بیاہ میں ہوتا ہے، بالکل خلاف سنت اور حرام مطلق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ لَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَ كَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ [الإسراء: ٢٦، ٢٧]

[اور اسراف و بے جا خرچ سے بچو، بے جا خرچ کرنے والے یقیناً شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار کا بڑا ہی ناشکرا ہے]

یعنی مال اللہ نے اس لیے دیا ہے کہ اللہ کی مرضی کی جگہ میں خرچ ہو اور یہی مال کا شکر ہے، جبکہ شیطان چاہتا ہے کہ رایگاں بے کار خرچ ہو، تاکہ اللہ آدمی سے ناراض ہو اور یہی اللہ کی ناشکری ہے۔ سو بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ یہ اس بات پر دلیل ہے کہ شادی کے جو مصارف ایسے ہیں جس کا حکم اللہ و رسول ﷺ نے نہیں دیا ہے، وہ سب حرام ہیں۔ سودی قرض لے کر یا بھیک مانگ کر صرف کرنا اور بھی زیادہ حرام ہے، کیونکہ یہ دوہرا گناہ ہے۔ گناہ کے کام میں اگرچہ آدمی ثواب کی نیت کرے، مگر عذاب ہی ہوتا ہے اور گناہ کے کام میں ثواب سمجھنا بھی کفر ہے۔ نیز فرمایا:

﴿ وَ لَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ﴾ [الأنعام: ١٤١]

[اور اسراف نہ کرو یقیناً وہ اسراف کرنے والوں کو ناپسند کرتا ہے]

معلوم ہوا کہ مال کا بے جا خرچ کرنا حرام ہے اور مُسرف کو اللہ دوست نہیں رکھتا، بلکہ وہ اللہ کا مخالف ہوتا ہے اور اس کام میں برکت نہیں ہوتی، بلکہ نحوست آ جاتی ہے۔ ایسے نکاح سے جو اولاد پیدا

ہوتی ہے وہ بھی بد ہی ہوتی ہے۔

① عائشہ رضی اللہ عنہا سے مرفوعاً مروی ہے کہ بڑی برکت والا نکاح وہ ہے جو تکلیف میں سہل ہو۔ اس کو بیہقی نے روایت کیا ہے۔[1]

جس نکاح میں عورت تھوڑے مہر پر راضی ہو وہ نکاح مبارک ہوتا ہے۔ ایک کم بختی یہ ہے کہ لوگ مہر ادا نہیں کرتے، اسی سبب سے کمی وبیشی کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا، حالانکہ مہر قرض کے حکم میں ہے۔ مرنے کے بعد اگر مہر لیا جاتا ہے تو دوسرے رشتے دار ترکے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ میراث وفرائض کا باب بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اگر تھوڑا مہر ہو تو دینا آسان پڑے۔

② عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بیبیوں کا مہر ساڑھے بارہ اوقیہ (پانچ سو درہم) تھا۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[2]

اس حساب سے کچھ کم وبیش ایک سو چالیس روپے ہوتے ہیں۔[3] دوسرے مسلمانوں کی عورتوں کا اس سے بھی کم مہر ہونا چاہیے۔

③ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ اگر زیادہ مہر میں دنیا کے اندر کچھ بزرگی یا اللہ کے نزدیک تقویٰ ہوتا تو رسول اللہ ﷺ اس کے ساتھ اولیٰ تھے۔ اس کو احمد اور اہلِ سنن نے روایت کیا ہے۔[4]

یعنی جب دوسرے لوگ پیغمبر سے رتبہ وتقویٰ میں کم ہیں تو وہ کیوں زیادہ مہر مقرر کریں؟ اس میں کوئی خوبی نہیں ہے، ورنہ یہ شرف بھی رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہوتا۔

④ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا مہر چار ہزار درہم تھا۔[5] وہ بادشاہِ حبشہ نجاشی نے اپنی طرف سے مقرر کر دیا تھا۔

---

① مسند أحمد (٦/٨٢) السنن الكبرىٰ للبيهقي (٧/٢٣٥)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٦)

③ تذکیر الاخوان (ص: ۱۷۹) میں اسی طرح ہے۔ یہ حساب لین دین کے قدیم اندازے کے مطابق ہے۔ اب اس میں بہت اضافہ ہو چکا ہے۔ علامہ عبداللہ بن زید آل محمود اپنے خطبات (ص: ۱۰۳۴) میں فرماتے ہیں کہ پانچ سو درہم کی یہ مقدار اب سو ریال سے قدرے کم ہے۔ اس حساب سے موجودہ وقت میں یہ تقریباً دو ہزار روپے کے مساوی ہے۔ واللہ أعلم بالصواب۔

④ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٦) سنن الترمذي، رقم الحديث (١١١٤) سنن النسائي (٦/١١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٨٨٧)

⑤ سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٠٧)

چار ہزار درہم کے اب کم وبیش ایک ہزار ایک سو روپیہ ہوتے ہیں۔

پھر عام لوگ جو دس دس، بیس بیس ہزار یا لاکھ یا کروڑ یا زیادہ حق مہر باندھتے ہیں، یہ بالکل خلاف سنت ہے۔ آدمی کے ذمے اگر مہر قرض رہا اور وہ مر گیا تو جب تک مہر والی کو راضی نہ کرے گا بخشا نہیں جائے گا۔ مہر اور قرض میں کچھ فرق نہیں ہے، پھر زیادہ قرض لینے پر جرات کرنا دینداری سے دوری ہے۔

⑤ رسول اللہ ﷺ نے زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمے میں ایک بکری کا کھانا دیا تھا۔ اس کو شیخین نے انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1]

ولیمہ وہ کھانا ہے جو نکاح کے بعد ہو، پہلے کھانا کرنا لغو اسراف اور خلاف سنت ہے۔

⑥ صفیہ رضی اللہ عنہا کے ولیمے میں آپ ﷺ نے حیس (حلوہ) کھلایا تھا۔ یہ انس رضی اللہ عنہ سے صحیحین میں مروی ہے۔[2]

معلوم ہوا کہ جو کھانا یا حلوہ بے تکلف میسر ہو وہ کھلائے۔ برادری اور دو چار دوست آشنا کافی ہیں۔ زیادہ بکھیڑا نہ کرے کہ یہ بالکل خلاف سنت ہے۔

⑦ بعض ازواج کے ولیمے میں دو سیر ستو پر کفایت کیا تھا۔ اس کو بخاری نے صفیہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے۔[3]

پلاؤ، زردہ، متنجن، شیر مال، باقر خانی، فیرنی، وغیرہ تکلفات کا بکھیڑا کرنا اور عمدہ برنج اور رنج میں پڑنا لا حاصل ہے۔ چار جاہل خوش ہوئے تو کیا ہوا؟ اگر ناخوش ہوئے تو کیا فرق پڑتا ہے؟

⑧ حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ پہلے دن کا کھانا کھلانا حق ہے اور دوسرے دن کا سنت اور تیسرے دن کا ریا وسمعہ ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[4]

یعنی اول روز سنت موکدہ اور دوسرے روز دستور اور تیسرے دن کھلانا نام کے لیے ہوتا ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٢٨)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٣٦٥)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٧٢)

④ سنن الترمذي، رقم الحديث (١١٠٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٩١٥)

امرا کے گھروں میں تین دن سے بھی زیادہ مدت تک خوان بندی وغیرہ ہوا کرتی ہے، یہ بالکل درست نہیں ہے۔ ایسا کھانا کھانا ریا وسمعہ کی وجہ سے نادرست ہے۔

⑨ حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ جو لوگ بدلے اور نام کے لیے کھانا کریں تو ان کا کھانا قبول کیا جائے نہ کھایا جائے۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[1]

پانچویں رسم:

بیوہ عورت کو دوسرے نکاح سے باز رکھنا ہے، حالانکہ کنواری اور بیوہ کے نکاح کا حال وانجام نفع ونقصان میں ایک ہی ہے، پھر کنواری کے لیے جلدی کرنا اور بیوہ کو روکنا کیا معنی رکھتا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۳۲]

[اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو انھیں ان کے خاوندوں سے نکاح کرنے سے نہ روکو جب کہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں۔ یہ نصیحت ان کو کی جاتی ہے جنھیں تم میں سے اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر یقین وایمان ہو، اس میں تمھاری بہترین صفائی اور پاکیزگی ہے، اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے]

یعنی عدت کی مدت تین حیض یا تین مہینے مقرر ہے، سو جس عورت کو شوہر طلاق دے وہ عدت کے بعد اگر دوسرا نکاح دستور کے موافق کرنا چاہے تو اُس کے اولیا اس کو نہ روکیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے کئی طرح پر دوسرے نکاح کی تاکید فرمائی ہے۔ اول یہ کہ والی وارث اس کو نہ روکیں، بلکہ اور ترغیب دلائیں۔ دوسرے یہ کہ جو اس نصیحت کو نہ مانے اور برا جانے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کام میں ستھرائی ہے۔ جو شخص اس کو عیب جانے تو گویا وہ گندہ

---

[1] یہ حدیث مسند احمد میں نہیں ہے۔ اسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے شعب الإیمان (٥٦٦٧) میں روایت کیا ہے۔

اور ناپاک ہے۔ چوتھے یہ کہ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اب جو شخص یوں جانے کہ دوسرا نکاح کرنے میں بڑی بڑی قباحتیں ہیں تو وہ شخص گویا اپنے آپ کو اللہ سے زیادہ دانا جانتا ہے، پھر معاذ اللہ اس کے ایمان کا کیا ٹھکانا ہے؟

نیز فرمایا:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ اِنْ يَّكُوْنُوْا فُقَرَآءَ يُغْنِهِمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ﴾ [النور: ٣٢]

[جو عورتیں تمھاری برادری میں بیوہ ہو جائیں تو ان کو آپس میں بیاہ دو اور تمھارے جو غلام و لونڈی نیک ہوں کہ بیاہ ہو جانے سے تمھارا کام نہ چھوڑیں ان کو بھی بیاہ دو اگر وہ محتاج و فقیر ہوں گے تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ ان کی مفلسی و محتاجی جاتی رہے گی]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضروری نہیں کہ جب بیوہ خود درخواست کرے تب ہی اس کا دوسرا نکاح کیا جائے، بلکہ والی کو چاہیے کہ خود تدبیر کر کے شرع کے موافق اجازت لے، اگر وہ خود نکاح کرنا چاہے تو اس کو نہ روکیں۔ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ''اللہ ان کو غنی کر دے گا'' سے یہ ثابت ہوا کہ نکاح کرنے والے پر خاص رحمتِ الٰہی ہوتی ہے، اس لیے محمد ﷺ نے بھی دوسرے نکاح کی سخت تاکید فرمائی ہے۔ علی رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ تین کاموں میں دیر نہ کرنا۔ جب نماز کا وقت آ جائے اور جب جنازہ موجود ہو اور جب بیوہ عورت کا جوڑ مل جائے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

اگلی سب بیبیاں اور پیغمبرزادیاں اسی طرح کرتی آئی ہیں، چنانچہ رقیہ رضی اللہ عنہا دختر رسول اللہ ﷺ کا نکاح ثانی عثمان رضی اللہ عنہ سے ہوا، پھر ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح ہوا۔ یہ دونوں پہلے عتبہ و عتیبہ پسران ابولہب کے نکاح میں تھیں۔ ام کلثوم کا نکاح پہلے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ہوا، پھر ہر سہ پسران جعفر سے ہوا۔[2] امامہ دختر زینب رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بعد علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، پھر

---

[1] مسند أحمد (١/ ١٠٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧١)

[2] ان تینوں صاحبزادوں سے مراد عون، محمد اور عبداللہ بن جعفر ہیں۔ دیکھیں: كتاب المحبر (ص: ٤٣٧)

علی رضی اللہ عنہ کے بعد وصیتِ علی رضی اللہ عنہ کے مطابق مغیرہ بن نوفل[1] سے نکاح کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم[2] کی بیویوں میں عائشہ رضی اللہ عنہا کے سوا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی کے دوسرے اور کسی کے تیسرے خاوند تھے۔ یہی حال ازواج و دخترانِ رسول علیہ الصلاۃ والسلام اور ان کی نواسیوں اور سیدانیوں کا تھا۔

ام رومان مادر عائشہ رضی اللہ عنہا کا نکاح اول عبد اللہ بن سخبر سے ہوا تھا، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے ان سے عائشہ رضی اللہ عنہا پیدا ہوئیں۔ اسما بنت عمیس رضی اللہ عنہا پہلے جعفر رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں، پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا۔ ان سے محمد بن ابی بکر پیدا ہوئے۔ پھر ابو بکر رضی اللہ عنہ کے بعد انھوں نے علی رضی اللہ عنہ سے نکاح کیا۔ یہ حال شیخانیوں کا تھا جن سے شرافت کی بنیاد ہے، پھر جو کوئی ان کے کام اور رسم و عادت کو برا جانے تو اس کے ایمان میں نقصان ہے۔ وہ اشراف نہیں کمینہ ہے، اس لیے کہ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج، بنات، نواسیوں اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی بیبیوں سے کسی کی عزت، آبرو اور غیرت بڑھ کر نہیں، بلکہ ان کے برابر بھی نہیں ہے۔ اب اس کو عیب جاننے والا اور بے عزتی و بے غیرتی سمجھنے والا کافر ہے۔ ایسا شخص اپنے آپ کو شیخ سید شریف نہ سمجھے، بلکہ راجپوت رانگھڑ کہلائے اور مسلمانی کا نام نہ لے۔

چھٹی رسم:

یہ ہے کہ جب کوئی برادری میں مر جاتا ہے تو عورتیں چلا کر روتی پیٹتی ہیں اور جو عورت ماتم پرسی کو آتی ہے وہ بھی اس نوحے میں شریک ہوتی ہے، پھر کسی کے یہاں تین دن اور کہیں سات دن، دس روز یا چالیس دن کہیں کہیں چھ چھ ماہ تک یہی معمول رہتا ہے اور مُردے کا بیان کرتے ہیں، حالانکہ نوحہ کرنا حرام ہے اور سوگ یہ ہے کہ اچھے کپڑے نہ پہنے، خوشبو نہ ملے، سرمہ نہ لگائے، کسی کی شادی میں شریک نہ ہو اور اپنے گھر میں بیٹھی رہے۔ سو شرعاً جس عورت کا خاوند مر جائے وہ چار مہینے دس دن تک اپنا سنگار نہ کرے، اس کے بعد اس کے لیے ممانعت نہیں۔ خاوند کے سوا کسی دوسرے کے لیے تین دن سے زیادہ سوگ نہیں ہے۔ ماتم پرسی کی حقیقت اتنی ہی ہے کہ جب کسی کا کوئی مر جائے تو اس کے دوست آشنا رشتے داروں کو چاہیے کہ اس کے پس ماندگان کو تسلی اور دلاسا دیں اور سمجھا دیں کہ صبر کرو اور بے صبری سے ثوابِ آخرت برباد نہ کرو۔ ماتم پرسی بھی مرنے سے تین روز کے بعد لغو

---

[1] المعارف لابن قتيبة (ص: ١٤٢)

[2] المعارف لابن قتيبة (ص: ١٣٢)

اور بے ہودہ حرکت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرة: ١٥٣]

[صبر و نماز سے مدد لو یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ہمراہ ہے]

پھر فرمایا:

﴿ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ﴾ [البقرة: ١٥٥-١٥٧]

[اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیجیے جو کسی مصیبت آنے کے وقت کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو خود اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں، ان پر ان کے رب کی نوازشیں اور رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں]

انبیا علیہم السلام کی عادت یہی تھی کہ رنج و غم میں نماز پڑھنے لگتے تھے۔ جب سارہ علیہا السلام کو بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے گئے تو ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔[1] اسی طرح ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم تشویش اور غم کے وقت کیا کرتے تھے۔[2] پھر اہلِ صبر کو خوشخبری سنائی اور کہا کہ مصیبت کے وقت استرجاع کرو، ایسے لوگوں کو اللہ کی شاباشی ہے اور مہربانی اور وہی صحیح راہ پر ہیں۔

نیز فرمایا:

﴿ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ﴾ [الحديد: ٢٢،٢٣]

[کوئی مصیبت دنیا میں نہیں آتی ہے نہ تمھارے نفسوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں، وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے، یہ کام اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے تاکہ تم اپنے سے فوت شدہ کسی چیز پر رنجیدہ نہ ہو جایا کرو اور نہ عطا کی گئی کسی چیز پر اتراؤ

---

1. صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٢١٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧١)
2. سنن أبي داود، رقم الحديث (١٣١٩)

اور اللہ تعالیٰ اترانے والے شیخی خوروں کو پسند نہیں فرماتا ہے]

یعنی جتنے خوشی اور غم کے اسباب ہیں، سب کا حال ان کے دنیا میں پیدا ہونے سے پہلے ہی اللہ کے یہاں کتاب میں لکھا ہے، پھر جس کو کچھ آفت پہنچے خواہ وہ آفت عام ہو، جیسے وبا وقحط وغیرہ، خواہ آفت خاص ہو، جیسے کسی کا کوئی مر گیا تو وہ سب پہلے سے تقدیر کی کتاب میں لکھی تھی جو ٹلنے والی نہ تھی، پھر جو مصیبت پہنچے تو آدمی کو غم نہ کرنا چاہیے اور جو کچھ مل گیا اور خوشی ہوئی تو اس پر اِترانا نہ چاہیے کہ ہم ایسے ہیں کہ ہم کو یہ ملا اور ہمارے لیے ایسا ہوا، کیونکہ اللہ اترانے والے فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتا ہے۔

① حدیثِ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ میں نوحہ کرنے والی اور اس کو سننے والی عورت پر لعنت فرمائی ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ چلاّنے والی عورت اور سننے والی دونوں ملعون ہیں، ہاں آنسو سے رونے اور دل کے رنج پر اللہ عذاب نہیں کرتا، جس طرح کہ صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً آیا ہے[2] کیونکہ یہ آدمی کے اختیار میں نہیں ہے ہاں زبان سے شکایت اور مُردے کی نوحہ کرنے کی وصیت پر عذاب ہوتا ہے۔

② حدیثِ ابن مسعود رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ وہ ہم میں سے نہیں جو رخساروں پر طمانچے مارے اور گریبان پھاڑے اور جاہلیت جیسا چلاّئے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[3]

③ حدیثِ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ[4] میں فرمایا ہے کہ میں اس سے بے زار ہوں جو سر منڈوائے اور چلاّ کر روئے اور گریبان پھاڑے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[5]

پھر جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بے زار ہیں، وہ کہاں کا مسلمان ہے؟

---

① سنن أبي داود، رقم الحدیث (۳۱۲۸)

② صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۳۰۴) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۲۴) اس حدیث کے الفاظ ہیں: ''کیا تم نہیں سنتے کہ اللہ تعالیٰ آنکھ سے آنسو نکلنے اور دل کے غم پر عذاب نہیں دیتا ہے، مگر عذاب اس کے سبب سے دیتا ہے، پھر اپنی زبان کی طرف اشارہ فرمایا یا رحم کرتا ہے۔''

③ صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۹٤) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰۳)

④ زیرِ نظر کتاب اور تذکیر الاخوان کے مطبوعہ نسخہ جات میں یہ روایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے واسطے سے مروی ہے، لیکن یہ درست نہیں، کیونکہ مذکورہ بالا روایت سیدنا ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

⑤ صحیح البخاري، رقم الحدیث (۱۲۹٦) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۱۰٤)

④ حدیثِ ابو مالک رضی اللہ عنہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ نوحہ کرنے والی عورت اگر مرنے سے پہلے توبہ نہ کر لے گی تو قیامت کے دن اس کا پاجامہ گندھک کا ہوگا اور اوڑھنی خارش کی۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔①

⑤ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ جس مردے پر نوحہ کیا گیا، وہ اسی بات پر قیامت کے دن عذاب دیا جائے گا۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔②

یعنی فرشتے یہ کہہ کر عذاب کریں گے کہ تو ایسا اور ایسا تھا۔

⑥ ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ جو مردے پر رونے والا کھڑا ہو کر یوں کہے کہ ہائے میرے پہاڑ! ہائے میرے سردار! اور اس کے مثل تو اللہ اس کے واسطے دو فرشتے مقرر کرتا ہے کہ وہ اس مردے کی چھاتی پر گھونسے مارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا تو ایسا ہی تھا؟ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔③

ہر مسلمان کو چاہیے کہ اپنے مردوں کو عذاب سے بچائے اور نوحہ وغیرہ نہ کرنے کی وصیت کر جائے، ورنہ پھر عذاب نقد وقت ہے۔

⑦ حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں نوحے کو شیطان کی آواز فرمایا ہے اور کہا ہے کہ جو رنج آنکھ اور دل سے ہے، وہ اللہ کی طرف سے اور رحمت ہے اور جو ہاتھ وزبان سے ہے، وہ شیطان کی طرف سے ہے۔ اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔④

⑧ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں اس سے منع کیا ہے کہ کوئی نوحہ کرنے والی عورت جنازے کے ہمراہ جائے۔ اس کو احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔⑤

⑨ ایک حدیث میں یہ بھی فرمایا ہے کہ رونے پیٹنے والیوں کی دوزخ میں قیامت کے دن دو قطاریں ہوں گی۔ ایک ان کے دائیں طرف اور دوسری ان کے بائیں طرف۔ وہ دوزخیوں پر نوحہ کریں

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٤)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٩١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣٣)

③ سنن الترمذي، رقم الحديث (١٠٠٣)

④ مسند أحمد (١/٣٣٥)

⑤ مسند أحمد (٢/٩٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٥٨٣)

گی جس طرح کتے روتے ہیں۔ اس کو طبرانی نے روایت کیا ہے۔[1]

(10) صحیح بخاری میں آیا ہے کہ جب حسن بن حسن بن علی رضی اللہ عنہم وفات پا گئے تو ان کی بیوی نے سال بھر تک ایک خیمہ ان کی قبر پر لگایا، پھر اٹھا لیا تو ایک پکارنے والے کو سنا کہ وہ کہہ رہا ہے:

"ألا هل وجدوا ما فقدوا؟" یعنی کیا انھوں نے پا لیا جو گم کیا تھا؟ تو دوسرے نے کہا:

"بل يئسوا فانقلبوا" یعنی نہیں، بلکہ نا امید ہو کر لوٹ گئے۔[2]

یعنی اسی طرح اگر ہزار برس غم میں رہو تو مردہ تو پھر آنے والا نہیں، لہٰذا زیادہ سوگ میں بیٹھنا اور بہت سا غم کرنا لا حاصل ہے۔ آدمی اللہ کی اس قدر عبادت کرے کہ خود اس کی عاقبت درست ہو۔

إن عشت تفجع بالأحبة كلهم
وفناء نفسك لا أبا لك أفجع

[اگر تم زندہ رہے تو سارے رفقا واحباب پر غم زدہ ہو گے اور خود تمھاری ذات کا فنا ہونا، تمھارا باپ نہ رہے زیادہ حسرت وافسوس کا باعث ہے]

(11) حدیثِ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا میں فرمایا ہے کہ کسی عورت کے لیے حلال نہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہے کہ تین دن سے زیادہ سوگ میں بیٹھے، مگر اپنے خاوند پر چار مہینے دس دن۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ تین دن سے زیادہ بھائی، باپ، چچا، ماموں، بھانجے اور بھتیجے کے لیے سوگ میں رہنا حرام ہے، بلکہ تین دن کے بعد ہی بے حاجت خوشبو لگائے اور رنگین کپڑے پہنے تاکہ یہ رسمِ بد اُٹھ جائے۔

(12) حدیثِ عمران بن حصین وابی برزہ رضی اللہ عنہما میں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جنازے میں دیکھا کہ لوگ چادر اتارے ہوئے صرف کرتوں میں جنازے کے پیچھے چلے آتے ہیں۔ فرمایا: کیا تم جاہلیت کا کام اختیار کرتے ہو یا رسم جاہلیت کی مشابہت کرتے ہو؟ میں نے قصد کیا تھا کہ میں

---

(1) المعجم الأوسط (٥/ ٢٥١) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "فيه سليمان بن داود اليمامي وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٣/ ١٠٠) نیز دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (٣٣٨٨)

(2) صحيح البخاري مع الفتح (٣/ ٢٠٠)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٨٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٤٨٦)

تم پر بد دعا کروں کہ تمھاری صورت بدل جائیں۔ اس کو احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ مصیبت میں لباس کو ترک کرنا اور سر یا پاؤں ننگے کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ یہ کفر کی رسم تھی۔ اسی طرح معمول کے لباس کا بدلنا حرام ہے، جیسے ماتم میں سیاہ کپڑے پہننا یا سیاہ پٹی بازو پر باندھنا یا خط اور لفافے کے کنارے کو سیاہ کرنا وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ اگر اس دم بد دعا کرتے تو وہ لوگ بندر اور سور کی صورت ہو جاتے۔ معلوم ہوا کہ موت کے سبب چوڑیاں نہ پہننا، کپڑا نہ سینا اور چارپائی پر نہ سونا رسم کفر ہیں، اسی طرح تیجا، دسواں، چالیسواں، چھ ماہی، برسی کرنا اور شبِ براءت کے روز مُردوں کا غم تازہ کرنا؟ یہ سب ہنود کی رسمیں ہیں۔

ساتویں رسم:

زینت اور بناؤ سنگار کرنا اور سیدھی سادھی وضع کو معیوب سمجھنا ہے۔ وہ آرایش جو شرعاً جائز ہے، جیسے قیمتی کپڑا پہننا، اچھے برتن میں کھانا، اچھے مکان میں رہنا اور اچھی سواری پر سوار ہونا، وہ منع نہیں ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَ الطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ﴾
[الأعراف: ٣٢]

[آپ فرما دیجیے کہ اللہ کے پیدا کیے گئے اسبابِ زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنائے ہیں اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس نے حرام کیا ہے؟]

بلکہ اگر یہ کام شکر کے واسطے ہو تو بہتر ہے۔ ہاں نام و نمود کے لیے یا تکبر کے لیے ہو تو حرام و مکروہ ہے، یا اس لیے نہ ہو مگر کفار، فساق اور اہلِ بدعت سے مشابہت ہو تو بھی منع ہے، اگرچہ کرنے والے کے ذہن میں مشابہت مقصود نہ ہو۔

① حدیثِ نبوی ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»[2] [جو کسی قوم کی مشابہت کرے وہ ان ہی میں سے ہے]

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٤٨٥) یہ حدیث مسند احمد میں نہیں ہے۔ علاوہ ازیں اس کی سند بھی موضوع ہے، کیوں کہ اس کی سند میں متعدد روات متروک ہیں۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١)

اس حدیث کی شرح میں شیخ الاسلام نے بے مثال و مثل کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" لکھی ہے۔

بعض چیزیں فی نفسہ حرام ہیں، جیسے گھر میں تصویریں لگانا، فرش اور تکیے ریشمی قیمتی کپڑوں کے بنانا، سونے کے چھلے اور انگوٹھیاں مرد ہو کر پہننا، بہت سا گوٹا پٹھا پہننا اور چاندی سونے کے برتن، عطردان، آبخورے اور کٹورے رکھنا اور عورت کا بہت باریک کپڑا پہننا جس سے شکم و سینہ نظر آئے وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴾ [آل عمران: ١٤]

[لوگوں کو بہت رجھایا ہے مزے کی محبتوں پر عورتوں اور بیٹوں اور ڈھیر جڑے ہوئے سونے اور چاندی کے اور پلے ہوئے گھوڑے اور مویشیاں اور کھیتی سے، یہ دنیا کی زندگی کا برتنا ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے]

اس جگہ چھے چیزیں دنیا کی زینت بتائیں، پھر آخرت کے ثواب کو ان سے بہتر ٹھہرایا، گویا ان میں منہمک ہو جانا حرام اور عقاب کا سبب ہے۔ خیل وغیرہ میں کوتل گھوڑے جلو میں رکھنا، ہاتھی بگھی پر سوار ہونا، چوبدار و نقیب اور نوبت نقارے ماہی مراتب رکھنا، محل میں بہت سی عورتیں ہونا، خزانہ بہت ہونا اور ملک بہت ہونا وغیرہ داخل ہے۔ اس دنیا کے لیے جس کا نام لیا سو طرح کے جھوٹ اور فریب کرتے ہیں، پھر اگر کسی کو ہاتھ لگے تو رات دن اس کی محافظت اور افزایش میں رہتا ہے، ایک دوسرے پر حسد، بغض و تکبر کرتا ہے، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس کی تلاش میں اور کوئی حاصل ہونے کے بعد مر جاتا ہے۔ یہ کارخانہ یوں ہی پڑا رہ جاتا ہے، پھر ایسی چیز کی محبت میں کیوں مشغول ہو؟ وہ چیز جو تھوڑی محنت سے ملے، ہمیشہ باقی رہے اور اُس میں عیش و آرام بھی زیادہ ہو، اُس کو کیوں حاصل نہ کرے؟ وہ چیز اللہ کے ہاں کا حسنِ انجام و انعام ہے۔ اللہ نے دنیا کی مثال پانی اور پیداوار سے دے کر فرمایا ہے:

﴿ فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ﴾ [یونس: ١٤]

[پھر ہم نے اس کو کاٹ کر ڈھیر کر ڈالا گویا کل کو یہاں بستی نہ تھی]

اس میں اللہ نے یہ خبر دی ہے کہ دنیا کی چیزیں اور سب لوگ آخرکار فنا ہو جاتے ہیں، پس جس کی حقیقت فنا ہو، اس پر دل لگانا کیا معنی رکھتا ہے؟

آنچہ دیر نپاید دلبستگی را نشاید

یعنی جو چیز بھی دیر پا نہ ہو وہ دل بستگی کے مناسب نہیں۔ بلکہ مسلمان کو تو یوں جاننا چاہیے کہ دنیا کا عیش و آرام خاص کافروں کے واسطے ہے اور آخرت کی نعمت و بہشت ہمارے لیے ہے۔

② حدیث میں آیا ہے:

«اَلدُّنْيَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْكَافِرِ»[1]

[دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے]

اللہ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ لحاظ نہ ہوتا کہ لوگ ایک طرح کے ہو جائیں گے تو ہم اُن کو جو رحمن کے منکر ہیں، اُن کے گھروں کی چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن پر وہ چڑھیں اور ان کے گھروں کے دروازے اور تخت جس پر تکیہ لگا کر بیٹھیں، سونے کے بنا دیں، سو یہ سب کچھ نہیں مگر دنیا کی زندگی ہے اور آخرت تیرے رب کے یہاں پرہیز گاروں کے لیے ہے۔[2]

یعنی کافروں کو آخرت میں عذاب ہونا ہے۔ دنیا میں تو وہ کچھ عیش و آرام کر لیں، مگر لحاظ یہ ہے کہ اور لوگ بھی کافروں کو زیادہ عیش و آرام میں دیکھ کر انھیں کی راہ اختیار کر کے سب کے سب ایک ہی طرح کے ہو جائیں گے۔ اس سبب سے کافروں کو دنیا میں زیادہ عیش نہیں دیا، وگرنہ دنیا میں کافروں کو اس قدر آسودگی ہوتی جس کا نمونہ ذکر ہوا۔

③ حدیثِ ابوامامہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ سنو! سنو! پرانے کپڑے پہننا اور بہت زینت نہ کرنا ایمان کی بات ہے۔ دو بار یہی کلمہ فرمایا۔ اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[3]

یعنی جس کو آخرت کی نعمتوں کی خواہش ہوتی ہے، اس کے خیال میں دنیا کی زیب و زینت نہیں آتی۔ وہ دنیا کے زیادہ تکلف کو بے فائدہ جانتا ہے، پھر اگر میلا کچیلا کپڑا ہے تو کچھ پروا نہیں اور

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٦)

② دیکھیں: سورۃ الزخرف (آیت: ۳۵)

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٦١) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤١١٨)

اگر پھٹا پرانا پیوند لگا ہے تو کچھ خیال نہیں۔

④ حدیثِ سوید بن وہیب میں ایک صحابی سے یہ بھی فرمایا تھا کہ جس نے زینت کا کپڑا پہننا خاکساری وانکساری کی راہ سے چھوڑ دیا تو اس کو اللہ بزرگی کا جوڑا پہنائے گا۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[1]

⑤ عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ ان کے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ اتنا کھاؤ پیو، خیرات کرو اور پہنو کہ وہ بے جا خرچ کرنے اور اترانے میں نہ مل جائے۔ اس کو احمد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی جو کھانا، پہننا اور خیرات کرنا بے جا خرچ کے طور پر ہو کہ کسی کا حق تلف ہو یا دنیا ودین کا کچھ فائدہ نکلتا نہ ہو تو وہ درست نہیں ہے، اسی طرح وہ کھانا، پہننا اور صدقہ دینا جس میں اترانا اور تکبر نکلے ممنوع ہے۔

⑥ عبداللہ بن بریدہ کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے فضالہ بن عبید رضی اللہ عنہ سے کہا: کیا سبب ہے کہ میں تجھ کو پریشان صورت دیکھتا ہوں؟ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بہت زیادہ رفاہ (آسودگی وخوشحالی) سے منع کیا ہے۔ کہا کہ میں تمھارے پاؤں میں جوتا نہیں دیکھتا ہوں؟ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو یہ حکم دیتے تھے کہ ہم کبھی ننگے پاؤں بھی رہیں۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[3]

بہت سا مرفہ حال اور آسودہ وضع خواہ مخواہ مقطع بنا رہنا رسول اللہ علیہ السلام کو خوش نہیں آتا تھا۔ سو فرمایا کہ تم تکلف کے مقید نہ رہو۔ کبھی اگر بالوں میں کنگھی نہیں کی، خوشبو نہیں لگائی اور سفید تکلف کے کپڑے نہیں پہنے تو نہ سہی، بلکہ گاہ گاہ برہنہ پا چلنا پھرنا بہتر ہے کہ اس سے تکلف کی عادت جاتی رہتی ہے۔

⑦ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر کے کونے میں ایک پردہ لگا ہوا دیکھا تو کہا: مجھے یا کسی نبی کے لائق نہیں ہے کہ منقش ومزین گھر میں بیٹھے۔ اس کو احمد اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[4]

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٧٨)

② مسند أحمد (٢/ ١٨١) سنن النسائي (٣/ ٧٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٥)

③ مسند أحمد (٦/ ٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٦٠)

④ مسند أحمد (٥/ ٢٢١، ٢٢٢) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٧٥٥) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٣٦٠)

معلوم ہوا کہ مکان میں دیوار گیریاں لگانا، آئینہ بندی کرنا، جھاڑ فانوسیں لٹکانا یا گلکاری کرنا درست نہیں ہے۔ مسلمان کو سنت کی اتباع میں ایسے مکان میں جانا نہ چاہیے، خواہ وہ دیوان خاص ہو یا دیوان عام، شب باشی کا مکان ہو یا دن کی نشست کا، زندے کا مکان ہو یا مردے کا، برج ہو یا مقبرہ، چلّہ ہو یا درگاہ، امیر کا گھر ہو یا غریب کا، فاسق کا گھر ہو یا متقی کا، ہاں اگر کوئی دینی ضرورت ہو تو وہ بات الگ ہے۔

⑧ عائشہ رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تو مجھ سے ملنا چاہے تو تجھ کو دنیا سے زادِ راکب کے برابر کافی ہے، بڑے آدمیوں کے پاس بیٹھنے سے بچ اور اپنے کپڑے کو پرانا مت جان جب تک کہ تو اس کو پیوند نہ لگائے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ یہ اسلام کے خصال ہیں۔ اس سے ایمانداری ثابت ہوتی ہے اور اس کے خلاف کرنا خلاف سنت ہے۔

⑨ ابو ریحانہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے دس چیزوں سے منع فرمایا ہے۔ عورت کو دانت ریتنے، نیلا گودنے، بال اکھاڑنے یعنی ڈاڑھی اور ماتھے کا، دو مردوں کے ساتھ بے لباس سونے، عورتوں کے ساتھ بے لباس سونے، عجمیوں کی طرح ریشمی استر لگانے، ترنج بنانے، غارت گری، چیتے کی کھال پر سوار ہونے اور انگوٹھی پہننے سے، مگر حکومت والے کو۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[2]

⑩ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو زرد خوشبو کا سلگانا، سفید بالوں کو بدلنا، سیاہ کرنا، ازار لٹکانا، سونے کی انگوٹھی پہننا اور حرام جگہ دکھانے کو بناؤ سنگھار کرنا برا لگتا تھا۔ اس کو ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[3]

⑪ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ» اس کو احمد نے روایت کیا ہے۔[4]

---

① سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٨٠) اس کی سند میں "صالح بن حسان" سخت ضعیف ہے۔

② مسند أحمد (٤/١٣٤) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٤٩) سنن النسائي (٨/١٤٣-١٤٤) اس حدیث میں "ابو عامر معافری" راوی ضعیف ہے۔

③ سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٢٢) سنن النسائي (٨/١٤١)

④ مسند أحمد (٢/٥٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٣١)

یعنی جس نے اپنے آپ کو کسی قوم سے مشابہ کیا تو وہ اُن میں ہے، خواہ وہ نصاریٰ ہوں یا مجوس، خواہ وہ ہنود ہوں یا فساق، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تو وہ شخص ان ہی لوگوں میں شمار ہو جاتا ہے۔

پھر اگر مکمل مشابہت اختیار کی تو بالکل جو احکام اُس قوم کے حق میں جاری ہوتے ہیں، وہی اس پر بھی جاری ہوں گے اور اگر تھوڑی مشابہت اختیار کی تو اسی قدر اُس قوم کے احکام اس پر جاری ہوں گے۔ پھر بعض کام ایسے ہوتے ہیں کہ آدمی اپنی زینت کے واسطے کرتا ہے تو اس سے کفار کے ساتھ مشابہ ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کافر جو کام اپنے دین کی بات جان کر کریں اور وہ بات مسلمانوں پر فرض و واجب نہ ہو تو وہی کام مسلمان کرے، یا جو کام کفار کے ساتھ مخصوص ہے اور اُن کی علامت و امتیاز ٹھہر گیا ہے تو وہ کام بھی مسلمان کے لیے کرنا منع ہے۔

کوئی کام ایسا ہوتا ہے کہ جب تک کافر اس ملک میں رہے اور وہ کام کرے تب تک مسلمان نہ کریں، لیکن جب وہ چلا جائے تب وہ کام مسلمان کو جائز ہو جاتا ہے۔ بعض کام وہ ہے کہ مسلمان کو جائز ہے اور اتفاقاً اس ملک میں کافر غالب ہو گئے اور وہی کام اپنے دین کی رو سے وہ کافر کرنے لگے، تو پھر اس کام کو مسلمان بھی مشابہت کے سبب سے نہ کرے۔ جو کام ہمارے دین میں فرض و واجب ہے، اگر وہی کام کافر بھی کرے تو وہ کام ہم کو چھوڑنا نہ چاہیے اور جو کام بشریت و آدمیت کا مقتضا ہے، جیسے کھانا، پینا، سونا، جاگنا، نکاح کرنا، کھیتی، باغ، زمین آباد کرنا، سینا، پرونا، تجارت کرنا؛ اس کام میں بھی مشابہت کا لحاظ نہیں ہوتا ہے۔ ہاں ان کاموں میں اگر کافر کوئی خاص وضع نکالے تو وہ مسلمان کے لیے یقیناً منع ہو جائے گی۔ الغرض مسلمان کو کافر کا ہم رنگ اور ہم وضع بننا حرام ہے، خواہ لباس میں ہو یا چال ڈھال یا مکان یا سواری یا رسوم یا عبادات یا عادات یا مواسم و اعیاد یا ماتم و سوگ وغیرہ میں ہو۔

⑫ رکانہ رضی اللہ عنہ نے مرفوعاً کہا ہے کہ ہمارے اور مشرکوں کے درمیان فرق ٹوپیوں پر پگڑیاں ہیں۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[1]

مکے کے مشرک فقط پگڑی باندھتے تھے، اس کے نیچے ٹوپی نہ رکھتے، مسلمان ٹوپی پر پگڑی باندھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اور کافر کے لباس میں فرق کرنا چاہیے، اگرچہ ادنا بات میں ہو۔

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٧٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٨٥) اس کی سند ضعیف ہے۔

⑬ اسی طرح حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ یہود و نصاریٰ ڈاڑھیاں نہیں رنگتے، سو تم ان کے خلاف کرو، یعنی رنگو۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ وضع قطع میں بھی کفار سے مخالفت کرے۔ ان تینوں احادیث سے معلوم ہوا کہ کافر کی مشابہت کسی امر میں بھی نہ کرے، جیسے ہولی کی خوشی کرنا، ہندوؤں سے ہولی میں ملاقات کرنا، ہولی کھیلنا، دیوالی میں روشنی کرنا، کھیلیں، مٹھائی، کھلونے آپس میں بانٹنا، اولاد کو دینا، شبِ براءت میں روشنی کرنا، آتش بازی چھوڑانا، نیل کنٹھ دیکھنے کو مبارک سمجھنا، دیوالی اور سہرے میں جانوروں کا رنگنا، بسنتی پوشاک پہننا، دسہرے بسنت میں نربد، گنگا، ہردوار وغیرہ میں جانا، چوٹیاں رکھنا، مونچھیں بڑھانا، ڈاڑھی منڈوانا، ماتھے پر قشقہ، ٹیکا لگانا، گائے، گنگا، پیپل وغیرہ معابد ہنود کی تعظیم کرنا، گائے کا گوشت نہ کھانا، دھوتی باندھنا، لہنگا چولا پہننا، چوکا دے کر کھانا، گوبر کو پاک سمجھنا، اپنے آپ کو راجا کنور، ٹھاکر کہلانا، پیتل پھول کے برتنوں کا اکثر استعمال کرنا، لڑکوں کو زیور پہنانا، کنگنا باندھنا؛ یہ سب ہنود کی مشابہت ہے۔ اسی طرح میز لگا کر چھری کانٹے سے کھانا،[2] کاٹھی پر سوار ہونا، انگریزی ٹوپی، جوتا پہننا، گھر کے عوض بنگلہ کوٹھی بنانا، گھر کو تصاویر سے سجانا، کمپنی باغ کی طرح باغ لگانا، بگھی پر سوار ہونا، کُرتی پتلون پہننا،[3] کھڑی زبان میں باتیں کرنا، کرسی لگا کر بیٹھنا وغیرہ؛ یہ سب نصاریٰ کے ساتھ مشابہت ہے۔

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٠٣)

② چھری کانٹے سے کھانے میں نصاریٰ کی مشابہت سے ممانعت شاید ابوداؤد کی اس حدیث کی بنیاد پر ہے جس کو انھوں نے سنن (۳۷۷۸) میں عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ گوشت کو چھری سے کاٹ کر نہ کھاؤ اس لیے کہ یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، لیکن یہ حدیث ضعیف ہے۔ امام احمد بن حنبل نے اس میں ایک راوی ابومعشر نجیح کے ضعیف ہونے کی بنا پر اس کو رد کیا ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے اسے موضوعات (۳۰۲/۳) میں، امام سیوطی نے "اللالي المصنوعة" (٢/ ٢٢٥) میں اور علامہ البانی نے "ضعيف الجامع الصغير" (٦٢٧٠) میں ذکر کیا ہے۔ اس کے معارض دو صحیح حدیثیں مروی ہیں جن سے نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح طور پر گوشت کا چھری سے کاٹ کر کھانے کا ثبوت ملتا ہے۔ اس لیے چھری کانٹے سے کھانا جائز ہے۔ والله أعلم بالصواب.

③ کُرتی یعنی شرٹ پتلون اور کوٹ وغیرہ پہننے کا جہاں تک تعلق ہے تو اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عرب کا عام لباس صرف دو چادریں ہوا کرتی تھیں۔ ایک نیچے اور دوسری اوپر زیبِ تن کرتے تھے۔ قمیص (کرتے) پہننے کا رواج بہت ہی کم تھا، لیکن چادر کے مقابلے میں کرتے قمیص زیادہ پردے کا سبب ہیں اور ←

اسی طرح نوروز کی خوشی کرنا اور مہر جان کا ماننا مجوس کے ساتھ مشابہت ہے، سینے پر پیش روگریبان رکھ کر بوتام لگانا، تنگ تنگ کپڑے پہننا، گلو بند لگانا، انگریزی رفتار چلنا، بڑے دن کی تعظیم کرنا، نصاریٰ کو اس کی مبارک باد دینا، بڑے دن کے سلام کو جانا، اُس دن نذر و نیاز کی ڈالیاں لے جانا، دُم بریدہ گھوڑے پر سوار ہونا، غم میں سیاہ کپڑے پہننا، یہ سب عیسائیوں کے ساتھ مشابہت ہے۔ نیز اپنی شان وشوکت کے لیے سب سے اونچے ہو کر بیٹھنا، ہاتھیوں پر نمود کے لیے سوار ہونا، بہت سی جلوسواری میں رکھنا، ڈنکا گھڑیال، ماہی مراتب رکھنا، جھک کر سلام کرنا، آداب تسلیمات بجا لانا، یہ سب اکاسرہ و قیاصرہ اور کفار و مشرکین کے ساتھ مشابہت ہے۔

⑭ نیز زینت کے بعض اسباب وہ ہیں جن سے خاص نہی آئی ہے، جیسے مرد کے لیے سونا اور ریشمی کپڑا پہننا، اس کی حرمت حدیثِ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ میں آئی ہے۔ اس کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[1]

حریر وہ ہے جس کا تانا بانا بالکل ریشم ہو۔ یہ بوڑھے، جوان، بچے سب کے حق میں حرام ہے، مگر بچہ گناہ گار نہیں ہوتا۔ جو اس کو پہنائے وہ گناہ گار ہے۔ یہ جمہور کے نزدیک مشروع اور جائز ہے، لیکن ابن دقیق العید اور شوکانی رحمہ اللہ اس کو بھی غیر مشروع کہتے ہیں۔

⑮ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی شخص نے ایک جوڑا بھیجا تھا، اس میں ریشمی دھاریاں تھیں۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی رضی اللہ عنہ کو دیا۔ علی رضی اللہ عنہ نے اس کو پہنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر غصہ معلوم ہوا۔ فرمایا: میں نے تیرے پاس تیرے پہننے کو نہیں بھیجا تھا، اس لیے بھیجا تھا کہ تو اس کو پھاڑ کر عورتوں کی اوڑھنیاں بنا دے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[2]

وہ کپڑا بالکل ریشمی نہ تھا، فقط اس میں ریشم کی دھاریاں تھیں، لیکن اس پر بھی غصہ فرمایا۔ معلوم

← ان کے پہننے میں بھی آسانی زیادہ ہے، اسی لیے قمیص کو نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا اور زیب تن بھی کیا تھا، جیسا کہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کپڑوں میں سب سے زیادہ پسندیدہ قمیص تھی جس کو آپ پہنتے تھے۔ (سنن أبي داود، ترمذي، ابن ماجه، مسند أحمد، مستدرك الحاكم)

آج بھی کرتا، قمیص، شلوار، پاجامہ اور ازار، کوٹ، پتلون، شرٹ، نیکر وغیرہ مغربی طرز کے ملبوسات سے زیادہ ساتر اور استعمال کے اعتبار سے زیادہ آسان ہیں، لہٰذا مغرب کی اس نقالی سے احتراز بہتر ہے۔ والله أعلم بالصواب.

① سنن الترمذي، رقم الحديث (١٧٢٠) سنن النسائي (٨/١٦١)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦٢٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٧١)

ہوا کہ مرد کو ریشمی کپڑے سے، گو بالکل حریر خالص نہ ہو، کمال احتیاط چاہیے۔

(۱۶) حدیثِ عمر رضی اللہ عنہ میں فقط دو انگل حریر کی اجازت دی ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1] یعنی اگر دو انگل کی گوٹ سنجاف لگا لے تو جائز ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

(۱۷) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ حریر دنیا میں وہی پہنے گا جس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔[2] اس سے معلوم ہوا کہ مرد کے لیے دارائی، اطلس، مشجر، گلبدن اور ریشمی مخمل وغیرہ پہننا اور استعمال کرنا حرام ہے۔

(۱۸) دوسری حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں آیا ہے کہ ایک مرد کو دو سرخ کپڑے پہنے دیکھا تو اس نے سلام کیا تو آپ نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا۔ اس کو ترمذی اور ابوداود نے روایت کیا ہے۔[3]

معلوم ہوا کہ مرد کو سرخ کپڑا پہننا ایسا سخت حرام ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کا جواب نہ دیا، حالانکہ سلام کا جواب واجب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فاسق کے سلام کا جواب دینا بھی اچھا نہیں ہے، تاکہ وہ باز آئے، پھر فاسق سے دوستی محبت رکھنے کا کیا ذکر ہے؟

(۱۹) عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک غالیچہ لیا، جس میں تصویریں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں نہ گئے اور چہرے پر ناخوشی معلوم ہوئی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اللہ ورسول کے سامنے توبہ کرتی ہوں۔ مجھ سے کیا گناہ ہوا؟ فرمایا: یہ کیسا غالیچہ ہے؟ کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیٹھنے اور تکیہ لگانے کے لیے ہے۔ فرمایا: تصویر بنانے والے قیامت کے دن معذب ہوں گے۔ اُن سے کہا جائے گا کہ جو تم نے پیدا کیا ہے اس میں جان ڈالو، جس گھر میں تصویریں ہوتی ہیں، وہاں ملائکہ نہیں آتے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[4]

معلوم ہوا کہ تصویر کو زینت کے لیے گھر میں نہ رکھے، چہ جائیکہ تصویر بنائے، بلکہ ان کو ناپاک سمجھ کر گھر سے دور کر دے، تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خوش ہوں اور رحمت کے فرشتے گھر میں آئیں۔

(۲۰) ایک بار جبریل علیہ السلام وعدے پر نہ آئے، اس لیے کہ گھر میں کتا اور ایک تصویر دار پردہ تھا۔

---

(1) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۸۲۸) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۶۹)

(2) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۸۳۵) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۰۲۸)

(3) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۴۰۶۹) سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲۸۰۸)

(4) صحیح البخاري، رقم الحدیث (۵۹۵۷) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۱۰۵)

حضرت ﷺ نے کتے کو گھر سے باہر نکال دیا اور پردہ پھاڑ کر دو تکیے پا انداز بنائے کہ روندنے میں آئیں۔ اس کو صحیحین میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔[1]

(۲۱) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ جس نے اپنا کپڑا تکبر سے لٹکایا تو اللہ قیامت کو اس کی طرف نہ دیکھے گا۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[2]

اگر کسی کا پائجامہ یا تہمد یا قبا یا چادر اتفاقاً نیچا ہو گیا ہے تو یہ اور بات ہے، لیکن زینت اور وضع داری کے لیے کپڑا ٹخنے سے نیچے کرنا حرام ہے۔

(۲۲) بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً آیا ہے کہ جو ازار ٹخنوں سے نیچے لٹکے، وہ دوزخ میں ہے۔[3] ازار میں لنگی، تہمد، پاجامہ؛ سب داخل ہے، یعنی نیچا پہننا دوزخیوں کا کام ہے۔

(۲۳) ابن عمر رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ پاجامہ اور کرتا اور پگڑی میں کپڑے کا نیچا کرنا منع ہے۔ اس کو ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[4]

جیسے سبز عمامہ باندھنا، تاکہ لوگ اس کو سید جانیں، یا سبز یا سیاہ لباس پہننا، تاکہ لوگ حاجی جانیں، اسی طرح اونچی ٹوپیاں سر پر دھرنا، تاج لگانا اور لنگوٹ لگانا یا گیروے کپڑے پہننا کہ لوگ فقیر جانیں یا کرتا، جبہ، فرغل پہننا، اس لیے کہ لوگ مشائخ جانیں، یا عالم سمجھیں، یہ سب حرام ہے، خواہ کپڑا اس وضع کا ہو یا رنگ اس وضع کا، مگر سپاہیوں کی وردی اس سے باہر ہے۔

(۲۴) حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں آیا ہے کہ اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما رسول اللہ ﷺ کے پاس آئیں، وہ باریک کپڑے پہنے ہوئے تھیں۔ آپ علیہ السلام نے منہ پھیر کر فرمایا: اے اسما! عورت کو جب حیض آنے لگے تو اس کو مناسب نہیں کہ اس کا بدن دکھائی دے مگر چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[5]

معلوم ہوا کہ جالی لوٹ، گاچ، بک، لاہی اور پتلا جھولا وغیرہ ایسا کپڑا جس سے بدن نظر آئے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٦٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٥)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٨٧)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٢٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٦٠٦)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٠٤)

عورت کے لیے پہننا حرام ہے، وہ عورت گویا ننگی منگی ہے، البتہ جس کے سامنے عورت کو ننگے پھرنا درست ہے، اس کے سامنے یہ بھی روا ہے۔

۲۵ حفصہ بنت عبدالرحمن باریک اوڑھنی اوڑھے ہوئے عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئی تو انھوں نے وہ اتار کر پھاڑ ڈالی اور اسے دوسری گاڑھی اوڑھنی اوڑھا دی۔ اس کو مالک نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ عورت کو عورتوں کی محفل میں بھی ایسا باریک کپڑا پہن کر جانا درست نہیں ہے، پھر دیور، جیٹھ اور خاوند کے بھانجے، بھتیجے وغیرہ مردوں کا کیا ذکر ہے، جو سب حرام ہے۔ ہاں خاوند کے باپ یا بیٹے سے پردہ ضروری نہیں ہے۔

۲۶ حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں سونے کی انگوٹھی کو آگ کی چنگاری فرمایا ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[2] یہی حکم سونے کے چھلے وغیرہ کا ہے۔

۲۷ علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار داہنے ہاتھ میں ریشم اور بائیں ہاتھ میں سونا لے کر فرمایا کہ یہ دونوں میری امت کے مردوں پر حرام ہیں۔ اس کو احمد، ابوداود اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[3]

معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے ان دونوں کا استعمال قطعاً حرام ہے۔ ہاں ان کا ہاتھ میں لینا مثلاً اشرفی تڑوانے، حریر بیچنے یا کسی کو دکھانے کے لیے تو یہ مباح ہے۔

۲۸ حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ جو کوئی اپنی جورو کو آگ کا بالا پہنانا چاہے یا ہنسلی ڈالنا چاہے یا کڑے کنگن تو وہ سونے کی یہ چیزیں اس کو پہنائے، ہاں چاندی جائز ہے سو اس سے کھیلو۔ اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[4]

اس سے عورتوں پر بھی سونے کی حرمت نکلی لیکن دیگر احادیث سے اس کا جواز ثابت ہوتا ہے۔[5] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھر والیاں اور بیٹیاں سونا پہنتی تھیں، بلکہ ان میں چاندی کا رواج تھا، یہی

---

① موطأ الإمام مالك (٢/ ٣٢٩)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٩٠)

③ مسند أحمد (١/ ١١٥) سنن أبي داود (٤٠٥٧) سنن النسائي (٨/ ١٦٠) سنن ابن ماجه (٣٥٩٥)

④ مسند أحمد (٢/ ٢٣٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٣٦)

⑤ علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ نے کتاب "آداب الزفاف" (ص ١٥٠-١٩٦) میں متعدد احادیث بیان کر کے ←

بہتر ہے، کیونکہ اس حدیث میں یوں فرمایا ہے کہ پھر اس کو آگ کا بالا ہنسلی کڑا پہننا ہو گا۔ مرد پر سونا، چاندی دونوں حرام ہیں، خواہ الگ الگ ہوں خواہ ملے جلے۔ مرد زیور کے سوا اور چیزوں میں چاندی کا استعمال کر سکتا ہے۔

(۲۹) حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے پینے سے اور ریشم و دیباج اور اس پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ دیبا و دارائی کا پہننا اور اس کی مسندیں بنانا حرام ہے۔ ظاہر حدیث یہ ہے کہ سونے چاندی کے برتنوں میں فقط کھانا پینا منع ہے نہ کہ اور طرح کا استعمال، لیکن فقہا نے کہا ہے کہ چاندی وسونے کے عطر دان، پاندان، خاصدان، چمچا وغیرہ ظروف و آلات سب حرام ہیں۔ پس احتیاط اولیٰ ہے۔

(۳۰) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ کوئی چاندی اور سونے کے برتن میں پیے گا یا جس میں کچھ بھی سونا و چاندی ہو گا تو وہ اپنے پیٹ میں آگ غٹ غٹ پیتا ہے۔ اس کو دارقطنی نے روایت کیا ہے۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ نرے زر و سیم کا برتن یا دونوں کا ملا ہوا، چاندی کا ملمع یا گل بوٹے سونے کے یا سونے و چاندی کی فقط تحریریں، ان سب میں کھانا پینا ایسا برا ہے جیسے دوزخ کی آگ کھانا۔

(۳۱) ابن عباس رضی اللہ عنہما مرفوعاً کہتے ہیں کہ مخنث مرد اور مردانہ عورت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کی ہے۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔[3]

← عورتوں کے لیے حلقہ دار سونے کے زیورات جیسے بالی، کنگن، ہنسلی اور انگوٹھی وغیرہ کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے رد میں علامہ اسماعیل بن محمد انصاری نے "إباحة التحلي بالذهب المحلق للنساء" تالیف کر کے ہر طرح کے سونے کے زیور کو عورتوں کے لیے مباح قرار دیا ہے۔ ہندو پاک کے اکثر علما اسی کے قائل ہیں۔ اسی طرح عالی جناب مفتی محمد ابراہیم نے علامہ البانی رحمہ اللہ کی تعریف کرنے کے بعد کہا ہے کہ ان کے بعض مبنی بر شذوذ مسائل ہیں، ان ہی مسائل میں سے یہ مسئلہ بھی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: فتاوىٰ الشيخ محمد إبراهيم (٩٢/٤) المجموع للنووي (٦ / ٤٠) فتاویٰ ابن باز (۱/ ۲۴۶-۲۴۹) اردو اڈیشن۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٧)

[2] سنن الدار قطني (١/ ٤٠) امام دارقطنی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے لیکن امام ذہبی رحمہ اللہ نے "میزان الاعتدال" (۴/۴۰۶) میں کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے۔

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٥)

اس میں ہیجڑے، خوجے، زنخے؛ سب داخل ہیں، اسی طرح وہ عورتیں جو گھوڑے پر سوار ہوں، ہتھیار باندھیں، تیر کمان لگائیں، انگرکھا، قبا، ٹوپی، پگڑی وغیرہ مردانہ لباس پہنیں اور مردانی گفتگو کریں تو یہ سب ملعون ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ عورت کے لیے سرمہ، منہدی نہ لگانا، خوشبو نہ ملنا، زیور نہ پہننا، رنگین کپڑے نہ پہننا، ہاتھ پاؤں کا منہدی سے سرخ نہ رکھنا اپنے دین کے سوا اور بات لکھنا پڑھنا منع ہے۔

(۳۲) ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ ان مردوں پر لعنت کرے جو عورتوں کے مشابہ بنتے ہیں اور ان عورتوں پر جو مردوں کے مشابہ بنتی ہیں۔ اس کو بخاری نے روایت کیا ہے۔[1]

یہ مشابہت قطعی حرام ہے اور صاحبِ مشابہت ملعون ہے۔

(۳۳) حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ ایک مخنث کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لایا گیا تو اس نے ہاتھ پاؤں میں منہدی لگائی تھی۔ پوچھا: اس کا کیا حال ہے؟ کہا: یہ عورت کی طرح بنتا ہے۔ فرمایا: اس کو نکال دو۔ کہا گیا: کیا ہم اس کو قتل نہ کر دیں؟ فرمایا: مجھ کو نمازیوں کے قتل سے منع کیا گیا ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[2]

معلوم ہوا کہ مرد کو معمولی بات میں بھی عورت کی مشابہت نہیں کرنی چاہیے۔ اس نے فقط منہدی لگائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو نکال دیا اور اس کا بستی میں رہنا پسند نہ فرمایا۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ مرد کو پان کھانا، سرمہ لگانا[3] یا کرتے کا گریبان آگے کو عورتوں کی طرح رکھنا یا نیچے نیچے پاجامے پہننا یا کلی دار ازار کا استعمال کرنا یا بڑے بال سر پر رکھنا منع ہے۔

غرض کہ جس بات میں عورتوں سے مشابہت ہو، اس سے ہزار کوس بھاگے۔ رات کو سرمہ لگانا زینت کے لیے نہیں ہوتا، اس سے فقط فائدہ مقصود ہوتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ مخنث، زنانے اور سدا

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٨٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٢٨) اس کی سند میں دو راوی "ابو یسار قرشی" اور "ابو ہاشم دوسی" ضعیف ہیں۔

[3] مردوں کے لیے بھی سرمہ لگانا مسنون ہے خواہ وہ زینت کے لیے ہو یا فائدے کی غرض سے، کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود سرمہ لگاتے تھے اور اثمد سرمہ استعمال کرنے کا حکم دیتے تھے، جیسا کہ ابن عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہم کی روایت میں مذکور ہے، جس سے اثمد سرمے کا استعمال نگاہ کی تیزی اور پلکوں کی زینت دونوں مقصد کے لیے ثابت ہوتا ہے، والله أعلم.

سہاگن فقیر منہ دیکھنے کے قابل نہیں ہیں، بلکہ اگر بے نمازی ہوں تو قتل کے قابل ہیں۔

㉞ حدیثِ علی رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ایک عربی کمان تھی، ایک شخص کے ہاتھ میں فارسی کمان دیکھی، تو فرمایا: اس کو پھینک دے اور ایسی لے۔ اس کو ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔[1]

عرب کی کمان نرم اور فارس کی کمان سخت ہوتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اترانے اور بہادری اور زور جتانے کو بڑے بڑے تیغے، بڑی بڑی ڈھالیں اور بھاری قیمت بھاری وزن کی بندوقیں باندھنا اور سخت سخت کمانیں نہ رکھنا چاہیے، شجاعت دل سے ہے اور فتح اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ظاہری اسباب کے لیے ہلکے پھلکے ہتھیار کافی ہیں۔

㉟ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ بعضے اونٹ شیطانوں کے ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ بعض افراد اپنے ساتھ سانڈنیاں لے کر نکلتے ہیں جن کو انھوں نے موٹا کر رکھا ہے، وہ ان میں سے کسی اونٹ پر نہیں چڑھتے اور اپنے بھائی پر گزر کرتے ہیں کہ جو چلنے سے تھک گیا ہے، لیکن اس کو سوار نہیں کر لیتے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی جو اونٹ نمود اور جلو کے واسطے ہیں اور خوب کھلا پلا کر موٹے بنائے گئے ہیں اور اپنے چڑھنے نہ کسی مسلمان کے چڑھانے کے لیے ہیں سو وہ شیطانوں کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ شیطان اس بات سے خوش ہوتا ہے۔ یہ جلو کی سانڈنیاں اور اسی طرح گھوڑے، خچر، ہاتھی وغیرہ شیطان کا کارخانہ ہے۔ مسلمان اس کو شیطان کی سواری سمجھ کر دور کرے اور ذریتِ شیطان میں داخل نہ ہو۔

㊱ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے گھوڑے کا حال پوچھا گیا تو فرمایا: گھوڑے تین طرح کے ہیں۔ ایک گناہ ہیں۔ وہ یہ کہ آدمی نے گھوڑا باندھا دکھانے اور بڑائی کرنے اور مسلمان پر چڑھائی کرنے کے لیے سو وہ گھوڑے اس کے لیے گناہ ہیں اور ایک گھوڑا پردہ ہے کہ آدمی نے اللہ کی راہ میں گھوڑا پالا اور اللہ کا حق اس کی سواری میں بھولا نہ اس

---

[1] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٨١٠) امام بوصیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: في إسناده عبد الله بن بشر الحبراني ضعفه يحيى القطان" وغیرہ

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥٦٨) اس کی سند میں انقطاع ہے۔ دیکھیں: الضعيفة (٢٣٠٤)

کی گردن میں، یعنی کبھی اس کو مانگنے دیا اور زکات بھی دی اور اس کے کھانے پینے کی خبر گیری رکھی، سو ایسا گھوڑا عیب پوش ہے کہ اس کو کوئی محتاج نہیں جانتا اور وہ گھوڑا جو اس کے لیے اجر ہے وہ یہ ہے کہ گھوڑا اللہ کی راہ میں مسلمانوں کے لیے باندھا، تاکہ مسلمان اس پر سوار ہو کر جہاد کریں۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[1]

معلوم ہوا کہ نام اور فخر کے لیے گھوڑے رکھنا حرام ہے، پھر کوتل گھوڑے رکھنا بڑا گناہ ہے۔

37. انس رضی اللہ عنہ مرفوعاً کہتے ہیں کہ سب خرچ اللہ کی راہ میں ہیں سوائے مکان بنانے کے کہ اس میں کوئی خیر نہیں ہے۔ اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے۔[2]

یعنی ضروری حاجت سے زیادہ گھر بنانا منع ہے، پھر اس کی آرایش وزیبایش کرنا بالکل رائیگاں ہے۔

38. دوسرا لفظ حدیثِ انس رضی اللہ عنہ میں یہ ہے کہ ایک انصاری نے ایک قبہ بنایا تھا، یعنی گول گھر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب نہ دیا، اس نے جب اس کو ڈھا دیا تب سلام لی۔ اس کو ابوداود نے طویل سیاق کے ساتھ روایت کیا ہے۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ اونچے بلند مکان بنانا وبال اور گناہ ہے۔

39. حدیثِ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ بعضے گھر شیطانوں کے ہوتے ہیں۔ سعد بن ابی ہند [راوی حدیث] کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ شیطان کے گھر یہی ہودے اور کجاوے ہیں جن کو لوگوں نے ریشمی کپڑوں سے ڈھانپا ہوتا ہے۔ اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[4]

اس سے مراد حویلی کا آراستہ کرنا، دیوار گیری اور چھت پر پردہ ڈالنا، یا پالکی و ناکی میانہ کا ہے جن کا غلاف حریر وغیرہ کا تیار کرتے ہیں، سو ایسے مکان شیطان کے گھر ہوتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔

40. انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو زعفران لگانے سے منع کیا ہے۔ اس کو شیخین

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۲۸٦۰) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۸۷)

[2] سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲٤۸۲) اس کی سند میں ''زافر بن سلیمان'' متکلم فیہ ہے۔ البتہ سنن الترمذي، رقم الحدیث (۲٤۸۳) ہی میں یہ روایت «یؤجر الرجل في نفقته کلها إلا التراب» صحیح سند سے مروی ہے۔

[3] مسند أحمد (۳/ ۲۳۰) سنن أبي داود، رقم الحدیث (۵۲۳۷)

[4] سنن أبي داود، رقم الحدیث (۲۵٦۸) اس کی سند میں انقطاع ہے، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

نے روایت کیا ہے۔[1]

(۴۱) یعلیٰ بن مُرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرد کو خلوق[2] لگائے دیکھ کر فرمایا: کیا تیری بیوی ہے؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: دھوڈالو، اسے پھر نہ لگانا۔ اس کو ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے۔[3]

عرب کی عورتیں چند عطر ملا کر خوشبو بناتی تھیں جو مرد کے لیے حرام ہے۔ اس میں زعفران بھی ہوتی تھی۔

(۴۲) ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یوں کہا ہے کہ جس شخص کے بدن پر خلوق ہوتا ہے، اللہ اس کی نماز قبول نہیں کرتا۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[4]

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما نے خلوق لگایا تھا، کیوں کہ سفر کی وجہ سے ان کے ہاتھ پھٹ گئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے سلام کا جواب نہ دیا اور کہا جا اس کو دھوڈال۔ اس کو ابوداود نے روایت کیا ہے۔[5]

(۴۳) حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں فرمایا ہے کہ مردوں کی خوشبو وہ ہے جس کی بو کھلی ہو اور رنگ چھپا ہوا ہو اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ کھلا ہو اور بو چھپی ہو۔ اس کو ترمذی، نسائی اور ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[6]

معلوم ہوا کہ زعفرانی اور صندلی کپڑا مرد کے لیے پہننا درست نہیں ہے۔

(۴۴) جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ ایک بستر مرد کے لیے اور ایک اس کی بیوی کے لیے اور تیسرا مہمان کے لیے اور چوتھا شیطان کے لیے ہے۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[7]

یعنی تین بستر سے زیادہ رکھنا ریا، اسراف اور تکبر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کسے ہوئے پلنگ، مسہریاں اور کوچین فرش تیار رکھتے ہیں اور ہر مکان میں طرح طرح کے فروش بچھے ہوتے

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٤٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٠١)

(2) خلوق: ایک قسم کا مرکب خوشبو ہے جس کا جزو اعظم زعفران ہوتا ہے۔

(3) سنن الترمذي (٢٨١٧) سنن النسائي (١٥٢/٨) اس کی سند میں "عبداللہ بن حفص" راوی مجہول ہے۔

(4) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤١٧٨) اس کی سند میں "زید" اور "زیاد" مجہول ہیں۔

(5) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٤١٧٦)

(6) سنن أبي داوٗد (٤٠٤٨) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٨٨) سنن النسائي (١٥١/٨)

(7) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٨٤)

ہیں، یہ سب شیطانی سامان ہے۔

(۴۵) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ مشرکوں کی مخالفت کرو، ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کم کرو۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ ڈاڑھی دین اسلام کی نشانی ہے، بلکہ مسلمانوں کی وردی ہے۔ ایک مشت[2] سے ڈاڑھی کم کرنا یا مونچھیں بڑی بڑی کرنا، کفر کی علامت ہے اور ڈاڑھی منڈوانا یا دائیں بائیں سے کم کرنا شرک کی علامت ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨٩٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٩)

[2] ایک مشت ڈاڑھی رکھنے کی تعیین کسی بھی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، بلکہ یہ بعض علما کا قول ہے۔ ان کا استدلال صحیح بخاری (۳۴۹/۱۰) میں مذکور ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ایک اثر سے ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما جب حج یا عمرہ کرتے تو اپنی ڈاڑھی کو پکڑتے اور ایک مشت سے زائد جو ہوتا اس کو کاٹ لیتے تھے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس اثر سے استدلال کرتے ہوئے ایک جماعت ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کے کاٹنے کی قائل ہے، جب کہ علامہ ابن التین نے ابن عمر رضی اللہ عنہما کے اثر کے ظاہری مفہوم کا انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ایک مشت ہی ڈاڑھی رکھتے تھے، بلکہ آپ ڈاڑھی پکڑتے تھے اور ٹھوڑی کے نیچے کے کچھ بال اپنی ڈاڑھی کی درازی کو برابر کر لینے کے لیے کاٹ لیتے تھے۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ڈاڑھی مونڈنا، کاٹنا اور اس کو برابر کرنا ممنوع ہے، لیکن اگر ڈاڑھی بڑی ہو تو اس کے طول یا عرض سے کچھ لینا بہتر ہے۔ ان کی دلیل عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مروی ترمذی کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ڈاڑھی کے طول و عرض سے کچھ لیتے تھے۔ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے، کیونکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے امام بخاری رحمہ اللہ کے حوالے سے اس کو منکر اور باطل قرار دیا ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ نے قاضی عیاض کا تعاقب کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ قول ڈاڑھی بڑھانے کے حکم میں وارد احادیث کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے، بلکہ سب سے بہتر اور صحیح قول یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، اس سے کسی قسم کا تعرض نہ کیا جائے اور اس میں سے کچھ نہ کاٹا جائے۔ (فتح الباري: ٣٥٠/١٠) شرح صحیح مسلم (۱۲۹/۱) ڈاڑھی رکھنے کے بارے میں احادیث میں کل پانچ الفاظ وارد ہیں: "أعفوا"، "أوفوا"، "أرخوا"، "أرجوا"، "وفروا".

ان سب کا معنی یہ ہے کہ ڈاڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے ساتھ کسی طرح کا تعرض نہ کیا جائے۔ جیسا کہ شروح الحدیث فتح الباری اور شرح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔

علامہ محمد عبد الرحمن محدث مبارک پوری رحمہ اللہ "تحفة الأحوذي" (١١/٤) میں بیان کرتے ہیں کہ بعض لوگ ابن عمر، عمر اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم کے آثار سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مشت سے زائد ڈاڑھی کاٹ دینی چاہیے۔ یہ استدلال ضعیف ہے، کیونکہ ڈاڑھی بڑھانے کے بارے میں منقول صحیح مرفوع احادیث ان ←

(۴۶) حدیث عبد اللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ میں کنگھی کرنے سے منع کیا ہے،[1] مگر کبھی کبھی یعنی ہر روز بالوں میں کنگھی کرنا تکلف ہے اور تکلف سے روکا گیا ہے، ایک دو روز کے بعد کرے۔

(۴۷) عمرو بن شعیب اپنے باپ سے وہ اپنے دادا سے مرفوعاً کہتے ہیں کہ سفید بال نہ اکھاڑو کہ یہ مسلمان کا نور ہے۔ جس کا بال مسلمانی کی حالت میں سفید ہوا، اللہ اس کے لیے ایک نیکی لکھتا ہے اور اس کا ایک گناہ مٹاتا ہے اور اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[2]

تو اب جوں جوں سفیدی زیادہ ہوگی، ان تینوں چیزوں میں زیادتی ہوگی، پھر جس کو توبہ کی حاجت ہے، اس کے لیے یہ بال کی سفیدی خود بخود توبہ ہے کہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور عابدوں کے لیے خود بخود بے مشقت ایک عبادت ہے کہ ثواب بڑھتا ہے اور درجے بلند ہوتے ہیں۔

(۴۸) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لڑکے کو دیکھا کہ اس کا کچھ سر مونڈا ہوا ہے اور کچھ نہیں۔ فرمایا: سب مونڈو یا سب چھوڑو۔ اس کو مسلم نے روایت کیا ہے۔[3]

اس سے معلوم ہوا کہ اس شکل کے سوا سر کے بالوں کی جتنی شکلیں ہیں، وہ سب حرام ہیں۔

(۴۹) حدیثِ انس رضی اللہ عنہما میں آیا ہے کہ ایک لڑکے کی دو چوٹیاں دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو منڈواؤ یا کتراؤ کہ یہ یہود کی وضع ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[4]

مسلمان کو نہ چاہیے کہ اپنی اولاد کو کافروں کی اولاد بنائے، پھر بزرگوں کے نام کی چوٹیاں یا کاکلیں رکھنا زیادہ حماقت اور شرک ہے۔

(۵۰) خریم اسدی رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہ کیا خوب آدمی ہے، اگر اس کے سر

← آثار کی نفی کرتی ہیں، لہٰذا ان صحیح مرفوع احادیث کے مقابلے میں ان اقوال و آثار سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہے۔ پس احوط طریقہ ان لوگوں کا ہے جو ظاہر حدیث پر عمل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس کے طول و عرض سے بال لینا برا فعل ہے۔ واللہ أعلم بالصواب.

مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: "وجوب إعفاء اللحية" مولفہ مولانا محمد زکریا کاندھلوی۔ سید بدیع الدین شاہ الراشدی کی کتاب "اسلام میں ڈاڑھی کا مقام" اور ڈاکٹر عمر سلیمان اشقر کی کتاب "ثلاث شعائر".

[1] مسند أحمد (٤/٨٦)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢٠٢)

[3] صحيح مسلم (٢/١٦٧٥)

[4] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤١٩٧)

کے بال بڑے اور اس کا تہد لمبا نہ ہوتا۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[1]

(۵۱) حدیثِ ابن عباس رضی اللہ عنہما میں حضرت ﷺ نے خبر دی ہے کہ آخر زمانے میں ایک قوم ہو گی جو سیاہ خضاب کرے گی، جیسے کبوتر کا سینہ ہوتا ہے۔ وہ بہشت کی خوشبو نہ پائے گی۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[2]

اس سے سیاہ خضاب کی حرمت نکلی مرد کرے یا عورت، کیونکہ لفظ قوم میں عورتیں بھی داخل ہیں۔ ہاں سرخ زرد خضاب جہاد میں درست ہے، سیاہ وہاں بھی درست نہیں ہے۔ زینت کے لیے کیسا ہی خضاب کیوں نہ ہو، استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

(۵۲) حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں فرمایا ہے کہ اللہ بالوں میں جوڑ ملانے والی اور ملوانے والی اور نیلا گودنے والی اور گدوانے والی پر لعنت کرے۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[3]

یہ کام عورتیں زینت کے واسطے کرتی ہیں سو ایسی عورتیں ملعون ہیں۔

(۵۳) ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ نے ان عورتوں پر لعنت کی جو نیلا گدوائیں اور ماتھے کے بال اکھاڑیں اور حسن کے لیے اپنے دانت الگ الگ کر دیں۔ یہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدل ڈالنے والیاں ہیں۔ اس کو شیخین نے روایت کیا ہے۔[4]

بعض عورتوں کے دانت بڑے بڑے ہوتے ہیں اور وہ ریت کر چھوٹے چھوٹے الگ الگ کرتی ہیں۔ کسی کے بال ماتھے تک ہوتے ہیں تو وہ بال اکھاڑ کر اپنا ماتھا بڑا کرتی ہیں، کوئی نیلا گودتی ہے، سو یہ سب اللہ کی لعنت میں گرفتار ہیں۔

(۵۴) حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں مردانہ وضع والی عورت پر لعنت کی ہے۔ اس کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے۔[5]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٧٩)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٢١٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٣٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٤)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٨٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٢٥)

[5] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٩٩)

خاتمہ

آج روز شنبہ وقت عصر پنجم شوال ۱۳۰۵ھ کو تاج محل واقع بلدۂ بھوپال میں یہ رسالہ ختم ہوا، یہ "تقوية الإيمان" حصہ دوم کا خلاصہ ہے، جس کا ترجمہ "تذكير الإخوان" چودہ جزو میں ہے، فی صفحہ تیئیس (۲۳) سطر اسی قدر صفحہ وسطر کے حساب سے یہ رسالہ چار جزو میں قدرے کم وبیشی کے ساتھ ملخص ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اس کو قبول کرے۔ اور سب مسلمانوں کو توفیق دے کہ عقیدہ توحید کو خوب درست کریں اور جملہ انواع شرک و بدعت سے خوب بچیں، اور سنت مطہرہ کو اپنا بانا ٹھہرائیں اور تقدیر پر ایمان لا کر اسلام ٹھیک کریں، اللہ پر متوکل ہوں، حضرت ﷺ اور ان کے اصحاب و اہل بیت بلکہ جمیع متوسلین متبعین سے محبت رکھیں اور ان کے رویہ کو اختیار کریں، اور بدعات قبور اور ضلالات پیر پرستی و گور پرستی و بدعات تقلید و بدعات رسوم سے توبہ کریں اور راگ باجا سننا اور اپنے نسب پر فخر کرنا اور شادی و ماتم میں بے جا خرچ کرنا اور بہت سی زینت دنیا کے امور میں کرنا، ترک کر کے پاک باطن اور صاف ظاہر، نرے مسلمان خالص مومن پورے متبع ومحسن بن جائیں۔

اللهم آمين، وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خير خلقه محمد وآله وصحبه وأتباعه أجمعين.

سائق العباد

إلى

صحة الاعتقاد

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ - ۱۳۰۷ھ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد لله الهادي إلى أصول الإيمان، وفروع الإسلام، و شؤون الإحسان، والصلاة و السلام على أفضل رسله و خاتم أنبيائه، من جاءنا بالسنة المقدسة و عظيم القرآن، وعلى آله و صحبه الماضين على خير هديه، والداعين إليه كل إنسان. أما بعد:

تعارف:

اسلام کے عقائد صحیحہ پر مشتمل یہ رسالہ ایک عربی رسالے "القائد إلى العقائد" کا ترجمہ ہے، جسے سید ابو النصر میر علی حسن خان ۔کان الله له۔ نے بعض اہلِ ایمان بھائیوں کی فرمائش پر تحریر کیا تھا۔ میں نے جناب عالیہ شاہ جہان بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال ۔أدام الله مجدها۔ کے حکم پر اردو میں اس کا ترجمہ کیا اور اس کا نام "سائق العباد إلى صحة الاعتقاد" رکھا ہے۔ نفعها الله بها و سائر المسلمات و المسلمين بمنه و كرمه، اللهم آمين.

رسالے کا موضوع اور غرض و غایت:

اس رسالے کے مولف نے حمد و نعت کے بعد لکھا ہے کہ اس مختصر رسالے میں صرف عقائدِ سلف کا بیان ہے، جو اس امت کے اکابر ائمہ اور قابل اعتماد لوگ ہیں۔ اس تصنیف کی غرض اپنی ذات کو اور ہر اس شخص کو فائدہ پہنچانا ہے، جو صحیح شرعی عقائد کا طالب ہو، تا کہ وہ جملہ دینی و دنیاوی سعادتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو۔ ان عقائد کے دلائل کی تفصیل کو ایک اور کتاب کی تحریر پر موخر کیا ہے جس کو اس رسالے کے بعد رضائے الٰہی ارادے سے اربابِ کتاب و سنت کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ إن شاء الله تعالىٰ، و بالله التوفيق.

اہلِ حق اور اصحابِ حدیث کا منہج:

اہلِ حق اور اصحابِ حدیث ایمان باللہ عزوجل، توحید کی شہادت اور ذاتِ باری تعالیٰ کے

ان صفات قدیمہ سے موصوف ہونے پر متفق ہیں، جن صفات کا ثبوت یا تو قرآن مجید سے ملتا ہے، وہ قرآن جس کے پس و پیش میں باطل کا گزر نہیں، یا پھر ان کا ثبوت رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث سے ہوتا ہے جو صحیح اور قابل اعتماد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے حقِ تبلیغ سے کما حقہ فارغ ہو چکے ہیں اور راہِ ہدایت کو کچھ اس طرح روزِ روشن کی طرح واضح فرما گئے ہیں کہ کسی ملحد کو اس میں بات کرنے کی جرأت ہے نہ کسی مخالف کے لیے کوئی دم مارنے کی گنجایش۔

الغرض اہلِ حق اور اہلِ حدیث اللہ تعالیٰ کے ان اسما و صفات پر ایمان لائے ہیں جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں اور وہ اپنے ظاہری معنی پر محمول ہیں۔ وہ ان میں کسی طرح کی تاویل کرتے ہیں جو تعطیل اور انکارِ صفات کو مستلزم ہو اور نہ ایسی تشریح کرتے ہیں جو ذاتِ باری کی تشبیہ اور تمثیل کی خبر دیتی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا اہلِ سنت پر یہ بہت بڑا فضل ہے کہ اس نے ان کو آیات کی تحریف و تاویل اور کیفیتِ صفات کی تشریح سے بچا لیا ہے، جس میں افراط و تفریط کا اچھا خاصا دخل ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ نے انھیں صحیح فہم و ادراک کی توفیق بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ شاہراہِ تنزیہ اور توحید کو طے کر گئے اور تعطیل و تشبیہ سے محفوظ رہے ہیں۔

صفاتِ الٰہیہ کے بارے میں اہلِ سنت کا بنیادی محلِ استدلال:

اس بارے میں اہلِ سنت نے اس ارشادِ باری تعالیٰ کا اتباع کیا ہے:

1. ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ: ۱۱] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں]
2. ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ٤] [اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے]

ان آیتوں نے ذاتِ باری تعالیٰ کی صفات و افعال کے متعلق مماثلت کے خیال کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا ہے۔ یہ طریقہ کار ان کو یوں کفایت کر گیا ہے کہ سنت نبویہ کی موجودگی میں ردی قسم کی بدعات کی طرف کبھی ان کی نگاہ بھی نہیں اٹھتی ہے۔ اسی کی بدولت ان کو اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑے بڑے مرتبے حاصل ہوئے ہیں۔ رضي الله عنهم و أرضاهم و جعل الفردوس نزلهم و مأواهم.

پہلی فصل

اسمائے حسنیٰ

کتاب وسنت میں اسمائے باری تعالیٰ کا بیان:

اللہ عزوجل کے وہ اسمائے حسنیٰ جو قرآن وسنت میں درج ہیں اور اس کی ذات وصفات کے ثبوت، افعال عجیبہ کے صدور اور ہر کمال کی جامعیت پر دلالت کرتے ہیں، درج ذیل ہیں:

الله، رحمٰن، رحيم، ملك، مليك، سبوح، قدوس، سلام، مؤمن، مهيمن، عزيز، جبار، متكبر، خالق، خلاق، بارئ، مصور، غافر، غفار، قاهر، قهار، وهاب، رازق، رزاق، رب، فتاح، عالم، عليم، علّام، قابض، باسط، خافض، رافع، فاطر، صانع، معز، مذل، سميع، بصير، حكم، عدل، جميل، لطيف، خبير، حليم، عظيم، غفور، شكور، شاكر، علي، كبير، حفيظ، حافظ، ناصر، نصير، مقيت، حسيب، رفيع، جليل، أكرم، كريم، فعال، قديم،[1] رقيب، قريب، مجيب، حنان، منان، ديان، واسع، محيط، حكيم، طبيب، كافي، شافي، ودود، مجيد، باعث، شهيد، وكيل، كفيل، قوي، متين، حميد، محصي، مبدي، معيد، محي، مميت، كاشف، قاضي، حي، قيوم، مدبر، واجد، ماجد، سيد، واحد، وتر، فرد، أحد، صمد، قادر، قدير، مقتدر، مقدم، مؤخر، أول، آخر، ظاهر، باطن، ولي، والي، مولى، متعالي، بر، تواب، طالب، غالب، منتقم، عفو، غياث، رؤوف، مقسط، جامع، غني، مغني، معطي، مانع، وفي، صادق، ضار، نافع، جواد، نور، هادئ، بديع، باقي، وارث، رشيد، صبور، حيي، الحق المبين، سريع الحساب، فالق الحب والنوىٰ، ذو الطول، ذو الفضل، ذو العرش، ذو المعارج، ذو الانتقام اور ذو الجلال والإكرام. یہ کل اسما ایک سو اکاون ہیں۔

[1] قرآن مجید اور صحیح احادیث میں اس اسم کا اسمائے باری تعالیٰ میں سے ہونا ثابت نہیں۔

اسمائے حسنٰی کے معانی و مطالب:

جس طرح ان اسما میں سے ہر ایک کے معنی علاحدہ علاحدہ ہیں اور ہر ایک سے ایک الگ وصف سمجھا جاتا ہے، اسی طرح بعض مختلف اسما بھی قدر مشترک کے اعتبار سے ایک صفت پر دلالت کرتے ہیں۔ بعض اسما سے اللہ عزوجل کا ثبوت اور بقا ظاہر ہوتے ہیں اور بعض سے صفتِ وحدانیت، خلق اور تدبیرِ خلائق آشکارا ہوتی ہے، اسی طرح کوئی وصف ایجاد و ابداع ظاہر کر رہا ہے تو کوئی تشبیہ کی نفی جتلا رہا ہے۔

اسمائے حسنٰی کی تعداد اور ان پر ایمان کا بیان:

امام بخاری، مسلم، ترمذی اور دیگر محدثین نے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام (ایک کم سو) ہیں۔ جو شخص ان کا احصا کرے گا وہ بہشت میں داخل ہوگا۔''[1]

حدیث میں موجود لفظ ''احصا'' کا لغوی معنی اگرچہ شمار کرنا ہے، مگر یہاں پر مقصد ان ناموں کو یاد کرنا ہے نہ کہ فقط ان کی گنتی کر رکھنا۔ ترمذی وغیرہ کی روایت میں جو ان ناموں کی تفصیل و تشریح وارد ہوئی ہے، دراصل وہ راویِ حدیث کی طرف سے ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان سے اس کا تفصیلی ثبوت نہیں ملتا۔

اس حدیث میں اللہ تعالیٰ کے ناموں کو ننانوے قرار دینا کثرتِ اطلاق اور زیادتِ استعمال کے اعتبار سے ہے۔ تمام اسما کا ننانوے کے عدد میں حصر و احاطہ کرنا مقصود نہیں ہے، کیونکہ مذکورہ ایک سو اکاون اسما میں سنن ترمذی کی روایت سے مروی ننانوے نام بھی داخل ہیں۔ وہ سب نام، جو کتاب و سنت سے ثابت ہیں اور ہر ایک کی سند محدثین کے ہاں معروف و مشہور ہے اور کتاب ''الجوائز والصلات''[2] وغیرہ دیگر مبسوط کتابوں میں درج ہیں، گزشتہ صفحات میں درج کیے گئے ہیں۔ ہر مسلمان کے لیے ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ان اسما کو اپنے ظاہری معنی پر بلا تشبیہ و تمثیل رکھا جائے اور کسی طرح کا اعتراض یا کوئی تاویل و الحاد اور ان میں کمی بیشی نہ کی جائے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا توقیفی امر ہے۔ جو اسم اور وصف شارع سے منقول ہے، فقط اسی کو قبول کرنا واجب ہے۔ اُن پر رائے اور اجتہاد سے کسی چیز کا قیاس کرنا درست نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري (٢٥٨٥) صحيح مسلم (٢٦٧٧) سنن الترمذي (٣٥٠٦)

[2] اس سے مولف رحمہ اللہ کی کتاب ''الجوائز والصلاة من جمع الأسامي والصفات'' مراد ہے، جو عربی زبان میں ہے۔

دوسری فصل

صفاتِ باری تعالیٰ

وہ صفات جن کو پروردگارِ عالم نے اپنی ذات کے لیے ثابت کیا ہے اور وہ قرآن مجید کی نصوص سے ثابت ہیں، ان میں سے ایک صفت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساتوں آسمانوں کے اوپر عرش مجید پر مستوی ہے۔ قرآن مجید میں سات جگہ اس کا ذکر آیا ہے اور کئی ایک احادیث کے ذریعے بھی یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے، اس لیے محدثین اور پختہ علم لوگوں کا اس پر ایمان ہے۔

تشبیہ سے بچنے کا آسان اور مختصر طریقہ:

تشبیہ سے بچنے کے لیے مختصر کلمہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾ [الشورىٰ: ١١] [اس کی مثل کوئی چیز نہیں] اور: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهُ كُفُوًا اَحَدٌ﴾ [الإخلاص: ٤] [اور نہ کبھی کوئی ایک اس کے برابر کا ہے] کفایت کرتا ہے۔ اس کے باوجود جو شخص اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق پر فوقیت وعلو اور اس عالمِ فانی سے اس کی علاحدگی کو تسلیم نہ کرے تو وہ شخص کتاب وسنت کو رد کرنے والا تصور ہوگا۔ أعاذنا اللہ من ذلك.

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات کے اعتبار سے تو آسمانوں کے اوپر ہے، مگر اس کا علم ہر جگہ ہے۔[1] امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اس لیے برحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کا حکم آسمان سے دے چکا ہے۔ امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم اپنے پروردگار کو ساتوں آسمانوں کے اوپر تمام مخلوق سے جدا مانتے ہیں اور جہمیہ کا یہ قول کہ اللہ کی ذات یہاں (زمین) پر ہے، غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بلند و بالا ہے اور ہم اس جہمی عقیدے کے قائل نہیں ہیں۔[2]

---

[1] مختصر العلو للذهبي (ص: ٧٥)

[2] مصدر سابق

صحیح دلائل سے ثابت شدہ صفاتِ الٰہیہ:

اللہ عزوجل کی صفاتِ عظیمہ درج ذیل ہیں:

حیات، علم، قدرت، قوت، عزت، جلال، مجد، جبروت، کبریا، عظمت، مشیت، ارادہ، سمع، بصر، رویت، کلام، قول، وحی، پردے کی آڑ سے بات کرنا۔ بعض مرسلین، ملائکہ اور دیگر مقرب بندوں کو اپنا کلام سنا دینا۔ وعدہ، وعید، ترغیب، ترہیب، خلق، امر، شہادت وغیب اور ہر عیب ونقصان سے مبرا ہونا ہے۔

اس کے سوا وجہ، یدین، نفس، عین، ذات، شخص، مرء، صورت، یمین، کف، حثیات، اصبع، ساعد، ذراع، صدر، ساق، قدم، رجل، جنب، روح، رحم، ظل، علو، مشیت، مرصاد، دنو، قرب، اتیان، نزول، ہرولہ، وطأت، نفس، ضحک، عجب، فرح، تبشبش، نظر، غیرت، ملال، استحیا، استہزا، خدیعت، مکر، فراغ، تردد، فضل، رحمت، محبت، رضا، سخط، غضب، عداوت، ولایت، اختیار، صبر، اعادہ خلق، محاضرہ، مصافحہ، اطلاع، اِشراف، عندیت، تقلیبِ قلوب، علمِ غیب، ذکرِ خلق اور ہر روز نئی شان میں رہنا۔ جو صفات ان کے سوا آیات قرآنیہ سے واضح طور پر ثابت ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی صحیح وحسن احادیث میں وارد ہوئی ہیں، وہ سب اسماے حسنیٰ اور صفاتِ جلیلہ میں شمار ہوتی ہیں۔ بعض احادیث میں بعض اوصاف کی مراد متعین ہے اور بعض کا معنی محتمل ہے۔

تنبیہ:

اللہ عزوجل کی صفات ذاتیہ اس کے متعلقہ افراد کی کثرت کے اعتبار سے اگرچہ بے حد وحساب ہیں، مگر اس کثرتِ اضافات سے اللہ تعالیٰ کی کسی ذاتی صفت میں تکثر نہیں ہوا، بلکہ ان میں سے ہر ایک واحد ذات کی مانند واحد بالذات ہے۔

تیسری فصل

اللہ عزوجل کا ہر رات آسمانِ دنیا پر نزول

اہلِ حق اور اہلِ توحید کا اس بات پر اجماع ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہر رات آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے اور اس کا یہ نزول مخلوق کے نزول سے کسی قسم کی مشابہت نہیں رکھتا۔ ہمیں نزولِ باری تعالیٰ کی اصل کیفیت معلوم ہے نہ ہم اس کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ دے سکتے ہیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اس کی کیفیت نہیں بتلائی ہے۔ صرف اس قدر فرمایا ہے کہ اللہ عزوجل ہر شب کو آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی زوجہ محترمہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ایک دن کہا: آج کے دن اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرمایا کرتا ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا: کون سے دن؟ ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے جواب دیا: عرفہ کے دن۔[2]

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نصف شعبان کو رات سے آخر دن تک آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔[3]

امام صابونی رحمہ اللہ نے رسالہ عقائد میں اپنی سند سے ان روایتوں کو درج کیا ہے اور اس صفت کے ثبوت میں سیر حاصل بحث کی ہے۔[4]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٥٨)

[2] الإبانة لابن بطة (٢٣٦/٣)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٧٣٩) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٣٨٨) مسند أحمد (٢٣٨/٢)
ان تمام روایات میں متعدد راوی ضعیف اور ناقابلِ احتجاج ہیں، جس کی وجہ سے یہ روایت ضعیف ہے۔

[4] دیکھیں: عقيدة السلف أصحاب الحديث للصابوني (ص: ١٧)

چوتھی فصل

صفتِ کلام

متفق عقائد میں سے ایک اعتقاد یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہمیشہ سے ایسے کلام کے ساتھ متکلم رہا ہے جو فہم و سماعت اور کتابت و قراءت میں آتا ہے۔ قرآنِ مجید کتاب اللہ، کلامِ الٰہی، وحی اور تنزیل سماوی ہے۔ حفاظ کرام کو جو چیز یاد ہے اور اس کا پڑھنے والا جس چیز کو پڑھتا ہے اور سامعین کے کانوں میں جو کلمات پہنچتے ہیں، وہ سب حقیقت میں اللہ ہی کا کلام ہے۔ جس چیز پر اس کی کتابت کریں، خواہ وہ بچوں کی تختی ہو یا کتاب، زمین کا کوئی خطہ ہو یا آسمان کا کوئی حصہ، جہاں کہیں اس کی قراءت ہو، بہر حال وہ اللہ ذوالجلال کا کلامِ پاک ہے۔ اللہ کا کلام اس کی ازلی صفت ہے، مخلوق نہیں ہے اور وہی دلوں میں ضبط، قراءت کے وقت زبانوں پر متلو، کتابوں میں مرقوم اور سامعہ و باصرہ کو مسموع و مشاہد ہوتا ہے۔ جو شخص اللہ کے کلام کو مخلوق کہے، اہلِ سنت کے نزدیک وہ کافر ہے۔

قرآن مجید کی ابتدا و انتہا دونوں اللہ ہی کی جانب سے ہیں۔ چنانچہ وہ عربی زبان میں جبریل علیہ السلام کے واسطے سے محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوا ہے۔ اس میں ہر نیک و بد کے لیے خوشخبری اور وعید ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مکمل قرآن مجید کسی کمی بیشی کے بغیر اپنی امت کے حوالے فرمایا۔ لکھنے پڑھنے میں بنفسہ اللہ تعالیٰ کا کلام لکھا، پڑھا اور سنا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس کی نقل وحکایت کی کتابت و تلاوت ہوتی ہے۔ کلامِ الٰہی میں حرف وصوت کا ہونا خود قرآن و حدیث سے اس طرح ثابت ہے جس کا کوئی مسلمان انکار نہیں کر سکتا۔ جو شخص اس کے سوا کوئی اور طریقہ اختیار کرے، وہ سنت کا تارک اور مبتدع ہے۔

متکلمین اور اشاعرہ وغیرہ کے کلام میں جو کلام نفسی کو صفت ازلی ٹھہرایا گیا ہے، قرآن وحدیث میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

پانچویں فصل

تنزیہِ باری تعالیٰ

اللہ عزوجل واجب الوجود اور تمام کمالات و صفاتِ حسنہ سے موصوف ہے۔ وہ زوال و فنا سے بالا اور ہر طرح کے نقصان و عیب سے مبرا ہے۔ تمام مخلوق کو وہ اکیلا پیدا کرنے والا ہے، جمیع معلومات سے آگاہ ہے، ممکنات میں سے کوئی چیز اس کے قبضۂ قدرت سے خارج ہے نہ موجودات میں سے کوئی چیز اس کے ارادے کے بغیر واقع ہوتی ہے۔ وجوبِ وجود، استحقاقِ عبادت و الوہیت اور صفتِ خلق و تدبیر وغیرہ میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ صرف وہی ایک ذات مستحقِ عبادت اور بندوں کو دینے والی ہے۔ وہی ہر بیمار کو شفا بخشنے والا اور تمام ضرر دور کرنے والا ہے۔

وہ خود کسی میں حلول کرتا ہے نہ کوئی دوسرا اس میں حلول کر سکتا ہے۔ وہ کسی سے متحد ہوتا ہے نہ کوئی دوسرا اس سے مل سکتا ہے۔ اس میں کسی طرح کا حدوث و تجدد نہیں پایا جاتا۔ وہ ذات و صفات میں بے مثل اور یگانہ ہے۔ اس کو کامل یکتائی اور بے پروائی حاصل ہے۔ اس نے کسی کو جنا ہے نہ اسے کسی نے جنا ہے۔ ذات و صفات میں کوئی اس کا مثل نہیں ہے۔ وہ جہل و کذب سے بری ہے۔ قرآن و حدیث میں جو صفاتِ الٰہیہ وارد ہوئی ہیں، ان کے بارے میں چھان بین اور بحث کرنا قابلِ مذمت بدعت ہے۔

چھٹی فصل

رویتِ الٰہی

اہلِ ایمان کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کا دیدار ہونا آیات قرآنیہ سے ثابت ہے۔ صحیح ومتواتر احادیث میں اس طرح وارد ہے:

"بے شک تم اپنے رب تعالیٰ کو اس طرح دیکھو گے جس طرح تم چودھویں رات میں چاند کو دیکھتے ہو، جس وقت وہ کامل ہو جاتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی رویت میں کوئی خفا اور اشتباہ باقی نہیں رہے گا۔"[1]

علامہ صابونی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اس تشبیہ سے مقصود ذاتِ باری تعالیٰ کی چاند سے تمثیل نہیں ہے، بلکہ فقط اس کے دیدار کو چودھویں رات کے چاند کی رویت سے تمثیل مراد ہے۔ انتھی.[2]

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار دو طرز پر ہو سکتا ہے۔ اول اس کا ظہور و انکشاف کامل طور پر ہو، جس کے مقابلے میں تصدیق ایمانی اور ایمان بالغیب بھی بے اصل و لاشے ثابت ہوگا۔ معتزلہ کا مختار مذہب یہی ہے اور فی نفسہ حق بھی ہے، مگر اس میں ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ اس معنی میں رویت کو اسباب کے اندر محصور کر دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رویت کا دوسرا طریقہ اسے متعدد صورتوں میں دیکھنا ہے جس پر بہت سی احادیث دلالت کرتی ہیں اور یہی مذہب قوی ہے۔

الغرض ایمان والے اللہ تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھوں سے آمنے سامنے اس کی صورت اور رنگ کے ساتھ دیکھیں گے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"میں نے اپنے رب تعالیٰ کو حسین تر صورت میں دیکھا۔"[3]

---

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (٥٢٩) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٦٣٣)

[2] عقیدة السلف أصحاب الحدیث للصابوني (ص: ٢٤)

[3] سنن الترمذي، رقم الحدیث (٣٢٣٤)

جس طرح اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھتے ہیں، اسی طرح آخرت میں بالمشافہہ اس کا دیدار ہوگا۔ اگر اس رویت سے مراد شارع کی مذکورہ دو صورتوں کے سوا رویت کا کوئی اور معنی ہے تو اسی پر ہمارا ایمان ہے، اگرچہ بعینہٖ اس وقت تک ہم نے اس کو نہ سمجھا ہو۔

ساتویں فصل

ذکرِ خیر وشر

ہر نیکی وبدی، اطاعت ومعصیت اور ایمان وکفر اللہ ہی کی خلق اور ارادے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے عزم و ایجاد کے بغیر کوئی چیز، وہ خیر ہو یا شر، واقع نہیں ہوتی۔ البتہ اتنا فرق ہے کہ ایمان و اطاعت سے اللہ تعالیٰ خوش اور راضی ہوتا ہے اور کفر و معاصی سے خفا اور نا خوش۔

تنبیہ:

اہلِ سنت کا یہ عقیدہ ہے کہ ہر خیر وشر کا وجود اللہ ہی کی قضا وقدر اور اس کے ایجاد و امر سے ہوتا ہے، مگر باوجود اس کے براہِ ادب شر اور بدی کو وہ اللہ کی جانب منسوب نہیں کرتے، کیونکہ اس میں اس کی ذات عالی سمات کی نسبت طعن و الزام کا گمان متبادر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

«اَلْخَيْرُ فِيْ يَدَيْكَ وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ» [1]

[خیر و بھلائی تیرے ہاتھوں میں ہے اور شر و برائی کی نسبت تیری طرف نہیں ہے]

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ بھلائی اللہ کے ہاتھوں میں ہے اور برائی سے وہ بری ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں ابراہیم علیہ السلام سے منقول ہے:

﴿وَإِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ يَشْفِيْنِ﴾ [الشعرآء: ۸۰]

[اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے]

بیماری چونکہ اذیت وکلفت کا سبب تھی تو اس کو ابراہیم علیہ السلام نے ادباً اپنی ہی طرف منسوب کیا اور شفا کو اللہ تعالیٰ کا عمل بتایا، حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ مرض اور شفا دونوں ہی اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

---

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۷۷۱)

گناہ اگرچہ نبود اختیار ما حافظ
تو در طریق ادب کوش وگو گناہِ من است

[اے حافظ! اگرچہ گناہ صرف ہمارے اختیار سے نہیں ہوتا، پھر بھی ادب کا تقاضا یہ ہے کہ تو نیکی اور بھلائی کے کام میں لگا رہ اور کہہ گناہ میرا ہی ہے]

آٹھویں فصل

افعالِ الٰہیہ کی حقیقت

اللہ تعالیٰ تمام عالم سے غنی اور بے پروا ہے۔ وہ اپنی صفات میں کسی بھی لحاظ سے کسی شخص اور سبب کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ کسی کا محکوم اور تابع ہے۔ ہر امر میں وہی سب پر غالب ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے اور جس امر کا ارادہ کرتا ہے، اس کا حکم جاری کر دیتا ہے۔ اللہ پر کسی کے واجب کرنے سے کوئی فعل لازمی اور ضروری نہیں ہوتا۔ ہاں جس چیز کا وہ وعدہ کر لیتا ہے، اپنے لطف و کرم سے وہ اسے پورا فرما دیتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی سچا نہیں ہے۔ اللہ کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ معاملات جزئیہ میں اَلطف اور اَصلح کا پاس لحاظ کرنا اس پر لازم نہیں ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کا کوئی فعل قبیح نہیں ہے اور اس کا کوئی حکم حق و انصاف کے خلاف نہیں ہے۔ اس کی ہر ایجاد اور ہر ارشاد میں حکمت پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا ہے۔ اشیا کا حسن و قبح عقل کی رو سے نہیں ہے۔ اسی طرح اعمال کا نیک و بد ہونا اور ان پر ثواب و عذاب کا مرتب ہونا بھی عقل کے تابع نہیں ہے، بلکہ یہ جملہ امور اللہ ہی کے حکم اور اسی کی تشریع و ارشاد پر موقوف ہیں۔

نویں فصل

فرشتوں کا ذکر

فرشتے بھی مختلف مراتب رکھنے والی اللہ تعالیٰ کی ایک مخلوق ہے۔ وہ مقرب ہوں یا غیر مقرب، آسمانی ہوں یا زمینی؛ ہر ایک کے ذمے ایک خدمت بجا لانا مقرر ہے۔ بعض فرشتے بندوں کے اعمال تحریر کرنے کی ذمے داری ادا کرتے ہیں۔ بعض فرشتے ہلاکت کے مختلف اسباب سے لوگوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ بعض کے ذمے مخلوق کے دل میں خیر و نیکی کا القا کرنا ہے، جس طرح شیاطین اولادِ آدم کے دلوں میں برے خیالات ڈالا کرتے ہیں۔ ہر فرشتے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے ایک حد مقرر ہے جس سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔ ہر فرشتہ احکام کی تعمیل میں ہمیشہ کمر بستہ رہتا ہے اور ان میں سے کوئی نافرمانی اور خلاف ورزی کے نام سے بھی آشنا نہیں ہے۔

دسویں فصل

قضا و قدر کا بیان

قلیل و کثیر، نیک و بد اور تلخ و شیریں؛ جملہ مقدرات اللہ ہی کے حکم و تقدیر سے واقع ہوتے ہیں۔ کوئی چیز تقدیر کو ٹالنے والی ہے نہ تقدیر سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے۔ ہر شخص کو وہی بات پیش آتی ہے جو نوشتۂ تقدیر ہے۔ بالفرض تمام مخلوقات اس امر پر اتفاق کر لیں کہ وہ کوشش کر کے کسی کو کچھ ایسا فائدہ پہنچا دیں جو اللہ نے اس کے مقدر میں نہیں لکھا تو انھیں اس معاملے میں کسی طرح کامیابی ممکن نہ ہوگی۔ ایسے ہی اگر وہ سب مل کر خلافِ تقدیر کسی کو نقصان پہنچانا چاہیں تو ان کے ایسا کرنے سے کسی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت و ارادے سے جو ضرر و تکلیف بندے پر نازل کرتا ہے، اللہ کے سوا اسے کوئی دور نہیں کر سکتا اور وہ جس کی بہتری چاہتا ہے، اس کو رد کر دینا بھی کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔

گیارھویں فصل

معراج کا ذکر

اہلِ حدیث ائمہ سلف کا اس پر اجماع ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات اپنے جسد اطہر اور روح مبارک کے ساتھ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک اور وہاں سے ساتوں آسمانوں کو طے کر کے سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے اور صبح صادق سے پہلے مکہ معظّمہ میں واپس آ گئے۔ جو شخص اس کے خلاف اعتقاد رکھے اور کہے کہ معراج کا قصہ خواب کا واقعہ ہے، یہ سیر جسمانی نہیں تھا، وہ کافر اور گمراہ ہے، کیونکہ معراج کا بیان تواتر کے ساتھ منقول ہے، اس میں کسی طرح سے شک و شبہہ نہیں ہو سکتا۔ احادیث صحیحہ، جو اہلِ نقل و فضل کے ہاں مقبول و مسلم ہیں، اس پر شاہد ہیں۔ اگر کسی طرح کی توجیہ و تاویل نہ کی جائے تو ظاہرِ حدیث اس بات کا فائدہ دیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ معراج کی رات پروردگارِ عالم کے دیدار سے مشرف ہوئے ہیں۔ چونکہ اس سلسلے میں قیل و قال کرنا بدعت ہے، اس لیے کسی سے اس کے متعلق بحث کرنا ہمیں بھی منظور نہیں ہے۔ رویت کا منکر اللہ و رسول کی مخالفت کرنے والا ہے[1] أعاذنا الله من ذلك.

[1] روزِ قیامت دیدار الٰہی کا منکر یقیناً بدعتی ہے، البتہ شبِ معراج رویتِ باری تعالیٰ کے سلسلے میں بیشتر صحابہ کرام اور ائمہ سلف کا یہی موقف ہے کہ آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی رویت عینی حاصل نہیں ہوئی۔

بارھویں فصل

جسم کا انجام

قیامت کے دن دنیا میں ملے ہوئے ان جسموں کا روحوں کے ساتھ لوٹایا جانا کتاب و سنت کے واضح دلائل کے ساتھ ظاہر ہے۔ آخرت میں ہر شخص کا بدن عرف و شرع کی رو سے وہی ہو گا جو دنیا میں تھا، اگرچہ مشیت ایزدی کے ساتھ طول و عرض کی مقدار میں کچھ کمی بیشی کیوں نہ آ جائے۔ مرنے کے بعد ہر شخص کا قبر سے اٹھنا برحق ہے۔ قیامت کی سختیاں اور خوفناک واقعات، جن کی خبر اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے دی ہے، جیسے اختلاف مراتب کی بنیاد پر بندوں کا اذیت و تکلیف اٹھانا، دائیں اور بائیں ہاتھوں میں نامۂ اعمال تھمایا جانا، ان اعمال ناموں میں ذرہ برابر تک کی نیکی و بدی درج پانا، اسی طرح اعمال کا وزن، پل صراط سے گزرنا، حساب و کتاب، سوال و جواب اور ہر عمل کی جزا و سزا ملنا وغیرہ؛ جن جن زلازل و فتن اور آلام و محن کا وقوع حشر کے روز بتلایا گیا ہے، سب کچھ ہونے والا ہے اور حق ہے۔

تیرھویں فصل

شفاعت

اہلِ سنت کا ایمان ہے کہ قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کی پہلی بڑی شفاعت اللہ تعالیٰ کے اذن وحکم سے تمام متقین و فاسقین اور کفار ومشرکینِ اہلِ محشر کے لیے عام ہوگی۔ جس کے سبب لوگوں کو شدید رنج وملال اور بے چینی سے تخفیف و افاقہ ہوگا۔[1] آپ ﷺ کی دوسری شفاعت نافرمان مومنین اور کبیرہ گناہوں کے مرتکب لوگوں کو جہنم سے نکالنے کی غرض سے ہوگی، جب کہ وہ آگ میں جل کر کوئلے بن چکے ہوں گے۔[2]

رسول اللہ ﷺ سب سے پہلے شفاعت کے لیے کھڑے ہوں گے اور سب سے پہلے آپ ﷺ ہی کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ قرآن کی جن آیات میں شفاعت کی نفی کا ذکر ہے، اس سے مراد وہ شفاعت ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کے حکم کے بغیر واقع ہو۔

چنانچہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴾ [النبأ: ٣٨]

[وہ کلام نہیں کریں گے، مگر وہی جسے رحمان اجازت دے گا اور وہ درست بات کہے گا]

آپ ﷺ کی شفاعت کا مستحق وہی شخص ہے جو دل سے پورے خلوص کے ساتھ "لا إله إلا الله" کہتا تھا، توحید پر ثابت قدم تھا اور شرک سے پوری نفرت رکھتا تھا۔

یہ ایمان لانا بھی ضروری ہے کہ اہلِ ایمان وتوحید کا ایک گروہ حساب و کتاب کے بغیر جنت کا راہی بنے گا۔ دوسرا گروہ ہلکا پھلکا حساب دے کر بلا تکلیف و عذاب بہشت میں داخل ہوگا۔ تیسرا گروہ ان گناہ گاروں کا ہوگا جو جہنم میں داخل ہو کر مختلف عذابوں سے دو چار ہو کر نجات پائے گا اور پھر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣١٦٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٠٠)

جنت میں داخل ہو کر پہلے سے جنت میں گئے ہوئے لوگوں سے جا ملے گا۔

غرض کہ کوئی ایمان والا جہنم میں ہمیشہ نہیں رہے گا۔ ان میں سے ہر ایک کو اول یا آخر اللہ تعالیٰ ضرور جنت میں پہنچا دے گا۔ جب کہ اس کے برعکس کفار و مشرکین ہمیشہ جہنم میں پڑے رہیں گے اور ابد الآباد تک وہاں سے ان کے چھٹکارے اور رہائی کی کوئی صورت نہ بن پائے گی۔ نعوذ باللّٰہ منہا.

چودھویں فصل

حوضِ کوثر، قبر اور جنت وجہنم کا بیان

حوضِ کوثر:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے کوثر نامی ایک حوض عطا ہوا ہے جس پر امتِ مرحومہ یعنی اہلِ اسلام کا گزر ہو گا۔ اس حوض کا پانی دودھ سے بڑھ کر سفید، شہد سے زیادہ میٹھا ہے۔ جس خوش نصیب کو وہ ایک دفعہ میسر ہوگا، اسے کبھی پیاس کی تکلیف نہ ہوگی۔[1]

قبر:

قبر میں مخلص مومنوں کو آرام کا میسر آنا اور کفار و منافقین کا عذاب میں مبتلا رہنا ضروری امر ہے، اسی طرح منکر ونکیر کے سوال و جواب کا ہونا بھی درست اور صحیح ہے۔ اس بارے میں کسی نے کیا خوب کہا ہے:

جانا تجھ کو جانب پروردگار ہے
وہاں کون تیرا مددگار ہے
جب قبر تیرے واسطے محل خواب ہو
ملائکہ سے کیا سوال و جواب ہو

اسی طرح عربی ادب کی مشہور کتاب ''مقامات حریری'' میں کیا خوب فقرہ لکھا ہے:

"وإلى الله مصيرك، فمن نصيرك؟ وفي القبر مقيلك، فما قيلك؟"[2]

[اور انجام کار تجھے اللہ کے پاس جانا ہے، وہاں تیرا معاون و مددگار کون ہو گا؟ قبر و لحد میں تجھے جا سونا ہے، وہاں تو کیا بولے گا؟]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٠٠)

[2] مقامات الحريري "المقامة الصنعانية" (١/٤)

بہشت و دوزخ کا وجود برحق ہے۔ بہت سی آیات و احادیث اس کو بیان کرتی ہیں۔ فی الحال یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی ایجاد سے موجود ہیں اور بہت سے دلائل کے ساتھ اس کا ثبوت موجود ہے۔ ان دونوں کے لیے فنا و عدم نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں بقا کی غرض سے بنایا ہے۔ البتہ کسی آیت و حدیث سے صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ جنت و جہنم بالفعل کہاں ہیں۔ زمین کے نیچے ہیں یا آسمان کے اوپر؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں جہاں رکھنا چاہا، وہیں پر وہ موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ جہان اور اس کی مخلوقات کا ہمیں تفصیلی علم نہیں ہے کہ ہم ان کا پتا بتائیں۔ بہر حال ہم اللہ تعالیٰ سے بلند درجات کے ساتھ بہشت بریں کا سوال کرتے ہیں اور جہنم اور اس کے تمام طبقات سے پناہ چاہتے ہیں۔ اہلِ جنت جنت سے کبھی نکالے نہیں جائیں گے، اسی طرح وہ جہنمی جو جہنم ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں، ابد الآباد تک اس سے باہر نہیں نکالے جائیں گے۔ جب جہنم سے تمام اہلِ اسلام رہا ہو جائیں گے اور کفار کے سوا کوئی مومن اس میں باقی نہ رہے گا، اس وقت ایک منادی آواز دے گا کہ اے اہلِ جنت! اب یہاں ہمیشگی کا قیام ہے موت کا نام نہیں، اور اے اہلِ جہنم! اب تم ہمیشہ یہاں رہو گے، تمھیں کبھی موت نہیں آئے گی۔ صحیح حدیث میں یہ بات موجود ہے۔[1]

کبائر کا مرتکب مسلمان ہمیشہ جہنم میں نہیں رہے گا، اگرچہ وہ توبہ کیے بغیر فوت ہوا ہو۔ خرقِ عادت کے طور پر اسے ہر طرح کے عذاب سے معافی مل جانا بھی ممکن ہے، کیونکہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے افعال دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو بطریقِ عادت مروجہ کے سبب کثیر الوقوع اور عام طور پر واقع ہوتے ہیں۔ دوسرے وہ جو خاص طور پر قلیل الوجود، خرقِ عادت اور خلافِ طبع متعارف ہیں۔ کبیرہ گناہوں کے مرتکب کو توبہ کے بغیر کلی نجات مل جانا اسی دوسرے طریق میں شمار ہوتا ہے۔ اس مسئلے میں بہ ظاہر جن نصوص کے اندر باہم دگر تعارض معلوم ہوتا ہے، ہماری اس تقریر سے وہ تعارض رفع ہو جاتا ہے۔ واللہ أعلم.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٧٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٥٠)

پندرھویں فصل

عصمت کا بیان

بعثتِ انبیا سے لوگوں کے عذر اور حجت کا خاتمہ:

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے پاس اس غرض سے رسولوں کو بھیجا ہے کہ ان کے لیے اللہ کے ہاں کوئی عذر اور حجت باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی معرفت جو اوامر و نواہی بھیجے ہیں، وہ تمام کے تمام درست اور برحق ہیں۔ رسولوں کو چند فضائل کی وجہ سے دوسرے لوگوں پر فوقیت حاصل ہے اور یہ فضائل رسولوں کے سوا کسی شخص میں جمع نہیں ہوتے:

اول: معجزات کا صدور۔

دوم: طبیعت کی سلامتی اور مزاج کا اعتدال۔

سوم: اخلاق کی پاکیزگی اور چال چلن کی خوبی۔

چہارم: کفر، کبیرہ گناہوں اور صغیرہ گناہوں پر اصرار سے عصمت وحفاظت۔

رسولوں کی حفاظت کیسے ہوتی ہے؟

اللہ کی طرف سے تین طرح سے رسولوں کی حفاظت ہوتی ہے:

1. ان کی خلقت وفطرت نہایت لطیف و پاکیزہ اور ان کا مزاج از بس معتدل و سنجیدہ ہوتا ہے، لہٰذا ان کی سرشت معصیت کے ارتکاب سے ان کا دفاع کرتی رہتی ہے۔
2. بذریعہ وحیِ الٰہی اطاعت والے کاموں اور نیکیوں کی خوبیاں، نافرمانی والے کاموں اور گناہوں کی برائیاں ان پر ظاہر ہو جاتی ہیں۔ وہ خوف وخشیتِ الٰہی کے سبب گناہ کی طرف رغبت نہیں کر سکتے۔
3. اللہ کی طرف سے ان کے لیے غیبی طور پر کوئی عجیب اور انوکھی چیز ظاہر ہوتی ہے جو انھیں گناہوں سے بچا لیتی ہے، جیسے یوسف علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَاۤ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَ الْفَحْشَآءَ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ﴾ [یوسف: ٢٤]

[اور بلاشبہ یقیناً وہ اس کے ساتھ ارادہ کر چکی تھی اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ کر لیتا اگر یہ نہ ہوتا کہ اس نے اپنے رب کی دلیل دیکھ لی، اسی طرح ہوا، تا کہ ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو ہٹا دیں۔ بے شک وہ ہمارے خالص کیے ہوئے بندوں سے تھا]

فضائلِ سید المرسلین ﷺ کا تذکرہ:

اہلِ حدیث کے عقائد میں یہ عقیدہ بھی شامل ہے کہ محمد ﷺ تمام مخلوقات سے زیادہ جلیل القدر اور ان سب سے بہتر ہیں۔ آپ ﷺ کی ذات پر نبوت ختم ہو چکی ہے، لہٰذا اب قیامت تک کوئی سچا نبی نہیں ہوگا۔ آپ ﷺ کی شریعت تمام لوگوں کے لیے عام ہے۔ تمام جنوں اور انسانوں پر محمد ﷺ کی تعمیل اور آپ ﷺ کا اتباع فرض اور لازم ہے۔ آپ ﷺ سید الانبیا اور خاتم الرسل ہیں۔ آپ ﷺ کی عمومی بعثت اور دیگر خاص فضائل کی وجہ سے، جو آپ ﷺ کی ذاتِ عالیہ میں جمع ہیں، محدثین کی جماعت نے آپ ﷺ کے فضائل کی تفصیل میں عمدہ عمدہ کتابیں تصنیف کی ہیں، جیسے قاضی عیاض رحمہ اللہ کی کتاب ''الشفاء''، امام سیوطی رحمہ اللہ کی کتاب ''خصائص کبریٰ''، امام عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''مواہب لدنیہ'' اور شیخ عبدالحق دہلوی رحمہ اللہ کی کتاب ''مدارج النبوۃ''۔

سولھویں فصل

اولیاء اللہ کا تذکرہ

اولیاء اللہ کی پہچان اور کراماتِ اولیا کا بیان:

اولیاء اللہ کی کرامت برحق ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں میں سے جس کی عزت افزائی چاہتا ہے، اپنی رحمت کے ساتھ اس کو کرامت عطا فرما دیتا ہے۔ عرفِ شرع میں ولی وہ شخص ہے جسے پروردگارِ عالم کی ذات و صفات کی معرفت حاصل ہو، ایمان و اخلاص کی حقیقت معلوم ہو۔ وہ کتاب وسنت کا عالم اور ظاہراً و باطناً شریعت کا پابند ہو۔ آیت و حدیث میں تحریف لفظی و معنوی کو روا نہ رکھتا ہو، بدعات کا معتقد نہ ہو اور منکرات پر عمل پیرا نہ ہو۔ جو لوگ ان کمالات کے ساتھ متصف ہوں گے، ان سے جو امر خارقِ عادت صادر ہو گا، اسے کرامتِ اولیا کہیں گے۔ سلفِ امت اور ائمہ سلف کا اس بارے میں یہی اعتقاد رہا ہے۔

جو تصرف اور خرقِ عادت امر اللہ کے دشمنوں اور شیطان کے دوستوں سے صادر ہو، اسے کرامت نہیں کہیں گے، کیونکہ وہ دنیا میں ان کے لیے حاجت روائی، مکر اور استدراجِ الٰہی ہے اور آخرت میں ان کے لیے باعثِ عقوبت ہے۔

اولیاء اللہ کی شناخت کا کوئی متعین قاعدہ ہے نہ ان کے لیے وضع لباس یا کسی کھانے پینے یا کسی چیز کی خصوصیت و امتیاز یا ان کے گھر کا کوئی خاص انداز یا علوم وفنون متداولہ سے معین علم وفن کا اکتساب یا مباح امور میں کسی ظاہری و باطنی طرز کا اختصاص جیسی کوئی مخصوص علامت ہے، کیونکہ اولیاء اللہ امت محمدیہ، علی صاحبہا الصلوۃ والسلام، کے ہر فرقے اور طبقے میں، فاسق اور مبتدعین کو نکال کر، موجود ہوتے ہیں۔

اولیاء اللہ کہیں تو اصحابِ حدیث وقرآن میں ہیں، کہیں اسلحہ اور زبان سے جہاد کرنے والوں میں ہیں، کہیں اربابِ تجارت وصناعت میں داخل ہیں اور کہیں مزدوری وزراعت میں مصروف ہیں۔

جہاں تک اولیا کو صوفی یا مشائخ وفقرا کہنے کا تعلق ہے تو یہ ایک عرف جدید ہے۔ سلف سے

ایسا کوئی لفظ اور نام منقول نہیں ہے۔ صنعت وحرفہ کا لحاظ کیے بغیر ان لوگوں سے جو آدمی زیادہ زاہد اور متقی ہو گا، اللہ کے نزدیک اس کی قبولیت اور عزت زیادہ ہو گی۔ جب دو افراد باہم دگر طہارت و تقوے میں برابر ہوں گے تو اللہ کے ہاں بھی دونوں کا درجہ یکساں ہو گا۔

اولیاء اللہ کی علامت جملہ اعمال وعقائد میں قرآن و حدیث کا اتباع کرنا ہے۔ وہ اعمال خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے، کم ہوں یا زیادہ۔ مگر اس سب کے باوجود ولایت کے لیے عصمت شرط نہیں ہے۔ اولیا کے دلوں میں جو خیالات وخطرات آتے ہیں، ان پر کتاب وسنت کی مطابقت کے بغیر عمل نہیں کرنا چاہیے۔ اس پر تمام اولیا کا اتفاق ہے۔ جو اس کے خلاف چلے وہ ولایت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

اسلام، ایمان اور احسان کے فرق میں صرف حدیثِ جبریل علیہ السلام کی سند کافی ہے۔[1] اس حدیث کے مطابق شہادتین کے اقرار، کلمہ طیبہ اور اعمالِ صالحہ کا نام اسلام ہے۔ ذاتی تصدیق اور اِذعان کا نام ایمان ہے اور باطنی اِخلاص، جو زبان کی صداقت کے ساتھ ہو، وہ احسان ہے۔ اس کے سوا علما وفقرا نے اس بارے میں جو زائد تشریح لکھی ہے یا مختلف دلائل سے جو استنباط کیا ہے، وہ مذاقی و وجدانی امر ہے نہ کہ تحقیقی وقرآنی۔

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۳٦)

سترھویں فصل

دجال کا ذکر

تمام اہلِ اسلام اس بات کے معتقد ہیں کہ قیامت قائم ہونے سے پہلے دجال ضرور نکلے گا، جیسے کہ رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے۔ اس وقت عیسیٰ ۔علی نبینا و علیه السلام۔ چوتھے آسمان سے دمشق شہر کے مشرقی سفید منارے پر نزول فرمائیں گے اور دروازہ لُد پر، جو دمشق کے مشرقی جانب ہے، دجال کو قتل کریں گے۔[1] ''لُد'' ملک شام میں ایک جگہ کا نام ہے، جو رملہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ہے۔

اہلِ حدیث کا یہ بھی اعتقاد ہے کہ جب ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے پاس ان کی روح قبض کرنے کے ارادے سے آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے ان کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ ان کی ایک آنکھ جاتی رہی، پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے ان کی آنکھ درست کر دی۔[2] ہمارا اس پر ایمان اس لیے ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ سے صحیح سند کے ساتھ مروی ہے۔ کسی بدعتی اور گمراہ کے سوا، جو دینِ الٰہی کا مخالف ہے، کوئی خالص مومن اس کا منکر نہیں ہے۔ نیز ہمارا اس پر بھی ایمان ہے کہ موت کا وجود برحق ہے۔ جنت وجہنم میں داخل ہو جانے کے بعد ایک وقت آئے گا کہ موت بہشت اور دوزخ کے درمیان ذبح کر دی جائے گی۔[3]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠٧٥، ٤٠٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٧٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٣٧٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٨٤٩)

اٹھارویں فصل

خاتمے کا بیان

اہلِ سنت کا عقیدہ ہے کہ ہر شخص کے انجام کی کیفیت نا معلوم ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ کس کا خاتمہ کس طرح ہوگا۔ ہم کسی آدمی کو جنتی یا جہنمی نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کسی کے انجام کار سے ہم واقف نہیں ہیں۔

حکم مستوری و مستی ہمہ برخاتمت ست
کس ندانستہ کہ آخر بچہ حالت گزرد

[پردہ پوشی اور سرشاری سب کے حکم کا دارو مدار خاتمے پر ہے، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کس حالت پر فوت ہوا ہے؟]

نوشتۂ تقدیر کا غلبہ:

صحیح حدیث میں آیا ہے کہ آدمی تمام عمر جنتیوں جیسے نیک اعمال کرتا رہتا ہے، حتی کہ اس کے اور بہشت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے تو اس کا نوشتہء تقدیر، جو اس کا جہنمی ہونا ہے، اس پر یک لخت غالب آ جاتا ہے اور وہ موت کے قریب ایسے کام کرنے لگتا ہے جو اسے جہنم میں لے جائیں گے، اسی طرح بعض آدمی جہنمیوں والے اعمال کرتے ہیں، حتی کہ ان میں اور جہنم میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے تو اس کے جنتی ہونے کا تقدیری فیصلہ اپنا رنگ جماتا ہے، جس کے سبب وہ تھوڑی نیکیوں کے باوجود بلا تکلیف جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔[1]

اسی پُرخطر خاتمے کی رو سے ہر ایمان والا اپنے آپ کو "أنا مؤمن إن شاء اللّٰه" کہہ سکتا ہے۔ یعنی میں ایمان دار ہوں بشرطیکہ اللہ چاہے، اس کا یہ کہنا بطور شک کے نہیں ہونا چاہیے۔ جس شخص کے متعلق معلوم ہو کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے تو مسلمان اس کے حق میں بس اتنی گواہی دے سکتے ہیں کہ وہ شخص جلد یا بدیر جنت میں پہنچ جائے گا۔

[1] صحیح البخاري، رقم الحدیث (۳۰۳۶، ۲۶۴۳)

گناہ گار موحد لوگ انجام کار جنتی ہیں:

جس شخص کی تقدیر میں ان برے اعمال کے عوض، جن اعمال سے توبہ کی نوبت نہیں آئی، عذاب جھیلنا لکھا ہے، وہ آگ میں اپنی مدتِ عذاب کو پورا کر کے جنت میں پہنچ جائے گا، حتی کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے کفار کے سوا اہلِ ایمان میں سے کسی کو دوزخ میں باقی نہ رکھے گا۔ جو شخص کفر کی حالت میں مرے گا، اس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہیں نہیں ہوگا۔ اسے کبھی نجات ملے گی نہ اس کے عذاب کی مدت کی کوئی انتہا ہوگی۔

ہم جن کے جنتی ہونے کی گواہی دے سکتے ہیں:

رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کے حق میں بالخصوص افضلِ امت یا جنتی ہونے کی شہادت دی ہے، جیسے عشرہ مبشرہ،[1] فاطمہ،[2] خدیجہ،[3] عائشہ،[4] حسن اور حسین رضی اللہ عنہم۔[5] ان کے بہتر اور جنتی ہونے کی ہم بھی گواہی دے سکتے ہیں، کیونکہ ہماری گواہی رسول اللہ ﷺ کی خبر اور تصدیق کو متضمن ہے، لہٰذا ہمیں ان لوگوں کے وقار اور عظمت کا اعتراف و اقرار کرنا چاہیے، کیونکہ دینِ اسلام میں ان کا رتبہ اور مقام بہت بلند ہے۔ اہلِ بدر اور بیعت الرضوان والوں کا حال بھی اسی طرح کا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ جن لوگوں کے حق میں رسول اللہ ﷺ نے جنتی ہونے کی شہادت دی ہے، ہم بھی ان کے بہشتی ہونے کی گواہی دیتے ہیں، مگر ان کے سوا دیگر لوگوں کے جنتی ہونے کا ہم حکم نہیں لگا سکتے، بلکہ عام طور پر اچھے لوگوں کے لیے بہتری کی امید اور بدکاروں کے لیے برے انجام کا خوف رکھتے ہیں اور اصل حقیقت کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتے ہیں۔

صحابہ کرام اور ان کی اولاد کی فضیلت میں درجہ بندی:

یہ مسئلہ بھی مسلمات میں سے ہے کہ سابقین اولین انصار و مہاجرین متاخرین صحابہ اور

---

[1] سنن أبي داؤد (٤٦٤٩) سنن الترمذي (٣٧٤٧) سنن ابن ماجه (١٣٣)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٩٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٥٠)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٩٣١) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٣٤)

[4] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٨٨٠)

[5] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٧٦٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١١٨)

اَخلاف مسلمین سے افضل و اشرف ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَ قٰتَلَ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ قٰتَلُوْا وَ كُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى﴾ [الحديد: ١٠]

[تم میں سے جس نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور جنگ کی، وہ (یہ عمل بعد میں کرنے والوں کے) برابر نہیں۔ یہ لوگ درجے میں ان لوگوں سے بڑے ہیں جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور جنگ کی اور ان سب سے اللہ نے اچھی جزا کا وعدہ کیا]

باقی رہی اولادِ صحابہ کی فضیلت کی تفصیل تو اس کے بارے میں صحیح قاعدہ یہ ہے کہ اولاد و ابنائے صحابہ کی فضیلت و بزرگی حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درجات کے مطابق ہے۔ اس قاعدے کلیے سے صرف فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قربِ قرابت کی وجہ سے تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد سے افضل ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت طیبہ اور عترتِ طاہرہ صرف فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اولاد ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے ہاں وہی شخص سب سے بہتر اور اعلیٰ ہے، جو زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے۔

انیسویں فصل

خلفاے راشدین

خلفاے اربعہ کی ترتیب وار فضیلت:

رسول اللہ ﷺ کے بعد ساری امت سے افضل واکمل آپ ﷺ کے خاص دوست، ایمانی بھائی، ہجرت کے ساتھی اور یارِ غار ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، جو سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی میں وزیر اور آپ ﷺ کی وفات کے بعد جانشین اور خلیفہ با تدبیر ہوئے۔

ان کے بعد ابو حفص عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا مرتبہ ہے جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ملتِ اسلام کو عزت اور دینِ حق کو قوت بخشی۔ پھر عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا درجہ ہے، جنھوں نے قرآن مجید کے متعدد نسخے لکھوا کر اطراف واکنافِ زمین میں بھجوائے اور انصاف و احسان کے ساتھ حکومت کی۔ ان کے بعد رسول اللہ ﷺ کے چچا زاد بھائی اور داماد ابو الحسن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو سارے لوگوں پر فوقیت اور شرف حاصل ہے۔

یہ چاروں اصحاب خلفاے راشدین اور ائمہ مہدیین ہیں اور ان پر خلافت نبویہ ختم ہوگئی، اس کے بعد جبری سلطنت اور چوپٹ راج کا دور دورہ رہا۔

خلفاے راشدین کی ترتیب وار فضیلت کا مطلب:

خلفاے راشدین کی ترتیب وار فضیلت سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان میں سے پہلے کو دوسرے پر، دوسرے اور تیسرے کو تیسرے اور چوتھے پر تمام ذاتی کمالات اور افعال میں کلی فضیلت حاصل ہے، اس سے تو پھر یہ ثابت ہوتا ہے کہ علی ۔کرم اللہ وجهہ۔ جو حسب ونسب، شجاعت وقوت، علم ظاہر و باطن اور دیگر صفات میں فرد کامل تھے، ان سب صفات کے اعتبار سے پہلے تینوں خلفا سے مقام ومرتبہ میں کم ہو جائیں۔ معاذ اللہ عن ذلك.

بلکہ فضیلت کی اس ترتیب سے اصل مقصود اسلام کی نصرت و منفعت کی مقدار کا اظہار ہے، جو ہر ایک کے دور میں واقع ہوئی۔ مثلاً ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے دور میں دین حق کو جو بے حد و حساب قوت و شوکت حاصل ہوئی اور مجوسی بادشاہوں، اہلِ کتاب اور مشرکوں نے جو ذلت اٹھائی، عثمان اور علی رضی اللہ عنہما کے دور میں اسلام کو وہ قوت و شوکت حاصل نہ ہوئی، اس لیے شیخین (ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو وزیرِ مطلق اور سردارِ امت کہا جاتا ہے، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں دو جہتیں موجود تھیں۔ ایک اللہ تعالیٰ سے لینے کی اور دوسری مخلوق کو دینے کی۔ چنانچہ اس دوسری جہت کے اعتبار سے شیخین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے حد مناسبت اور خاص مہارت تھی اور بنی آدم کے مختلف فرقوں کے جمع و تالیف کا سلیقہ اور جنگی تدابیر میں جیسا ملکہ اور ید طولیٰ ان کو حاصل تھا، وہ رتبہ کسی اور صحابی کو حاصل نہیں تھا۔

بیسویں فصل

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنا کفر ہے:

ہمارے لیے حضرات صحابہ کرام اور صحابیات رضی اللہ عنہم کی توہین کرنے اور ان کی برائی بیان کرنے سے اپنی زبانوں کو روکنا لازم اور ضروری ہے، کیونکہ وہ سب ہمارے مقتدا، سردار اور پیشوا ہیں۔ ان کی بدی کرنا قطعاً حرام اور کبیرہ گناہ ہے، بلکہ بعض اہلِ علم نے تو اسے کفر کہا ہے اور دلیل میں یہ آیت پیش کی ہے:

﴿لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ﴾ [الفتح: ٢٩]

[تاکہ وہ ان کے ذریعے کافروں کو غصہ دلائے]

اس آیت کے مطابق تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر غیظ و غضب رکھنا اور ان سے بغض رکھنا کفار کا خاصا ہے۔ مذکورہ آیت سے یہ استدلال فی الواقع نہایت عمدہ اور واضح ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم امت پر فرض ہے:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم کرنا حکمِ باری تعالیٰ اور ارشادِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق، جو قرآن و حدیث میں درج ہے، تمام افرادِ امت پر فرض اور واجب ہے۔ حدیث کی معتبر و معتمد کتابوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مناقب و فضائل میں بہت سی صحیح احادیث وارد ہیں، جن پر کسی گمراہ اور گمراہ کرنے والے بدعتی کے لیے مجالِ جرح و انکار نہیں، پھر بھی وہ کسی بے شرمی کا مظاہرہ کرے تو ہیچ ہے:

﴿وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾ [الرعد: ٣٣]

[اور جسے اللہ گمراہ کر دے پھر اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں]

جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے باہمی اختلاف اور جھگڑے کا تعلق ہے تو ہمیں اس کا تذکرہ

ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے عیب وصواب پر بات نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ اسی طرح ہمیں رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات، اہلِ بیت اور پاکیزہ اولاد کی بھی قدر ومنزلت اور ان کے حقوق وفضائل کی معرفت بھی ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی ہر بیوی کو ام المومنین جاننا اور سب کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعاے خیر کرنا چاہیے۔

اکیسویں فصل

اہلِ قبلہ، امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور ایمان کا ذکر

اہلِ قبلہ کا حکم:

مدعیانِ اسلام اور اہلِ قبلہ میں سے کسی کو کافر نہیں کہنا چاہیے، جب تک اس بات کا ثبوت نہ میسر آ جائے کہ وہ خالقِ کائنات کی ذات یا اس کے علم، قدرت اور اختیار وغیرہ جیسی صفات کا منکر ہے، یا رسولوں کی بعثت، دوبارہ زندہ ہونے اور قیامت وغیرہ ضروریات دینیہ کو نہیں مانتا، یا اس کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت، وصفِ الوہیت اور صفتِ ربوبیت میں عملاً اور اعتقاداً شرک ظاہر ہو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر:

اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یعنی نیکی کا حکم دینا اور برے اعمال سے منع کرنا۔ جو مسلمان اس میں کوتاہی کرے، وہ ناقص ایمان والا ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے میں شرط یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں فتنہ اور شر قائم نہ ہوتا ہو اور جسے نصیحت کی جائے، اس کی طرف سے نصیحت قبول کرنے کی امید ہو۔

ایمان شرعی کا بیان:

شرعی ایمان قول، عمل اور دل کی نیت سے عبارت ہے۔ کبھی ایمان کی تفسیر یوں کی جاتی ہے کہ ایمان معرفتِ الٰہی کا نام ہے اور یہ کم اور زیادہ ہوتا ہے۔ ایمان کا کم اور زیادہ ہونا قرآن و حدیث، ائمہ سلف اور خلفِ امت مرحومہ کے اتفاق سے ثابت ہے۔ حالتِ غفلت، بے ہوشی اور سوتے مرتے وقت بھی ایمان باقی رہتا ہے، اگرچہ یہ تین چیزیں تصدیق و معرفت سے، جو حیات اور ہوش و حواس کا تقاضا کرتی ہے، کلی طور پر الگ حکم رکھتی ہیں۔

بائیسویں فصل

میثاق، انبیا کی عصمت ومتابعت اور مقرر رزق وموت کا بیان

میثاق:

میثاق اور اقرارِ ربوبیت، جو اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں اپنے بندوں سے لیا تھا، قرآن وحدیث سے ثابت ہے اور ہم اس کے وقوع کے قائل ہیں۔ جب کہ فرقہ معتزلہ کے لوگ اس کے منکر ہیں اور اس مسئلے پر وارد ہونے والی آیات واحادیث کی عقلی تاویلیں کرتے ہیں، مگر ان کا یہ اعتقاد اسلام کے بالکل خلاف اور ناحق ہے۔

انبیا ورسل کی عصمت اور ان کی متابعت:

حضرات انبیا کے سوا کسی شخص کو عصمت اور پاک دامنی حاصل نہیں ہے، اگرچہ کوئی کیسا ہی عالی مرتبہ یا کسی متبرک مقام کا رہنے والا کیوں نہ ہو۔ بنا بریں ہر قول وعمل میں متابعت بھی صرف انبیا کا خاص وصف ہے۔ امت میں سے رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی صحابی، تابعی یا اہلِ بیت یا امام ومجتہد کو یہ منصب حاصل نہیں ہے، کیونکہ آپ ﷺ کے جملہ ارشادات برحق اور کلامِ حق ہیں، جبکہ کسی دوسرے آدمی کے بعض اقوال مقبول ہوتے ہیں اور بعض مردود۔

کسی شخص کا مقرر رزق کھائے بغیر مرنا ممکن نہیں:

ہر شخص اپنی زندگی میں مقدر رزق پورا کر لیتا ہے، خواہ وہ رزق حلال سے ہو یا حرام سے۔ جب تک کوئی آدمی اپنا مکمل رزق نہیں کھا لیتا، اسے موت نہیں آتی، البتہ رزق حلال کمانے اور کھانے پر آدمی کو اجر وثواب ملتا ہے اور حرام خوری کے باعث وہ مجرم اور گناہ گار ٹھہرتا ہے۔ یہ بات ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص عرصہ دراز تک دنیا میں زندہ رہے اور خوب کھائے پیے، مگر اس سب کے باوجود اسے رزق میسر نہ ہو یا دوسرے آدمی کے رزق پر اس کی زندگی بسر ہو جائے۔ جس شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے، وہ بھی

اپنی میعادِ زندگی کو ختم کر کے ہی مرتا ہے، لہٰذا طبعی موت سے مرنے والا شخص اور قتل کیا جانے والا شخص دونوں ہی اپنی مدتِ حیات کو ختم کر کے مرتے ہیں۔ قرآن مجید سے اس کے دلائل درج ذیل ہیں۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ مَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا﴾ [آل عمران: ١٤٥]

[اور کسی جان کے لیے کبھی ممکن نہیں کہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے، لکھے ہوئے کے مطابق جس کا وقت مقرر ہے]

نیز فرمایا:

﴿ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ﴾ [آل عمران: ١٥٤]

[اگر تم اپنے گھروں میں ہوتے تب بھی جن لوگوں پر قتل ہونا لکھا جا چکا تھا، اپنے لیٹنے کی جگہوں کی طرف ضرور نکل آتے]

مخلوقاتِ الٰہیہ میں سے موت ایک ایسی مخلوق اور صفت ہے جو میت کی ذات کے ساتھ قائم ہے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ٢]

[جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کون عمل میں زیادہ اچھا ہے]

موت اور اجل ایک ہی چیز ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ وَ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ﴾ [الأعراف: ٣٤]

[اور ہر امت کے لیے ایک وقت ہے، پھر جب ان کا وقت آ جاتا ہے تو وہ ایک گھڑی نہ پیچھے ہوتے ہیں اور نہ آگے ہوتے ہیں]

جب کسی کی میعاد اور اجل مکمل ہو جاتی ہے، تب موت کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں ہوتا۔

تیئیسویں فصل

متفرق اعتقادات

موزوں پر مسح کرنا:

موزوں پر مسح کرنا صحیح احادیث سے ثابت ہے، جو تواتر کے قریب ہیں۔[1] مقیم کے لیے موزوں پر مسح کرنے کی مدت ایک دن اور ایک رات ہے اور مسافر کے لیے تین دن اور تین راتیں۔[2]

نمازِ تراویح:

ماہِ رمضان میں تراویح پڑھنا رسول اللہ ﷺ سے صحیح حدیث میں ثابت ہے۔[3] البتہ تعدادِ رکعات کی تصریح کسی حدیث صحیح میں وارد نہیں ہوئی ہے۔[4] اجمالاً اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سال کے تمام مہینوں کی نسبت ماہِ رمضان میں زیادہ محنت اور عبادت کرتے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رمضان ہو یا غیر رمضان، رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعتوں سے زیادہ رکعات نہیں ادا کرتے تھے۔[5] ایک اور روایت سے تیرہ رکعت ادا کرنا بھی ثابت ہے۔[6]

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں جب لوگوں کو الگ الگ تراویح پڑھتے دیکھا تو انھوں نے ان کو اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے پیچھے با جماعت تراویح پڑھنے کا حکم دیا۔ اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ نے تب بیس

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٠٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٤)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٧٦)

[3] سنن أبي داود (١٣٧٥) سنن الترمذي (٨٠٦) سنن النسائي (١٣٦٤) سنن ابن ماجه (١٣٢٧)

[4] یہ بات درست نہیں ہے، جیسا کہ اگلی سطروں میں خود مولف رحمہ اللہ کی پیش کردہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث سے عیاں ہوتا ہے۔

[5] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠٩٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٣٨)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٧٦٣)

رکعت تراویح اور تین وتر پڑھے۔[1]

بہرحال نمازِ تراویح میں افضل مقدار وہ ہے جس میں نمازی ذوق کے ساتھ ہوشیار ہو کر کھڑے رہیں یا پھر اس میں زمان و مکان کی فضیلت کی رعایت ہوگی۔

امامت کا حق دار:

نمازِ جمعہ، جماعت، عیدین اور ان کے علاوہ دیگر نمازیں ہر مسلمان امام کے پیچھے ہو جاتی ہیں، خواہ وہ امام نیک بخت و پرہیز گار ہو یا فاسق و بدکردار۔ بعض سلف سے جو اہلِ بدعت کے پیچھے نماز پڑھنے کی ممانعت منقول ہے، اس سے مراد کراہت تنزیہی ہے یا اس سے مراد یہ ہے کہ امام ایسی بدعت کا مرتکب ہو جو کفر کی حد تک پہنچی ہوئی ہو یا کفر پر دلالت کرتی ہو۔

اہلِ اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ کرامیہ فرقے کا یہ قول کہ ولایت نبوت سے افضل و اعلیٰ ہے، مردود ہے یا اس کی تاویل کی جائے گی۔ نیز یہ بھی اجماعی مسئلہ ہے کہ اولیا کا کشف و الہام اور حالتِ نیند کے واقعات حجت شرعیہ نہیں ہوتے ہیں، لہٰذا اس سے کسی چیز کی فضیلت و کراہت یا حلت و حرمت کا ثبوت ہرگز نہیں ہوگا۔ البتہ دینِ اسلام کے جو احکام دلائل کے ساتھ ثابت ہیں، ان کے لیے موافقت کی شرط کے ساتھ ان سے مزید سند و شہادت ہو سکتی ہے۔ امت کے تمام سلف و خلف کا، سوائے چند ناقابل قدر لوگوں کے، اسی پر اجماع ہے، مگر اس مسئلے کے متعلق اکثر اہلِ بدعت اور صوفیہ نے دھوکا کھایا ہے۔

فضلِ الٰہی سے مایوسی:

اللہ کے فضل سے مایوس اور ناامید ہونا کفر ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [يوسف: ٨٧]

[بے شک حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو کافر ہیں]

ایسے ہی اللہ کے غضب سے بے خوف اور نڈر ہو جانا بھی کفر ہے۔ سورت اعراف میں فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] موطأ الإمام مالك (١/ ١١٥) میں صحیح سند کے ساتھ مروی ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حکم سے اُبی بن کعب اور تمیم داری رضی اللہ عنہما لوگوں کو رمضان میں گیارہ رکعت پڑھایا کرتے تھے۔ بیس رکعت تراویح اور تین وتر والی روایت ضعیف ہے، کیونکہ اس کی سند میں انقطاع ہے۔

﴿ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ [الأعراف: ٩٩]

[پھر کیا وہ اللہ کی تدبیر سے بے خوف ہو گئے ہیں؟ تو اللہ کی تدبیر سے بے خوف نہیں ہوتے مگر وہی لوگ جو خسارہ اٹھانے والے ہیں]

غیر اللہ کو غیب دان ماننا:

اسی طرح غیبی امور اور واقعات میں کاہن کی تصدیق کرنا بھی کفر ہے۔ نیز رسول اللہ ﷺ پر نازل شدہ قرآن مجید سے پھر جانا اور اللہ کے سوا کسی دوسرے کو غیب دان جاننا اور ماننا بھی آدمی کو کافر بنا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ [الأعراف: ١٨٨]

[کہہ دے! میں اپنی جان کے لیے نہ کسی نفع کا مالک ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو ضرور بھلائیوں میں سے بہت زیادہ حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی، میں نہیں ہوں مگر ایک ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں]

جب رسول اللہ ﷺ اپنے آپ کو علم غیب سے یوں صاف صاف ناواقف ٹھہرائیں تو پھر بھلا دوسرے لوگ غیب سے کیوں کر آگاہ ہو سکتے ہیں؟

فوت شدگان کے لیے ایصالِ ثواب:

جب کوئی زندہ ایمان دار اپنے کسی فوت شدہ مسلمان بھائی کے لیے دعاے خیر کرے یا اس کی طرف سے کچھ صدقہ دے یا کوئی مالی یا بدنی یا دونوں سے مرکب عبادت بجا لائے تو صحیح دلائل کے مطابق ان سب صورتوں میں مُردے کو اجر و ثواب ملتا ہے۔

دعا کون قبول کرتا ہے؟

دعاؤں کو قبول کرنا اور سب حاجتوں کو پورا کرنا صرف اللہ ہی کا کام ہے۔ کافر کی دعا کے قبول

ہونے میں اختلاف ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ مَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ﴾ [الرعد: ١٤]

[اور نہیں ہے کافروں کا پکارنا مگر سراسر بے سود]

اس آیت کریمہ کی ظاہری عبارت اس بات کا پتا دیتی ہے کہ دنیا و آخرت میں کفار کی دعا رائیگاں جاتی ہے۔ واللہ أعلم.

جن بھی جنت اور جہنم میں جائیں گے:

ارشادِ الٰہی کے پیشِ نظر کافر جن جہنم میں جھونکے جائیں گے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ لٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ﴾ [السجدة: ١٣]

[اور لیکن میری طرف سے بات پکی ہو چکی کہ یقیناً میں جہنم کو جنوں اور انسانوں، سب سے ضرور بھروں گا]

سورۃ الجن میں ہے:

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾ [الجن: ١٥]

[اور جو ظالم ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے]

اسی طرح مسلمان جن انسانوں کی طرح جنت میں جائیں گے جس کا ثبوت اس آیت سے ملتا ہے جو بہشت کی حوروں کا وصف بیان کرنے کے سلسلے میں وارد ہوئی ہے:

﴿فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ﴾ [الرحمن: ٥٦]

[ان میں نیچی نگاہ والی عورتیں ہیں، جنھیں ان سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہے اور نہ کسی جن نے]

شیاطین کا کام دلوں میں وسوسے ڈالنا ہے:

اللہ تعالیٰ نے شیاطین کو پیدا کیا ہے جن کا کام آدمیوں کے دلوں میں وسوسے ڈالنا ہے۔ ان شیاطین کو شب و روز یہی فکر رہتی ہے کہ یہ اولادِ آدم کو سیدھی راہ سے پھیر دیں۔ ان کا تسلط اور غلبہ صرف اسی شخص پر ہوتا ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہوتی۔ رہا وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ

چاہتا ہے اور اس سے محبت کرتا ہے تو وہ اسے ان شیاطین کے مکر و فریب سے بچا لیتا ہے۔

جادو کو تقدیرِ الٰہی کے بغیر موثر سمجھنا کفر ہے:

دنیا میں جادو اور جادو گر دونوں موجود ہیں، مگر جادو گر رب تعالیٰ کے حکم کے بغیر کسی کا نقصان کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ جو شخص جادو کو عمل میں لائے یا یہ اعتقاد رکھے کہ تقدیرِ الٰہی کے بغیر جادو کے ذریعے سے کسی طرح کا نفع و نقصان ہونا ممکن ہے تو ان دونوں صورتوں میں وہ کافر ہو جاتا ہے۔

اگر کسی مسلمان کی زبان سے کلمۂ کفر برآمد ہو تو اس سے توبہ کرانی چاہیے۔ اگر تو وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ اس کی گردن مار دی جائے، لیکن اگر وہ کلمہ صریح کفر نہ ہو، بلکہ مجہول اور مشتبہ لفظ ہو تو اس کے کہنے سے اسے سمجھا کر دوبارہ یہ کلمہ بولنے سے منع کر دیا جائے، پھر بھی اگر وہ اس کلمے کا اعادہ کرے تو تنبیہ کے طور پر اسے کچھ سزا دی جائے۔

تمام نشہ آور چیزیں شارع کے فرمان کے مطابق حرام ہیں۔ قلیل و کثیر نشہ آور کی حرمت یکساں اور برابر ہے۔

اہلِ حدیث کے عقائد:

امام صابونی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اہلِ حدیث نمازوں کو اول وقت میں ادا کرنا پسند کرتے ہیں اور اس بارے میں جلدی کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ امام کے پیچھے سورت فاتحہ پڑھنا مقتدی پر واجب بتلاتے ہیں۔ کچھ وقت سونے کے بعد تہجد پڑنے کا حکم کرتے ہیں، اسی طرح قرابت داروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا، ہر کس و ناکس کو سلام کہنا، کھانا کھلانا۔ فقرا، مساکین اور یتیموں پر شفقت کرنا۔ نو مسلم کے کام کو عالی ہمتی سے انجام دینا، کھانے پینے شادی بیاہ وغیرہ میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنا، امورِ خیر میں جلدی کرنا۔ اس کے سوا دیگر نیک اعمال کے تذکرے محدثین کی وصیتوں میں مذکور ہیں۔

اہلِ حدیث کا شیوہ:

''اہلِ حدیث اپنی محبت اور عداوت دونوں میں شریعت ہی کے موافق ہوتے ہیں۔ دین کے مسائل میں لڑائی جھگڑا ان کا شیوہ نہیں ہے۔ یہ اہلِ بدعت و ضلالت کے قریب تک نہیں پھٹکتے، جاہلوں اور نفس پرستوں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور اہلِ بدعت کو برا جانتے ہیں جو دین میں نئی نئی

باتیں نکالتے ہیں جن کا قرآن و سنت میں نشان تک نہیں ہے۔ ایسے بدعتیوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور ان کی صحبت سے بھی وہ دور بھاگتے ہیں، ان کی گفتگو تک کا سننا روا نہیں رکھتے، مبادا ان کی جھوٹی اور رنگ آمیز تقریریں کانوں کی راہ سے دل تک پہنچ کر باطل خیالات اور فاسد خطرات پیدا کر دیں اور دلوں کو بالکل گمراہی میں ڈال دیں۔

اہلِ بدعت کی پہچان:

''اہلِ بدعت کی ظاہری علامات تو ان کی بدعات ہی ہیں، تاہم ان کی واضح ترین علامات اہلِ حدیث سے بغض و عداوت رکھنا اور ان کی توہین و تحقیر کے درپے رہنا ہے۔ کبھی یہ اہلِ بدعت حشویہ اور ظاہریہ کہہ کر محدثین کو بدنام کرتے ہیں اور کبھی ان کا نام مجسمہ اور مشبہہ رکھتے ہیں۔ اس بغض اور عداوت کا اصل سبب یہ ہے کہ مبتدعین کے خیال میں وہ صحیح احادیث جو بہ سند صحیح رسول اللہ ﷺ سے مروی ہیں، وہ یقین اور اعتقاد صحیح کے لیے مفید نہیں ہیں، ان کے ذہنوں میں ماننے کے لائق وہی نتائج اور دعوے ہیں جن کو شیطان فاسد افکار و قیاسات اور باطل وسوسوں و مغالطوں پر مترتب کر کے ان کو دکھاتا ہے۔ ان شیاطین کے پیروکاروں کے دل اور سینے بالکل تنگ و تاریک ہیں اور ان کے تمام شبہات بے اصل اور اعتبار سے ساقط ہیں۔ چونکہ ان پر اللہ تعالیٰ کی پھٹکار ہے، اس لیے اللہ نے انھیں راہِ حق سے اندھا اور بہرہ کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے رسوا کرنے کا ارادہ کر لیں، اسے کوئی عزت عطا کرنے والا نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے، وہی کر دکھاتا ہے۔''[1] انتھیٰ

سعید و نیک بخت کبھی بگڑ کر انجام کار شقی و بدبخت بن جاتا ہے اور کتنے ہی بدبخت ہیں جو کبھی اعمال صالحہ کی بدولت نیک بخت بن جاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے قیامت کی چھوٹی بڑی علامتیں اور شرطیں بیان فرمائی ہیں، جن کی تفصیل کتبِ احادیث میں آئی ہے۔ وہ سب کی سب حق ہیں اور محدثین نے ان کو جمع کر کے عمدہ عمدہ کتابیں لکھی ہیں، مثلاً اِشاعہ، اِذاعہ اور حجج الکرامۃ وغیرہ۔[2]

---

[1] عقيدة السلف أصحاب الحديث للصابوني (ص: ٣٥)

[2] "الإشاعة لأشراط الساعة" یہ امام محمد بن عبدالرسول الحسینی (۱۰۴۰۔۱۱۰۳ھ) کی تالیف ہے، جبکہ "الإذاعة لما كان وما يكون بين يدي الساعة" اور "حجج الكرامة في آثار القيامة" مولف رحمہ اللہ کی تصانیف ہیں۔ اول الذکر کتاب عربی میں اور ثانی الذکر کتاب فارسی میں ہے۔

انسانوں کے رسول فرشتوں کے رسولوں سے افضل ہیں:

انسانوں کے رسول فرشتوں کے رسولوں سے چند وجوہ کے اعتبار سے افضل ہیں، جن کی تفصیل مناسب مواقع پر بیان ہوئی ہے۔ مگر رسلِ ملائکہ تمام لوگوں سے باجماع امت، بلکہ بحکم بداہت، افضل ہیں۔ عام اہلِ اسلام بنی آدم عام فرشتوں سے بہتر اور اکرم ہیں۔

گناہ کو حلال جاننا اور کسی شرعی مسئلے کا مذاق اڑانا کفر ہے:

جس چیز کا گناہ ہونا قطعی دلیل سے ثابت ہو، اس کو حلال جاننے سے آدمی کافر ہو جاتا ہے۔ نیز اسے خفیف اور ہلکا سمجھنا یا کسی شرعی مسئلے پر تمسخر یا استہزا کرنا تکذیبِ دین اور کفر کی نشانیوں میں سے ہے، جس کے باعث کسی پر کفر کا حکم لگایا جاتا ہے۔ معدومِ محض پر شے کا اطلاق کرنا ثابت نہیں ہے۔

دیدارِ الٰہی دنیا میں نہیں آخرت میں ہوگا:

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کو سر کی آنکھوں سے دیکھنا عقلاً اور شرعاً ممکن نہیں ہے، مگر آخرت میں دیدارِ الٰہی کا ہونا قرآن وسنت کی شہادت کے ساتھ ثابت ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھنا شرعاً جائز و ثابت ہے، کیونکہ یہ ایک قسم کا قلبی مشاہدہ ہے جو اللہ کے فضل و کرم سے اکابر اہلِ اسلام اور کرام اہلِ اسلام کو میسر آ سکتا ہے۔

روح کی حقیقت:

روح اللہ کی پیدا کردہ ایک حادث چیز ہے۔ ضروریات دینیہ اس پر گواہ ہیں۔ حضرات صحابہ کرام اور تابعین رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک ہے۔ جسمانی موت واقع ہونے سے روح مٹ نہیں جاتی، بلکہ حافظ ابن قیم رحمہ اللہ کے قول کے مطابق روح کا حدوث اجسام کی پیدایش کے زمانے میں ہوتا ہے۔

دنیا مومن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے:

کافر جب تک دنیا میں رہتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے نعمت میں رہتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"دنیا ایمان والے آدمی کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت ہے۔"[1]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩٥٦)

اللہ کی معرفت اور عبادت کا طریقہ کار:

اللہ تعالیٰ کی معرفت اور عبادت کا واجب ہونا اللہ تعالیٰ کے حکم اور شرع سے ہے نہ کہ فقط عقل کی رو سے۔

حکم کی بجا آوری استطاعت کے مطابق ہے:

جو چیز طاقت بشری سے خارج ہے، اس کی بجا آوری کا حکم شرع سے ثابت نہیں ہے، بلکہ اس کے خلاف دلیل موجود ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اللہ کسی جان کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی گنجایش کے مطابق]

نیز ارشاد فرمایا ہے:

﴿ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ﴾ [البقرة: ٢٨٦]

[اے ہمارے رب! اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھوا جس (کے اٹھانے) کی ہم میں طاقت نہ ہو]

باقی رہا ممتنع بالغیر[1] جیسے اس شخص کا ایمان لے آنا جسے پروردگار نے فرعون و ابولہب وغیرہ کی طرح کافر اور بے ایمان جانا اور لکھا ہے تو اہلِ علم کا اتفاق ہے کہ ایسی چیز کے ساتھ تکلیف اور حکم شرعی کا تعلق صرف جائز و ممکن ہی نہیں بلکہ متحقق و واقع ہے۔

عقائد و مسائل کے اختیار میں صحیح طریقہ کار:

عقائد و مسائل دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ سے ثابت ہیں اور سلف صالحین صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم کے ہاں بھی وہ مقبول و مسلم ہیں، مگر ہماری عقلیں کما حقہ ان کے اِدراک اور تشریح سے قاصر ہیں۔ اس قسم کے عقائد و مسائل کو ایک گروہ نے قبول نہیں کیا۔ وہ ان عقائد و مسائل پر وارد آیات و احادیث کی تاویل کرتے ہیں، حالانکہ اس میں مناسب امر ہر اس چیز پر اسی طرح ایمان لے آنا تھا جس طرح وہ کسی آیت و حدیث میں وارد ہوئی ہے۔ رہا اس کی تاویل کرنا تو یہ درحقیقت شریعت کو جھٹلانا ہے۔

دوسرے وہ عقائد و مسائل ہیں جن کا کتاب و سنت سے کچھ اِدراک ہوتا ہے نہ خیر القرون

[1] "الممتنع: هو الذي يكون عدمه في الخارج ضروريا، فإن اقتضاه الذات [كشريك الباري تعالىٰ] فهو الممتنع بالذات، وإن اقتضاه الغير فهو الممتنع بالغير" (دستور العلماء: ٣/٢٣١)

میں ان کے متعلق کسی طرح کی گفتگو ہوئی ہے تو ایسی چیزوں سے اپنی فکر کو علاحدہ رکھنا اور انھیں لایعنی سمجھ کر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''آدمی کا کمالِ اسلام اس چیز کو ترک کرنا ہے جو بے کار ہے۔''[1]

اجتہاد اور مجتہدین:

مسائل شرعیہ اور عقلیہ میں کبھی تو مجتہد چوک جاتا ہے اور کبھی صحیح بات کہتا ہے۔ غلطی کھانے والے مجتہد کو ایک حصہ اجر وثواب اور صحیح رائے والے مجتہد کو دوہرا اجر وثواب ملتا ہے۔ اگر ہر مجتہد کا درست رائے والا ہونا تسلیم کیا جائے تو خطا کار مجتہد اور درست رائے والے مجتہد کے لیے حدیث میں بیان ہونے والی اجر وثواب کی تقسیم بے کار اور رائیگاں ہو جائے گی۔

امت محمدیہ کا کوئی دور مجتہد سے خالی نہیں رہے گا:

کوئی زمانہ مجتہد سے خالی نہیں رہتا۔ دلائل کا اظہار کرنے والے شخص سے کسی وقت اور کسی حال میں زمین خالی نہیں رہے گی، اگرچہ ایسے لوگ قلیل اور بہت ہی تھوڑے کیوں نہ ہوں۔ امتِ محمدیہ میں قیامت تک ایک حق کی طرف راہنمائی کرنے والے ایسے گروہ کا رہنا لازم وضروری ہے جو لوگوں کو سچی اور سیدھی راہ بتایا کرے۔ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

''میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر غالب رہے گا، مخالفین ان پر غلبہ نہ پا سکیں گے۔''[2]

اجتہاد میں آسانی کے باوجود مقلدین کا جمود کیوں؟

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے دین کا کچھ فہم عطا کیا ہے، وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجتہدین متاخرین پر جس طرح اجتہاد آسان کر دیا ہے، متقدمین مجتہدین کو یہ آسانی اور سہولت میسر نہ تھی، کیونکہ ان کے پاس اجتہاد کا کل ضروری سامان فراہم نہیں تھا، چنانچہ اسی وجہ سے متقدمین کو متاخرین کے برعکس اجتہاد کرنے میں نہایت محنت اور دقت اٹھانا پڑتی تھی، جبکہ متاخرین کو اجتہاد کے لیے ہر طرح کی سہولت میسر ہے۔ رہے مقلدین تو چونکہ وہ تقلید اور قیاس پر اڑے ہوئے اور قرآن و حدیث چھوڑ کر دوسرے علوم وفنون میں پڑے ہوئے ہیں، اس لیے ان کو وہی کچھ دکھائی دیتا ہے جس میں وہ مبتلا ہیں اور اپنا الزام دوسروں کے سر رکھتے ہیں۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٨١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٢٠)

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے نفع مند علم اور کامل فہم سے نواز رکھا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے اجتہاد کا دروازہ بھی کھول دیا ہے، مگر مقلدین کے وہم وخیال میں یہ امر بالکل محال ہے۔

اصول وفروع میں تقلید مطلقاً ناجائز اور حرام ہے:

شرعی مسائل میں تقلید کرنا، خواہ وہ مسائل اصلی ہوں یا فرعی، مطلقاً ناجائز ہے۔ امام ابنِ حزم رحمہ اللہ نے بہ دلیلِ اجماع تقلید کا ممنوع ہونا ثابت کیا ہے۔[1] علامہ شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "القول المفید" اور "أدب الطلب" وغیرہ میں تقلید کی ممانعت میں چاروں اماموں کے اقوال نقل کیے ہیں، جن میں انھوں نے اپنی اور غیروں کی تقلید سے صراحتاً منع کیا ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ بالفرض تقلید کی ممانعت پر اجماع نہ بھی ہو تو جمہور کے نزدیک تو اس کے حرام ہونے پر کچھ کلام ہی نہیں ہے۔ اس کی تائید اس اجماع سے ہوتی ہے جس میں منقول ہے کہ مُردوں کی تقلید بالکل ناجائز ہے۔ نیز اس کی تائید اس اجماعی مسئلے سے بھی ہوتی ہے کہ مجتہد کا قیاس اور رائے پر عمل کرنا جب کہ اسے کتاب وسنت سے کوئی دلیل دستیاب نہ ہو، بہ حکم ضرورت صرف اسی کے لیے جائز ہے اور دوسروں کے لیے ناجائز۔ اس کے متعلق قاضی شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "إرشاد الفحول" میں تحریر کیا ہے کہ ان دو اجماعوں سے تقلید کی جڑ کٹ گئی۔ انتہیٰ[2]

عامی شخص پر، جو قرآن وحدیث سے واقفیت نہیں رکھتا ہے، خاص مذہب کا التزام ضروری نہیں ہے۔ ابن برہان اور نووی رحمہما اللہ کا مختار مسلک یہی ہے۔ مقلد کا ایمان، جو اپنے پاس کسی طرح کی حجت نہیں رکھتا، صحیح ومقبول ہے۔

اجماع کی حیثیت:

جو اجماع قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو، وہ استدلال کے لائق نہیں ہے اور جس کی اصل قرآن وحدیث میں ہو اس سے سند لینا، ان لوگوں کے بہ قول جو اجماع کو حجت کہتے ہیں، درست ہے۔ اجماع بھی مجتہدین کا معتبر ہے نہ کہ مقلدین کا۔

فرقہ ناجیہ:

ہر گروہ اور فرقے کا یہ گمان ہے کہ ان کے فرقے کے لوگ ہی نجات پائیں گے اور باقی سب

[1] إرشاد الفحول (ص: ٢/ ٢٤٤)

[2] إرشاد الفحول (ص: ٤/ ٢٤٣)

لوگ جہنم میں جائیں گے، جب کہ اس فرقے کی تعیین میں رسول اللہ ﷺ کی وضاحت سارے جھگڑوں کو ختم کر دیتی ہے۔ آپ ﷺ نے اس کی تعیین کرتے ہوئے فرمایا کہ فرقہ ناجیہ وہی ہے جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلتا ہے۔[1] اس وضاحت کے مطابق فرقہ ناجیہ وہی ہے جو قرآن مجید اور حدیث صحیح کے اس ظاہری مفہوم کے مطابق عقیدہ و عمل کو اختیار کرے، جس کو جمہور صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا ہے۔ ان کا باہمی اختلاف صرف انہی مسائل میں ہے جن میں کوئی نص مشہور ہے نہ وہ مسائل صحابہ کے اتفاق رائے سے قرار پائے ہیں۔ صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم وغیرہ کے اختلاف کا سبب ان کے استنباط کا مختلف ہونا یا مجمل کی تفسیر علاحدہ طور پر کرنا ہے۔ غیر ناجیہ فرقے وہ ہیں جو سلف کے خلاف اعمال و عقائد تراشتے ہیں۔

اصل علم:

علم تو بس تین چیزوں میں منحصر ہے:

اوّل: آیت محکمہ، یعنی جو منسوخ نہ ہو یا وہ آیات محکمات جو متشابہات کے سوا ہیں۔

دوم: سنت قائمہ، یعنی وہ حدیث جس کی سند و متن میں کسی قسم کا خلل نہ ہو یا اس کے مطابق عمل ہوتا ہو۔

سوم: فریضہ عادلہ، یعنی علم فرائض یا وہ احکام جو کتاب و سنت سے منصوص نہیں، بلکہ ان سے مستنبط ہیں یا اس سے آیت کریمہ: ﴿اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ﴾ [النساء: ٥٩] [اللہ کا حکم مانو اور رسول کا حکم مانو اور ان کا بھی جو تم میں سے حکم دینے والے ہیں] کے مطابق مومن، عاقل اور عادل حکمران کے احکام مراد ہیں۔

قرآن و حدیث کی نصوص کو ظاہر پر محمول کرنا واجب ہے:

قرآن و حدیث کی نصوص اپنے ظواہر پر رکھی جائیں گی، جب تک کسی قطعی دلیل کے ساتھ تاویل کی ضرورت ثابت نہ ہو۔ جو چیزیں عرفاً ان سے سمجھ میں آتی ہیں، ان کا اطلاق بھی شرعاً درست ہے۔ اس کے مطابق ہی اعتقاد بھی رکھنا چاہیے، مگر تشبیہ سے تنزیہ ضروری ہے، جو ایک وہمی چیز ہے۔

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

خلیفہ کا تقرر اور اس کی ذمے داریاں:

اہلِ اسلام پر ایسے خلیفہ کا مقرر کرنا واجب ہے جو احکامِ اسلام جاری کرے، حدودِ شرعیہ کا نفاذ کرے، سرحدوں کی حفاظت کا بندوبست کرے، لشکر کو آراستہ رکھے، صدقات و زکات وصول کرتا رہے، باغیوں اور لٹیروں کی سرکوبی کرتا رہے اور جمعہ وعیدین کا اہتمام کرے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے درمیان جو تنازعات اور خصومات واقع ہوں، شریعت کے مطابق ان کا تصفیہ کرنا اور ضرورت کے تحت مال غنیمت وغیرہ کی تقسیم کرنا، جن کا انتظام و انصرام ہر ہر شخص سے ناممکن ہے، باجماعِ امت ان چیزوں کا قائم کرنا امام پر واجب ہے۔ یہ وجوب سمعاً اور شرعاً ہے نہ کہ عقلاً۔ تفصیلی کتابوں میں امام کے لوازم و شرائط پوری تفصیل کے ساتھ درج ہیں۔

قیامِ خلافت کا طریقہ کار:

خلافت اہلِ حل وعقد کی بیعت سے ثابت ہوتی ہے۔ اہلِ حل وعقد سے مراد وہ علما، روسا اور سردارانِ لشکر ہیں جو ادراک وشعور والے ہوں اور مسلمانوں کی مصلحت ومنفعت پر عبور رکھتے ہوں، سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اسی صورت سے منعقد ہوئی تھی۔

انعقادِ خلافت کا ایک طریقہ یہ ہے کہ خلیفہ اپنے بعد کسی معین شخص کو خلیفہ بنانے کی وصیت کر جائے، اس طرح اس شخص کو خلافت مل سکتی ہے، جیسے عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کہ ان کے لیے ابو بکر رضی اللہ عنہ نے وصیت کر دی تھی۔ یا خلافت کا قیام ایسے چھے آدمیوں کے مشورے سے ہو جن میں سے ہر ایک خلافت کی اہلیت اور لیاقت رکھتا ہو اور ان میں سے ایک شخص کو خلافت کے لیے مخصوص کر دیا جائے جس طرح عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق چھے آدمیوں کے مشورے سے قائم ہوئی۔ آخر پر علی رضی اللہ عنہ کی خلافت اہلِ حل وعقد حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بیعت سے مقرر ہوئی، اس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی نظر میں علی رضی اللہ عنہ کے سوا خلافت کا حق دار کوئی نہ تھا، اسی لیے کبار مہاجرین وانصار نے علی رضی اللہ عنہ کے خلاف بغاوت کو ممنوع اور ناجائز قرار دیا۔

یہ چاروں حضرات خلفاے راشدین کہلاتے ہیں، جن کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے دینِ محمدی کو شوکت وعزت عطا کی، کفار ومشرکین کو ہر جگہ شکست وذلت سے دوچار کیا، اساسِ اسلام کو استحکام اور حق کے جھنڈوں کو رفعت دی۔ ان لوگوں کو اور جو ان کے پیرو ہیں، ان کو خلیفہ بنا کر اللہ سبحانہ وتعالیٰ

نے اپنا وہ وعدہ پورا کیا جو غربتِ اسلام کے وقت کیا تھا:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ﴾ [النور: ٥٥]

[اللہ نے ان لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور انھوں نے نیک اعمال کیے، وعدہ کیا ہے کہ انھیں زمین میں ضرور ہی جانشین بنائے گا]

نیز اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اوصاف جمیلہ بیان کرتے ہوئے جو یہ فرمایا تھا:

﴿اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ﴾ [الفتح: ٢٩] [کافروں پر بہت سخت ہیں]

زمانہ خلافت میں ان سب امور کا کما حقہ ظہور ہو گیا تھا۔

جو شخص خلفا سے محبت اور اخلاص رکھے، دعاے خیر کے ساتھ انھیں یاد کرے اور ان کے فضائل وحقوق کو کما حقہ سمجھے، اس کا شمار فلاح یافتہ اور کامیاب لوگوں میں ہوگا۔ جو ان سے بغض رکھے اور رافضیوں اور خارجیوں کی طرح ان پر طعن اور عیب زنی کرنے کی فکر میں رہے، وہ ہلاک ہونے والوں میں داخل ہوگا۔

سلطان اور امامِ وقت اگرچہ انتہا درجے کا ظالم و فاسق ہو، معزول کیے جانے کے لائق نہیں ہے، جب تک وہ کسی ایسے امر کا ارتکاب نہ کرے جو کھلا کفر ہو، جیسے عمداً فرض نماز وغیرہ کا ترک کرنا۔ جو لوگ امامِ وقت کے خلاف بغاوت کریں تو انھیں قتل کرنا چاہیے، تاوقتیکہ وہ مطیع اور فرمانبردار نہ بن جائیں۔ جو باغی بھاگ جائیں یا گرفتار ہو جائیں یا زخمی ہو جائیں، انھیں قتل نہیں کرنا چاہیے۔

تابعین رضی اللہ عنہم، یعنی وہ لوگ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صحبت میں رہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد تمام امت سے افضل ہیں۔ اس کی دلیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان ہے کہ تمام زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے اور بعد میں وہ لوگ جو اس سے قریب ہیں اور اس کے بعد وہ لوگ جو ان سے ملحق ہیں۔[1]

تابعین رضی اللہ عنہم کے بعد ان لوگوں کی فضیلت ہے جنھیں علم و عمل کے ساتھ تابعین سے قرب کا شرف حاصل ہوا، جیسے صحاح ستہ کے مصنفین اور ان کے اساتذہ و تلامذہ۔ ایک قرن اور زمانے کو دوسرے قرن پر جو فضیلت دی جاتی ہے، اس سے مقصود ہر جہت سے ترجیح نہیں ہے، بلکہ کثرتِ فضائل اور نیکیوں کی نشر و اشاعت کے لحاظ سے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی جاتی ہے اور اس بارے میں جو متعارض

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٠٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٣٣)

احادیث مروی ہیں، ان میں اسی طرح تطبیق دی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان: «كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ»[1] [ہر بدعت گمراہی ہے] اپنے عموم پر باقی ہے، جو تمام بدعات کو شامل ہے۔ آپ ﷺ سے مروی بہت سی احادیث اس کی تائید کرتی ہیں۔ احادیث نبویہ میں بدعت کی تقسیم کا اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ جو لوگ بدعت کی تقسیم کے قائل ہیں، خود ان کی تصریحات کے مطابق ایک چھوٹی سی سنت کا اتباع بدعت کی ترویج و اختراع سے کئی گناہ بہتر ہے، اگرچہ بدعت حسنہ ہی کیوں نہ ہو۔

توبہ کی اہمیت وفضیلت:

اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ وہ ہمیشہ توبہ کیا کریں۔ قرآن و سنت کی نصوص سے یہ حکم ثابت ہے۔ توبہ تمام گناہوں کو مٹا دیتی ہے، خواہ وہ گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ۔ صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا چھوٹی نافرمانی اور گناہِ کبیرہ پر اصرار کرنا بڑی معصیت ہے۔ جو آدمی یہ اعتقاد رکھے کہ ایمان والے شخص کو معاصی کے ارتکاب سے کچھ ضرر نہیں ہے، وہ گمراہ، کتاب و سنت کا مخالف اور سلف اور ائمہ امت کے اجماع کو رد کرنے والا ہے۔ جو شخص تقدیر کو اہلِ شرک و معصیت کے لیے عذر اور حجت ثابت کرے، اس کا شمار بھی مشرکین میں ہوگا۔

اہلِ سنت اس بات کے معتقد ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس شخص کو چاہتا ہے، دینِ حق کی طرف ہدایت دے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ حق سے پھیر دیتا ہے۔ وہ جسے گمراہ کر دے، اس کے لیے کوئی دلیل کارآمد نہیں ہوگی، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ﴾ [الأنعام: ١٤٩]

[پھر کامل دلیل تو اللہ ہی کی ہے، سو اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ضرور ہدایت دے دیتا]

نیز فرمایا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ﴾ [الأعراف: ١٧٩]

[اور بلاشبہ یقیناً ہم نے بہت سے جن اور انسان جہنم ہی کے لیے پیدا کیے ہیں]

اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے کل مخلوق کو اپنی قدرت کاملہ سے کسی کی مدد اور تعاون کے بغیر پیدا کیا ہے۔ مخلوق کے دو گروہ بنائے، ایک گروہ کو اپنے فضل و رحمت سے بہشت و نعمت کے لیے بنایا اور

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (٨٦٧)

دوسرے گروہ کو جہنم میں جانے اور عذاب اٹھانے کے لیے پیدا کیا۔ جہنمیوں کو جو تکلیف اور عذاب ہوگا، وہ عدل و انصاف کے مطابق ہوگا نہ کہ ظلم و جبر کے سبب۔ کسی کو اللہ نے گمراہ اور بدبخت بنایا ہے اور کسی کو ہدایت یافتہ اور نیک بخت ٹھہرایا ہے، کسی کو رحمت سے قریب کیا ہے اور کسی کو دور۔ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں کسی کا جواب دہ نہیں ہے، اس کے برعکس بندوں سے ہر عمل کی بابت پرسش ہونے والی ہے۔

توبہ کرنے والے سے عذاب کا ٹال دینا عقل کے موافق اللہ پر واجب نہیں ہے کہ وہ خوامخواہ ایسا ہی کر دے، بلکہ یہ تو اس کے فضل و رحمت کا تقاضا ہے کہ توبہ کے بعد عذاب نہ دے۔ رہی بحث شرعی طور پر توبہ کے قبول ہونے کی تو جو شخص کسی گناہ کبیرہ سے توبہ کرے تو اس کے کسی دوسرے کبیرہ گناہ میں مبتلا ہونے کے باوجود اس کی توبہ صحیح ہوگی اور اس گناہ کا اس سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ جن صغیرہ گناہوں سے توبہ نہ کی ہوگی، عدل و انصاف کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ کو ان پر گرفت کرنے کا حق پہنچتا ہے۔

اہلِ سنت کا کہنا ہے کہ مسلمان آدمی اگر بے شمار گناہوں کا مرتکب ہو کر توبہ کیے بغیر فوت ہو جائے تو اسے بے حد گناہ گار ہونے کے باوجود کافر نہ ٹھہرائیں گے بشرطیکہ خاتمے تک وہ اخلاص اور توحید پر قائم رہا ہو، کیونکہ اس کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے، چاہے تو تمام گناہوں سے درگزر کر دے اور قیامت کے روز صحیح سلامت بہشت میں پہنچا دے۔ اس کے اعمال و افعال پر کسی طرح کا حساب و کتاب نہ ہو اور ہر قسم کی تکلیف و عذاب سے کلی طور پر رہائی پائے۔ اگر اللہ چاہے تو میعادِ سزا اور نصابِ عذاب تک اسے جہنم میں رکھے، بہر حال وہ ہمیشہ جہنم میں نہیں پڑا رہے گا، بلکہ آخر کار جنت میں ضرور داخل ہوگا۔

حاصل کلام یہ کہ ایماندار گناہ گار اگرچہ آگ میں رکھ کر عذاب دیا جائے گا، مگر وہ کفار کی طرح آگ میں پھینکا جائے گا نہ وہ ان کے ساتھ ہمیشہ جہنم میں رہے گا اور نہ کافروں کی طرح بدبخت سمجھا جائے گا۔ جب کہ کافر اللہ کی رحمت سے کلی طور پر محروم ہوں گے، کسی حال میں انھیں راحت و آرام کی امید بھی پیدا نہیں ہوگی۔ رہے مومن تو انھیں ہر زمانے میں اللہ کی رحمت پر بھروسا رہے گا۔ ان کا انجام جنت ہے، اسی لیے وہ جنت کے لیے پیدا کیے گئے ہیں اور جنت ان کے لیے پیدا کی گئی ہے اور اللہ کے فضل و رحمت کا یہی تقاضا ہے۔

مومن مخلص کا طرزِ زندگی:

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ اے رب! ہمیں اسلام کی حالت پر موت دے اور ہمیں نیک لوگوں میں شامل کر دے۔ جو شخص یہ خواہش رکھتا ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں میں سے اس کا ایمان و اسلام خالص و صحیح ٹھہرے تو اسے چاہیے کہ وہ قرآن و حدیث کے مطابق اپنے عقائد درست کرے، تمام گناہوں سے توبہ کرے اور الحاد و ارتداد سے اپنے آپ کو محفوظ رکھے۔ اگر خدانخواستہ اس سے کوئی ایسا قول و فعل صادر ہوا ہو جو مستلزمِ ارتداد ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس سے توبہ کرے اور یہ عزم کرلے کہ پھر کبھی اس کا مرتکب نہ ہوگا۔ اس طرح اس کو کھوئی ہوئی سعادت پھر میسر آ جائے گی۔

تارکِ صلات کا حکم:

اہلِ حدیث کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ جو مسلمان عمداً فرض نماز ترک کر دے، آیا وہ کافر ہوگا یا نہیں؟ مقتدائے اہلِ سنت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور دیگر علمائے سلف کا یہ اعتقاد ہے کہ تارکِ نماز کافر اور اسلام سے خارج ہو جاتا ہے، کیونکہ صحیح حدیث میں وارد ہوا ہے کہ بندوں کے ایمان اور کفر میں فرق کرنے والی چیز یہی نماز کا چھوڑ دینا ہے۔[1] لہٰذا اس حدیث کے مطابق تارکِ نماز کافر کہلائے گا، جب کہ امام شافعی رحمہ اللہ کا علمائے سلف کی ایک جماعت کے ساتھ موقف یہ ہے کہ ترکِ نماز سے مسلمان کو کافر نہیں کہیں گے، تاوقتیکہ نماز کے فرض ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو، لہٰذا ان کی رائے یہ ہے کہ بے نماز کو مرتد کی طرح قتل نہیں کرنا چاہیے۔ رہی وہ حدیث جس میں تارکِ نماز کے کافر ہونے کا بیان ہے تو یہ لوگ اس کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ترکِ نماز، جس پر کفر کا حکم ہے، وہی ہے کہ ترکِ نماز انکار کے ساتھ ہو۔ مگر حدیث کا ظاہری مفہوم پہلے موقف کی تائید کرتا ہے، اگرچہ اس میں کمزور سی تاویل بھی ہو سکتی ہے۔ واللہ أعلم.

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

خاتمہ

یہ رسالہ ان صحیح عقائد کا مجموعہ ہے جن کا کتاب وسنت کے ترازو میں وزن کیا گیا ہے اور انھی عقائد پر سلفِ امت، ائمہ دین اور تمام کے تمام علماے دین گامزن تھے۔

اہلِ حدیث کی مدح اور اہلِ بدعت کی مذمت:

شیخ الاسلام ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمن صابونی رحمہ اللہ نے اپنے عقائد کے رسالے کو اہلِ حدیث کی مدح اور اہلِ بدعت کی مذمت پر ختم کیا ہے۔

اہلِ بدعت کا اہلِ حدیث سے بغض:

امام صابونی رحمہ اللہ نے احمد بن سنان قطان رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ دنیا بھر میں کوئی ایسا بدعتی نہ ملے گا جو اہلِ حدیث سے بغض نہ رکھتا ہو۔ جو شخص بدعتی ہو جاتا ہے، اس کے دل سے حدیث کی حلاوت اور لذت جاتی رہتی ہے۔ امام ابن ابی قتیبہ سے متعلق منقول ہے کہ مکہ معظّمہ میں لوگوں نے ان کے سامنے محدثین کا تذکرہ کیا تو ابن ابی قتیبہ نے کہا کہ اہلِ حدیث بری قوم ہیں۔ یہ سن کر امام احمد رحمہ اللہ اپنے کپڑے جھاڑ کر مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ابن ابی قتیبہ کو "زندیق زندیق" کہتے ہوئے اپنے گھر چلے گئے۔ ابو نصر بن سلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ الحاد پر حدیث کے سننے اور باسند روایت بیان کرنے سے زیادہ قابل نفرت اور گراں کوئی چیز نہیں ہے۔

امام احمد بن اسحاق رحمہ اللہ نے ایک شخص سے مناظرہ کیا اور دوران مناظرہ انھوں نے کہا: "حدثنا فلان" یہ سن کر وہ شخص کہنے لگا: "حدثنا" کو رہنے دو، تم کب تک "حدثنا" کہتے رہو گے؟ اس پر شیخ احمد رحمہ اللہ نے خفا ہو کر اسے کہا: اے کافر! یہاں سے اٹھ جا اور دوبارہ میرے گھر میں نہ آنا۔

محمد بن ادریس رازی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اہلِ بدعت کی علامت محدثین کی عیب جوئی کرنا اور زندیقوں کی نشانی اہلِ حدیث کو "حشویہ" کہنا ہے۔ ان کا مقصد حدیث کو بے اصل و بے اعتبار ٹھہرانا ہے۔ فرقہ قدریہ کی علامت اہلِ سنت کو جبریہ کہنا ہے، جہمیہ کی عادت اہلِ سنت کا نام مشبہہ رکھنا ہے

اور روافض کا شیوہ اہلِ حدیث کو ناصبی قرار دینا ہے۔

امام صابونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ گمراہ لوگوں کا تعصب ہے، کیونکہ اہل سنت کا نام اہلِ حدیث کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اہلِ بدعت جو اپنی طرف سے اہلِ سنت کے لیے ایسے القاب تراشتے ہیں، اس میں وہ ان شیاطین مشرکین کے ہم مسلک ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے لیے طرح طرح کے نام گھڑا کرتے تھے۔ کوئی آپ ﷺ کو ساحر کہتا اور کوئی کاہن ٹھہراتا، کسی نے آپ ﷺ کو شاعر کہا اور کسی نے مجنون۔ بعض نے آپ ﷺ کو جھوٹ گھڑنے والا بتایا اور بعض نے فتنے میں مبتلا افترا بازی کرنے والا بنایا، حالانکہ رسول اللہ ﷺ ان سب عیبوں سے پاک و صاف تھے اور اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ رسول اور سچے نبی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴾ [الإسراء: ٤٨]

[دیکھ انھوں نے کس طرح تیرے لیے مثالیں بیان کیں، پس گمراہ ہو گئے، سو وہ کسی راہ پر نہیں آ سکتے]

اسی طرح اہلِ بدعت ۔خذلھم اللہ تعالیٰ۔ حاملینِ اخبار، ناقلینِ آثار اور راویانِ احادیثِ رسول ﷺ کو، جو طریق نبوی کے متبع اور سنت احمدی پر چلنے والے ہیں، انواع و اقسام کے القاب و اوصاف سے یاد کیا کرتے ہیں، حالانکہ اصحاب الحدیث ان تمام الزامات سے بری ہیں اور ان کا اس کے سوا کوئی نام نہیں ہے کہ وہ صحیح سنت، پسندیدہ سیرت، درست راستوں اور قوی دلائل والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جملہ اوامر و نواہی میں انھیں اپنی کتاب کے اتباع اور احادیث و اخبارِ رسول اللہ ﷺ کی اقتدا کی توفیق دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی راہنمائی کی ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو اخذ کرتے ہیں اور سنت کی ملازمت سے ہدایت پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور ائمہ شریعت و علماے امت کی محبت کے لیے ان کے دلوں کو کھول دیا ہے۔

آدمی کا انجام اسی کے ساتھ ہوگا جس سے اسے محبت ہے:

جو شخص جس قوم سے محبت رکھے گا، قیامت کے روز وہ انھی میں اٹھے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت رکھتا ہے۔''[1]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٨١٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٤٠)

اہلِ سنت کی علامات میں سے ایک علامت علما و ائمہ حدیث اور اس کے اولیا و انصار کے ساتھ محبت کرنا اور ان ائمہ بدعت سے بغض رکھنا ہے جو لوگوں کو آگ کی طرف بلاتے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو ہلاکت کے گھر جہنم کی طرف کھینچتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اہلِ سنت کے دلوں کو علماے سنت اور اہلِ حدیث کی محبت سے آراستہ کر دیا ہے، جو محض اللہ تعالیٰ کا فضل و رحمت ہے۔

سچے سنی کی علامت:

امام ابو رجا قتیبہ بن سعید رحمہ اللہ نے کتاب الایمان کے آخر میں لکھا ہے کہ جب تو ایسے شخص کو پائے جو سفیان ثوری، مالک بن انس، اوزاعی، شعبہ، ابن مبارک، ابو الاحوص، شریک، وکیع، یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی سے محبت رکھتا ہے تو جان لینا کہ یقیناً وہ سچا سنی ہے۔ نیز انھی لوگوں میں محمد بن ادریس، شعبی اور جو ان کے بعد میں ہوئے ہیں، شامل ہیں، مثلاً لیث بن سعد، سفیان بن عیینہ، حمادین اور ابن عون وغیرہ اور جو ان کے بعد آئے، جیسے یزید بن ہارون، عبدالرزاق اور جریر بن عبدالحمید اور ان جیسے دوسرے لوگ اور جو ان کے بعد ہیں جس طرح محمد بن یحییٰ ذہلی، محمد بن اسماعیل بخاری، مسلم بن حجاج قشیری، ابو داود سجستانی، ابو زرعہ رازی، ابو حاتم، ابن ابی حاتم، محمد بن اسلم طوسی، عثمان بن سعید دارمی، ابن خزیمہ، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ قزوینی رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ سنت جو حدیث پر عامل اور اس کے ناصر تھے اور اسی جانب مخلوق کی راہنمائی کرتے تھے۔ اس صفت کے حامل علما بہت بلکہ بے حد و شمار گزرے ہیں، جس کی تفصیل اس جگہ بیان کرنا مناسب نہیں۔

اہلِ بدعت کو ذلیل اور حقیر سمجھنے پر محدثین کا اتفاق:

امام صابونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو عقائد میں نے یہاں لکھے ہیں، مذکورہ بالا محدثین بالاتفاق سب اسی کے قائل تھے۔ کسی اعتقاد میں وہ باہم دگر مختلف نہیں تھے۔ اس پر بھی سب کا اتفاق تھا کہ اہلِ بدعت کو ہمیشہ مقہور و ذلیل اور مبغوض و حقیر سمجھنا چاہیے۔ ان کو اپنے پاس پھٹکنے دیں نہ خود ان کی صحبت و معاشرت تلاش کریں۔ ان کے ترک و ہجر میں اللہ کی رضا اور خوشنودی طلب کریں۔

عقائد صحیحہ کو اپناؤ اور اہلِ بدعت سے کنارہ کش رہو:

امام صابونی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اللہ کے فضل سے میں انھیں محدثین کے آثار کا متبع ہوں اور

انھیں انوار سے روشنی کا خواہاں ہوں۔ میں اپنے دوستوں اور بھائیوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ وہ اس راہ سے نہ بہکیں اور اغیار کے اقوال نہ دیکھیں۔ وہ ان بدعات و محدثات میں مبتلا نہ ہوں جو مسلمانوں میں رائج ہو چکے ہیں، کیونکہ محدثین کے زمانے میں بدعات مروجہ میں سے کوئی ایک بھی بدعت کسی کی زبان پر آتی تو وہ اس شخص کو قطعاً چھوڑ دیتے، اسے بدعتی کا لقب دیتے، اسے جھوٹا کہتے اور اسے ہر طرح کی اذیت پہنچاتے۔

خبردار! اہلِ بدعت کی کثرت سے دھوکا نہ کھانا:

میرے بھائیوں کو اہلِ بدعت کی کثرت اور زیادتی کسی دھوکے میں مبتلا نہ کرے، کیونکہ یہ تو قربِ قیامت کی علامات سے ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''علم کی کمی اور جہل کی زیادتی علاماتِ قیامت سے ہے۔''[1] علم سے مراد سنت ہے اور جہل سے مراد بدعت۔

دورِ حاضر میں متمسک بالسنہ ہونے کا اجر و ثواب:

اس زمانے میں جو شخص رسول اللہ ﷺ کی سنت کو پکڑے رکھے، اس پر استقامت کے ساتھ عمل کرے اور لوگوں کو بھی اس کی تلقین کرے تو اس کا اجر و ثواب ان لوگوں سے بڑھ کر بے حد و حساب ہوگا، جنھوں نے اول اسلام میں سنت کے مطابق عمل کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسے شخص کے لیے پچاس آدمیوں کے برابر ثواب بتلایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دریافت فرمایا: کیا آخر زمانے کے پچاس آدمیوں کے ثواب کے برابر؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: نہیں، بلکہ تمھارے پچاس آدمیوں کے مثل اس کا اجر و ثواب ہوگا۔ آپ ﷺ کی طرف سے اجر و ثواب کا یہ وعدہ خاص اس شخص کے لیے ہے جو فسادِ امت کے وقت رسول اللہ ﷺ کی سنت پر قائم رہے۔[2]

حدیثِ رسول ﷺ کی تعظیم اور اس کے تعلیم و تعلم کی فضیلت:

امام زہری رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''ایک سنت کی تعلیم دو سو برس کی عبادت سے بہتر ہے۔''

امام صابونی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

''ایک روز ابو معاویہ ضریر رحمہ اللہ خلیفہ ہارون الرشید کی مجلس میں حدیث بیان کر رہے تھے،

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

[2] سنن أبي داؤد (٤٣٤١) سنن الترمذي (٣٠٥٨) سنن ابن ماجه (٤٠١٤)

اسی اثنا میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث: «اِحْتَجَّ آدَمُ مُوْسیٰ»[1] کا تذکرہ بھی آیا۔ اس پر عیسیٰ بن جعفر نے کہا کہ آدم و موسیٰ علیہما السلام کی باہم دگر گفتگو کیوں کر ہوئی حالانکہ ان دونوں میں ہزاروں برس کا فاصلہ ہے؟ اس کا یہ کہنا تھا کہ ہارون الرشید غصے سے اچھل پڑے اور یہ کہنے لگے کہ وہ (ابو معاویہ ضریر) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کر رہے ہیں اور تو اس پر کہتا ہے کہ یہ کس طرح ہوا؟ ہارون کا غصہ ٹھنڈا ہونے تک ان کی زبان پر یہ کلمہ برابر جاری رہا۔"

امام صابونی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہر شخص پر واجب ہے کہ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اخبار و احادیث کی قدر و تعظیم کیا کرے اور رضا و تسلیم اور قبول و تصدیق سے پیش آتا رہے۔ جو شخص اس کے سوا کوئی اور راہ اختیار کرے گا اور حدیث صحیح سن کر چوں وچرا زبان پر لائے گا یا دل میں حدیثِ رسول کے قبول کی بابت تردد و شک پائے یا اس کے مضمون کو مستبعد و منکر بتائے تو اس پر ہارون الرشید کی طرح سخت انکار کرنا چاہیے۔ اسی طرح صحیح سندوں کے ساتھ مروی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث کو قبول کرنا لازم وضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان لوگوں میں شامل فرمائے جو اس کے کلام کو سن کر اچھی باتوں پر عمل کرتے ہیں اور دنیا میں تمام عمر کتاب و سنت پر قائم رہتے ہیں اور اپنے فضل و کرم سے ہمیں گمراہ کن ارادوں، کمزور قسم کی آرا اور گمراہی میں مبتلا کرنے والے گناہوں سے محفوظ فرمائے۔

امام صابونی رحمہ اللہ کا حاصل کلام تمام ہوا۔[2]

ہمارے زیرِ نظر امام صابونی رحمہ اللہ کے اصل رسالے پر حافظ عبدالغنی بن عبدالوحد کا، جو ایک مشہور امام ہیں، مصنف رسالے تک مع سند سماع لکھا ہے۔ اس سند کے رجال حفاظ ہیں۔ اس پر تاریخِ سماع ۵۸۲ھ مرقوم ہے۔

حافظ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ نے "کتاب العلو" میں لکھا ہے کہ اسماعیل بن عبدالغافر نے امام الحرمین رحمہ اللہ سے سنا، وہ فرماتے تھے کہ مکہ معظمہ میں مختلف مذاہب کے بارے میں مجھے خلجان اور تردد پیدا ہوا تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے فرماتے ہیں کہ تم صابونی والا عقیدہ اختیار کرو۔[3] انتہیٰ.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٤٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦٥٢)

[2] عقيدة السلف أصحاب الحديث للصابوني (ص: ٤٠)

[3] العلو للإمام الذهبي (١٣١٨/٢)

میں کہتا ہوں کہ امام صابونی رحمہ اللہ کی کتاب میں جو عقائد ہیں، ان سب کو میں نے مختصراً اس رسالے "سائق العباد إلى صحة الاعتقاد" میں درج کر دیا ہے اور اس کے ساتھ دیگر ائمہ حدیث اور علماے سنت سے جو کلام ثابت ہے، اس کا اضافہ کر دیا ہے، لہٰذا (اس رسالے کو پڑھنے والے قاری!) تجھ پر اللہ کی رحمت ہو۔ ہم نے قرآن و حدیث کے جو نصوص اس میں درج کیے ہیں، ان کو اپنے اوپر لازم کر لو، ان دونوں سے ہرگز جدا نہ ہونا، ان کے سوا کسی اور چیز سے ہدایت نہ چاہنا، باطل پرست اور متکلمین کی خرافات و آرا کی طرف متوجہ نہ ہونا، کیونکہ فوز و فلاح اسی چیز میں ہے جو اللہ و رسول کی کتاب و سنت میں ہے نہ کہ ان امور میں جن کو متکلمین نے اپنی اندھی عقلوں اور باطل افکار سے ایجاد کر لیا ہے۔ تجھے چاہیے کہ ہر ملمع اور باطل مقولے کے عوض اللہ عزوجل کے کلام اور حدیثِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قانع اور راضی رہو۔

اتباع کی اہمیت و فضیلت:

حافظ امام عبداللہ بن محمد بن قدامہ مقدسی رحمہ اللہ نے، جو علم شریعت میں مجتہد مطلق ہیں اور علماے آفاق ان کے علم و فضل کے معتقد ہیں، رسالہ عقائد کے خاتمے میں ایک فصل اتباع کی فضیلت پر تحریر کی ہے[1] تو ہم نے چاہا کہ اس میں سے صرف احادیث کو چن کر یہاں تحریر کر دیں، کیونکہ اس رسالے میں بیان کردہ عقائد تو ہماری تحریر میں آ ہی چکے ہیں، اب ان کے دلائل کو بھی علاحدہ کتاب میں جمع کرنے کا ارادہ ہے۔

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ اپنے خطبے میں فرماتے تھے:

"ہم اللہ کی اس طرح حمد اور ثنا کرتے ہیں جس طرح اس کے لائق ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دیتا ہے اسے کوئی گمراہ کرنے والا نہیں ہے اور جسے اللہ گمراہ کر دے اس کو کوئی راہِ راست پر لانے والا نہیں ہے۔ بے شک تمام کلاموں سے سچا کلام اللہ کی کتاب ہے اور سب راہوں سے بہتر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ ہے۔ تمام کاموں سے بدتر کام دین میں نئی باتوں کا نکالنا ہے، کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

(اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے)[2]

---

[1] یہ فصل امام ابن قدامہ رحمہ اللہ کے استاد حافظ عبدالغنی مقدسی رحمہ اللہ کے عقیدے سے متعلق رسالے میں ہے۔ دیکھیں: تذكرة المؤتسي شرح عقيدة الحافظ عبد الغني المقدسي (ص: ٣٥٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٨٤٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦٧)

امام نسائی رحمہ اللہ نے اس روایت میں ان الفاظ کا اضافہ کیا ہے: ''ہر گمراہی جہنم میں ہے۔''[1]

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''آگاہ رہو کہ میں ہر اعتبار سے آدمی ہی ہوں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ کا قاصد طالب بن کر میرے پاس آنے والا ہے، لہٰذا میں یہاں سے چلا جاؤں گا اور تم میں دو عمدہ چیزیں چھوڑ جاؤں گا۔ اول اللہ کی کتاب جس میں ہدایت اور نور ہے۔ جو اس کو پکڑے گا ہدایت پر رہے گا اور جو شخص اسے چھوڑ دے گا اور قرآن کے سوا کسی اور طرف جائے گا تو وہ گمراہی میں مبتلا ہو گا۔ دوم میرے اہلِ بیت، چنانچہ اس بارے میں مَیں تمھیں اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ یہ کلمہ دہرایا۔'' (یہ روایت مسلم کی ہے)[2]

اس کے بعد حافظ ابن قدامہ رحمہ اللہ نے عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ بلاشبہہ جو شخص تم میں سے زندہ رہے گا، وہ بہت سا اختلاف دیکھے گا۔ اس وقت تم اپنے اوپر میری اور خلفاے راشدین کی سنت کو لازم کر لینا اور اسے اپنے دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑ لینا اور اپنے آپ کو محدثات سے بچاتے رہنا، کیونکہ ہر محدث بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور گمراہی آگ میں ہے۔ اسے ابوداود اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے۔[3] سنن ابن ماجہ کی روایت میں اس قدر اضافہ ہے:

''میں نے تم کو صاف شاہراہ پر چھوڑا ہے جس کی رات دن کے برابر روشن ہے۔ میرے بعد کوئی شخص ہلاک ہونے والے کے سوا گمراہ نہیں ہو گا۔''[4] یعنی جس کے مقدر میں نار و ہلاکت لکھی ہے۔

ایک روایت میں اتنی زیادتی اور وارد ہوئی ہے کہ ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا:

''اللہ کی قسم بلاشبہہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ کہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کھلی راہ پر چھوڑ گئے ہیں، جس کی رات دن کے مانند ہے۔''[5]

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

[1] سنن النسائي، رقم الحديث (١٥٧٨)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٤٠٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٠٧) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٧٦)

[4] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٣)

[5] ظلال الجنة للألباني (١/ ٢٠)

''میں نے تم لوگوں میں وہ چیز چھوڑی ہے کہ تم اس کے بعد گمراہ نہ ہو گے جب تک تم اسے پکڑے رکھو گے، وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی، حتی کہ حوض کوثر پر بھی یہ دونوں بالاتفاق ساتھ ساتھ میرے پاس پہنچیں گی۔''[1]

ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبے میں کہا:

''میں ہر امر میں متبع ہوں، کسی لحاظ سے مبتدع نہیں ہوں۔''[2]

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

''بے شک تم کھلی ہوئی راہ پر چھوڑے گئے ہو، مگر یہ کہ تم از خود لوگوں کے ساتھ مل کر دائیں جانب یا بائیں جانب مڑ کر گمراہی اختیار کر لو۔''[3]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

''ہم مقتدی اور متبع ہیں، مبتدی اور مبتدع نہیں ہیں۔ جب تک ہم حدیث کو پکڑے رہیں گے، ہم گمراہ نہیں ہوں گے۔''[4]

امام زہری رحمہ اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت بیان کی ہے کہ ''زانی زنا کرتے وقت ایماندار نہیں ہوتا ہے۔'' امام اوزاعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بارے میں زہری رحمہ اللہ سے پوچھا کہ اس کا مقصد کیا ہے؟

امام زہری رحمہ اللہ نے جواب میں کہا کہ اللہ کی طرف سے جو علم آیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدستور ہم تک پہنچا دیا، اب ہمارا کام فقط اس کو قبول کر لینا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کو اسی طرح رکھنا چاہیے جس طرح وہ وارد ہوئی ہیں۔[5] یعنی ان میں تاویلیں نہ کی جائیں۔

امام اوزاعی رحمہ اللہ کا قول ہے:

''سنت پر صبر کر اور اس جگہ ٹھہر جہاں قوم ٹھہری ہوئی ہے اور وہی کہہ جو انھوں نے کہا

---

[1] المستدرك للحاكم (١/١٧٢) صحيح الجامع (٢٩٣٧)

[2] الطبقات الكبرىٰ لابن سعد (٣/١٨٢)

[3] موطأ الإمام مالك (٢/٢١)

[4] شرح أصول اعتقاد أهل السنة للالكائي (١/٩٦)

[5] حلية الأولياء (٣/٣٦٩)

ہے۔ اس چیز سے رک جا جس سے وہ رکے ہیں اور سلف صالحین کی راہ پر چل، کیونکہ تیرے لیے اس میں کفایت ہے جو ان کے لیے کافی ہوا۔"[1]

امام ابن قدامہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ کتاب و سنت اور آثارِ سلف سے یہ مختصر سی فصل ماخوذ ہے۔ تجھے چاہیے کہ اس کو اور جو کچھ اس کے علاوہ اللہ عزوجل سے، رسول اللہ ﷺ سے، سلف صالحین اور ائمہ امت سے، جس پر کہ خیارِ امت کا اتفاق ہو چکا ہے، اسی طرح وارد ہوا ہے، اس کو لازم پکڑ لے اور اس کے سوا دوسروں کے اقوال کو ذلیل و خوار اور لغو و بے اعتبار اور عبث و بیکار جان کر چھوڑ دے۔ اگر چہ اکثر متاخرین اس کے سبب دھوکے میں مبتلا ہو چکے ہوں اور اس کو اپنے سر آنکھوں پر رکھ چکے ہوں۔ یہ تمام کے تمام اہلِ باطل ہیں۔ ان کے کثیر ہونے سے تو دھوکا نہ کھانا، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

"عن قریب میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، ایک فرقے کے سوا وہ سب فرقے آگ میں جائیں گے۔ وہ فرقہ وہ ہے جو میرے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلے گا۔"[2]

(اسے ائمہ حدیث کی ایک جماعت نے مختلف الفاظ اور سندوں سے روایت کیا ہے)

ہم اللہ تعالیٰ سے اس کے پسندیدہ اعمال کی توفیق مانگتے ہیں۔ وہ ہمیں نبی مختار محمد ﷺ اور ان کی پاک باز آل اور بہترین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے پاس پہنچا دے اور ہمیں عزت کے گھر جنت میں جمع کر دے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ دعا سننے والا اور اسے قبول کرنے والا ہے۔

یہاں پر علامہ ابن قدامہ رحمہ اللہ کا بیان ختم ہو گیا۔

رسالہ "القائد إلى العقائد" کے مصنف نے صلات و سلام کے بعد آخر میں یہ لکھا ہے کہ اس رسالے کی تصنیف اواخر ماہ جمادی الآخرہ ۱۲۹۷ ہجری دار الاقبال بھوپال میں دو دنوں کی دو مجلسوں میں وقوع پذیر ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور اسے ہر آفت و زوال سے مقصد تک پہنچنے کے ساتھ محفوظ رکھے۔ اس رسالے کو اس غرض سے شائع کیا ہے کہ یہ مجموعہ عبادات، معاملات، اصول و آداب اسلامیہ اور عقائد دینیہ کا جامع ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی سے توفیق و احسان کا سوال ہے۔

---

[1] حلية الأولياء (٦/١٤٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٤١)

دعاية الإيمان

إلٰی

توحید الرحمٰن

تالیف

امام العصر علامہ نواب محمد صدیق حسن خان حسینی بھوپالی رحمہ اللہ

(۱۲۴۸ھ-۱۳۰۷ھ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عرضِ ناشر

یہی دین محکم، یہی فتحِ باب
کہ دنیا میں توحید ہو بے حجاب

حمد وصلات کے بعد واضح ہو کہ اسلام میں توحید کی اہمیت بہت زیادہ ہے، اسی کی تعلیم کے لیے تمام نبیوں اور رسولوں کو اللہ نے بھیجا، اپنی کتابیں نازل فرمائیں اور نبی اکرم ﷺ پر قرآن کریم کو نازل فرمایا۔ ان سب کی دعوت کا خلاصہ یہی توحید ہے۔ شیخ الحدیث علامہ بدیع الدین الراشدی رحمہ اللہ نے شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ قرآن کریم کی ہر آیت سے صراحتاً یا کنایتاً توحید ہی کا اثبات ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ الٓرٰ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍۙ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ﴾ [هود: ۱، ۲]

"الٓرٰ۔ ایک کتاب ہے جس کی آیات محکم کی گئیں، پھر انھیں کھول کر بیان کیا گیا، ایک کمال حکمت والے کی طرف سے جو پوری خبر رکھنے والا ہے۔ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، بے شک میں تمھارے لیے اس کی طرف سے ایک ڈرانے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔"

انبیا ورسل علیہم السلام کو توحید کی دعوت واشاعت کا جو حکم دیا گیا تھا، اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کریں کہ اس کام میں انھیں غیر معمولی مشکلات ومصائب کا سامنا کرنا پڑا، وطن اور جان ومال ہر ایک کی قربانی دینی پڑی، پھر بھی اللہ کا حکم یہی تھا کہ اس دعوت پر جمے رہو۔ اللہ کے ان نیک بندوں نے اپنا فرض ادا کیا، جس کا ثمرہ یہ ہے کہ دنیا کے ہر خطے میں توحید کے ذوق آشنا موجود ہیں۔ صلى الله عليهم وسلم تسليما كثيرا.

توحید کا ذکر سن کر بعض لوگ اسے مسائلِ حیات سے الگ کوئی تعلیم سمجھتے ہیں، لیکن یہ فہم ونظر کا

قصور ہے، کیوں کہ رسالت جیسا عظیم نظام جس مقصد کے لیے قائم کیا جائے، وہ زندگی سے غیر متعلق نہیں ہوسکتا۔ علامہ بدیع الدین شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''توحید ہی سے عمل صالح کی طرف رغبت ہوتی ہے ...توحید ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی بدولت ایک مومن نیکی، عمل صالح، اخلاق حسنہ، ایمان داری اور راست بازی پر قائم رہ سکتا ہے۔ بلکہ اسی توحید سے انسانیت کا نظام برقرار رہ سکتا ہے اور اسی سے امت کے درمیان اتحاد واتفاق قائم رہتا ہے۔ توحید ہی کی بدولت آپس میں بگڑے ہوئے دل ملیں گے، بغض، حسد اور کینے سے صاف ہوں گے۔''

زندگی سے توحید کا رشتہ سمجھنے کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور اصحاب کرام رضی اللہ عنہم کے حالات پر نظر ڈالیے، کس طرح ان نفوس قدسیہ نے ہر طرح کی آزمایش میں صبر کیا اور حق کی سربلندی کے لیے ہر طرح کی قربانی پیش کی۔ ان کے دور میں دنیوی ساز و سامان اور مادی وسائل سے مالا مال اقوام اہلِ توحید کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ توحید کی متاعِ عزیز سے ان کا دامن خالی تھا، اس لیے مسلمانوں کے مقابلے میں انھیں ہزیمت سے دو چار ہونا پڑا اور شان وشوکت کے مظاہر انھیں کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے۔

اسلام میں توحید کی اہمیت کے پیش نظر ائمہ دین اور علماے اسلام نے ہر دور میں اس عقیدے کی شرح وتفصیل پر توجہ دی، محدثین کرام نے مجامیع حدیث میں مستقل کتب، فصول اور ابواب منعقد کیے اور اس طرح اس عقیدے کو ذہن نشین کرایا۔

علامہ بدیع الدین رحمہ اللہ نے ''هداية المستفيد'' پر جو مقدمہ تحریر فرمایا، اس میں اختصار کے ساتھ علما کی ان خدمات کا ذکر کیا ہے، جو عقیدۂ توحید کی شرح وتفصیل میں سامنے آئی ہیں۔ اس خدمت میں ایک معتد بہ حصہ برصغیر کے علماے اہلِ حدیث کا بھی ہے۔ ان مخلصین نے اپنے اپنے وقت میں توحید کی تائید اور شرک کی تردید میں عربی و اردو دونوں زبانوں میں مسلسل کام کیا ہے، جس کے خوشگوار اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ امت کا ایک حصہ ان مساعی جمیلہ کی بیخ کنی پر آمادہ نہ رہتا تو برصغیر میں توحید کی اشاعت کا حال دوسرا ہوتا اور آج جو ایمان سوز نظارے آنکھوں کے سامنے ہیں، نظر نہ آتے۔

برصغیر میں علومِ اسلامیہ کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو نواب عالی مقام، ناشر السنة النبوية،

حاملِ لواء التحقیق والتالیف علامہ سید صدیق الحسینی البخاری (المتوفی ۱۳۰۷ھ) کا اسم گرامی آفتاب کی طرح روشن نظر آتا ہے۔ آپ نے علم کی اشاعت، علما کی سرپرستی، عقیدۂ سلف کی تائید، اسلام کی تبلیغ اور امت کی اصلاح و ترقی کے میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کی مثال مشکل ہے۔ علم اور دین کی خدمت کے لیے آپ نے محکم منصوبہ مرتب کیا اور ضرورت کے مطابق مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں اور دوسرے علما کو بھی تصنیف و دعوت کے کام سے وابستہ کیا۔ تفسیر، حدیث، عقیدہ اور اصول کے اصل مآخذ کو آپ نے برصغیر اور بلادِ عربیہ میں عام کیا۔ اس دور میں کتبِ دینیہ کی قلت کا جو حال تھا، آج اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جنھیں اس وقت کا حال معلوم ہے، صرف وہی اس کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔

نوابِ عالی تبار کی تصانیف کی تعداد ۲۲۲ یا اس سے اوپر ہے، جن میں مختلف موضوعات اور مختلف زبانوں کی کتابیں ہیں۔ شاہ بدیع الدین رحمہ اللہ نے عقیدے کے موضوع پر نواب صاحب رحمہ اللہ کی پندرہ کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں، لیکن ان میں زیرِ نظر کتاب کا نام نہیں ہے۔ محترم ڈاکٹر محمد اجتبا ندوی صاحب نے نواب صاحب پر عربی زبان میں اپنی مفصل و مفید کتاب میں تصانیف کی کل تعداد ۲۲۲ اور عقیدہ پر کل ۲۳ کتابوں کے نام ذکر کیے ہیں۔ جامعہ سلفیہ کے ایک فاضل اور دار الحدیث مکہ مکرمہ میں استاد ڈاکٹر اختر جمال لقمان نے نواب صدیق حسن رحمہ اللہ پر عربی زبان میں جو کتاب تصنیف کی ہے، اس میں عقیدے کے موضوع پر نواب رحمہ اللہ کی کتابوں کی تعداد ۴۶ لکھی ہے، جن میں دس کتابیں عربی زبان میں اور بقیہ اردو یا فارسی میں ہیں۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ نواب عالی مقام کو اس موضوع سے کتنا لگاؤ تھا اور امت کی اصلاح کے لیے توحید کی اشاعت کو موصوف کس قدر ضروری سمجھتے تھے۔

حالات پر نظر رکھنے والے حضرات بہ خوبی جانتے ہیں کہ برصغیر میں جماعتِ اہلِ حدیث کے علما و محققین نے علمی و اصلاحی دونوں ضرورتوں کے پیشِ نظر تصنیفات کا ایک اچھا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ نیت کے اخلاص، علمی وسعت اور دقتِ نظر کے سبب اللہ تعالیٰ نے ان کے کام میں برکت عطا فرمائی اور اس سے بڑے پیمانے پر عقیدہ و عمل کی اصلاح ہوئی۔ آج کے دور میں ان کتابوں کی جدید اشاعت ہمارا فرض ہے، جس طرح اہم موضوعات پر تالیف و تحقیق کا کام ضروری ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی نے اس نوعیت کے مختلف منصوبوں کی سرپرستی کی ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس مبارک اقدام سے علومِ اسلامیہ کی اشاعت کا کام ہو گا اور دوسری طرف نئی نسل کی دینی تربیت اور روشن ماضی سے آگاہی کا مقصد حاصل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ جمعیت کے ذمے داروں کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

زیرِ نظر کتاب "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمٰن" کی تسہیل، تخریج اور ترتیب کی خدمت جناب مولانا محمد اعظمی ﷾ نے انجام دی ہے۔ موصوف میرے مشفق اساتذہ کی فہرست میں نمایاں مقام رکھتے ہیں، جن کی خدمات نصف صدی کو محیط ہیں۔ میں ان کی اس خدمت کا کما حقہ تعارف تو نہیں کرا سکتا، البتہ یہ ضرور عرض کروں گا کہ موصوف کی وسیع نظر، اخلاصِ نیت اور طویل علمی و اصلاحی تجربے سے کتاب کے قارئین ضرور محظوظ ہوں گے اور نواب ﷫ کی اس وقیع تصنیف سے استفادہ ان کے لیے آسان ہو جائے گا۔ استادِ محترم نے ''طبع جدید'' کے عنوان سے جو مقدمہ سپردِ قلم فرمایا، اس سے ان امور کا ادراک ہو جائے گا جو کتاب کی اس موجودہ اشاعت میں ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ کسی کتاب کی تسہیل کے مسئلے میں مجھے قدرے تامل رہتا ہے، کیونکہ اس سے مصنف کی اصل عبارت باقی نہیں رہتی، لیکن اس عمل کی بعض نظیریں موجود ہیں اور علما اسے مفید خیال کرتے ہیں، اس لیے اسے میں نے بھی قبول کر لیا ہے، لیکن اگر اصل عبارت برقرار رکھتے ہوئے حاشیے میں تسہیل ثبت کی جائے تو اسے میں افضل سمجھتا ہوں۔ استادِ محترم نے شاید اسی لیے فرمایا ہے:

''قاری کو زیادہ الجھن یا غلط فہمی نہ ہو سکے اور مولفِ کتاب کا کلام حتی الامکان اپنے رنگ وروپ میں باقی رہے۔'' وللناس فيما يعشقون مذاهب.

استادِ محترم کے بیان کے مطابق "دعاية الإيمان" کی تسہیل میں نواب صاحب کی عربی تصنیف "الدين الخالص" سے مدد حاصل ہوئی اور آپ نے محسوس کیا کہ اس کتاب کی تحقیق و تخریج بھی ضروری ہے۔ استادِ محترم کو اس بات سے خوشی ہو گی کہ محترم ڈاکٹر عبدالرحمٰن الفریوائی نے "الدين الخالص" کی تحقیق و تخریج کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ ان شاء اللہ ان کے ادارے سے جلد ہی مذکورہ کتاب تخریج وفہارس کے ساتھ منظرِ عام پر آ جائے گی۔

"دعاية الايمان" کی فہرستِ مضامین پر ایک نظر ڈالیے تو اندازہ ہو گا کہ عقیدے کے

موضوع پر یہ کتاب کس قدر جامع ہے۔ نواب رحمہ اللہ نے مقدمے میں توحید کے اثبات، شرک کی تردید، وجودِ باری کے دلائل اور بعض دوسرے متعلقہ امور کا مختصر ذکر کیا ہے، پھر پہلے باب میں توحید کی تینوں اقسام اور شرک ونفاق پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا باب موحدین ومشرکین کے انجام سے متعلق ہے۔ تیسرے باب میں دونوں فریق کے درجات ودرکات کا بیان ہے۔ مضمون کی توضیح کے لیے حکایات بھی درج کی ہیں۔ تقلید کی تعریف، اشراک کے اقسام اور علم غیب وغیرہ بھی اسی باب میں مذکور ہیں۔ چوتھے باب میں شرک کے بعض احوال، عبادت کی قسموں، اس کی حکمت اور فوائد کا بیان ہے۔ پانچویں باب میں شرک پر دو آیتوں کی تفسیر اور بعض حکایات ہیں۔ چھٹے باب میں شرک کی بعض دیگر اصناف کا بیان ہے، اسی باب میں استغاثہ، توسل، نذر لغیر اللہ، ذبح لغیر اللہ وغیرہ اہم موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ساتویں باب کا تعلق شفاعت کے اقسام، جادو کی حرمت، علم نجوم کی حرمت، پھر محبتِ الٰہی اور اس کے اسباب سے ہے، اس کے بعد خاتمہ اور اس کا ذیل ہے۔

ہم نے ابواب اور عناوین ومتعلقات کا سرسری ذکر اس لیے کیا ہے کہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ نواب عالی مقام نے اس کتاب میں کس طرح عقیدے کے تمام اہم مسائل کو سمیٹ لیا ہے اور کتاب وسنت کے دلائل کی روشنی میں ان پر بحث کی ہے۔ اس بحث میں ایک بالغ نظر اور صاحبِ تجربہ مصلح کی طرح ہندوستانی معاشرے کو ذہن میں رکھا ہے اور کتاب وسنت سے دوری کے سبب جو خرابیاں اس معاشرے میں پیدا ہوگئی ہیں، انھیں دور کرنے کے لیے موثر طریقے کی نشان دہی کی ہے۔

نواب صاحب رحمہ اللہ نے پانچ صفحات کے خطبۂ کتاب میں یہ واضح فرما دیا ہے کہ کلمۂ شہادت کی تشریح وتفریع اس کتاب کا بنیادی موضوع ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد حدیثیں ذکر کی ہیں، جن سے کلمے کی فضیلت واہمیت ثابت ہوتی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

> ''جو شخص اس کلمے کا قائل ہے، وہ مسلمان ہے۔ اور جو منکر ہے، وہ اسلام سے خارج ہے۔ اس کلمے کا لفظی معنی بہت آسان ہے، لیکن اس معنی کا تحقق اور حقیقی وجود بہت مشکل ہے۔ کلمے کا پہلا جملہ ''أشهد أن لا إله إلا الله'' توحید کی جڑ ہے اور دوسرا جملہ ''وأن محمدا رسول الله'' تصدیقِ رسالت کا خاص طریقہ ہے۔ جو کوئی توحید پر قائم ودائم ہو کر ہر قسم کے ظاہری ومخفی شرک سے بچتا رہا، وہ بلاشبہہ جنتی ہوگا۔ جو شخص شرک سے نہیں

بچا، چاہے ہزار بار زبان سے اس کلمے کو پڑھے اور اسلام و ایمان کا دعوی کرے، وہ دوزخ ہی میں جائے گا، اس کی مغفرت ہرگز نہ ہوگی۔"

مزید فرماتے ہیں:

"اس رسالے میں نہایت اختصار اور غایت اقتصار سے توحیدِ خالص کی اقسام اور انواع شرک کو ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ توحید خالص کی حقیقت بہ خوبی سمجھ میں آ جائے۔ اس رسالے کا نام "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمٰن" رکھا گیا ہے۔ اس تحریر وتقریر کا اولین مقصد اپنے اولاد واحفاد کی تعلیم ہے، پھر ان لوگوں کی راہنمائی کرنا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ہدایت وبھلائی اختیار کرنے کی توفیق بخشے۔"

مسرت کی بات ہے کہ مذہبی کتابوں پر توجہ کے اس دور میں نواب صاحب کی یہ کتاب عمدہ کتابت وطباعت کے ساتھ منظر عام پر آ رہی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے تمام قارئین کو ہدایت بخشے اور لوگ توحید وسنت کی شاہراہ پر قدم آگے بڑھائیں۔ آزمائش کے اس دور میں توحید ہی کی راہ پر چل کر ہمیں سرخ روئی حاصل ہوسکتی ہے۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه، آمين، وصلى الله على رسوله الكريم، والحمد لله رب العالمين.

مقتدی حسن محمد یاسین

جامعہ سلفیہ، بنارس

۱۴/صفر ۱۴۲۶ھ

طبع جدید

حضرت نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ کی جامع صفات ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ ان کی علمی تالیفات، نادر تحریرات اور مختلف علوم وفنون میں ان کے شاہکاروں کی کثرت و وسعت کا حال یہ ہے کہ ان تمام کا صحیح شمار نہیں ہو سکا ہے۔ اس علمی خزانے میں ایک کتاب "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمن" ہے۔ یہ کتاب توحیدِ باری تعالیٰ کے اِثبات اور شرک کی نفی کے موضوع پر کتاب و سنت کے دلائل سے بھرپور اور عقلی و منطقی استدلال سے بے نیاز ہے۔ کتاب میں فلاسفہ اور فرق ضالہ کے افکار و نظریات کا رد بھی نہایت حکیمانہ انداز میں نصوصِ کتاب و سنت ہی سے کیا گیا ہے۔

ٹائٹل پر اس کتاب کا سنہ اشاعت "۱۳۰۴ھ" درج ہے اور اس کی مدتِ تالیف صرف ایک ہفتہ ہے، جیسا کہ اس کتاب کے خاتمے کی آخری سطروں میں نواب صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

"یہ رسالہ ۲۷ محرم ۱۳۰۴ھ کو لکھنا شروع کیا تھا، چہارم صفر سنہ صدر کو بحمدہ تعالیٰ تمام ہوا۔"

یعنی یہ کتاب آج سے ۱۱۹ سال پہلے لکھی گئی اور شائع ہوئی تھی۔ اکثر کتابوں کی طرح اس کی طباعت و اشاعت بھی دوبارہ نہیں ہوئی۔ اس دور میں علمی و مذہبی کتابیں کچھ عربی اور زیادہ تر فارسی میں لکھی جاتی رہیں، کیونکہ اردو زبان کا رواج عام نہیں تھا۔ جو کتابیں اردو میں لکھی گئیں، ان میں عربی و فارسی الفاظ و تراکیب اور علمی اصطلاحات کے کثرتِ استعمال سے تحریر کا عام فہم ہونا تو کجا اہلِ علم کو بھی غور و فکر کی مشقت اٹھانے کے بعد ہی اصل مفہوم تک رسائی ہوتی ہے۔

کتاب مذکور بھی قدیم اردو زبان میں ہے اور قدامتِ زبان کے تمام اوصاف کے ساتھ اکثر مقامات میں تعقید لفظی و معنوی بھی حل طلب مسئلہ ہے۔ چونکہ کتاب کا اسلوب خالص علمی ہے، اس لیے اگر کہیں پر تعقید کے سمجھنے و سلجھانے میں ذرا بھی چوک ہو جائے تو اصل مفہوم الٹ پلٹ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ قدیم تصنیفات کی طرح یہ کتاب بھی تحقیق و تخریج اور فہارس کے بغیر شائع ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی (کویت) کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے اس

کتاب کی افادیت واہمیت کے پیش نظر اس کی دوبارہ اشاعت کی ضرورت محسوس کی اور جدید تقاضوں کے مطابق حسبِ ذیل امور سے آراستہ اڈیشن شائع کرنے کا اہتمام کیا:

1. قدیم اردو کی تسہیل جو عصر حاضر کی اردو سے ہم آہنگ ہو۔
2. عربی وفارسی کلام کا اردو ترجمہ۔
3. آیات واحادیث کی مختصر تخریج۔
4. ترتیبِ فہارس۔

جمعیت موصوفہ نے ان امور کی خدمت وانجام دہی کے لیے مجھ ناتواں کا انتخاب کیا اور کتاب کی فوٹو کاپی میرے پاس بھیج دی، جو میرے لیے باعثِ افتخار واعزاز ہے۔ ظاہر ہے یہ عظیم خدمت محض حسنِ ظن کی بنا پر مجھ ناچیز کو تفویض کی گئی ہے، کیونکہ میری علمی اہلیت اس حد تک معروف نہیں ہے کہ اس کریمانہ انتخاب و اعزاز کی مستحق ہو، بہر حال اس ذرہ نوازی پر بہت ہی شکر گزار اور ممنون ہوں، ساتھ ہی اسے اپنے لیے بہت بڑی سعادت سمجھتا ہوں۔

اللہ کی توفیق سے جب یہ علمی کام ہم نے شروع کیا تو جیسا کہ کتاب کی اردو زبان کا حال اوپر بھی ذکر کیا ہے، اس کو عربی وفارسی کتابوں سے کہیں زیادہ ادق ومعقد پایا، اس لیے پہلے مرحلے میں اردو زبان کی تحلیل وتسہیل کا کام ہی ہمارے لیے علمی امتحان اور سخت آزمایش ثابت ہوا۔ عبارت فہمی کے سلسلے میں غور وفکر کی محنت نے جہاں کہیں ذہن ودماغ کو تھکا دیا تو استمداد کے لیے نواب صاحب ہی کی عربی کتاب "الدین الخالص" کی طرف مراجعت کی۔ الحمد للہ اس سے فہمِ مطالب اور تسہیلِ زبان میں بہت آسانی ہوئی۔ یہ عربی کتاب بھی اسی موضوع پر بہت مفصل و مدلل دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کی تحقیق وتخریج کی بھی سخت ضرورت ہے۔ معلوم نہیں اہلِ علم نے اس بلند پایہ اور جامع کتاب کی تحقیق کی طرف اب تک کیوں نہیں توجہ دی ہے، جب کہ اس میں احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کاش ڈاکٹریٹ کا کوئی امیدوار اس میں مذکورہ آیات واحادیث وغیرہ کی تخریج اور عملِ فہارس کو اپنا موضوع بناتا تو یہ زبردست علمی ودینی خدمت ہوتی اور تراثِ اسلامی کا احیا بھی۔

اس کتاب کی اردو زبان کو سہل کرنے میں ہم نے امکانی حد تک یہ اہتمام کیا ہے کہ الفاظ وعبارات میں زیادہ ردوبدل کیے بغیر مشکل الفاظ کی جگہ ان کے معانی اور پیچیدہ تراکیب کی ترتیب اس

ڈھنگ سے کر دی جائے کہ قاری کو زیادہ الجھن یا غلط فہمی نہ ہو سکے اور مولفِ کتاب کا کلام حتی الامکان اپنے رنگ و روپ میں باقی رہے۔ اس کوشش میں ہم کہاں تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ اس کا فیصلہ اہلِ علم کے حوالے ہے۔

رہا تخریجِ احادیث کا معاملہ تو اس میں بھی قلتِ مراجع کے سبب مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اور تتبع کے باوجود بعض حدیثوں کا اصل مخرج و ماخذ معلوم نہ ہو سکا۔ اس کام میں بعض عزیزوں نے بھی کچھ سہولت بہم پہنچائی ہے، اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے۔

کتاب کے قدیم اڈیشن میں کسی طرح کی کوئی فہرست شامل نہیں تھی، اب تین فہرستیں (فہرستِ مضامین، فہرستِ آیات اور فہرستِ احادیث) تیار کر کے شاملِ اشاعت کی جا رہی ہیں۔

راقم الحروف کو اس اہم علمی و دینی خدمت کی سعادت کے حصول کے باعث و محرک عالم باعمل شیخ عارف جاوید محمدی ﷾ اور شیخ احمد اللہ محمد ادریس مبارکپوری ﷫ ہیں۔ ان دونوں مخلصین کی حوصلہ افزائی سے یہ علمی سفر انجام کو پہنچا، فللہ الحمد. اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے، آمین۔

افسوس اس کتاب کی اشاعت سے پہلے موخر الذکر کرم فرما اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ۔ ان کی رحلت سے جہاں جماعتی کاز کو نقصان پہنچا، وہیں شیخ عارف کا ایک بازو الگ ہوگیا۔ یہ دونوں مخلص ساتھی جمعیۃ احیاء التراث کی طرف سے برصغیر میں سلفی خدمات کے ترجمان اور نگراں تھے۔ اللہ تعالیٰ شیخ عارف صاحب کو طویل حیات بخشے اور کتاب وسنت کی خدمت واشاعت کی مزید توفیق بخشے۔

مجھ کم ترین کے لیے یہ امر باعثِ شکر و فخر ہے کہ اصحابِ جامعہ سلفیہ بنارس نے اس کتاب کی مراجعت کی زحمت فرما کر اس کی طباعت واشاعت میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ فرمایا۔ بالخصوص محترم مولانا عبداللہ سعود سلفی (ناظم جامعہ) نے خصوصی توجہ دے کر اور محترم ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری ﷫ نے تقدیمِ ناشر لکھ کر جامعہ سلفیہ سے اہتمام کے ساتھ شائع کرنے کی کوشش فرمائی، جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت دو چند ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی دینی و دعوتی خدمات کو شرفِ قبول بخشے، آمین۔

جمعیۃ احیاء التراث کی خدمت میں ہم ہدیۂ تبریک وتحسین پیش کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ہندی اہلِ علم کے علمی و دینی ترکوں و دفینوں کے احیا واشاعت کا بھی اہتمام کر رہی

ہے، چنانچہ اس وقت اسلامی عقائد کے باب میں نواب صدیق حسن بھوپالی رحمہ اللہ کی دو معرکہ آرا اردو کتب "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمٰن" اور "دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع" کو شائع کرنے کی طرف نظر کرم فرماتے ہوئے کوشش کی ہے کہ یہ جدید اڈیشن عصر حاضر کے معیار و انداز پر اردو زبان کی تسہیل، عربی و فارسی نصوص کے اردو تراجم، آیات و احادیث کی تخریج اور فہارس کے اضافوں پر مشتمل ہو۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خالص دینی و علمی خدمت کو قبول فرمائے۔ اس کے مولف و ناشر اور جنھوں نے اس اڈیشن کی تجدید و تحسین، تحقیق و تخریج اور ترتیبِ فہارس کی خدمت انجام دی ہے، حسبِ مراتب جزائے خیر عطا فرمائے اور اس کتاب کو ہر خاص و عام کے لیے نافع و مفید اور ذریعہ ہدایت بنائے، آمین۔ والحمد لله الذي بنعمته تتم الصالحات.

العبد الفقير لرحمة الله القدير

محمد الاعظمی

سابق شیخ الجامعہ جامعہ عالیہ عربیہ، مئو

۱۴۲۳/۱۱/۲۲ھ = ۲۰۰۳/۱/۲۶ء

دیباچہ

أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰه.

[میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں]

یہ کلمہ اس رسالے کی حمد و نعت ہے۔ حدیثِ جبریل میں بہ روایتِ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، رسول اللہ ﷺ نے اس کلمے کو اسلام کا کلمہ فرمایا ہے۔ اس حدیث کو امام مسلم رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے۔[1]

کلمۂ توحید کی اہمیت:

اس کلمے کا بیان بہت سی حدیثوں میں آیا ہے:

① صحیح بخاری و مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث «بُنِيَ الْإِسْلَامُ ...» میں کلمۂ اسلام کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

«شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ»[2]

[یہ گواہی دینا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں]

② ایک متفق علیہ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«أُمِرْتُ أَنْ أُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَشْهَدُوْا أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ»[3]

[مجھے اللہ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ دشمنانِ اسلام سے جہاد کروں، حتی کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں]

③ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ایک طویل مرفوع حدیث میں یوں مذکور ہے:

---

① صحيح مسلم، رقم الحديث (٨)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦)

③ صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠)

«أَتَدْرُوْنَ مَا الْإِيمَانُ بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ ؟ قَالُوْا: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ أَعْلَمُ، قَالَ: شَهَادَةُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ»[1]

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا:

[کیا تم جانتے ہو کہ ایک اللہ پر ایمان لانا کیسے ہوتا ہے؟ صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے با ادب عرض کی: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ (ﷺ) نے فرمایا: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں]

④ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے واقعے میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

«مَا مِنْ أَحَدٍ يَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، صِدْقًا مِنْ قَلْبِهٖ إِلَّا حَرَّمَهُ اللّٰهُ عَلَى النَّارِ»[2]

[جو شخص سچے دل سے یہ گواہی دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جہنم حرام کر دے گا]

⑤ ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے:

«مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، ثُمَّ مَاتَ عَلٰى ذٰلِكَ إِلَّا دَخَلَ الْجَنَّةَ»[3]

[جس بندے نے لا الہ الا اللہ کہا، پھر اسی کلمے پر وفات پا گیا تو وہ ضرور جنت میں جائے گا]

⑥ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں یوں مذکور ہے:

«مَنْ شَهِدَ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللّٰهِ، حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ النَّارَ»[4] (رواه مسلم)

[جو بندہ اس بات کی گواہی دے گا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پر جہنم حرام کر دے گا]

⑦ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٨) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٨٩) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

[4] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٩)

«مَنْ مَاتَ وَهُوَ يَعْلَمُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»[1] (رواه مسلم)

[جو شخص اس بات پر یقین رکھتے ہوئے انتقال کر گیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو وہ جنتی ہے]

⑧ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک طویل مرفوع حدیث میں ہے:

«فَمَنْ لَقِيَكَ مِنْ وَّرَاءِ هٰذَا الْحَائِطِ، يَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، مُسْتَيْقِنًا بِهَا قَلْبُهُ، فَبَشِّرْهُ بِالْجَنَّةِ»[2] (رواه مسلم)

[رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اس باغ کے پیچھے تمہاری ملاقات کسی ایسے شخص سے ہو جائے جو دل کے یقین کے ساتھ یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو اس کو جنت کی خوش خبری سنا دو]

⑨ معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث کے الفاظ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَفَاتِيحُ الْجَنَّةِ: شَهَادَةُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ»[3] (رواه أحمد)

[جنت کی کنجیاں اس بات کی گواہی دینا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے]

کلمۂ توحید کی اہمیت:

جو شخص اس کلمے کا قائل ہے، وہ مسلمان ہے اور جو اس کا منکر ہے، وہ اسلام سے خارج ہے۔ اس کلمے کا لفظی معنی بہت آسان ہے، لیکن اس معنی کا حقیقی وجود بہت مشکل ہے۔ کلمے کا پہلا جملہ «أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰه» توحید کی جڑ ہے اور دوسرا جملہ «أَنَّ مُحَمَّداً رَسُوْلُ اللّٰهِ» تصدیقِ رسالت کا خاص طریقہ ہے۔ جو کوئی توحید پر قائم و دائم ہو کر ہر قسم کے ظاہری و مخفی شرک سے بچتا رہا، وہ یقیناً جنتی ہوگا، لیکن جو شخص شرک سے نہیں بچا، چاہے ہزار بار زبان سے اس کلمے کو پڑھے اور اسلام و ایمان کا دعوی کرے، وہ دوزخ ہی میں جائے گا، اس کی مغفرت ہرگز نہیں ہوگی۔

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٦)

[2] صحيح مسلم، رقم الحديث (٣١)

[3] مسند أحمد (٥/٢٤٢) اس کی سند ضعیف ہے۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد والبزار، وفيه انقطاع بين شهر و معاذ، و إسماعيل بن عياش روايته عن أهل الحجاز ضعيفة، وهذه منها" (مجمع الزوائد: ١/١٦١، السلسلة الضعيفة: ٣/٤٧٧)

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ، قَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا الْمُوْجِبَتَانِ؟ قَالَ: مَنْ مَّاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَ مَنْ مَّاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ النَّارَ»[1] (رواہ مسلم)

[دو خصلتیں جنت اور جہنم کو واجب کرتی ہیں۔ ایک صحابی نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! واجب کرنے والی دو چیزیں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کی موت اس حالت میں ہوئی کہ وہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتا رہا تو وہ جنت میں جائے گا اور جس شخص کی موت اس حالت میں ہوئی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کرتا رہا تو وہ جہنم میں داخل ہوگا]

اسی طرح جو شخص کلمے کے دوسرے جملے «أَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ» کا قائل ہے، مگر کسی بدعت میں اعتقاداً یا عملاً گرفتار ہے تو وہ بھی پورے طور پر رسالت کی تصدیق کرنے والا نہیں ہے۔ واضح رہے کہ اگر وہ بدعت اس طرح کی ہے کہ کفر تک نہیں پہنچاتی ہے تو وہ بدعتی اس بدعت وضلالت کے مطابق جہنم میں رہ کر مقرر عذاب پا کر نجات پائے گا، لیکن اگر وہ بدعت ایسی ہے جو قرآن یا حدیث کی نصِ قطعی کے صریح خلاف ہے تو اس کی نجات کی کوئی صورت معلوم نہیں ہوتی ہے۔

سببِ تالیف:

اس رسالے میں نہایت اختصار سے توحیدِ خالص کی اقسام اور انواعِ شرک کو ذکر کیا گیا ہے، تاکہ توحیدِ خالص کی حقیقت بہ خوبی سمجھ میں آجائے۔ اس رسالے کا نام "دعاية الإيمان إلى توحيد الرحمن" رکھا گیا ہے اور اس تحریر وتقریر کا اولین مقصد اپنی اولاد و احفاد کی تعلیم ہے، پھر ان لوگوں کی راہنمائی کرنا ہے جنھیں اللہ تعالیٰ ہدایت اور بھلائی اختیار کرنے کی توفیق بخشے۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ اپنے قول وفعل اور حال کو اس کتاب کے مضامین ومقاصد پر پیش کر کے موازنہ کرے اور دیکھے کہ وہ کس قسم کا مسلمان ہے؟ محض وہ زبان سے اسلام لایا ہے یا تہِ دل سے ایمان والا ہے؟ اگر دل سے ایمان لایا ہے تو وہ کیسا دل ہے جو اس تصدیق وایمان کے باوجود کلمہ طیبہ کے مضمون ومقصد کے خلاف عمل کرتا ہے اور اس کو اپنے دین وایمان کے لیے مضر نہیں جانتا ہے۔ اگر فقط

[1] صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۳) اس حدیث کے آغاز میں مذکورہ الفاظ «ثِنْتَانِ مُوْجِبَتَانِ» صحیح مسلم میں ہمیں نہیں مل سکے، البتہ مشکاۃ المصابیح (۳۸) میں یہ الفاظ صحیح مسلم کے حوالے سے مرقوم ہیں۔ واللہ أعلم بالصواب.

زبان سے مسلمان ہوا ہے تو اس کو سچے ایمان کی فکر کرنی چاہیے اور اس بات سے خبردار رہنا چاہیے کہ کبائر (بڑے گناہوں) کے ارتکاب سے اگرچہ مسلمان بندہ دائمی جہنمی نہیں ہوتا، لیکن اس میں بھی شک کی گنجایش نہیں کہ وہ جہنم کا مستحق ٹھہر جاتا ہے۔ چاہے اس میں جائے یا نہ جائے، یہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ جس شخص کے عقیدے میں کوئی شرک یا بدعت، جو کفر تک پہنچاتی ہے، شامل ہو تو وہ جنت سے محروم ہو کر بالکل جہنمی ہو جاتا ہے۔ والعیاذ باللّٰه.

غرض کہ کفر و ایمان اور طاعت و عصیان سب کچھ اللہ ہی کے ارادے و مشیت سے ہوتا ہے۔ انسان پر واجب ہے کہ حق کا طلب گار رہے اور باطل کی نفی کرے۔ اللہ کا کام حق و باطل کو بیان کرنا اور رسول کی ذمے داری تبلیغ کرنا اور ہماری ذمے داری اس کو تسلیم کرنا ہے۔ وباللہ التوفیق، وھو المستعان.

مقدمہ

اثباتِ توحید اور نفیِ شرک کا بیان

توحید کے دلائل:

قرآن پاک میں توحید کے بے شمار دلائل ہیں۔ اہلِ علم وایمان کے نزدیک ایمان درست کرنے کے لیے وہی دلائل کافی اور اطمینان بخش ہیں، کسی دوسرے شخص کے بیان وبرہان کی ضرورت نہیں ہے۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

[دلیلوں کے پیچھے دوڑنے والوں کے پاؤں لکڑی کی مانند ہوتے ہیں، جو بہت ہی ناپایدار ہوتے ہیں]

پہلی دلیل جس سے توحید کا اثبات ہوتا ہے، وہ ﴿بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ﴾ ہے، پھر پوری سورۃ الفاتحہ ﴿وَلَا الضَّآلِّيْنَ﴾ تک میں اللہ تعالیٰ کی خالص توحید پر تیس دلیلیں موجود ہیں۔[1] ہم نے اپنی کتاب "الدین الخالص" میں اثباتِ توحید اور نفیِ شرک کی ستاسی (۸۷) آیتیں ذکر کی ہیں۔[2] یوں تو سارا قرآن ہی اجمالی طور پر بیانِ توحید اور ردِ شرک سے بھرا ہوا ہے، تاہم اس جگہ بہ طور نمونہ بعض آیتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

پہلی آیت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

[1] ان دلائل کی تفصیل مولف رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "إخلاص التوحيد للحميد المجيد" میں ذکر کی ہے، جو امام شوکانی رحمہ اللہ کی کتاب "الدر النضيد في إخلاص التوحيد" کا ترجمہ ہے۔ نیز دیکھیں: الدين الخالص للمؤلف رحمہ اللہ (۱/ ۷)

[2] الدين الخالص (۱/ ۷)

﴿يَآيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ [البقرة: ۲۱]

[اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو اور ان کو پیدا کیا، جو تم سے پہلے تھے، تم پرہیز گار ہو جاؤ گے]

عبادت کا معنی و مفہوم:

مذکورہ آیت میں ساری اولادِ آدم کو مخاطب کر کے عبادت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ عبادت انتہائی عاجزی و فروتنی کرنے کو کہتے ہیں اور عبودیت حد درجہ خاکساری برتنے کو کہتے ہیں۔ شریعت میں عبادت محبت و خضوع اور خوف و رجا کا نام ہے۔ قرآن کریم میں جہاں کہیں عبادت کا ذکر آیا ہے، اس سے مراد یہی توحید ہے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ عبادت یوں ہوتی ہے کہ بندہ اللہ کی توحید ثابت کرے، اس کے رسول کی تصدیق کرے، فرشتوں اور کتابوں پر ایمان لائے، قضا و قدر کی خیر و شر کو اللہ کی طرف سے جانے، نماز ادا کرے، رمضان کے روزے رکھے، زکات ادا کرے، بیت اللہ شریف کا حج بجا لائے اور دوسرے فرائض و واجبات ادا کرنے میں حتی الامکان سستی روا نہ رکھے۔

مذکورہ بالا آیت سے توحیدِ عبادت پر استدلال:

"ترجمان القرآن بلطائف البیان" میں تفسیر ابن کثیر کے حوالے سے نقل کیا گیا ہے کہ یہ آیت توحیدِ باری تعالیٰ پر دلیل ہے۔ یعنی اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کریں، تنہا اسی کو پوجیں۔[1] بہت سے مفسرین نے اس آیت سے صانعِ عالم (سارے جہان کو بنانے والی ہستی) کے وجود پر استدلال کیا ہے، جیسے مفسرِ قرآن امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ وغیرہ ہیں۔[2]

جس طرح آیت مذکورہ وجودِ صانع پر دلیل ہے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہتر طور پر یہ آیت توحیدِ عبادت پر دلالت کر رہی ہے، کیونکہ جو شخص بھی آسمانی و زمینی موجودات اور ان کی مختلف شکلوں، رنگوں، طبیعتوں اور منفعتوں پر غور کرے گا اور دیکھے گا کہ ان اشیا و منافع کو کس طرح ان کی جگہوں میں رکھ کر کس عمدہ طریقے اور اچھوتے طرز پر نرالی کاریگری سے مرتب کیا گیا ہے تو ضرور وہ ان تمام

---

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۸)

[2] التفسير الكبير للرازي (۳/ ۳۱۹)

چیزوں کے خالق وصانع کی قدرت، حکمت، علم، مہارت اور عظمت وسلطنت کو معلوم کرلے گا۔[1]

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ١٤]

[اللہ برکت والا اور بہت عمدہ خالق ہے]

ایک حکایت:

کسی شخص نے عرب کے ایک دیہاتی سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر کیا دلیل ہے؟ اس نے کہا:

”يا سبحان الله! إن البعر ليدل على البعير، وإن أثر الأقدام لتدل على المسير، فسماء ذات أبراج، وأرض ذات فجاج، و بحار ذات أمواج، ألا يدل ذلك على وجود اللطيف الخبير؟“[2]

[اونٹ کی مینگنی اونٹ کے وجود پر دلالت کرتی ہے، قدم کا نشان کسی کے گزرنے کا پتا بتاتا ہے تو یہ برجوں والا آسمان، کشادہ راہوں والی زمین اور موجیں مارنے والے دریا کیا اللہ تعالیٰ کی ہستی پر دلالت نہیں کر رہے ہیں؟]

بعض تفاسیر میں اس حکایت کے الفاظ اس طرح منقول ہیں:

”إن البعرة تدل على البعير، وآثار القدم تدل على المسير، فهيكل علوي بهذه اللطافة ومركز سفلي بهذه الكثافة، أما يدلان على وجود الصانع الخبير؟“[3]

[مینگنی اونٹ کی خبر بتاتی ہے، پاؤں کے نشانات چلنے کا پتا دیتے ہیں تو کیا یہ بلند ترین نفیس آسمان اور یہ موٹی، بھاری پست زمین، جو مخلوق کی جائے قرار ہے، ایک خاص باخبر صانع کے وجود پر دلیل نہیں ہیں؟]

وجودِ باری تعالیٰ پر عقلی دلائل:

① امام رازی رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ خلیفہ ہارون رشید نے جب ان سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (١/٥٨)

[2] تفسیر ابن کثیر (١/٥٨)

[3] تلبیس ابلیس لابن الجوزي (ص: ٤٠) تفسیر الخازن (١/٣٢٩)

وجودِ صانع پر دلیل طلب کی تو انھوں نے اس کے جواب میں لغات، اصوات اور نغمات کے اختلاف سے استدلال کیا۔[1]

یعنی زبانوں، بولیوں، آوازوں اور نغموں کا الگ الگ ہونا، وجودِ صانع پر دلیل ہے۔

مرغان چمن بہر صبا حے خوانند ترا باصطلاحے

[اے اللہ! ہر صبح چمن میں پرندے اپنی اپنی زبانوں اور لہجوں میں تجھے پکارتے اور یاد کرتے ہیں]

② امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ سے کسی (بے دین) نے سوال کیا کہ وجودِ باری تعالیٰ پر کیا دلیل ہے؟ تو انھوں نے کہا:

"دعوني فإني متفكر في أمر قد اختبرت عنه، ذكروا لي أن سفينة في البحر موقرة، فيها أنواع من المتاجر، وليس بها أحد يحرسها، ولا يسوقها، وهي مع ذلك تذهب وتجيئ وتسير بنفسها، وتخترق الأمواج العظام حتى تتخلص منها، وتسير حيث شاءت بنفسها من غير أن يسوقها أحد. فقالوا: هذا شيئ لا يقوله عاقل! فقال: ويحكم هذه الموجودات بما فيها من العالم العلوي والسفلي، وما اشتملت عليه من الأشياء المحكمة، أليس لها صانع؟ فبهت القوم ورجعوا إلى الحق، وأسلموا على يديه"[2]

[ذرا ٹھہر جاؤ، کیونکہ میں ایک امر میں غور و فکر کر رہا ہوں، جس کا مجھ سے امتحان لیا گیا ہے۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا ہے کہ دریا میں سامان بھری ہوئی ایک بوجھل کشتی ہے۔ اس میں طرح طرح کے تجارتی سامان ہیں۔ کوئی اس کشتی کی نگرانی کرتا ہے اور نہ اس کو چلاتا ہے۔ اس کے باوجود کشتی اپنے آپ آتی جاتی اور چلتی پھرتی ہے۔ بڑی بڑی موجوں کو چیر پھاڑ کر نکل جاتی ہے۔ کسی کے چلانے ہانکنے کے بغیر اپنے آپ چلتی پھرتی رہتی ہے۔ لوگوں نے کہا: ایسی بات کوئی عقل والا نہیں کہے گا۔ امام صاحب نے فرمایا: افسوس

---

① تفسیر ابن کثیر (۱/۵۸)

② تفسیر ابن کثیر (۱/۵۸)

ہے تمھاری عقل پر کہ یہ موجودات جن میں عالم علوی و سفلی (آسمان و زمین) اور دوسری مضبوط اشیا ہیں، کیا ان کا کوئی صانع نہیں ہے؟ یہ سن کر قوم لا جواب ہو گئی، انھوں نے حق کی طرف رجوع کیا اور امام صاحب کے ہاتھ پر مسلمان ہو گئی]

③ اسی طرح امام شافعی رحمہ اللہ سے کسی نے وجودِ صانع پر دلیل کا سوال کیا تو انھوں نے کہا:

"هذا ورق التوت، طعمه واحد، تأكله الدود فيخرج منه الإبريسم، وتأكله النحل فيخرج منه العسل، وتأكله الشاة والبقر والأنعام فتلقيه بعرا وروثا، وتأكله الظباء فيخرج منها المسك، وهو شيئ واحد"[1]

[اس درخت توت کے پتے کو ذرا دیکھو، اس کا ایک ہی مزا ہے۔ اس کو کیڑا کھاتا ہے تو اس سے ریشم نکلتا ہے۔ شہد کی مکھی کھاتی ہے تو شہد بنتا ہے۔ بکری، گائے اور چوپائے کھاتے ہیں تو مینگنی اور گوبر بن کر نکلتا ہے۔ اس کو ہرن کھاتے ہیں تو مشک بنتا ہے، حالانکہ یہ ایک ہی چیز ہے۔ یہ کس کی کاریگری ہے؟]

④ یہی سوال امام احمد رحمہ اللہ سے کیا گیا تو انھوں نے کہا:

"ههنا حصن حصين أملس، ليس له باب ولا منفذ، ظاهره كالفضة البيضاء، وباطنه كالذهب الإبريز، فبينا هو كذلك إذ انصدع جداره فخرج منه حيوان سميع بصير ذو شكل حسن، وصوت مليح، يعني بذلك البيضة إذا خرج منها الدجاجة"[2]

[یہاں ایک مضبوط چکنا قلعہ ہے، اس کا کوئی دروازہ ہے نہ راستہ، ظاہر میں سفید چاندی جیسا اور اندر سے خالص سونے کی مانند ہے۔ اچانک اس قلعے کی دیوار پھٹ گئی تو اس میں سے ایک سنتا دیکھتا اچھی شکل اور خوش کن آواز والا جاندار نکلا۔ اس سے ان کی مراد انڈا تھی جس سے مرغی پیدا ہوتی ہے]

توحیدِ الٰہی پر عجیب استدلال:

ایک سوال کے یہ چار جواب ہیں جو اہلِ سنت کے چار ائمہ مجتہدین نے دیے ہیں۔ ان سے

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹)

[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹)

صانع کا وجود دوپہر کے سورج اور چودھویں رات کے چاند کی طرح بہ خوبی ثابت ہوتا ہے۔

کسی نے یہی سوال ابونواس شاعر سے کیا تو اس نے جواب میں یہ اشعار پڑھے:

تأمل في نبات الأرض وانظر
إلى آثار ما صنع المليك
عيون من لجين شاخصات
بأحداق هي الذهب السبيك
على قضب الزبرجد شاهدات
بأن الله ليس له شريك[1]

[زمین کے پودوں میں غور کرو اور بڑے بادشاہ کی کاریگری کے نشانات دیکھو کہ ہری ہری ٹہنیوں پر چاندی جیسی آنکھیں سنہرے حلقوں میں ٹکٹکی لگائے ہوئے اس بات کی گواہی دے رہی ہیں کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے]

کہتے ہیں کہ ایک شخص نے ابونواس کے مرنے کے بعد خواب میں دیکھا اور پوچھا: اللہ نے تمھارے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس نے کہا: ان اشعار کے سبب مجھ کو بخش دیا گیا۔

"التوحيد رأس الطاعات" (توحید تمام نیکیوں کی بنیاد ہے) کے یہی معنی ہیں۔ اللہ پاک کو بندوں کی کوئی چیز اپنی توحیدِ الوہیت و ربوبیت سے زیادہ محبوب و مطلوب نہیں ہے۔

ابن المعتز شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

فواعجبا كيف يعصى الإله
أم كيف يجحده الجاحد

[ہائے تعجب کیسے لوگ اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں اور کیسے منکرین اس کا انکار کرتے ہیں]

ولله في كل تحريكة
وتسكينة أبدا شاهد

[جبکہ ہر حرکت و سکون میں اللہ کی ہستی پر کوئی نہ کوئی دلیل موجود ہے]

[1] تفسير ابن كثير (١/ ٥٩)

و في كل شيىء له آية
تدل على أنه واحد [1]

[ہر چیز میں اللہ کے وجود پر نشانی ہے جو اس کے ایک ہونے کا پتا دیتی ہے]

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جو شخص آسمانوں اور ان کی بلندی اور بڑے چھوٹے چلتے پھرتے یا ٹھہرے ہوئے ستاروں میں غور کرے گا کہ کس طرح وہ فلک عظیم کے ہمراہ ہر رات دن میں اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ چکر لگاتے ہیں، پھر دریاؤں کو دیکھے گا، جو ہر طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہیں، پہاڑوں پر نظر کرے گا کہ کس طرح زمین پر ان کو رکھ کر زمین اور زمین والوں کو قرار وسکون کے لیے سامان مہیا کیا گیا ہے، مزید یہ کہ پہاڑوں کی شکلیں اور رنگتیں جدا جدا بھی ہیں، جیسا کہ اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿وَ مِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيضٌ وَّ حُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَ غَرَابِيبُ سُوْدٌ ۝ وَ مِنَ النَّاسِ وَ الدَّوَآبِّ وَ الْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ [فاطر: ۲۷، ۲۸]

[اور پہاڑوں میں طبقے ہیں، ان میں کچھ تو سفید اور سرخ کئی رنگ کے ہیں، اور کچھ کالے بھجنگ، اور اسی طرح آدمیوں، جانوروں اور چوپایوں میں بھی طرح طرح کے رنگ ہیں، اللہ تعالیٰ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں]

اسی طرح پانی کی نہریں ہیں جو ایک جہت سے دوسری جہت کی طرف بہتی ہیں، ان میں کس قدر فوائد و منافع ہیں۔ یہ قسم قسم کے حیوانات اور طرح طرح کی نباتات جن کے مزے، بو، شکلیں اور رنگ الگ الگ ہیں، حالانکہ پانی اور مٹی کی طبیعت ایک ہی ہے۔ ان تمام چیزوں میں جب بھی کوئی غور کرے گا تو وہ یقیناً صانع کے وجود اور اس کی عظیم قدرت وحکمت اور مخلوق کے ساتھ اس کی رحمت واحسان پر ضرور استدلال کرے گا۔[2]

یعنی یہ سارے عجائب وحقائق اور ان کے منافع اس بات پر روشن دلیل اور نمایاں حجت ہیں کہ ان کا کوئی صانع و موجد ہے، جو زبردست علم وحکمت والا ہے۔ اللہ کے علاوہ کوئی سچا معبود ہے نہ

[1] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹)

[2] تفسیر ابن کثیر (۱/ ۵۹)

اس کے سوا کوئی رب ہے۔ اسی پر میرا بھروسا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔

اس کے بعد امام ابن کثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"والآيات في القرآن الدالة على هذا المقام كثيرة جدا" انتهى.[1]

یعنی قرآن شریف میں ایسی آیتیں جو اللہ کی توحید پر دلالت کرتی ہیں بہت سی ہیں۔ بلا شبہہ قرآن کے بیان سے بڑھ کر کسی کا بیان حجت و برہان نہیں ہے۔

انعامات الٰہیہ کا تقاضا... شرک سے اجتناب:

اس باب کے شروع میں ذکر کردہ آیت ﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا...الخ﴾ [البقرة: ٢١] کے بعد اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے:

﴿ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً وَّ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ أَنْدَادًا وَّ أَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ [البقرة: ٢٢]

[تمھارا رب وہ ہے جس نے زمین کو تمھارے لیے فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی نازل کر کے میوے نکالے کہ تم ان کو کھاؤ اور کسی کو اس کا ہمسر نہ ٹھہراؤ، حالانکہ تم جانتے ہو]

پہلی آیت میں صانعِ عالَم اور اس کی توحید کے اثبات کا بیان تھا۔ اس آیت میں انعاماتِ الٰہیہ کا ذکر اور شرک باللہ سے ممانعت کا بیان ہے۔ یعنی تم پر لازم ہے کہ تم سب لوگ موحد بنو، مشرک نہ ہو جاؤ۔ توحید اور شرک ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ہر شے اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے، اس لیے اللہ نے پہلے توحید کا حکم دیا، پھر شرک سے منع فرمایا۔

اس آیت کی تفسیر "فتح البيان في مقاصد القرآن" میں اس طرح مذکور ہے:

"انسان جب اس کائنات میں غور و فکر سے دیکھے گا تو اس جہان کی مثال ایک گھر جیسی پائے گا۔ وہ تاروں کو چراغوں کی طرح سمجھے گا۔ انسان اس جہان میں مالک مکان و صاحبِ خانہ کی مانند ہے۔ اس گھر میں طرح طرح کے پودے مہیا ہیں، جو انسان ہی کے نفع اور فائدے

---

[1] تفسیر ابن کثیر (ص: ٥٩)

کے لیے ہیں۔ قسم قسم کے حیوانات ہیں جو سب اس کی ضروریات میں کام آتے ہیں۔ پس جب انسان کے لیے یہ ساری چیزیں فرماں بردار کردی گئی ہیں تو اس پر واجب ہے کہ تہ دل سے اللہ پاک کا شکر بجالائے اور اس کی توحید کو شرک کی تمام قسموں سے پاکیزہ رکھے۔"[1]

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک درکارند
تا تو نانے بکف آری و بغفلت نہ خوری

[بادل، ہوا، آفتاب، ماہتاب اور آسمان سب کام میں لگے ہیں، تاکہ تم غذا حاصل کرو اور غفلت کے ساتھ نہ کھاؤ]

ہمہ از بہر تو سرگشتۂ و فرماں بردار
شرطِ انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

[ساری چیزیں تمھارے لیے سرگرداں اور تابع فرمان ہیں۔ انصاف کے خلاف ہے کہ تم اللہ کے فرماں بردار نہ بنو]

پھر صاحبِ فتح البیان نے کہا ہے:

"لفظ "ند" کے معنی مثل ونظیر (اللہ کی مانند) کے ہیں۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "ما شاء الله وشئت" [جو اللہ چاہے اور آپ چاہیں] تو آپ نے فرمایا:

«جَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا! قُلْ: مَا شَاءَ اللّٰهُ وَحْدَهُ»[2]

[کیا تم نے مجھ کو اللہ کا ہمسر اور ہم مثل بنا دیا ہے؟ اس کے بجائے یوں کہو: "اکیلا اللہ جو چاہے]

صحیح بخاری ومسلم میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم اللہ کے لیے کوئی ہم مثل ٹھہراؤ، حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے۔[3]

---

[1] فتح البيان في مقاصد القرآن (١/ ١٠٤)

[2] مسند أحمد (١/ ٢١٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

شرک عقل دشمنی ہے:

''﴿وَأَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی عقل سے اتنا جانتے ہو کہ ساری چیزوں کا خالق اللہ ہے، جس کا کوئی ضد و ہمسر نہیں ہے، پھر ان اشیا و امثال کو اللہ کا ہم سر وہم مثل ٹھہرانا کس لیے ہے؟ یہ آیت اس بات پر بھی دلیل ہے کہ حجتوں و دلیلوں کا استعمال کرنا واجب ہے اور تقلید کا چھوڑ دینا لازم وضروری ہے۔'' انتہیٰ۔[1]

تفسیر ابنِ کثیر میں آیت مذکورہ کی تفسیر یوں مرقوم ہے کہ اس آیت میں اللہ پاک نے اپنی وحدانیت و الوہیت کو اس طور پر بیان کیا ہے کہ بندوں پر اس کا احسان ہے کہ ان کو عدم سے وجود بخشا، ظاہری و باطنی نعمتیں ان پر پوری فرمائیں، ان کے لیے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا، جس طرح دوسری آیت میں کہا ہے:

﴿وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا وَّ هُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ﴾

[الأنبياء: ٣٢]

[اور ہم نے آسمان کو مضبوط چھت بنایا اور یہ لوگ آسمان کی نشانیوں سے منہ پھیرتے ہیں]

''آیت میں ''سماء'' سے مراد بادل ہے کہ جب پانی کی حاجت ہوتی ہے تو ابر سے بارش ہوتی ہے۔ اس سے طرح طرح کے غلے اور میوے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سب اللہ کا رزق ہے، جو اس نے انسان وحیوان کو عطا کیا ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

[المؤمن: ٦٤]

[اللہ تعالیٰ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو رہنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا، اسی نے تمھاری شکلیں بنائیں اور کیسی اچھی شکلیں بنائیں اور عمدہ چیزیں تمھیں کھانے کو دیں، یہی اللہ تمھارا مالک ہے، یہ اللہ بڑی برکتوں والا سارے جہان کا پالنے والا ہے]

''اس آیت کا مضمون یہ ہے کہ دنیا اور دنیا والوں کا خالق، رازق اور مالک اکیلا اللہ ہے۔ اس لیے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ شرکت کے بغیر تنہا اسی کی عبادت کی جائے، اسی

[1] فتح البيان في مقاصد القرآن (١/ ١٠٥- ١٠٦)

لیے اللہ نے اپنا ہم مثل ٹھہرانے سے منع کیا ہے۔ سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جانتے ہو اللہ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ میں نے عرض کی: اللہ اور اس کا رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کا بندوں پر حق یہ ہے کہ وہ اللہ ہی کی عبادت کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کریں۔''[1]

''نیز یہ حدیث «أَجَعَلْتَنِي لِلّٰهِ نِدًّا ...» اوپر گزر چکی ہے۔ یہ سب کچھ توحید کی حفاظت وصیانت کی خاطر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ بات جان لی کہ اللہ کے سوا کوئی خالق، رازق اور رب نہیں ہے اور رسول اللہ ﷺ بھی اسی توحید کی طرف بلاتے ہیں تو پھر بلا شک وشبہہ یہی توحید حق وصواب ہے۔

''عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿أندادا﴾ کی تفسیر میں کہا ہے:

''اس سے مراد شرک ہے جو چکنے کالے پتھر پر اندھیری رات میں چلنے والی چیونٹی سے بھی کہیں زیادہ مخفی ہے، جیسے کسی سے یہ کہنا کہ اے فلاں اللہ اور تمھاری زندگی کی قسم ہے، یا یہ کہنا کہ اگر اس شخص کا کتا نہ ہوتا تو آج کی رات چور گھس آتے، یا گھر میں بطخ نہ ہوتی تو چور چوری کر لے جاتے، یا کہنا کہ اگر اللہ اور فلاں نہ ہوتا تو یوں ہوتا۔''

مطلب یہ کہ اللہ کے ساتھ فلاں کو ملا کر نہیں کہنا چاہیے، کیونکہ یہ سب شرک ہے۔

امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں:

"هذه الآية دالة على توحيده تعالىٰ بالعبادة وحده لا شريك له" انتهى.[2]

[یہ آیت اللہ تعالیٰ کی توحیدِ عبادت بلا شرکتِ غیرے پر دلیل ہے]

دوسری آیت:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴾ [البقرة: ١٦٣]

[اور تمھارا معبود ایک ہے، اس کے علاوہ کوئی سچا معبود نہیں ہے، وہ بہت رحمت والا مہربان ہے]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٢٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (٣٠)

[2] تفسير ابن كثير (١/٨٨)

اس آیت میں اللہ کا کوئی شریک، مشابہ اور مقابل ہونے کی نفی اس طرح پر ہے کہ اللہ اپنے افعال میں اکیلا ہے، اس کی مصنوعات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اپنی ذات پاک میں ایک ہے، کوئی اس کا حصے دار نہیں ہے۔ اپنی صفات میں بھی وہ اکیلا ہے، مخلوق کی کوئی چیز اس کے مشابہ نہیں ہے۔ اس کی تائید میں دوسری آیت یہ ہے:

﴿ مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ﴾ [آل عمران: ٦٢] [اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے]

اس میں مجوس اور نصاریٰ کی تردید ہے جو متعدد خدا مانتے ہیں، چنانچہ مجوس کہتے ہیں کہ خدا دو ہیں، ایک ''یزدان'' جو خالق نور و خیر ہے، دوسرا ''اہرمن'' جو خالقِ ظلمت و شر ہے۔

① ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ﴾ [النحل: ٥١] [تم دو الٰہ نہ بناؤ]

② عیسائی کہتے ہیں کہ خدا تین ہیں: (۱) باپ، (۲) بیٹا، (۳) روح پاک۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ﴾ [المائدة: ٧٣]

[پس جو لوگ تین خدا بتاتے ہیں وہ کافر ہیں]

③ ہندو لوگ کہتے ہیں کہ چھتیس کروڑ معبود ہیں۔ معتزلہ قدریہ جو بندے کو اپنے افعال کا خالق بتاتے ہیں، ان کے مذہب پر اَن گنت خدا لازم آتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ﴾ [الأنبياء: ٢٢]

[اگر آسمان و زمین میں بہت سے معبود ہوتے تو دونوں کا نظام بگڑ جاتا] اللهم اغفر.

تیسری آیت:

تیسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ﴾ [آل عمران: ١٨]

[اللہ اور فرشتوں اور علم والوں نے گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، حال یہ ہے کہ اللہ انصاف پر قائم ہے]

گویا مخلوقات کی بڑی بڑی ہستیوں اور کائنات کے بلند مرتبہ لوگوں کے اجماع و اتفاق سے اللہ کا ایک اکیلا معبود ہونا ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے ساتھ اہلِ علم کو گواہی میں شامل کرنا علم کی فضیلت پر بہت بڑی دلیل ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم وہی ہے جس کی بات اللہ کی بات کے موافق ہو، وہ عالم نہیں جو اللہ اور کتاب اللہ کے خلاف بات کہے۔

چوتھی آیت:

چوتھی آیت میں کہا ہے:

﴿ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحاً إِلَى قَوْمِهِ فَقَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلَهٍ غَيْرُهُ﴾ [المؤمنون: ٢٣]

[ہم نے نوح کو اس کی قوم کے پاس بھیجا، نوح نے کہا کہ اے قوم! اللہ کی پرستش کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے]

آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے زمین والوں کی طرف نوح علیہ السلام ہی رسول بن کر آئے تھے، ان سے پہلے جو دس صدیاں گزر چکی تھیں، وہ سب شریعت حقہ پر قائم تھیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں شرک عام ہو گیا تھا، خاص کر ان کی قوم تو خالص مشرک ہو گئی تھی۔ اللہ نے اس کی ہدایت کے لیے نوح علیہ السلام کو بھیجا۔ جب قوم نے ان کا کہنا نہ مانا تو طوفان آیا جس میں سب ڈوب گئے۔ چند موحد لوگ بچ رہے جو ایمان لائے اور نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار ہو گئے تھے۔ شرک کا یہ انجام تو دنیا میں ہوا، رہی آخرت کی بات تو وہاں ہمیشہ کے لیے جہنم نصیب ہو گی۔

نوح علیہ السلام کے بعد وقتاً فوقتاً پے در پے پیغمبر آتے رہے، وہ سب یہی پیغام لاتے رہے کہ توحید اختیار کرو، شرک سے بچو۔ مگر جب ان کی قوموں نے انکار کیا تو اس کے نتیجے میں عذابِ الٰہی آتا رہا۔ گذشتہ امتوں پر گیارہ طرح کا عذاب آیا تھا، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [الأنبياء: ٢٥]

[تم سے پہلے جو کوئی رسول ہم نے بھیجا، اس کو ہم نے یہی وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، پس تم میری ہی پرستش کرو]

گویا توحید تمام رسولوں کی اجتماعی دعوت ہے، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ تمام رسولوں کے بعد ہمارے رسول ﷺ تشریف لائے۔ آپ ﷺ بھی یہی تاکید کرتے رہے کہ اللہ کو ایک سمجھ کر اسی کی عبادت تنہا بلا شرکتِ غیر کرو۔ فرمایا:

﴿قُلْ إِنَّمَآ أُمِرْتُ أَنْ أَعْبُدَ اللّٰهَ وَ لَآ أُشْرِكَ بِهٖ إِلَيْهِ أَدْعُوْا وَ إِلَيْهِ مَاٰبِ﴾ [الرعد: ٣٦]

[مجھ کو یہ حکم ہے کہ میں اللہ کی عبادت کروں، کسی کو اس کا شریک نہ بناؤں، اسی کی طرف لوگوں کو بلاؤں اور اسی کی طرف لوٹ جانا ہے]

دوسری آیت میں یہ تصریح ہے کہ یہ تمھارا دین ایک ہی دین ہے۔ توحید میں اگلی امتوں کا کبھی کوئی اختلاف نہیں تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ هٰذِهٖٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ أَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ [الأنبياء: ٩٢]

[تمھارا یہ مذہب وہی ایک مذہب ہے اور میں تمھارا پروردگار ہوں، پس مجھ ہی کو پوجو]

یعنی غیر کو نہ مانو، چاہے وہ کوئی ہو اور کہیں کا ہو۔ فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَ أَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الْبَاطِلُ﴾ [لقمان: ٣٠]

[یہ توحید خالص اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا جس کو پکارتے ہیں وہ سب باطل ہے]

ألا كل شيئ ما خلا الله باطل

[اللہ کے علاوہ ہر چیز فانی ہے]

اللہ کا نام سچا، جھوٹا ہے سب جتن

آیت کا عموم اس بات پر صریح دلیل ہے کہ اللہ کے سوا ہر معبود کوئی ہو، کہیں ہو، وہ حیوان یا جماد یا نبات ہو، بلکہ ساری کائنات زائل ہونے والی اور فانی ہے۔ فرمایا:

﴿لَآ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهٗ﴾ [القصص: ٨٨]

[اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کی ذات کے سوا ہر چیز فنا ہونے والی ہے]

سوچنا چاہیے کہ فانی چیز کب اس لائق ہوتی ہے کہ کوئی اس کی عبادت کرے؟

ساغر فانی و بزم و ساقی فانی
باہر کہ شدی دَرد ملاقی فانی

[اے درد[1] سنو! ساقی، ساغر، بزم اور جن چیزوں سے تمھارا تعلق ہے سب فانی ہیں]

بردار دل از ہستی بے بود جہاں
اللہ بود باقی و باقی فانی

[اس ناپایدار دنیا کی چیزوں سے دل نہ لگاؤ، کیونکہ اللہ کے سوا سب کچھ فانی ہے اور اللہ ہمیشہ باقی رہے گا]

جب یہی حقیقت ہے تو اسی بنیاد پر اللہ نے فرمایا ہے:

﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝ أَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ [الزمر: ۲۔۳]

[اللہ کی بندگی کرو، خالص عبادت اسی کی کرکے، خبردار! خالص عبادت اللہ ہی کے لیے ہے]

دین کے خالص ہونے سے مراد یہ ہے کہ شرک سے بالکل پاک صاف ہو، دین میں کسی طرح سے شرک کا شائبہ آنے نہ پائے۔ سیدنا اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مشرکوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ آپ اپنے رب کا نسب بیان کریں، اس پر سورۃ الاخلاص نازل ہوئی۔[2]

اس سورت میں یہ بیان ہوا ہے کہ اللہ ایک ہے، صمد ہے یعنی سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محتاج نہیں ہے، اس نے نہ کسی کو جنا ہے نہ وہ کسی سے جنا گیا ہے، یعنی اللہ نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے اور نہ کوئی اس کا ہم مثل ہے۔

[1] ''درد'' خواجہ میر دہلوی کا تخلص ہے۔

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (۳۳٦٤)

پہلا باب

توحید اور شرک کی اقسام کا بیان

توحید کی اقسام:

توحید کی تین قسمیں ہیں: ایک اللہ پاک کی ربوبیت اور اس کے اسما و صفات کو پہچاننا۔ دوسری اللہ کی الوہیت وعبادت کو پہچاننا۔ تیسری قسم اس کے افعال کو پہچاننا۔ دینِ اسلام کا نام توحید اسی لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی بنیاد تین امتیازی چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ اللہ اپنے ملک وافعال میں اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ اپنی ذات میں بے مثل ہے، اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔ تیسری یہ کہ اللہ الوہیت میں یکتا ہے۔

تمام انبیا کی توحید انھیں تین قسموں کو شامل ہے۔ ان میں سے ہر قسم دوسری قسم کو لازم ہے، جو اس سے جدا نہیں ہوسکتی ہے۔ جس نے ایک قسم کو مانا اور دوسری کو نہ مانا تو اس نے توحید کا پورا حق ادا نہیں کیا۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے:

> ''پہلی قسم کا بیان سورۃ الحدید، سورت طٰہٰ، سورۃ الحشر کے آخر میں، سورۃ السجدۃ اور آل عمران کے آغاز میں اور سورۃ الاخلاص وغیرہ میں آیا ہے۔ دوسری قسم کا بیان سورۃ الکافرون، سورت الم تنزیل الکتاب کے آغاز میں، سورۃ المؤمن کے شروع اور درمیان میں، سورۃ الاعراف کے آغاز میں اور ساری سورۃ الانعام میں وارد ہوا ہے۔ قرآن پاک کی اکثر بلکہ سب سورتیں انھیں اقسامِ توحید کو شامل ہیں، اس حساب سے گویا سارا قرآن توحید کے بیان میں ہے۔ اس طرح اللہ نے توحید اور شرک کے حقوق اور ان کی جزاؤں وسزاؤں کو بھی ذکر کر دیا ہے۔''[1]

[1] مدارج السالکین (۳/۴۴۹)

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''جس توحید کو سارے انبیا لائے ہیں، وہ یہی توحیدِ الوہیت ہے۔ یعنی بندہ صرف اکیلے اللہ کو معبود مانے، اسی پر بھروسا کرے، دوستی اور دشمنی صرف اسی کے لیے ہو، جو کام کرے، اسی کے لیے کرے اور جو کام نہ کرے، اسی کے لیے نہ کرے۔ اس توحید میں اللہ کے نیک ناموں اور صفتوں کو ثابت ماننا لازم ہے۔ قرآنِ مجید میں اس توحید کی بہت سی دلیلیں ہیں۔ توحید سے مراد صرف توحیدِ ربوبیت ہی نہیں ہے کہ اکیلے اللہ کو خالقِ کائنات جانیں، جس طرح اہلِ کلام وتصوف سمجھتے ہیں، کیونکہ صرف اللہ کو ہر شے کا خالق سمجھنے سے کوئی موحد نہیں ہوتا ہے، جب تک کہ ''لا إله إلا الله'' کی شہادت نہ دیتا ہو، یعنی یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ کے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے۔ عرب کے مشرکین بھی اللہ کو ہر شے کا خالق کہتے تھے، اس کے باوجود بھی وہ مشرک تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَ مَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [يوسف: ١٠٦]

[یعنی اکثر ایمان لانے والے مشرک ہوتے ہیں]

''سلف کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جب ان لوگوں سے پوچھو کہ آسمان وزمین کو کس نے بنایا ہے؟ تو وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے بنایا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہر وہ شخص جو اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ ہر شے کا رب وخالق اللہ ہے تو اس سے وہ اللہ کی عبادت کرنے والا، اس کو پکارنے والا، اس سے امید وخوف رکھنے والا نہیں ہوتا ہے۔ اس بات کا اقرار تو عام مشرکین بھی کیا کرتے تھے، مگر وہ اپنے سفارشیوں کو اللہ کا ہم سر قرار دیتے تھے۔ قرآنِ کریم میں اس کا ذکر بہت جگہ آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بعض چاند، سورج اور تاروں کو سجدہ کیا کرتے تھے، ان کے نام کا روزہ رکھتے، ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور ان کی قربت چاہتے، پھر یہ بات کہتے کہ یہ کام شرک نہیں ہے، شرک تو جب ہوتا کہ ہم ان چیزوں کو مدبر عالم (سارے جہان کا انتظام سنبھالنے والا) سمجھتے، ہم تو ان کو صرف ایک واسطہ، ذریعہ اور قاصد جانتے ہیں، اس لیے ہم مشرک نہیں ہوئے، حالانکہ دینِ اسلام سے قطعی طور پر معلوم ہے کہ یہ کام شرک ہے۔''[1]

[1] درء تعارض العقل والنقل لابن تيمية (١/ ١٢٩)

حاصل یہ کہ انسان اس وقت تک موحد نہیں ہوسکتا، جب تک وہ توحیدِ ربوبیت کے اقرار کے ساتھ توحیدِ الوہیت کا اقرار نہ کرے۔ بہت سے لوگ جن کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی ہے، وہ توحیدِ ربوبیت کا اقرار اور توحیدِ الوہیت کا انکار کرتے ہیں، جو محض ان کی جہالت ہے۔ حقیقت میں وہ مشرک ہیں۔ بلاشک وشبہہ اللہ کے جتنے رسول آئے ہیں، وہ یہی توحیدِ عبادت اور اخلاصِ عمل لائے ہیں۔ سب باتوں سے پہلے ہر رسول نے اپنی قوم کو یہی بات سنائی تھی:

﴿يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ﴾

[الأعراف: ٥٩، ٦٥، ٧٣، ٨٥۔ هود: ٥٠، ٦١، ٨٣]

[اے میری قوم اللہ کو پوجو، اس کے سوا تمھارا کوئی معبود نہیں ہے]

نیز یہ دعوت پیش کی:

﴿ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [يوسف: ٤٠، بني إسرائيل: ٢٢]

[اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو]

اور اس طرف بلایا:

﴿ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ﴾ [نوح: ٣]

[اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرتے رہو اور میری بات مانو]

"لا إله إلا الله" کے یہی معنی ہیں، جو یہاں بیان کیے گئے ہیں۔ اس کلمے کو محض زبان سے کہنا، اس کے معنی پر عمل نہ کرنا اور نہ سچا اعتقاد رکھنا، کسی کام کا نہیں ہے۔

بعثتِ انبیا برائے توحیدِ ربِ کبریا:

غرض کہ یہی بات ٹھہرتی ہے کہ اصل توحید دو طرح پر ہے۔ ایک توحیدِ ربوبیت، خالقیت ورزاقیت وغیرہ، جس کا مطلب یہ ہے کہ اکیلا اللہ ہی سارے جہاں کا پیدا کرنے والا، روزی دینے والا اور پروردگار ہے۔ اس کا انکار کوئی مشرک بھی نہیں کرتا ہے اور نہ اس معاملے میں کسی کو اللہ تعالیٰ کا شریک بتاتا ہے۔ دوسری توحیدِ عبادت ہے، یعنی عبادت کی جتنی بھی قسمیں ہیں، وہ سب اکیلے اللہ کے لیے کی جائیں، کسی کو کسی طرح کی عبادت میں بھی اللہ کا شریک نہ کیا جائے، مگر افسوس! اکثر لوگ

اس توحید میں شرک کیا کرتے ہیں اور اللہ کے بہت سے ساجھی ٹھہراتے ہیں، اسی لیے جتنے رسول آئے، وہ اسی کام کے لیے بھیجے گئے کہ توحیدِ ربوبیت کو ثابت ومقرر رکھنے کے ساتھ ساتھ توحیدِ عبادت کی طرف مشرکوں کو دعوت دیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

1 ﴿ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ ﴾ [إبراهيم: ١٠] [کیا اللہ کے بارے میں کوئی شک ہے؟]

2 ﴿هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ﴾ [الفاطر: ٣] [کیا اللہ کے سوا کوئی اور پیدا کرنے والا ہے؟]

غرض کہ پیغمبروں کا آنا اسی توحیدِ عبادت کے اثبات کے لیے تھا، نہ کہ یہ بتانے کے لیے کہ کائنات کا خالق اللہ ہے، کیونکہ یہ مسئلہ ساری امتوں میں اوّل سے آخر تک اجماعی رہا ہے، اس میں کسی امت نے اختلاف نہیں کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی دیوانہ اور پاگل ہو کر اس میں اختلاف کرے۔ معلوم ہوا کہ مشرکوں نے جتنے معبود ٹھہرائے ہیں، جیسے بت اور مسیح علیہ السلام کی صلیب وتصاویر یا جن وشیاطین وغیرہ، ان کو وہ اللہ کا شریک اس لیے نہیں بناتے ہیں کہ یہ کسی شے کے خالق، رازق اور پالنہار ہیں، بلکہ وہ اس لیے ان کو معبود مانتے ہیں کہ وہ ان کی رسائی اللہ تک کرا دیں گے، اللہ کا مقرب بنا دیں گے، اللہ کے یہاں سفارشی ہوں گے۔

ان کفریہ باتوں کے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کا اقرار کرتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ دوسرے معبودوں کو صرف اپنا سفارشی اور اللہ کا نزدیکی جانتے ہیں، یہی ان کا شرک ہے۔ ان کے جواب میں اللہ نے بتا دیا ہے کہ اللہ کے پاس کوئی کسی کی سفارش اس کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا ہے۔ وہ تو خود ہی در ماندہ وعاجز ہیں، ان کی سفارش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسی وجہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام عبادتوں اور نیک کاموں کی بنیاد اور جڑ وہ توحید ہے جو کلمۂ توحید ''لا إله إلا الله'' سے سمجھی جاتی ہے۔ اس کلمے میں لفظ رب یا خالق یا رازق کا استعمال نہیں ہوا ہے، بلکہ اسم جلالہ کا ذکر کیا گیا ہے، جو معبود کے معنی میں ہے۔ یہ کلمہ کہنے سے مراد تہِ دل سے اس کے معنی کا اعتقاد رکھنا ہے، صرف زبان سے اتنا بول دینا کافی نہیں ہے۔

توحید کی حقیقت:

امام مقریزی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

''ہر چیز کا رب و مالک اور معبود اللہ ہے۔ رب اسے کہتے ہیں جو بندوں کو عدم سے وجود

عطا کرنے والا اور دونوں جہان کی اصلاح و درستی، روزی و تربیت اور عافیت کا کفیل و ذمے دار ہو۔ اللہ وہ ہے جو معبود برحق ہو۔ محبت، خوف، امید، تواضع، توبہ، نذر، طاعت، طلب و توکل اور ایسی ہی دیگر عبادات واعمال کا تعلق اسی اللہ کے ساتھ ہو، کیونکہ توحید کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ تمام امور کو اللہ کی طرف سے جانے اور اسباب و وسائل کی طرف توجہ نہ دے، جیسے فرمایا:

﴿قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِندِ اللَّهِ﴾ [النساء: ۷۸]

[اے نبی آپ بتا دیجیے کہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے]

بندے کو چاہیے کہ خیر و شر اور نفع و ضرر کو اسی اللہ کی طرف سے جانے۔

از خدا داں خلاف دشمن و دوست
کہ دل ہر دو در تصرف اوست

[دوست اور دشمن کا رد و بدل اللہ کی طرف سے جانو، کیونکہ دونوں کا دل اسی کے اختیار میں ہے]

''اس عقیدے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کو اللہ پر پورا بھروسا رہتا ہے، پھر وہ مخلوق کی شکایت نہیں کرتا اور نہ اس کو ملامت کرتا ہے، بلکہ اللہ کے فیصلے پر خوش ہوتا ہے اور اس کے حکم کو تسلیم کرتا ہے، اسی لیے توحید کو تمام اعمال سے زیادہ عمدہ اور لائق قدر قرار دیا گیا ہے۔

توحید کے دو غلاف:

''توحید کے دو غلاف ہیں۔ ایک زبان سے ''لا إله إلا الله'' کہنا۔ یہ زبانی توحید اور تثنیہ وتثلیث (دو یا تین خدا کہنے) کی ضد ہے جس کے قائل مجوس اور نصاریٰ ہیں۔ منافق، جس کا باطن ظاہر کے خلاف ہوتا ہے، اس سے بھی صرف زبانی توحید واقع ہوتی ہے۔ دوسرا غلاف یہ ہے کہ ''لا إله إلا الله'' کہنے کا جو مثبت و موافق معنی ہے، دل میں اس کے انکار و مخالفت کی کوئی کیفیت نہ ہو، بلکہ اس کے ساتھ دل سے اعتقاد و تصدیق بھی ضروری ہے۔ یہ توحید عام لوگوں کی ہوتی ہے۔

توحید کا مغز:

''توحید کا اصل نچوڑ یہ ہے کہ تمام امور کو اللہ کی طرف سے جانیں، دیگر واسطوں اور

وسیلوں سے بالکل تعلق نہ رکھیں، صرف اللہ کو پوجیں اور کسی غیر کو نہ پوجیں۔ اس توحید سے خواہشِ نفس کی پیروی بھی دور ہو جاتی ہے، کیونکہ خواہشِ نفس کی پیروی کرنے والے کی خواہشِ نفس ہی اس کا معبود ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ﴾ [الجاثية: ٢٣]

[اے پیغمبر! کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا لیا ہے؟]

''یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ بت پرست بت کو نہیں پوجتا ہے، بلکہ اپنی خواہشِ نفس کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے نفس کا جھکاؤ باپ دادا کے دین کی طرف ہونے سے وہ اسی خواہشِ نفس کا تابع ہو جاتا ہے۔

''ہوائے نفس کا ایک معنی یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس مرغوب چیزوں کی طرف مائل ہو۔ توحید کی وجہ سے یہ کیفیت دور ہو جاتی ہے، بلکہ مخلوق پر ناراض ہونے یا اس سے اچھی امید رکھنے کی نوبت ہی نہیں آتی ہے، کیونکہ جو شخص ہر بات کو اللہ کی طرف سے جانتا ہے تو پھر وہ غیر پر کیوں خفا ہونے لگا یا غیر سے کسی چیز کی امید کیوں رکھے گا؟ یہ توحید تو صدیقین کا مقام ہے۔ مشرکین بھی توحیدِ ربوبیت کے منکر نہ تھے، بلکہ اس کا اقرار کرتے تھے۔ انکار تو صرف وہ توحیدِ الوہیت و محبت کا کرتے تھے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ﴾ [البقرة: ١٦٥]

[کچھ لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کو اللہ کا شریک بناتے ہیں اور اللہ سے محبت کی طرح ان سے محبت رکھتے ہیں، لیکن جو ایمان والے ہیں، اللہ کی محبت سب سے زیادہ رکھتے ہیں]

''جب مشرکوں نے غیر اللہ کو اس توحید میں اللہ کا شریک قرار دیا تو اسی وجہ سے ان کو مشرک کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ﴾ [الأنعام: ١]

[پھر کافر لوگ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں]

مزید فرمایا:

﴿ وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ ﴾ [الأنعام: ١٥٠]

[”اور وہ لوگ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں]

”عدل کے معنی ہیں دو چیزوں میں برابری کرنا، لہٰذا اس آیت میں عدل سے مراد اللہ اور غیر اللہ میں برابری کرنا ہے۔ اللہ پاک نے یہ بات بتا کر کہ ولی (مددگار) حاکم اور رب (پروردگار) مَیں ہی ہوں، بندوں کو توحید اور شرک کے درمیان تضاد کی کیفیت بتا دی ہے۔

فرمایا:

① ﴿ اَغَيْرَ اللّٰهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا ﴾ [الأنعام: ١٤]

[کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو دوست مددگار بناؤں؟]

② ﴿ أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا ﴾ [الأنعام: ١١٤]

[کیا میں اللہ کے سوا اور کوئی حکم کرنے والا ڈھونڈوں؟]

③ ﴿ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْغِيْ رَبًّا ﴾ [الأنعام: ١٦٤]

[اے پیغمبر کہہ دو! کیا میں اللہ کے سوا اور کوئی پروردگار ڈھونڈوں؟]

”معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی ولی (دوست ومددگار) کوئی حکم (فیصلہ کرنے والا) اور کوئی رب (پرورش کرنے والا) نہیں ہے۔ پس جس نے غیر اللہ کو اللہ کے برابر ٹھہرایا، اس نے اللہ کی الوہیت ومعبودیت میں شرک کیا، اگرچہ توحیدِ ربوبیت کا قائل ہو۔

توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کے درمیان فرق:

”توحیدِ ربوبیت میں ساری مخلوق، کیا مومن اور کیا کافر، برابر ہے، البتہ توحیدِ الوہیت سے مومنوں اور مشرکوں کے درمیان فرق ہوتا ہے، اسی لیے اسلام کا کلمہ ”لا إله إلا الله“ قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی یوں کہے: ”لا رب إلا الله“ ”اللہ کے سوا کوئی رب نہیں“ تو اہلِ تحقیق کے نزدیک، یہ کافی نہ ہوگا، کیونکہ بندوں سے جو توحید مطلوب ہے، وہ یہی توحیدِ الوہیت ہے۔ مشرکین اسی توحید کے منکر ہیں۔ اللہ نے ان کے اقرارِ ربوبیت سے

توحید الوہیت پر حجت قائم کی ہے، یعنی جب اللہ ہی رب ہے تو معبود بھی وہی اکیلا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خلق (پیدا کرنا) جو رب کی شان ہے اور امر (حکم کرنا) جو معبود کی شان ہے، دونوں کو اپنے لیے ثابت فرمایا ہے، جن آیات میں اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور نعمتوں کا ذکر آیا ہے، ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾ [سورة النمل: ٦٠، ٦١، ٦٢] [کیا اللہ کے ساتھ اور کوئی الہ ہے؟]

''اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ مشرکین توحیدِ الوہیت کے اثبات میں تو پس وپیش کرتے ہیں، توحیدِ ربوبیت میں نہیں، اگرچہ بعض مشرک ایسے بھی تھے جو ربوبیت میں بھی شرک کرتے تھے۔''[1]

شرک کی قسمیں:

شرک دو طرح کا ہوتا ہے: ایک شرکِ الوہیت، دوسرا شرکِ ربوبیت۔ الوہیت وعبادت میں جو شرک ہوتا ہے، وہی اہلِ شرک پر غالب ہوتا ہے، جیسے بتوں، فرشتوں، جنوں اور زندہ و مردہ صلحا ومشائخ کو اللہ کی عبادت میں شریک کرنا اور ان کے روبرو نہایت درجے کی خاکساری و عاجزی بجالانا، اس طرح کی چیزوں کو تمام کتبِ الٰہیہ اوّل سے آخر تک باطل ومردود کہتی چلی آئی ہیں اور ایسے لوگوں کو اللہ کا دشمن بتاتی ہیں۔ سارے انبیا بھی اول سے آخر تک ان کے مشرک ہونے پر متفق ہیں۔ اللہ نے اسی شرک کے سبب سے اگلی امتوں کو ہلاک وبرباد کر دیا تھا۔

شرکِ ربوبیت:

شرکِ ربوبیت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی اور کو بھی خالق جانیں، جیسے مجوس دنیا کے دو خالق بتاتے ہیں یا فلسفی لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ سے ایک ہی بسیط شے صادر ہوئی ہے، جو عقل ہے، پھر اسی عقل فعال سے سارا عالم وجود میں آیا ہے اور وہی عقل سب کی پالنہار اور منتظم ہے۔ فلسفیوں کا یہ شرک بت پرستوں اور پارسیوں کے شرک سے بھی زیادہ سخت ہے، سارے جہان میں اس شرک سے بڑھ کر کوئی برائی اور گندگی نہیں ہے، کیونکہ اس میں الوہیت و ربوبیت کا انکار ہے۔

یہ شرک ان فلاسفہ کے سوا کسی امت میں نہ تھا۔ قدریہ جو قضا وقدر کا منکر گمراہ فرقہ ہے، اس کا

[1] تجريد التوحيد المفيد للمقريزي (ص: ١-٣)

شرک فلاسفہ کے اسی طویل شرک کا خلاصہ ہے، اسی لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قدریہ کو مجوس کے مشابہ کہا ہے۔ یہ دونوں شرک اکثر لوگوں میں جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک ہی طرح کا شرک ہوتا ہے۔ قرآن کریم بلکہ ساری آسمانی کتابوں میں اس شرک کی تردید کی صراحت آئی ہے۔ سورۃ الفاتحہ کی آیت ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ [ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں] میں شرکِ محبت والوہیت کی نفی ہے اور ﴿ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [ہم صرف تجھ سے مدد چاہتے ہیں] میں شرکِ خلق وربوبیت کی نفی ہے۔[1]

توحید کے چار مراتب کا بیان:

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ توحید کے چار مرتبے ہیں:

① ایک یہ کہ وجوبِ وجود کو اللہ میں منحصر کریں، اللہ کے سوا کسی کو واجب الوجود نہ جانیں۔ (اللہ کو واجب الوجود اور اس کے سوا ہر چیز کو ممکن الوجود کہا جاتا ہے۔ واجب الوجود اس ہستی کو کہتے ہیں جس کا وجود خود اسی سے ہو اور وہ اپنے وجود میں غیر کا محتاج نہ ہو)

② دوسرے یہ کہ آسمان و زمین اور سارے جوہروں (جوہر اس کو کہتے ہیں جو بذات خود قائم ہو) کی تخلیق و پیدائش اللہ کے لیے محدود کریں۔ ان دونوں مراتبِ توحید سے متعلق کتبِ الٰہیہ میں کوئی بحث نہیں ہے۔ اس میں عرب کے مشرکین اور اہلِ کتاب میں سے کسی نے اختلاف نہیں کیا ہے، بلکہ قرآن کریم اس پر نص صریح ہے کہ یہ بات سب کے نزدیک ثابت اور تسلیم شدہ ہے۔

③ تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ آسمان و زمین اور ان کے درمیان ساری چیزوں کی تدبیر وانتظام کو اللہ کی ذات میں منحصر کریں، یعنی اللہ کے سوا کسی کو مدبر و منتظم نہ جانیں۔

④ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے۔ انھیں آخری دو مراتب میں سارا جھگڑا چل رہا ہے۔ قرآن پاک میں انھیں دو مرتبوں سے بحث کی گئی ہے۔

قرآنِ مجید کے علوم خمسہ:

"قرآن مجید کے معانی پانچ علوم سے خارج نہیں ہوتے:

① ایک علم مخاصمہ (مخالف کی دلیل کو اسی پر الٹا کر اسے زیر کرنا) ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں چار گمراہ قوموں: یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین پر رد کیا ہے۔ علم مخاصمہ کے علم

[1] تجريد التوحيد المفيد للمقريزي (٥۔٧) مختصراً۔

بردار اہلِ کلام ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آیاتِ مخاصمہ (گمراہ فرقوں کی تردید والی آیتوں) میں مخالفین کو ان کے مشہور و مسلم اقوال اور بیانات سے الزام دیا ہے۔ اہلِ منطق کے طریقے پر دلائل کی تحقیق و وضاحت نہیں کی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نزولِ قرآن کا اصل مقصد یہ ہے کہ نفوس بشریہ (انسانوں) کو باطل عقائد اور فاسد اعمال سے پاک صاف کر کے مہذب بنایا جائے۔ عقائد باطلہ کے رد کے لیے آیات مخاصمہ نازل ہوئی ہیں اور اعمال فاسدہ کی نفی کے لیے آیاتِ احکام آئی ہیں۔ ان آیات میں مخاصمہ و تردید دو طرح پر مذکور ہے، ایک یہ کہ عقائد باطلہ کا ذکر کر کے ان کی قباحت کی صراحت کی ہے، دوسرے یہ کہ مخالفین کے شبہات ذکر کر کے ان کا جواب قطعی دلیل سے پیش کیا ہے۔

② دوسرا علم تذکیر بآیات اللہ ہے۔ (یعنی اللہ کی نشانیوں سے نصیحت کرنا)۔

③ تیسرا علم تذکیر بایام اللہ ہے۔ (یعنی گذشتہ قوموں کے حالات و واقعات سے عبرت دلانا)۔[1]

"اگر کسی کو اس امت میں یہود کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کے دنیا طلب علمائے سو کو دیکھے، جن کو تقلیدِ سلف کی عادت ہوتی ہے۔ وہ کتاب و سنت کی نصوص سے روگردانی کرتے ہیں، کسی ایک ہی عالم کے تشدد اور پسندیدہ مسائل کو پکڑے ہوئے ہیں، معصوم شارع علیہ السلام کے کلام سے بے پروا ہو کر موضوع احادیث اور فاسد تاویلات کو پکڑے رہتے ہیں۔ جس نے اس امت میں نصاریٰ کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کے مشائخ و اولیا کی اولاد کو دیکھو کہ ان کو اپنے آبا و اجداد سے کیا کیا خوش گمانیاں ہیں۔ وہ ان کی تعظیم و تکریم میں کس قدر افراط و مبالغہ کرتے ہیں۔ اور اس امت میں مشرکین کا نمونہ دیکھنا ہو تو قبر پرستوں اور پیر پرستوں کو دیکھو کہ اپنے نفع و ضرر میں ان پیروں کا تصرف و عمل دخل ثابت کرتے ہیں۔

منافقین کی اقسام:

"رہے منافق لوگ تو وہ دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ لوگ ہیں جو زبان سے کلمہ کہتے ہیں، لیکن ان کا دل کفر پر مطمئن ہے۔ یہ آیت انھیں کے حق میں نازل ہوئی ہے:

﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ [النساء: ١٤٥]

[1] علاوہ ازیں ④ علم احکام اور ⑤ علم التذکیر بالموت وما بعد الموت ہے۔ دیکھیں: الفوز الكبير للشاه ولي الله (ص: ٣٠)

[بلاشبہ منافق لوگ جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں رہیں گے]

''دوسری قسم کے منافق وہ ہیں جو اپنی قوم کی عادت پر چلتے ہیں۔ اگر قوم ایمان لائی تو یہ بھی ایمان لاتے ہیں اور اگر قوم کافر ہو جائے تو یہ بھی کافر ہو جائیں گے۔

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

[دوست نے میری گردن میں ایک ڈوری ڈال دی ہے، اس کا دل جدھر چاہتا ہے کھینچ لے جاتا ہے]

''پھر ان میں کوئی ایسا ہے جس کے دل پر دنیوی لذتوں کا ہجوم ہے، اس کے جی میں اللہ اور رسول ﷺ کی محبت بالکل باقی نہیں ہے، اس کے دل کو لالچ، دشمنی اور حسد نے گھیر لیا ہے۔ مناجات کی لذت اور عبادات کی برکت سے وہ بالکل ہی محروم ہے۔ ان لوگوں میں کوئی ایسا ہے جو امورِ معاش میں پوری طرح مشغول ہے اور اس کے دل میں کوئی فکرِ معاد (فکر آخرت) نہیں ہے۔ کوئی ایسا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے متعلق اس کے دل میں طرح طرح کے شکوک وشبہات آتے ہیں، اگرچہ یہاں تک نوبت نہیں آئی کہ وہ بالکل اسلام سے باہر نکل جائے۔ کوئی ایسا ہے کہ وہ اپنی قوم کی نصرت وحمایت میں رہتا ہے، اگرچہ طریقۂ اسلام کے خلاف کیوں نہ ہو، پھر وہ اسلام کا ہر عمل کرنے میں سست و کاہل بھی ہے، اس دوسری قسم کا نام نفاقِ عمل اور نفاقِ اخلاق ہے۔

''نفاق کی پہلی قسم کا معاملہ اعتقادی ہے، اس لیے رسول اللہ ﷺ کے بعد اس پر کسی کو اطلاع نہیں ہو سکتی، کیونکہ اعتقادی نفاق علمِ غیب کے قبیل سے ہے، جو صرف اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے۔ رہی دوسری قسم نفاقِ عملی تو یہ کثرت سے واقع ہوتی رہتی ہے، خصوصاً اس آخری زمانے میں تو یہ عام ہو چکی ہے۔ اسی نفاق کی طرف رسول اللہ ﷺ نے حدیثِ ذیل میں اشارہ فرمایا ہے:

«ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصاً، إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَ إِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَ إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ»[1]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤) صحيح مسلم، رقم الحديث (٥٨) ولفظه: «أربع من كن ←

[جس میں تین خصلتیں ہوں گی، وہ منافق ہے، ایک یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے، دوسرے یہ کہ جب وعدہ کرے تو اس کے خلاف کرے، تیسرے یہ کہ جب جھگڑا کرے تو بے ہودہ گوئی کرے]

''قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے نفاق کی ان دونوں قسموں کے احوال واوصاف ذکر کیے ہیں اور حدیثوں میں بھی یہ بیان ہوئے ہیں، تاکہ امت ان امور سے آگاہ ہو کر ڈرے اور پرہیز کرے۔ اس امت میں منافقین کا نمونہ دیکھنا ہو تو امرا و روسا کی مجلس میں جا کر ان کے مصاحبوں کو دیکھو کہ کس طرح یہ مصاحبین اپنے امرا کی مرضی کو شارع علیہ السلام کی مرضی پر مقدم رکھتے اور ترجیح دیتے ہیں۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو جس نے رسول اللہ ﷺ کے کلام کو بلا واسطہ سن کر نفاق اختیار کیا تھا اور جس نے اب شارع علیہ السلام کے حکم کو یقینی طریقے سے معلوم کر کے نفاق کو اختیار اور آپ ﷺ کی مخالفت پر اقدام کیا ہے، ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ جن اہلِ معقول کے دلوں میں شکوک و شبہات جاگزیں ہو گئے ہیں اور وہ آخرت کو بالکل فراموش کر چکے ہیں، یہی منافقین کے نمونے ہیں۔ جب کوئی شخص قرآن پڑھے تو ہرگز یہ خیال نہ کرے کہ اس میں جن منافقین اور گمراہ لوگوں کی مخالفت و تردید کا ذکر ہے، وہ لوگ ختم ہو گئے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو گمراہی اور خرابی پہلے زمانے میں تھی، وہ آج بھی موجود ہے، چنانچہ یہ حدیث اس پر دلیل ہے:

﴿لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ﴾[2]

[یعنی ضرور تم پہلی امتوں کے طریقوں پر چلو گے]

''ایمان کی شان یہ ہے کہ قرآنی تلاوت کے وقت اپنے ہر حال وقال کو اس کی آیات سے موازنہ کرے۔ فرقان کے ترازو میں اپنے عقائد واعمال کو تولے اور یہ سمجھے کہ یہ آیت اسی کے حق میں اتری ہے، اس لیے کہ عموم لفظ کا اعتبار ہوتا ہے، خصوصِ سبب کا نہیں۔

← فيه كان منافقا خالصا ومن كانت فيه خصلة منهن، كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا اؤتمن خان، و إذا حدث كذب، وإذا عاهد غدر، وإذا خاصم فجر» وفي رواية: «آية المنافق ثلاث: إذا حدث كذب، وإذا وعد أخلف، و إذا اؤتمن خان» [رواه البخاري و مسلم]

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٥٦) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٥٤)

''ایمان کی شان یہ بھی ہے کہ قرآن پڑھنے والا قرآن سے اللہ کی ہدایت کا طالب ہو، قرآن میں ہر امر و نہی کے پاس ٹھہر کر اس کو سمجھنے کی کوشش کرے، قرآن میں جہاں کہیں ﴿يَأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوْا﴾ یا ﴿يَأَيُّهَا النَّاسُ﴾ آیا ہے، وہاں یا تو اللہ نے کوئی حکم فرمایا ہے یا کسی کام سے منع کیا ہے، پس اس جگہ سے سرسری نہ گزر جائے، ذرا اس حکم پر کان رکھے اور آنکھیں کھولے۔''[1]

کتابوں کے نزول اور انبیا کی بعثت کا مقصود:

''اللہ تعالیٰ نے متعدد رسول اور مختلف کتابیں اس لیے بھیجی ہیں کہ لوگ عدل و انصاف اختیار کریں۔ سب سے بڑا عدل یہ ہے کہ موحد بنیں، کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ عمل اور عدل (توحید) کے درمیان منافات و مغایرت جتنی زیادہ ہوتی ہے، اتنا ہی زیادہ گناہ بڑا ہوتا ہے۔ گناہوں میں فرقِ مراتب اسی منافات کے تناسب سے سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح عمل اور عدل (توحید) میں جس قدر موافقت زیادہ ہوتی ہے، اسی قدر عمل کا مرتبہ اونچا اور بہتر قرار پاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں شرک باللہ ذاتی طور پر مقصودِ توحید کے منافی ہے، اسی لیے وہ بلا قید و شرط اکبر کبائر ٹھہرا ہے۔ ہر مشرک پر جنت حرام ہے، اس کا مال و خون مباح ہے اور اہلِ توحید کے لیے ان کو غلام بنانا جائز ہے، کیونکہ اہلِ شرک اللہ کی بندگی سے باہر ہو گئے اور تارکِ عبودیت ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی مشرک کا کوئی عمل ہر گز قبول نہیں کرتا ہے۔ اس کے حق میں کسی کی سفارش چلتی ہے نہ آخرت میں اس کی کوئی دعا قبول ہوتی ہے، نہ اس کی کوئی لغزش ہی معاف کی جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشرک شخص اللہ کے بارے میں سب سے بڑا جاہل ہوتا ہے۔ اس سے بڑا جہل کیا ہوگا کہ وہ خدا کی مخلوق کو، جو اسی کی طرح عاجز ہے، خدا کا ہم سر بناتا ہے؟ حقیقت میں مشرک نے یہ ظلم اللہ پر نہیں کیا، بلکہ اپنی ہی جان پر ظلم کیا ہے۔''[2]

باطل فرقوں کی توحید اور اس کی حقیقت:

''ہر فرقے کی توحید الگ الگ ہے۔ اہلِ باطل نے اپنے حسبِ منشا الگ الگ توحید مقرر

[1] الفوز الكبير للشاه ولي الله الدهلوي (ص: ٦٢)

[2] الجواب الكافي لمن سأل عن الدواء الشافي لابن القيم رحمه الله (ص: ٨٨-٨٩)

کی ہے، جس کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے ہیں۔ یہ توحید درج ذیل اقسام پر مشتمل ہے۔
① توحیدِ فلاسفہ، ② توحیدِ جہمیہ، ③ توحیدِ جبریہ، ④ توحیدِ اتحادیہ۔ یہ چار اقسام ہیں جن کو باطل کرنے کے لیے سارے رسول آئے ہیں اور عقل و نقل کی رو سے بھی یہ باطل ہیں۔"[1]

① فلاسفہ کی توحید یہ ہے کہ وجودِ باری تعالیٰ پر کوئی ماہیت زائدہ نہیں ہوسکتی، اس لیے یہ لوگ اللہ کی صفاتِ کمال کا انکار کرتے اور کہتے ہیں کہ اللہ کے لیے سمع (سننا) بصر (دیکھنا) قدرت، حیات، ارادہ، کلام، وجہ (چہرہ) یدین (دو ہاتھ) وغیرہ صفات بے کار اور غیر ثابت ہیں۔ انھوں نے انکار و تعطیلِ صفات کا نام توحید رکھا ہے۔

② فرقہ جہمیہ کی توحید فلاسفہ کی توحید ہی سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اللہ کی صفات کی نفی کرتے ہیں اور استوا علی العرش کے منکر ہیں۔ اس توحید کی اصلیت اللہ کے ان اسماے حسنی وصفات علیا کا انکار کرنا ہے، جنھیں اللہ کے رسول لائے ہیں اور ساری آسمانی کتابیں ان پر متفق ہیں۔

③ فرقہ جبریہ کی توحید یہ ہے کہ بندہ از خود کوئی کام نہیں کر سکتا ہے اور نہ اس کے ارادے و حرکت سے کوئی فعل واقع ہوتا ہے، بلکہ اس کے سارے افعال اللہ کا فعل ہیں۔ ان کے نزدیک افعال کی نسبت بندوں کی طرف کرنا توحید کے منافی ہے۔

④ فرقہ اتحادیہ یا وجودیہ کی توحید یہ ہے کہ اس کے نزدیک وجود صرف ایک ہے۔ دو وجود یعنی قدیم و حادث یا خالق و مخلوق یا واجب و ممکن نہیں ہیں، بلکہ حقیقت میں وجود ایک ہی ہے۔ اس بنا پر جس کو لوگ خلق مشبہ کہتے ہیں، وہی حق منزہ ہے ۔ یہ ساری مخلوق ایک ہی چشمے سے نکلی ہے، بلکہ عین واحد ہے۔

"ان چاروں قسموں کا نام اہلِ باطل نے توحید رکھا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں۔ جب مسلمان ان کے باطل نظریات کا انکار کرتے ہیں تو وہ توحید کا نام لے کر اور خود کو موحد بتا کر اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔ جس توحید کو اللہ نے بیان کیا ہے اور سارے رسول لائے ہیں، اس کا نام ان لوگوں نے (۱) ترکیب (۲) تجسیم (۳) تشبیہ (۴) اور تمثیل رکھا ہے۔ انھیں القاب کو وہ اپنا ہتھیار بنا کر اہلِ توحید سے جنگ کرتے ہیں اور اہلِ حق نے اللہ کے جو صحیح نام رکھے ہیں، ان کو وہ ڈھال بنا کر اپنے رکھے ہوئے

باطل ناموں سے مقابلہ کرتے ہیں۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ رسولوں کی توحید جو غایت کمال تھی، اس کا نام تو شرک وتجسیم رکھا گیا اور صفاتِ کمال کی تعطیل و انکار کا نام، جو غایت درجے کا نقص و عیب ہے، توحید مقرر کیا گیا ہے۔ ملحدین، جہمیہ اور معطلہ کی یہی توحید ہے۔

رسولوں کی پیش کردہ توحید:

''رسولوں کی توحید یہ ہے کہ تمام صفاتِ کمال اللہ ذو الجلال کے لیے ثابت ہیں، اس کی ذات ہر نقص وعیب اور زوال سے پاک صاف ہے۔ وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ سب امور اسی کی مشیت، ارادے اور قدرت سے ہوتے ہیں۔ حقیقت میں ہر فعل کا فاعل وہی ہے، بندہ محض کوشش کرنے والا ہے۔ عبادت کا حق دار اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے، اسی سے ہر امید وابستہ ہے، سب کو اسی کا ڈر ہے، انتہائی محبت اور انتہائی انکساری کا مستحق وہی ہے، اس کے سوا کوئی وکیل ہے نہ ولی نہ شفیع، اس کے اور مخلوق کی حاجتوں کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مشکلات کو حل کرنا، دعاؤں کو قبول کرنا اور الجھنوں کو دور کرنا اسی کا کام ہے۔

ہم دعا از تو اجابت ہم ز تو
ایمنی از تو مخافت ہم ز تو
[دعا بھی تجھی سے قبولیت بھی تجھی سے ہے
امید بھی تجھی سے اور خوف بھی تجھی سے ہے]

''ہاں معبود برحق اور بندوں کے درمیان اوامر ونواہی کی تبلیغ اور خبر رسانی میں بے شک ایک واسطہ ثابت ہے، کیونکہ اللہ کی مرضی و نا مرضی اور محبوب ومبغوض کو پہچاننا انبیا و رسل کے واسطے کے بغیر نہیں ہو سکتا اور نہ اللہ کے اسما وصفات کی حقیقتیں اس واسطے کے بغیر اجمالاً وتفصیلاً معلوم ومفہوم ہو سکتی ہیں، لیکن ملحدوں نے معاملہ الٹ دیا اور حقائق کو پلٹ ڈالا۔ انھوں نے رسولوں کا واسطہ تسلیم نہ کرکے صرف اپنی عقل کے واسطے کو کافی سمجھا، حالانکہ سارے جہان سے زیادہ یہی ملاحدہ وفلاسفہ بے عقل وبے شعور اور اللہ کی مخلوق میں اللہ تعالیٰ سے متعلق سب سے بڑے جاہل ہیں۔ ہم اللہ کے وعدے پر قائم ہیں، اسی

کی جناب میں مقدمہ پیش کرتے ہیں اور اسی کے سامنے یہ بحث ہوگی۔"[1]

نحن و إیاھم نموت و لا

أفلح یوم الحساب من ندما

[ہمیں اور انھیں موت کی آغوش میں جانا ہے، لیکن قیامت کے روز جو ذلت وندامت سے دو چار ہوا، وہ کامیاب نہیں ہوگا]

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ﴾ [الشعرآء: ۲۲۷]

[ظلم کرنے والوں کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں لوٹ کر جاتے ہیں؟]

یعنی ان کا انجام کیا ہونے والا ہے؟

---

[1] دیکھیں: مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة لابن الموصلي (ص: ۱۳۸)

دوسرا باب

موحد کے جنتی اور مشرک کے جہنمی ہونے کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَ لَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝ قُلْ إِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى إِلَيَّ اَنَّمَآ إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝﴾

[الکہف: ۱۰۷۔۱۱۰]

[بے شک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کیے، ان کی مہمانی فردوس کے باغات ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، ان سے ہٹنا نہیں چاہیں گے۔ کہہ دے اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاہی بن جائے تو یقیناً سمندر ختم ہو جائے گا، اس سے پہلے کہ میرے رب کی باتیں ختم ہوں، اگرچہ ہم اس کے برابر مزید سیاہی لے آئیں۔ کہہ دے میں تو تم جیسا ایک بشر ہی ہوں، میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے، پس جو شخص اپنے رب کی ملاقات کی امید رکھتا ہو تو لازم ہے کہ وہ عمل کرے نیک عمل اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے]

معلوم ہوا کہ توحید اس وقت ثابت ہوتی ہے جب اللہ کی عبادت میں کسی طرح کا شرک نہ ہو۔ جب شرک نہ ہوگا اور ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی پایا جائے گا تو ایسے شخص کا مہمان خانہ جنت ہوگی اور وہ ہمیشہ اسی بہشت میں رہے گا۔ کبھی وہاں سے باہر نہیں نکلے گا۔ وہ اس مرتبے کے لائق اس لیے ہوا ہے کہ ایمان اور عمل صالح رکھتا ہے۔ خالص عمل صالح وہ ہوتا ہے جو شرک سے پاک ہو، کیونکہ جو کوئی

اللہ کی الوہیت وربوبیت میں کسی چیز کو شریک کرتا ہے، وہ مشرک ہوتا ہے، اس کا کوئی عمل صالح نہیں ہے، اگر چہ وہ اپنے اعمال کو صالحہ خیال کرے۔ ایسے اعمال اس کے شرک کے ساتھ کسی کام نہیں آئیں گے۔

عقیدہ توحید کی اہمیت:

صاحبِ توحید اگر اعمال میں قاصر وناقص بھی ہوگا تو یہی توحید اس کا کامل ترین عمل اور افضل ایمان ہے، اسی لیے توحید کو طاعتوں کی چوٹی اور نیک عملوں کی بنیاد کہا جاتا ہے۔

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں آیا ہے:

''جس نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسی علیہ السلام بھی اس کے بندے اور رسول ہیں اور اللہ کے کلمے سے پیدا ہوئے، جس کو اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا، عیسی علیہ السلام اللہ کی روح ہیں اور بے شک جنت اور جہنم حق ہیں تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا، خواہ اس کا عمل کیسا ہی ہو۔'' (أخرجه الشيخان والترمذي)[1]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں یوں بھی آیا ہے:

''جس نے ''لا إله إلا الله محمد رسول الله'' کی گواہی دی، اللہ تعالیٰ اس پر جہنم کو حرام کر دے گا۔''[2]

موحد کا مقام:

معلوم ہوا کہ توحید کے پختہ ہونے کے بعد موحد کا انجام لامحالہ جنت ہے، جو اللہ کا فضل وکرم ورحم ہے۔ توحید سے مراد یہی ہے کہ الوہیت کا اقرار اور شرک کا انکار ہو۔ توحید گناہوں کو ڈھا دیتی ہے، موحد کو جنت میں لے جاتی ہے اور آگ سے دور کر دیتی ہے۔ جو شخص اللہ کی معبودیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی گواہی دیتا ہے، اس پر جہنم حرام ہو جاتی ہے۔ جس طرح سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٥) صحيح مسلم (١/ ٥٧) سنن الترمذي (٤/ ٤٤)

[2] صحيح مسلم (١/ ٥٨)

«رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَّبِالْإِسْلَامِ دِيْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُوْلًا وَّجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ»[1]

(رواه أبو داود)

[جس نے یہ کہا کہ میں راضی ہوا اللہ کے رب، اسلام کے دین اور محمد ﷺ کے رسول ہونے پر تو اس کے لیے جنت واجب ہوگئی]

اس حدیث میں توحیدِ الوہیت اور توحیدِ ربوبیت دونوں کے اقرار کا ذکر ہے۔

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع حدیث میں ہے:

''جس کا آخری کلام ''لا إله إلا الله'' ہوا، وہ جنت میں جائے گا۔''[2] (رواه أبو داود)

جنت کی بشارت:

اس میں صرف توحیدِ الوہیت کا ذکر کیا گیا ہے۔ نزع کے وقت اصل معتبر چیز ''لا إله إلا الله'' کہنا ہے، اس لیے کہ توحید اور شرک کے درمیان فرق اسی اقرارِ الوہیت سے ہوتا ہے، ورنہ ربوبیت کا اقرار تو مشرک بھی کرتے ہیں۔ بہر حال جس شخص میں ان دونوں قسموں (ربوبیت و الوہیت) کی توحید مجتمع ہوگئی، وہ جنت کا مستحق ہو گیا، اس میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے، اس کا وعدہ اللہ و رسول دونوں نے ہم سے کیا ہے۔ اللہ سے بڑھ کر کون سچا ہو سکتا ہے اور رسول سے زیادہ کون لائقِ اعتماد ہے؟

سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جبریل نے آکر مجھے یہ بشارت دی ہے کہ آپ کی امت میں سے جس کی موت اس حالت میں ہوگی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا رہا ہوگا تو وہ جنت میں جائے گا۔''

ابوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا: ''اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگرچہ اس نے زنا اور چوری کی ہو۔'' پھر میں نے یہی کہا: ''وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: «وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ» (اگرچہ اس نے

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥١٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣١٠٠)

زنا اور چوری کی ہو) چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا: «عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِيْ ذَرٍ» ''اگرچہ ابوذر کی ناک خاک آلود ہو۔''[1] (رواہ الشیخان والترمذي)

موحد کے لیے دخولِ جنت حتمی امر ہے:

یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ توحید تمام عبادتوں اور طاعتوں کی جڑ ہے۔ یہ اگر پختہ ہے تو اس کے سامنے گناہ، چاہے کبائر ہوں، کمزور پڑ جاتے ہیں اور موحد شخص کو نقصان نہیں دیتے ہیں، ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہ اور بات ہے کہ موحد اپنے گناہوں کی مغفرت نہ ہونے کی صورت میں جہنم میں جا سکتا ہے، مگر انجام میں توحید اس کو جہنم سے نکال کر جنت تک پہنچا دے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ وہ ہمیشہ جہنم میں رہے، جس طرح صرف توحیدِ ربوبیت والے ساکنِ جہنم ہوں گے، وللہ الحمد، کیونکہ شرک جہنم کو واجب کر دیتا ہے اور سارے اعمال برباد ہو جاتے ہیں، چاہے کتنے ہی صالح اور نیک ہوں، اس کے خلاف توحید جنت کو واجب کر دیتی ہے، چاہے موحد کتنا ہی ناقص العمل ہو۔ یہ مضمون حدیثِ جابر رضی اللہ عنہ کا واضح مفہوم، بلکہ منطوق ہے۔ وہ مرفوع حدیث یہ ہے:

«ثِنْتَانِ مُوجِبَتَانِ ... إلىٰ قوله: مَنْ مَاتَ يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ النَّارَ وَمَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئاً دَخَلَ الْجَنَّةَ»[2] (أخرجه مسلم)

[دو خصلتیں ہیں جو جنت وجہنم کو واجب کرتی ہیں... جو اس حالت میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک کرتا رہا تو وہ جہنم میں جائے گا اور جو اس حالت میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا رہا تو وہ جنت میں داخل ہوگا]

موحد ہی شفاعتِ رسول ﷺ کا حق دار ہے:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری شفاعت کا سب سے بڑا سعادت مند وہ شخص ہے جس نے خلوصِ دل سے ''لا إله إلا الله'' کہا ہے۔''[3] (رواہ البخاري)

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اسی کی شفاعت کریں گے جو مخلص موحد ہے اور اللہ کے ساتھ کسی

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٣٧) صحيح مسلم (١/ ٩٤، ٩٥) سنن الترمذي (٢٧٨٢)

[2] صحيح مسلم (١/ ٩٤)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩، ٦٥٧٠)

کو شریک نہیں کرتا ہے۔ اگر کسی نے زبان سے یہ کلمہ کہا، لیکن اس کے موافق عمل نہیں کیا تو وہ مخلص نہیں ہے اور جب مخلص نہ ہوا تو اب شفاعت بھی اس کے لیے نہ ہوگی۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''میری شفاعت ان لوگوں کے لیے ہوگی، جو کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک نہیں کرتے ہیں۔''[1]

معلوم ہوا کہ قبر پرست، پیر پرست، رائے پرست اور امام پرست رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے محروم رہیں گے۔

ستر ہزار اہلِ توحید حساب کے بغیر جنت میں داخل ہوں گے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''میری امت کے ستر ہزار لوگ حساب و عذاب کے بغیر جنت میں جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہیں جو دم نہیں کراتے، داغ نہیں دیتے، بدشگون نہیں لیتے اور اپنے رب پر بھروسا کرتے ہیں۔''[2] (رواه البخاري ومسلم والترمذي والنسائي بألفاظ مختصرا ومطولا)

امام احمد اور مسلم نے اس حدیث میں اتنا اضافہ کیا ہے کہ « لا يرقون » دم نہیں کرتے ہیں، مگر شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ « لا يرقون » کا اضافہ راوی کا وہم ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لفظ « لا يرقون » نہیں فرمایا ہے، بلکہ صرف « لا يسترقون » (دم نہیں کراتے) کہا ہے۔ رقیہ (دم) جب تک شرک نہ ہو، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ خود جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ پر دم کیا تھا اور صحابہ نے بھی کیا تھا، جسے آپ ﷺ نے جائز رکھا۔ راقی (دم کرنے والا) اور مسترقی (دم کرانے والا) ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ ''مسترقی'' دوسرے سے دم کا طلب گار اور دل سے غیر اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور ''راقی'' محسن ہوتا ہے، سائل اور طالب نہیں ہوتا۔ ان ستر ہزار جنتیوں کا اعلیٰ وصفِ کامل توکل ہے کہ وہ کسی سے طالبِ دم نہیں ہوتے اور نہ لوہے وغیرہ سے داغ دیتے ہیں۔[3]

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے اس کا مطلب بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ لوگ نہ منتر خوانی کا

---

[1] مسند أحمد (٦/ ٢٩) صحيح ابن حبان (١/ ٤٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٠٥) صحيح مسلم (١/ ١٩٨، ١٩٩، ٢٠٠) سنن الترمذي (٢٥٦٣)

[3] دیکھیں: مجموع الفتاوىٰ (١/ ١٨٢)

سوال کرتے ہیں اور نہ داغ دینے کے طالب ہوتے ہیں، بلکہ اللہ کی قضا پر راضی اور اس کی بلا و امتحان پر صابر ہوتے ہیں۔[1] انتہی.

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی مذکورہ بالا حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اہلِ توحید جہنم سے نجات پائیں گے اور حساب و عذاب کے بغیر جنت کی طرف سب سے پہلے جائیں گے۔ یہ ان کے اخلاصِ توحید کا نتیجہ وثمرہ ہے۔ اس حدیث میں موحدین کے اوصافِ اخلاص بھی ذکر کیے گئے ہیں، جس سے معلوم ہوا کہ جس شخص میں یہ اوصاف ہوں گے، وہ اہلِ توحید اور مستحقینِ جنت میں سے ہوگا۔ غرض کہ صداقتِ ایمان، اخلاصِ عمل، صحتِ عقیدہ اور توکل بڑی ہی پسندیدہ چیزیں ہیں۔ امت محمدیہ کے یہ ستر ہزار اہلِ ایمان اسی توحید کے ثابت ہونے کے طفیل بے حساب وکتاب جنت میں جائیں گے۔

مسند احمد و سنن بیہقی میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یوں بھی مروی ہے کہ ان ستر ہزار میں سے ہر ایک کے ساتھ مزید ستر ہزار بھی ہوں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے توحید و اخلاصِ عمل پر دل جمایا ہے اور شرکِ جلی و خفی کی جملہ اقسام سے اعتقاداً وعملاً احتراز کیا ہے۔"[2]

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت ہے:

''ان ستر ہزار جنتیوں کے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے۔''[3]

توکل کی اہمیت:

اس باب میں اصل چیز جس سے سارے فضائل و محاسن حاصل ہوتے ہیں، یہ ہے کہ اکیلے اللہ پر اعتماد و بھروسا ہو، اللہ سے سچی التجا ہو اور صدقِ دل سے اس پر متوکل ہو۔ یہی ثبوتِ توحید کی انتہا ہے، جو ہر مقام کریم اور مرتبہ عظیم کا ثمر عطا کرتی ہے، اسی کے نتیجے میں اللہ کی محبت، رجا، خوف اور قضا و قدر پر رضا و تسلیم کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ [الطلاق: ٣]

---

[1] مفتاح دار السعادة (٢/٢٣٤)

[2] مسند أحمد (٦) شعب الإيمان للبيهقي (٢٦٨)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٤٢) صحيح مسلم (١/١٩٧)

[اور جو کوئی اللہ پر توکل کرے تو وہ اس کو کافی ہے]

یعنی مکروہ چیزوں کو حاجت کے باوجود محض اللہ کے اعتماد پر ترک کر دینا۔ رہا اسباب کا استعمال اور دوا علاج کرنا تو اگر غیر مکروہ طریقے پر ہو تو اس سے توکل میں کوئی خرابی نہیں آتی ہے۔

گفت پیغمبر باآواز بلند
بر توکل زانوے اشتر بہ بند

[پیغمبر ﷺ نے بلند آواز سے فرمایا ہے کہ اونٹ کے پاؤں باندھ کر توکل کرو]

توحیدِ الٰہی اور فرائض کی بجا آوری پر جنت کی ضمانت:

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ ایک دیہاتی نے آکر عرض کی: "اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے ایسا عمل بتائیے کہ جب میں اسے کروں تو جنت میں داخل ہو جاؤں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، فرض نماز پابندی سے ادا کرو، زکات دو اور رمضان کے روزے رکھو۔" اس نے کہا: "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں ان اعمال میں کچھ بڑھاؤں گا اور نہ کچھ کم کروں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يَّنْظُرَ إِلَى رَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَلْيَنْظُرْ إِلَى هٰذَا» (متفق عليه)[1]

[جس کو جنتی آدمی دیکھنا اچھا لگے تو وہ اس شخص کو دیکھے]

یہ حدیث اخلاصِ توحید اور اخلاصِ عمل کی دلیل ہے۔ جب یہ دونوں چیزیں کسی آدمی میں جمع ہوتی ہیں تو وہ شخص جنتی ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک نجدی شخص کا قصہ سیدنا طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ جب اس کو رسول اللہ ﷺ نے نماز، زکات اور روزے کا حکم دیا تو اس نے کہا: "اللہ کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہیں کروں گا۔" آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَفْلَحَ إِنْ صَدَقَ» (متفق عليه)[2]

[اگر یہ شخص اپنی بات میں سچا ہے تو وہ نجات پا گیا ہے]

فلاح و کامیابی والا ہونا جنتی ہونے کی دلیل ہے۔ معلوم ہوا کہ خالص عمل پر جنت ملتی ہے اور یہ اخلاص کی نعمت اہلِ توحید کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہوتی ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٩٧) صحيح مسلم (١/ ٤٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦) صحيح مسلم (١/ ٤٠، ٤١)

سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کی ایک جماعت سے شرک نہ کرنے پر بیعت لی تھی۔[1] (متفق علیه)

سیدنا معاذ رضی اللہ عنہ نے کہا: ''اے اللہ کے رسول ﷺ! ایسا عمل بتائیے جو مجھے جنت میں داخل کرے اور جہنم سے دور رکھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم نے بہت بڑی بات پوچھی ہے، لیکن جس پر اللہ اس کو آسان کر دے، یہ اسی کے لیے آسان ہے۔ وہ عمل یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو، نماز قائم رکھو، زکات ادا کرو، رمضان کا روزہ رکھو اور بیت اللہ کا حج کرو۔''[2]
(رواه أحمد والترمذي وابن ماجه)

یہ حدیث توحیدِ الوہیت کے اثبات اور عمل کو خالص کرنے کی دلیل ہے، جس کا ثمرہ دخولِ جنت اور جہنم سے دوری ہے، بلکہ عثمان رضی اللہ عنہ کی ایک مرفوع حدیث کے الفاظ ہیں:

''جو شخص یہ یقین رکھتے ہوئے فوت ہوا کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے تو وہ جنت میں جائے گا۔''[3] (رواه مسلم)

یعنی اگر مرتے وقت زبان سے کلمہ نہیں کہا، لیکن دل میں اس کی تصدیق تھی تو بھی وہ جنتی ہوگا۔ یہ اہلِ توحید کے لیے بہت بڑی بشارت ہے، کیونکہ کبھی آدمی کو ایسا مرض لگ جاتا ہے جس سے زبان بند ہو جاتی ہے اور وہ زبان سے کوئی بات نہیں کہہ سکتا، حتی کہ کلمہ نہیں پڑھ سکتا، لیکن اگر دل میں اعتقاد صحیح ہے تو زبان کی یہ بندش اس کے لیے مضر نہیں ہوتی ہے۔

توحید کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے:

معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے اللہ سے اس حال میں ملاقات کی کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں ٹھہراتا، پنج گانہ نماز پڑھتا ہے اور رمضان کے روزے رکھتا ہے تو وہ بخش دیا جائے گا۔''[4]
(رواه أحمد)

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨) صحيح مسلم (٣/ ١٣٣٣)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٣١، ٢٣٧) سنن الترمذي (٤/ ١٢٤) سنن ابن ماجه (٢/ ١٣١٤)

[3] صحيح مسلم (١/ ٥٥)

[4] مسند أحمد (٥/ ٢٣٢)

معلوم ہوا کہ قیامت کے روز ابتدائی مغفرت اور جنت میں اولین دخول کے لیے توحید کے ساتھ عمل صالح بھی ضروری ہے، ورنہ بے عمل موحد جہنم سے نکل کر بہشت میں جائے گا، بشرطیکہ توحیدِ الوہیت وربوبیت میں مخلص ہو۔

سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے:

"جہنم سے ہر وہ شخص باہر نکلے گا جس کے دل میں ذرے کے برابر ایمان ہوگا۔ اس بارے میں جسے شک ہو، یہ آیت پڑھے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ﴾ [النساء: ٤٠] [بے شک اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا][1] (أخرجه الترمذي وصححه)

اس جگہ ایمان سے مراد توحید ہے۔

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ اس بات کی گواہی دینا کہ "لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله" (اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے ورسول ہیں) نماز قائم کرنا، زکات ادا کرنا، حجِ بیت اللہ اور رمضان کا روزہ رکھنا۔"[2]

(أخرجه الخمسة إلا أبا داود)

ضمام بن ثعلبہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ارکانِ اسلام سے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز روزہ وغیرہ بتایا، پھر اس نے کہا "لا أزيد عليهن ولا أنقص منهن" [میں ان میں زیادتی اور کمی نہیں کروں گا] آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَئِنْ صَدَقَ لَيَدْخُلَنَّ الْجَنَّةَ»[3] [اگر یہ سچا ہے تو ضرور جنت میں جائے گا] (رواہ مسلم)

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین چیزیں اصل ایمان ہیں: "لا إله إلا الله" کے قائل کی جان ومال کو نقصان پہنچانے سے باز رہنا، دوسری چیز اس کو کافر نہ کہنا اور کسی گناہ پر اس کو اسلام سے خارج نہ کرنا۔"[3] (الحديث، رواه أبو داود)

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٢٥)

[2] مسند أحمد (١٢٠/٢، ١٤٢) سنن الترمذي (١١٩/٤) سنن النسائي (١٠٨/٨)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢٥١٥) اس کی سند میں "يزيد بن أبي نشبة" مجہول ہے۔

حدیثِ غربا:

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا، وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ» (أخرجه مسلم)

[اسلام اجنبیت کے عالم میں شروع ہوا اور پھر ایسے ہی لوٹ آئے گا جیسے شروع ہوا تھا، پس خوشی و مسرت ہو ان کے لیے جو اجنبی ہیں]

اس جگہ اسلام سے توحید مراد ہے۔ ابتدا میں یہ توحید بہت کم یاب تھی، پھر اسی طرح آخر زمانے میں کم یاب ہو جائے گی۔ غریبوں کے لیے خوش ہونے کی بشارت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ فسادِ امت کے وقت توحید پر قائم رہیں گے، ان کی مغفرت ہوگی، وللّٰه الحمد.

دعوتِ توحیدِ باری تعالیٰ کا منہج:

دعوتِ توحید شہادتین کی طرف بلانے سے عبارت ہے، جیسا کہ کتاب وسنت اور اہلِ علم کے اقوال اس پر دلالت کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ وَ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾ [يوسف: ١٠٨]

[اے نبی! کہہ دیجیے کہ میری راہ یہ ہے، میں تم کو اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر بلاتا ہوں اور جو میری پیروی کرے، اور اللہ ہر عیب سے پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں]

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ آپ لوگوں سے کہہ دیں کہ یہ دعوت جس کی طرف میں تم کو بلاتا ہوں اور دعوت کے جس طریقے پر میں قائم ہو کر بتوں اور باطل معبودوں کے چھوڑنے اور طاعتِ الٰہی تک پہنچنے، معصیت سے پرہیز کرنے اور خالص عبادت کرنے کی جو دعوت دیتا ہوں، یہی اللہ وحدہ لا شریک لہ کی طرف میرے بلانے کا راستہ ہے۔ میں اس دعوت میں بصیرت اور علم و یقین پر ہوں، میں مشرک نہیں ہوں۔ انتہیٰ۔[1]

---

[1] تفسير الطبري (١٣/ ٧٩، ٨٠)

دعوتِ دین کے تین مدارج:

یہ آیت اخلاصِ توحید کی دلیل ہے، کیونکہ بہت سے داعیانِ حق ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کی طرف دعوت دینے کے بجائے اپنے نفس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَ الْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾
[النحل: ١٢٥]

[اے نبی! لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعے سے اپنے پروردگار کی راہ کی طرف بلاؤ اور ان سے بحث کرو تو اس طور سے جو بہترین ہو]

اس آیت میں اللہ نے دعوت کے تین مرتبے بیان کیے ہیں، جو مدعو کے حسب حال ہوتے ہیں، کیونکہ جو شخص حق کا طالب اور دل دادہ ہوتا ہے اور اس کو ہر چیز پر فوقیت دیتا ہے، اس کو حکمت سے بلانا چاہیے۔ وہ نصیحت و بحث کا محتاج نہیں ہوتا ہے۔ دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ جو شخص حق کے خلاف امور میں مشغول رہتا ہے، لیکن جب حق کو پہچان لے گا تو اس کا تابع ہو جائے گا، پھر اس کو نصیحت کے ساتھ ترغیب و ترہیب کی بھی ضرورت ہے۔ تیسرا یہ کہ اگر کوئی شخص حق کا معارض و معاند ہے تو اس سے عمدہ اور اچھے ڈھنگ سے مباحثہ و مقابلہ کرنا چاہیے، اگر وہ اپنے معاندانہ طریقے کار سے رجوع کر لے تو بہتر ہے، ورنہ اس سے جہاد کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ قاله ابن القيم رحمه الله[1]

عقیدہ توحید میں صوفیہ کے دو نظریات:

مسئلہ توحید میں مذہبِ صوفیہ دو طرح پر ہے۔ ایک "وحدة الشهود" کے نام سے معروف ہے۔ صوفیہ کے سارے سلف اور ائمہ سلوک اسی توحید کے قائل رہے ہیں۔ یہ لوگ آیت ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ٢] [اے دل کی آنکھ والو عبرت پکڑو] سے استدلال کرتے ہیں۔ دوسرا مذہب "وحدة الوجود" ہے۔ یہ مذہب ان لوگوں کے ذہن کی پیداوار ہے، جو مغلوب الحال اور مدہوش یا عقل و شعور سے محروم اور حیرانی و پریشانی کا شکار ہیں۔ متاخرین مشائخ کی ایک جماعت اس کی قائل ہوگئی ہے اور شرعی مدارج سے کوسوں دور جا پڑی ہے۔ ان لوگوں نے ایسے ایسے عجیب الفاظ و عبارات تراشے ہیں جو کانوں سے سنے نہیں جا سکتے۔ ان خرافات کو شرک و کفر کے

---

[1] الصواعق المرسلة لابن القيم (١٢٧٦/٤)

سوا کوئی اور نام نہیں دیا جا سکتا، عیاذاً باللہ منہ۔ اس عقیدے نے شریعت کے سارے کارخانے اور ناموسِ حق کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ ان لوگوں نے اپنی اس توحید کا نام ''توحیدِ خاصہ'' اور اہلِ اسلام کی توحید کا نام ''توحید عامہ'' رکھا ہے۔ إنا للہ...!

حالانکہ جس کو یہ لوگ توحیدِ عامہ کہتے ہیں، یہ وہی توحید ہے جس کے لیے رسل و انبیا آئے اور کتابیں نازل ہوئیں، اسی کے انکار پر دنیوی عذاب نازل ہوا اور آخرت کا عذاب مقرر ہوا۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ جو توحید کتاب وسنت سے ثابت ہے اور تمام انبیا ورسل کا اس پر اجماع ہے، وہ توحید عامہ ہے اور وحدۃ الوجود کا اعتقاد توحید خاصہ ہے یا براہمہ، فلاسفہ، ملاحدہ جہمیہ اور معطلہ کا مذہب توحیدِ خالص ہے تو ایسے لوگ اسلام سے بالکل خارج، مرتد اور محروم ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [النساء: ١١٥]

[اور جو کوئی ہدایت ظاہر ہونے کے بعد رسول کے خلاف کرے اور مسلمانوں کے راستے کے سوا دوسرے راستے پر چلے تو ہم اس کو اسی راہ پر چلنے دیں گے اور جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے]

اس بارے میں محققین کے نزدیک قول فیصل یہ ہے کہ وحدۃ الوجود کا قول ناقابل بیان ہے، جیسا کہ مشہور ہے کہ ''احادیث السکاری تطوی ولا تروی'' یعنی نشے کے خوگر افراد کی باتیں لائقِ التفات اور بیان کے قابل نہیں ہوتی ہیں۔

اسی طرح ''وحدت الشہود'' کا قول بھی ناقابل التفات ہے۔ مومن شبہات کے اندھیرے میں توقف کرنے والے ہوتے ہیں۔

توحیدِ خالص کے عناصر:

تمام بحثوں اور بیانوں سے بہترین بیان ''لا إله إلا الله'' ہے۔ یہی راہِ حق اور لائقِ قبول ہے، اسی کے لیے آسمان سے کتابیں اتریں اور اسی کی طرف رسولوں نے دعوت دی۔ اصل توحید وہ ہے جو گندے افکار اور شکوک وشبہات کی آلایشوں سے پاک وصاف ہو۔ اس توحید خالص کے چند

اہم عناصر ہیں۔ زبان سے اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے۔ دل سے اس کی تصدیق بجالانا۔ ارکان پر عمل کرنا۔ صانع کائنات کے وجود پر فطرتِ الٰہی کے مطابق ایمان لانا۔ عقلی دلیلوں سے استدلال نہ کرنا۔ فلسفیانہ حجتوں پر نظر نہ ڈالنا، اللہ کو اس کی صفتوں سے پہچاننا اور طریقہ سلف کے مطابق ان پر مجمل ایمان لانے پر اکتفا کرنا۔ صحیح بخاری کتاب التوحید میں صفاتِ باری تعالیٰ کا بیان کتاب وسنت کے مطابق تفصیل سے مذکور ہے۔

کلمہ اخلاص:[1]

عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی مرفوع روایت میں آیا ہے:

''اللہ نے اس شخص کو آگ پر حرام کیا ہے جس نے ''لا إله إلا الله'' کہا اور اس قول سے اس کا مقصد اللہ کی ذات اور رضا چاہنا ہے۔''[2] (رواه الشيخان)

صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے غزوۂ تبوک کے ذیل میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَأَنِّي رَسُوْلُ اللّٰهِ»[3]

[میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور میں اللہ کا بھیجا ہوا ہوں]

جو بندہ ان دونوں باتوں میں کسی شک کے بغیر اللہ سے ملے، وہ جنت سے محروم نہ ہوگا۔

وضاحت:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس بارے میں دو طرح کی حدیثیں آئی ہیں۔[4] ایک وہ ہیں جن میں یوں آیا ہے کہ جو شخص شہادتین کا اقرار کرے گا، جنت میں جائے گا یا جنت سے محروم نہیں رہے گا۔ ان احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ توحید خالص ہمیشہ کے لیے جہنم میں نہیں رہیں گے، بلکہ جب گناہوں سے پاک ہو جائیں گے تو جنت میں جائیں گے، اس سے محروم نہیں رہیں گے۔

[1] یہاں سے شروع ہونے والا مبحث امام ابن رجب رحمہ اللہ کے رسالے ''كلمة الإخلاص و تحقيق معناها'' کے ترجمہ وتہذیب پر مبنی ہے، جس میں مولف رحمہ اللہ نے حسبِ ضرورت اضافہ بھی کیا ہے۔

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٥) صحيح مسلم (١/٤٥٦)

[3] صحيح مسلم (١/٥٧)

[4] امام ابن رجب رحمہ اللہ کے رسالے ''كلمة الإخلاص'' کی متعدد طبعات میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے نام کی صراحت نہیں مل سکی، بلکہ مذکورہ بیان امام ابن رجب رحمہ اللہ ہی کے کلام کا تسلسل ہے۔ مزید برآں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی کتب سے بھی یہ اقتباس نہیں مل سکا۔ واللہ أعلم بالصواب.

حدیثِ ابو ذر رضی اللہ عنہ کا یہی مطلب ہے کہ وجودِ توحید کے ساتھ زنا کاری اور چوری دخولِ جنت سے مانع نہیں ہوتی ہے۔ یہ بات حق ہے، اس میں کوئی شک و شبہہ نہیں ہے۔ ان حدیثوں سے یہ نہیں نکلتا کہ توحید کے ساتھ بالکل عذاب نہیں ہوگا۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، نَفَعَتْهُ يَوْماً مِنْ دَهْرِهِ، يُصِيبُهُ قَبْلَ ذٰلِكَ مَا أَصَابَهُ»[1]

[جس نے "لا إله إلا الله" کہا تو یہ کلمہ کسی روز ضرور اس کو نفع پہنچائے گا، چاہے اس سے پہلے گناہوں کی سزا پائے]

دوسری قسم کی حدیثیں وہ ہیں، جن میں آیا ہے کہ اس کلمے کے قائل پر جہنم حرام ہے۔ اس کو بعض اہلِ علم نے اس معنی پر محمول کیا ہے کہ اس پر خلود فی النار حرام ہے یا وہ جہنم کی اس آگ پر حرام ہے، جس میں اہلِ جہنم ہمیشہ رہیں گے۔ یہ آگ جہنم کے طبقہ اعلی کے علاوہ ہوگی، کیونکہ گناہ گار موحدین کی ایک کثیر جماعت اپنے گناہوں کے سبب طبقہ اعلی میں جائے گی، پھر سفارشیوں کی شفاعت اور اللہ ارحم الراحمین کی رحمت سے نجات پا کر جنت میں داخل ہوگی۔ صحیحین میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: مجھ کو قسم ہے اپنی عزت وجلال کی! میں جہنم سے ان لوگوں کو ضرور باہر نکالوں گا جنھوں نے "لا إله إلا الله" کہا ہے۔[2]

علما کے ایک گروہ نے کہا ہے کہ ان حدیثوں سے مراد یہ ہے کہ "لا إله إلا الله" جنت میں داخل ہونے اور جہنم سے نجات پانے کا سبب ہے۔ ان احادیث کا مقتضا و منشا بھی یہی ہے، لیکن مقتضا پر اعتماد اسی وقت درست ہوگا، جب اس کی سب شرطیں موجود ہوں اور موانع نہ ہوں، کیونکہ کبھی مقتضا اپنی شروط میں سے کسی شرط کے فوت ہو جانے یا موانع میں سے کسی مانع کے پائے جانے کے سبب پیچھے ہو جاتا ہے۔ امام حسن اور وہب بن منبہ رحمہما اللہ کا یہی قول ہے۔

حکایت:

فرزدق جس وقت اپنی بیوی کو دفن کر رہے تھے تو ان سے امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: اس دن

[1] مسند البزار (٣) سلسلة الأحاديث الصحيحة (٥٦٧/٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥١٠) صحيح مسلم (١٨٤/١)

(قیامت) کے لیے کیا تیاری کی ہے؟ اس نے کہا: "شهادة أن لا إله إلا الله" کے ساتھ ستر (۷۰) سال سے تیاری کر رہا ہوں۔ امام حسن رحمہ اللہ نے کہا: بہت اچھی تیاری ہے، لیکن "لا إله إلا الله" کے لیے شرطیں ہیں، لہٰذا پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانے سے بچو۔ ایک روایت میں ہے کہ حسن رحمہ اللہ نے کہا: "هذا العمود فأين الطنب؟" [یہ تو خیمہ ہے، اس کی رسی کہاں ہے؟]"

دخولِ جنت کے لیے اعمال صالحہ ضروری ہیں:

کسی نے امام حسن رحمہ اللہ سے کہا: لوگ کہتے ہیں کہ "لا إله إلا الله" کا قائل جنت میں جائے گا؟ انھوں نے کہا: "ہاں! جس نے اس کا حق ادا کیا، وہی جنت میں جائے گا۔" اسی طرح کسی نے وہب بن منبہ رحمہ اللہ سے کہا: "لا إله إلا الله" جنت کی کنجی ہے تو انھوں نے کہا: ہاں! لیکن ہر کنجی کے لیے دانت ہوتے ہیں۔ اگر تم ایسی کنجی لاؤ گے جس کے دندانے ہیں تو تمھارے لیے دروازہ کھلے گا، ورنہ نہیں۔[1]

اس بات کے صحیح ہونے کی دلیل یہ ہے کہ بہت سی حدیثوں میں رسول اللہ ﷺ نے دخولِ جنت کو اعمال صالحہ کے ساتھ منسلک فرمایا ہے، چنانچہ صحیحین میں سیدنا ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے وہ عمل بتایئے جو مجھے جنت میں لے جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "اللہ کی عبادت کرو، کسی چیز کو اس کا شریک نہ کرو، نماز پڑھا کرو، زکات دیا کرو اور صلہ رحمی کیا کرو۔"[2]

اسی طرح کی چند حدیثیں پہلے بھی گزر چکی ہیں۔ مسند احمد میں بشیر بن خصاصیہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

"میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا، تاکہ آپ کی بیعت کروں، آپ ﷺ نے میرے لیے ایک شرط لگائی کہ میں گواہی دوں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے بندے و رسول ہیں اور نماز پڑھوں، زکات دوں، حج اسلام انجام دوں، رمضان کے روزے رکھوں اور راہِ خدا میں جہاد کروں۔ میں نے کہا: "یا رسول اللہ ﷺ! مجھ کو ان دو کاموں کی طاقت نہیں ہے، ایک جہاد، دوسرا صدقہ۔" یہ سن کر آپ ﷺ نے اپنا ہاتھ کھینچ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٩٦) صحيح مسلم (٤٣/١)

لیا، پھر ہاتھ ہلا کر فرمایا: ''نہ جہاد نہ صدقہ، پھر کیسے تم جنت میں جاؤ گے؟'' میں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! میں ان سب باتوں پر آپ ﷺ سے بیعت کرتا ہوں۔''[1]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حصولِ توحید کے ساتھ نماز، روزے اور حج کی طرح جہاد وصدقہ بھی دخولِ جنت کے لیے شرط ہے۔ مطلب یہ کہ عمل صالح کے بغیر جنت نہیں ملتی ہے۔

صدیق حسن بلا ست سر مستی تو
خود نیست برابر ست با ہستی تو

[صدیق حسن! تمھاری مدہوشی مصیبت ہے، تمھاری ہستی اور نیستی برابر ہے]

بے نقد عمل کس نفروشد جنت
ہیہات ہیہات از تہی دستی تو

[نقد عمل کے بغیر کوئی شخص جنت نہیں خریدے گا۔ افسوس! افسوس! تمھاری ناداری پر]

نیز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

''مجھے حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے لڑوں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔''[2]

اقرارِ شہادتین کے ساتھ دیگر فرائض کے انکار کی سزا:

اس حدیث سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ اور صحابہ کی ایک جماعت نے یہ سمجھا ہے کہ اقرارِ شہادتین سے دنیوی سزا ختم ہو جاتی ہے، اسی وجہ سے انھوں نے مانعینِ زکات سے قتال کرنے میں توقف کیا تھا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ سمجھا کہ ان سے قتال ممنوع نہیں ہے، مگر اس وقت جب وہ اسلام کے حقوق ادا کریں تو ممنوع ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان دلیل ہے:

«فَإِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ عَصَمُوا مِنِّي دِمَاءَ هُمْ وَأَمْوَالَهُمْ إِلَّا بِحَقِّهَا»[3]

[جب لوگ کلمے کا اقرار اور نماز و زکات ادا کریں گے تو انھوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا، مگر اس کے حق کے بدلے]

---

[1] مسند أحمد (٥/٢٢٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥) صحيح مسلم (١/٥١)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٠) صحيح مسلم (١/٥١، ٥٢)

اس فرمانِ رسول ﷺ کے سبب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا:

"فإن الزكاة حق المال"[1] [زکات مال کا حق ہے]

پس جو بات ابو بکر رضی اللہ عنہ نے سمجھی تھی، وہی بات صراحتاً نبی مکرم ﷺ نے فرمائی تھی اور بہت سے صحابہ نے سمجھی تھی، جیسے سیدنا عبداللہ بن عمر اور انس رضی اللہ عنہم وغیرہ۔ قرآن پاک بھی اسی پر دلالت کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوْا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ﴾ [التوبة: ١١]

[اگر لوگ توبہ کر لیں اور نماز وزکات ادا کریں تو وہ تمھارے دینی بھائی ہیں]

یعنی دینی اخوت اسی وقت ثابت ہوگی جب لوگ فرائض ادا کریں، کیونکہ شرک سے توبہ توحید کے بغیر نہیں حاصل ہوتی اور توحید عمل صالح کے بغیر تمام نہیں ہوتی ہے، پس دخولِ جنت عمل صالح پر مبنی ہوا۔

مذکورہ بالا احادیث کا صحیح مفہوم:

ایک جماعت نے کہا ہے کہ یہ حدیثیں فرائض وحدود کے نزول سے پہلے کی ہیں، مگر یہ قول بہت بعید ہے، اس لیے کہ یہ حدیثیں زیادہ تر مدینے میں نزولِ فرائض وحدود کے بعد فرمائی گئی تھیں اور بعض غزوۂ تبوک میں فرمائیں، جو حیاتِ نبویہ کے آخر میں واقع ہوا تھا۔ دوسرے گروہ نے کہا ہے کہ یہ احادیث منسوخ ہیں۔ تیسرے نے کہا کہ منسوخ نہیں بلکہ محکم ہیں۔ چوتھے گروہ کا قول یہ ہے کہ یہ نصوصِ مطلقہ دوسری احادیث میں مقید ہو کر آئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کفر کا اطلاق گناہوں پر ہوا ہے، جس طرح ریا پر شرک کا اطلاق ہوا ہے، اسی طرح شیطان کی طاعت کو معصیت، بلکہ اس کی عبادت کہا گیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ﴾ [يٰس: ٦٠]

[اے آدم کی اولاد! کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا؟]

نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے کہا تھا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٤٠٠) صحيح مسلم (١/٥١، ٥٢)

﴿ يَاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ﴾ [مريم: ٤٤] [ابا جان! شیطان کی عبادت نہ کریں]

جو شخص اللہ کی عبادت وطاعت صحیح ڈھنگ سے نہیں کرتا، وہ اس طاعت میں عابد شیطان (شیطان کا پجاری) ہوتا ہے، لہٰذا "لا إله إلا الله" کے سچے قائل وہی لوگ ہیں جو "مطيع الرحمن" (اللہ کے فرماں بردار) ہیں۔ جو شخص اللہ کو اکیلا معبود جانے گا، وہی خالص عبودیت بھی کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴾ [الكهف: ١١٠]

[اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے]

دخولِ جنت کے لیے کامل توحید ضروری ہے:

کامل توحید یہی ہے کہ اللہ کی محبوب چیز کو محبوب اور اس کی مکروہ چیز کو مکروہ رکھے، ورنہ جس نے اس کی کسی محبوب شے کو مکروہ رکھا یا کسی مکروہ کو محبوب بنایا، اس کی توحید کامل نہیں ہے، اس کے اندر ایک طرح کا شرک خفی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴾ [محمد: ٢٨]

[اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس چیز کی پیروی کی جس سے اللہ کو غصہ ہوا اور اس کی رضا مندی کو مکروہ رکھا، تو اللہ نے بھی ان کے سب نیک کاموں کو برباد کر دیا]

اہلِ توحید میں سے جو لوگ جہنم میں جائیں گے، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ "لا إله إلا الله" کہنے میں پورے طور پر سچے نہیں تھے۔ جب اللہ کے ماسوا سے دل پاک ہو جاتا ہے تو کلمے کا قائل صادق القول ہوتا ہے، ورنہ سچائی میں کچا ہے۔ غرض کہ اصل چیز کلمہ طیبہ پر استقامت ہے۔ اللہ کی قربت ومعیت اور رویت کا خیال کر کے گناہ سے باز رہنا اقرارِ کلمہ کی سچائی پر دلیل ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى﴾ [علق: ١٤] [کیا اسے نہیں معلوم کہ اللہ دیکھ رہا ہے؟]

﴿ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ﴾ [فجر: ١٤] [بیشک تمھارا پروردگار تاک میں لگا ہوا ہے]

حکایت:

ایک مرد نے ایک عورت کو جنگل میں اکیلا پا کر کچھ کرنا چاہا تو اس نے عورت سے کہا: ستاروں

کے سوا کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے۔ عورت نے کہا: ستاروں کو چمکانے والا کہاں گیا ہے؟

ایک دوسرے مرد نے ایک عورت پر دروازہ بند کر کے زبردستی کی اور کہا: اب تو کوئی دروازہ کھلا نہیں رہا۔ عورت نے کہا: ہاں! مگر ایک دروازہ جو ہمارے اور اللہ کے درمیان ہے، کھلا ہوا ہے۔ آخر مرد نے اس کو چھوڑ دیا۔ ایک عارف نے ایک مرد کو ایک عورت سے بات کرتے دیکھا تو کہا: اللہ تم دونوں کو دیکھ رہا ہے۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اللہ بندے سے جس قدر قریب ہے، اسی کے مطابق اس سے شرم کرنی چاہیے اور اس کی قدرت کے مطابق اس سے ڈرنا چاہیے۔ حاصل یہ کہ عبودیت کی ذلت اور محبوبیت کی عزت کو توحیدِ الٰہی کہتے ہیں۔ جس شخص نے اس توحید کو غیر اللہ کی عبادت اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی محبت سے بدلا، وہ مشرک ہے، اس نے اللہ کی ربوبیت و عبادت کی کوئی قدر نہیں جانی۔ شرکِ محبت کا مزید بیان آگے آئے گا، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فضائلِ کلمہ توحید:

کلمہ توحید کے فضائل وفواضل بہت زیادہ ہیں۔ سیدنا عمر اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا ہے کہ یہ تقویٰ، اخلاص، شہادتِ حق اور دعوتِ صدق والا کلمہ ہے۔[1] اس سے شرک سے براءت اور جہنم سے نجات ملتی ہے اور اسی کے لیے سارے جن وانس پیدا کیے گئے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاريات: ٥٦]

[میں نے جن وانس کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھ اکیلے کو پوجیں]

یہاں پر عبادت سے مراد توحید ہے۔ سارے رسول اور ساری کتابیں اسی لیے آئی ہیں۔ امام ابن عیینہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو کوئی نعمت اس سے بڑھ کر نہیں دی کہ ان کو "لا إله إلا الله" بتایا اور اس سے آگاہ کیا۔ یہ کلمہ جنت والوں کے لیے ایسا ہوگا، جیسے دنیا والوں کے لیے ٹھنڈا پانی ہوتا ہے۔[2] اسی کے لیے ثواب وعذاب کے گھر بنائے گئے ہیں اور اسی کے لیے رسولوں کو جہاد کا حکم دیا گیا ہے، یہی کلمہ رسولوں کی دعوت کی اساس ہے اور یہی کلمہ موسیٰ علیہ السلام کو ذکر کے لیے بتایا تھا۔

---

[1] مسند أحمد (٦٣/١)

[2] تهذيب الكمال (١٩١/١١)

کلمہ توحید کی عظمت:

مسند بزار میں سیدنا عیاض انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''لا إله إلا الله کلمہ حق ہے جو اللہ کے نزدیک بزرگی رکھتا ہے اور اللہ کے ہاں اس کا بڑا مرتبہ ہے۔ یہ کلمہ بہت ہی جامع ہے۔ جس نے اس کو سچے دل سے کہا، وہ جنت میں جائے گا۔''[1]

یہ کلمہ آگ سے بچانے والا اور جنت میں لے جانے والا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک موذن سے سنا وہ کہہ رہا تھا: ''أشهد أن لا إله إلا الله'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ جہنم سے نکل گیا۔''[2] (رواه مسلم)

کلمہ توحید مغفرت کا ذریعہ ہے:

کلمہ توحید سے مغفرت و بخشش ہوتی ہے، چنانچہ مسند احمد میں شداد بن اوس اور عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہما سے روایت ہے:

''ایک روز رسول اللہ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا: ''ہاتھ اٹھا کر ''لا إله إلا الله'' کہو۔'' سب نے ہاتھ اٹھا کر کہا، پھر آپ نے اپنا ہاتھ اٹھا کر کہا: ''اے اللہ! تو نے مجھے اس کلمے کا حکم کیا ہے، یہی کلمہ دیکر مجھے بھیجا ہے اور اس پر جنت کا وعدہ کیا ہے، تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے فرمایا:

«أَبْشِرُوْا! فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ غَفَرَ لَكُمْ»[3] [خوش ہو جاؤ! اللہ نے تمھیں بخش دیا ہے]

کلمہ توحید افضل الحسنات ہے:

اس کلمے کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ یہ افضل حسنات (تمام نیکیوں سے بڑی نیکی) ہے۔

سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ''لا الٰہ الا اللہ'' حسنات میں سے ہے؟'' آپ ﷺ نے فرمایا:

---

[1] كشف الأستار عن زوائد مسند البزار للهيثمي (١٠/١) علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے۔ دیکھیں: (تحقيق كلمة الإخلاص، ص: ٥٠)

[2] صحيح مسلم (٢٨٨/١)

[3] مسند أحمد (١٢٤/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه أحمد، وفيه راشد بن داود، قد وثقه غير واحد، وفيه ضعف، بقية رجاله ثقات" (مجمع الزوائد: ٨١/١٠)

''بلکہ احسن الحسنات ہے، یہ گناہوں اور خطاؤں کو مٹاتا ہے۔''[1]

سنن ابن ماجہ میں سیدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "لا إله إلا الله" کسی گناہ کو چھوڑتا ہے نہ کوئی عمل اس سے سبقت کرتا ہے۔''[2]

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ توحید تمام طاعتوں اور عبادتوں میں اعلیٰ وافضل ہے۔

حکایت:

کسی نے بعض علمائے سلف کو موت کے بعد خواب میں دیکھا اور ان کا حال پوچھا تو انھوں نے کہا: "لا إله إلا الله" نے کوئی چیز باقی نہیں چھوڑی ہے۔

کلمہ توحید تجدیدِ ایمان کا سبب ہے:

دل کے جو اعمال پرانے پڑ جاتے ہیں، ان کو یہی کلمہ تازہ کرتا ہے۔ مسند احمد میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت مروی ہے:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا: ''تم اپنے ایمان کو تازہ کرو۔'' صحابہ نے عرض کی: ''کیسے؟'' فرمایا: کثرت سے "لا إله إلا الله" کہو۔''[3]

کلمہ توحید سب سے زیادہ وزنی ہے:

کوئی چیز وزن میں اس کے برابر نہیں ہے۔ اگر آسمانوں اور زمین کو اس سے وزن کریں تو یہی کلمہ بھاری نکلے گا۔ جیسے سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث میں آیا ہے:

''نوح علیہ السلام نے موت کے وقت اپنے بیٹے سے کہا تھا کہ میں تم کو "لا إله إلا الله" کا حکم دیتا ہوں، اگر ساتوں آسمان اور ساتوں زمینیں ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور "لا إله إلا الله" ایک پلڑے میں تو یہی کلمہ وزنی ہوگا۔ اگر آسمان و زمین چوپائے اور مویشی ہوتے تو یہی کلمہ کہتے۔''[4]

---

[1] مسند أحمد (١٦٩/٥)

[2] سنن ابن ماجه (١٢٤٨/٢) اس کی سند میں "زكريا بن منظور" ضعیف ہے۔

[3] مسند أحمد (٣٥٩/٢) اس کی سند میں "صدقة بن موسى" ضعیف ہے۔

[4] مسند أحمد (٢٢٥/٢)

دوسری مرفوع روایت میں ہے:

''موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''اے رب! مجھ کو ایسی چیز سکھا دے جس سے تجھ کو یاد کروں اور پکارا کروں۔'' اللہ تعالیٰ نے کہا: ''اے موسیٰ! "لا إله إلا الله" کہو۔ کہا: ''اے رب! اس کو تو تیرے سارے بندے کہتے ہیں!'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اے موسیٰ! اگر ساتوں آسمان، ساتوں زمینیں اور ان میں رہنے والے سارے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں اور ''لا الہ الا اللہ'' ایک پلڑے میں، تو یہی پلڑا بھاری ہوگا۔''[1]

اسی طرح یہ کلمہ گناہوں کے نامہ اعمال پر بھی بھاری ہو جائے گا، جیسا کہ مسند احمد، سنن ابن ماجہ اور سنن ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے مرفوع حدیثِ بطاقہ میں آیا ہے۔[2]

مهما تفكرت في ذنوبي
خفت على قلبي احتراقه

[جب بھی میں نے اپنے گناہوں کے بارے میں غور کیا تو مجھے خوف ہوا کہ کہیں میرا دل جل نہ جائے]

لكنه ينطفي لهيبي
بذكر ما جاء في البطاقة

[لیکن حدیثِ بطاقہ کے یاد آنے پر میرے دل کی جلن مٹ جاتی ہے]

اے اللہ! تیرے اس بندۂ ناچیز کے پاس "لا إله إلا الله" کے سوا کوئی خیر ہے نہ کوئی نیکی، تو اس کے اعتقاد و عمل کو اس کلمے کے مطابق کر دے اور اس کے گناہوں سے درگزر فرما۔

کلمہ توحید فوراً دربارِ الٰہی تک پہنچ جاتا ہے:

یہ وہ کلمہ ہے جو سارے پردے پھاڑ کر اللہ پاک تک پہنچ جاتا ہے، چنانچہ سنن ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مرفوع روایت میں مروی ہے:

''لا الہ الا اللہ کے آگے کوئی حجاب حائل نہیں ہوتا، یہاں تک کہ وہ اللہ کے پاس پہنچ جاتا ہے۔''[3]

[1] شرح السنة (٥/ ٥٤) صحيح ابن حبان (٢٣٢٤) المستدرك للحاكم (١/ ٥٢٨)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢١٣، ٢٢٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٧٧٦) سنن ابن ماجه (٢/ ١٤٢٧)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥١٨) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن زیاد بن انعم'' راوی ضعیف ہے۔

نیز سنن ترمذی میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع روایت مروی ہے:

''کوئی بندہ جب اخلاص سے ''لا إله إلا الله'' کہتا ہے تو اس کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ عرش تک پہنچ جاتا ہے، جب تک بندہ کبیرہ گناہوں سے بچتا رہتا ہے۔''[1]

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی مرفوع حدیث میں آیا ہے:

''کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ اس کے اور اللہ کے درمیان حجاب نہ ہو سوائے ''لا إله إلا الله'' کے۔ جس طرح تمھارے دونوں ہونٹ اس کے آگے رکاوٹ نہیں ہوتے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے میں اس کے لیے کوئی چیز حجاب نہیں ہوتی ہے۔''[2]

کلمہ توحید نظرِ الٰہی اور قبولیتِ دعا کا مستوجب ہے:

کلمہ توحید کے فضائل میں یہ بھی ہے کہ اس کے کہنے والے کی طرف اللہ دیکھتا ہے اور اس کی دعا قبول فرماتا ہے۔

امام نسائی رحمہ اللہ نے ''عمل اليوم والليلة'' میں دو صحابیوں سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس نے ''لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير'' [ایک اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اسی کے لیے بادشاہت ہے، اسی کے لیے ساری تعریف ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے] کو روح کے اخلاص اور زبان کی تصدیق سے کہا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے آسمان کو پھاڑ دیتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس کے کہنے والے کی طرف نظر فرماتا ہے اور جس بندے کی طرف اللہ نظر فرمائے، اس کا حق یہ ہے کہ اللہ اس کا سوال پورا کرے۔''[3]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٩٠)

[2] أمالي ابن سمعون (١٧٢) اللآلي المصنوعة (٢/٣٤٥) اس کی سند میں ''عثمان بن عطاء'' راوی ضعیف ہے۔ نیز عطا خراسانی کا ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سماع و لقا بھی نہیں، لہٰذا یہ حدیث ضعیف ہے۔

[3] عمل اليوم والليلة للنسائي (٢٨) الترغيب والترهيب للمنذري (٢/٤١٨)

کلمہ توحید کہنے پر اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق فرماتا ہے:

اس کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کلمے کے قائل کی تصدیق فرماتا ہے، چنانچہ سیدنا ابو ہریرہ اور سیدنا ابو سعید رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بندہ جب ''لا إله إلا الله'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق فرماتا ہے: ''لا إله إلا أنا وحدي'' [میں ہی اکیلا سچا معبود ہوں] بندہ جب کہتا ہے: ''لا إله إلا الله وحده لا شريك له'' [اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے] تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لا إله إلا أنا وحدي لا شريك لي'' [میں اکیلا ہی سچا معبود ہوں، میرا کوئی شریک نہیں] بندہ جب کہتا ہے: ''لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك، وله الحمد'' [اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، اسی کے لیے بادشاہت اور ساری تعریفیں ہیں] تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لا إله إلا أنا وحدي، لا شريك لي، لي الملك، ولي الحمد'' [میں اکیلا ہی سچا معبود ہوں، میرے ہی لیے بادشاہت اور ساری تعریفیں ہیں] بندہ جب کہتا ہے: ''لا إله إلا الله، ولا حول ولا قوة إلا بالله'' [اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں، گناہوں سے بچنا اور نیکی کی قوت اللہ ہی کی توفیق سے ہے] تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''لا إله إلا أنا وحدي، ولا حول ولا قوة إلا بي'' [مجھ اکیلے کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور کسی طرح کی طاقت وقوت میری توفیق کے بغیر نہیں ہوتی] پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''جس نے اس کلمے کو بیماری میں کہا، پھر فوت ہو گیا تو اس کو آگ نہیں چھوئے گی۔''[1]

کلمہ توحید افضل الذکر ہے:

سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''سب سے زیادہ فضیلت والا ذکر ''لا الہ الا اللہ'' ہے۔''[2]

کلمہ توحید قبولیتِ اعمال کی بنیاد ہے:

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

---

[1] عمل اليوم والليلة للنسائي (٣٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٤٣) سنن ابن ماجه (١٢٤٩/٢)

”اللہ کے نزدیک سب سے محبوب کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہے، اس کے بغیر اللہ تعالیٰ کوئی عمل قبول نہیں فرماتا۔“[1]

کلمہ توحید افضل عمل ہے:

غرض کہ یہ کلمہ افضل اعمال اور تمام کلمات سے کئی گنا زیادہ وزنی ہے۔ اس کا کہنا بہت سے غلام آزاد کرنے کے برابر اور شیطان سے پناہ کا ذریعہ ہے۔

صحیحین میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے ”لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك، وله الحمد، وهو على كل شيئ قدير“ ایک دن میں سو بار کہا تو یہ اس کے لیے دس غلاموں کو آزاد کرنے کے برابر ہے، اس کے لیے سو نیکیاں لکھی گئیں اور سو برائیاں معاف ہوئیں اور شیطان سے اسے پناہ ملی۔ کوئی شخص اس سے بہتر کچھ نہیں لایا، مگر جس نے اس سے زیادہ عمل کیا۔“[2]

ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے ان کلمات کو دس مرتبہ کہا، اس نے گویا اولادِ اسماعیل میں سے چار جانوں کو آزاد کیا۔“[3] (رواه الشيخان)

سنن ترمذی میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے ان کلمات میں ”يحيي ويميت و هو حي لا يموت بيده الخير“ [وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے، وہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اس کے لیے موت نہیں ہے، اسی کے ہاتھ میں خیر ہے] زیادہ کرکے بازار میں پڑھا تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک لاکھ نیکیاں لکھتا ہے اور ایک لاکھ برائیاں مٹاتا ہے اور اس کا ایک لاکھ درجہ بلند کرتا ہے۔“[4]

---

1. المجالسة وجواهر العلم للدينوري (٨٣٧) المعرفة والتاريخ (١/ ٢٩٠) اس کی سند میں ”علی بن زید بن جدعان“ ضعیف ہے۔
2. صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٠٣، ٦٤٠٤) صحيح مسلم (٤/ ٢٠٧١)
3. مصدر سابق
4. سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٢٨)

دوسری روایت میں اتنا اور آیا ہے:

''اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بناتا ہے۔''[1]

کلمہ توحید قبر کی وحشت اور حشر کی دہشت سے امان کا سبب ہے:

اس کلمے کی ایک فضیلت یہ بھی ہے کہ وہ قبر کی وحشت اور حشر کی دہشت سے امان کا ذریعہ ہے، چنانچہ مسند احمد وغیرہ میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لا إله إلا الله" والوں پر ان کی قبروں میں اور حشر ونشر میں کوئی وحشت نہیں ہوگی۔ گویا میں دیکھتا ہوں کہ ''لا الٰہ الا اللہ'' والے کھڑے ہوکر اپنے سروں سے مٹی جھاڑتے ہوئے کہہ رہے ہیں: "الحمد لله الذي أذهب عنا الحزن" [سب تعریف اس اللہ کے لیے ہے جس نے ہمارا غم دور کیا][2]

ایک مرسل حدیث میں آیا ہے:

''جس نے "لا إله إلا الله الملك الحق المبين" روزانہ سو بار پڑھا تو یہ اس کے لیے محتاجی سے امان ہوگا، قبر کی وحشت سے سکون ملے گا، وہ تونگری سمیٹے گا اور جنت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔''[3]

یہ کلمہ مومنوں کا شعار ہوگا، جس وقت وہ اپنی قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے۔ نضر بن عربی کا بیان ہے کہ مجھ کو یہ بات پہنچی ہے کہ جب لوگ قبروں سے نکل کھڑے ہوں گے تو ان کا شعار یہی کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ'' ہوگا۔

طبرانی کی مرفوع روایت میں آیا ہے کہ پل صراط پر گزرتے ہوئے اس امت کا شعار لا الٰہ الا اللہ ہوگا۔[4]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٤٢٩)

[2] المعجم الأوسط (٤/٤٣٤) شعب الإيمان (١/٥٦) اس کی سند میں ''عبدالرحمان بن زید بن اسلم'' راوی متروک ہے، لہٰذا یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیں: العلل المتناهية (٢/٩١٤) مجمع الزوائد (١٠/٦٠٢) السلسلة الضعيفة (٣٨٥٣)

[3] تاريخ بغداد (١٢/٣٥٨) تاريخ قزوين (٤/٦٥) اس کی سند میں ''فضل بن غانم'' راوی ضعیف ہے۔

[4] المعجم الأوسط (١/٥٧) اس کی سند میں "ابن لهيعة" ضعیف ہے۔ امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "وفيه من وثق على ضعفه و عبدوس بن محمد لم أعرفه" (مجمع الزوائد: ١٠/٣٦٢) نیز دیکھیں: السلسلة الضعيفة (١٩٧٢)

کلمہ توحید کہنے سے جنت کے آٹھوں دروازے کھل جاتے ہیں:

فضائلِ کلمہ میں سے یہ بھی ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہنے والے کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ جس دروازے سے وہ چاہے، جنت میں جائے۔ یہ مضمون سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں اس شخص کے حق میں بیان ہوا ہے جو شہادتین کو وضو کے بعد پڑھتا ہے۔[1] (رواہ مسلم)

صحیحین میں سیدنا عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول اور کلمہ ہیں، جس کو اللہ نے مریم علیہا السلام کی طرف ڈالا تھا اور اللہ کی طرف سے وہ روح ہیں، جنت وجہنم حق ہیں اور اللہ ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے، جس دروازے سے چاہے، وہ جنت میں جائے۔''[2]

در خلد ز ہر در کہ در آئی خوش ہست

[جنت میں جس دروازے سے بھی جاؤ بہتر ہے]

کلمہ توحید سے جنت کے بند دروازے بھی کھل جاتے ہیں:

عبد الرحمان بن سمرہ کی حدیث جو ایک طویل خواب پر مشتمل ہے، اس میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

'' میں نے اپنی امت کے ایک آدمی کو دیکھا جو جنت کے دروازوں تک پہنچ گیا تھا، لیکن جنت کے دروازے اس کے لیے بند ہو گئے، پھر ''لا إله إلا الله'' کی شہادت نے آکر وہ دروازے کھول دیے اور اس کو جنت میں داخل کر دیا۔''[3]

کلمہ توحید کے سبب جہنم سے نجات مل جائے گی:

کلمے کی ایک فضیلت یہ ہے کہ اہلِ کلمہ، گو جہنم میں جائیں اور اپنے گناہوں کی سزا پائیں، لیکن

---

[1] صحيح مسلم (١/ ٢١٠)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٣٥) صحيح المسلم (١/ ٥٧)

[3] مجمع الزوائد للهيثمي (٧/ ١٨٢، ١٨٣) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني بإسنادين، في أحدهما سليمان بن أحمد الواسطي، وفي الآخر خالد بن عبد الرحمٰن المخزومي وكلاهما ضعيف"

جہنم سے ان کا نکلنا بھی ضروری ہے۔ صحیحین میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ عز وجل فرماتا ہے: میری عزت وجلال اور عظمت کی قسم! میں جہنم سے اس شخص کو ضرور باہر نکالوں گا، جس نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا ہے۔[1]

طبرانی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

''لا الٰہ الا اللہ والوں میں سے کچھ لوگ اپنے گناہوں کی وجہ سے جہنم میں جائیں گے تو ''لات وعزیٰ'' (دو بتوں کے نام ہیں) والے ان سے کہیں گے: تم کو ''لا إله إلا الله'' کہنا کچھ کام نہیں آیا، تب اللہ کو غصہ آئے گا اور ان کو آگ سے نکال کر جنت میں داخل کرے گا۔''[2]

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ حالتِ ناراضی میں یہ احسان فرمائے گا تو حالت رضا مندی میں کس قدر کرم فرما ہوگا۔ جو موحد اپنی توحید میں قاصر بھی ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کے اور مشرک کے درمیان برابری نہیں کرے گا۔

بعض موحد عارفین کے اقوال:

بعض علماے سلف ان الفاظ کے ساتھ دعا کرتے تھے:

''اللهم إنك قلت عن أهل النار إنهم أقسموا بالله جهد أيمانهم لا يبعث الله من يموت، ونحن نقسم بالله جهد أيماننا ليبعثن الله من يموت، اللهم لا تجمع بين القسمين في دار واحدة''

[اے اللہ! تو نے اہلِ جہنم کی یہ بات نقل کی ہے کہ انھوں نے اس بات پر اللہ کی بڑی مضبوط قسم کھائی ہے کہ اللہ مردوں کو قبروں سے نہیں اٹھائے گا اور ہم اس بات پر اللہ کی بڑی مضبوط قسم کھاتے ہیں کہ اللہ ضرور مردوں کو قبروں سے اٹھائے گا۔ اے ہمارے معبود! تو ان دونوں قسموں کو ایک گھر میں جمع نہ کر]

یعنی ہم کو جنت دے اور ان کو جہنم میں لے جا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٥١٠) صحيح مسلم (١/ ١٨٤)

[2] المعجم الأوسط (٢٠٩/٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''رواه الطبراني في الأوسط، وفيه من لم أعرفهم'' (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٨٢)

حکایت:

ابو سلیمان رحمہ اللہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اگر میری بخیلی پر مواخذہ کرے گا تو میں اس سے اس کے جود وسخا کا مطالبہ کروں گا، اگر وہ مجھ سے میرے گناہوں پر مواخذہ کرے گا تو میں اس کی معافی کا مطالبہ کروں گا، اگر وہ مجھے آگ میں ڈالے تو میں آگ والوں کو خبر کروں گا کہ میں اللہ کو چاہتا اور اس سے محبت کرتا ہوں۔ اس کا وصل کس قدر لذت بخش وشیریں تر ہے اور اس کا فراق کتنا گراں تر وسخت تر ہے۔

شأن المحب عجيب في صبابته
الهجر يقتله والوصل يحييه

[عاشق کا حال عشق کے معاملے میں عجیب ہے۔ ایک طرف محبوب کا فراق اسے مارے دیتا ہے تو دوسری طرف اس کا وصل اسے حیاتِ نو سے ہم کنار کرتا ہے]

بعض عارفین اولیا ساری رات رویا کرتے اور کہتے: اے اللہ اگر مجھے عذاب کرے گا تو میں تیرا محبّ ودوست ہوں اور اگر تو مجھ پر رحم فرمائے گا تو بھی میں تیرا محبّ ہوں۔

اگر بخشے زہے رحمت نہ بخشے تو شکایت کیا
سرِ تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

عارفوں کو جتنا حجاب وفراق سے خوف ہوتا ہے، اتنا عذاب سے نہیں ہوتا ہے۔ ذوالنون مصری نے کہا ہے: عذاب کا خوف فراق کے خوف کے مقابلے میں ایسا ہے، جیسا گہرے دریا میں ایک قطرہ!!

اے شب ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

بعض اہلِ معرفت نے کہا ہے کہ اے میرے معبود! تو اگر اپنا پورے کا پورا عذاب مجھے دے گا تو تیرا وہ قرب جو مجھ سے فوت ہوگیا ہے، میرے نزدیک اس عذاب سے زیادہ عظیم ہے۔

اوقات خوش آں بود کہ با دوست بسر شد
باقی ہمہ بے حاصلی وبے خبری بود

[بہتر وقت وہی تھا جو دوست کے ساتھ بسر ہوا، باقی سب کچھ بے کار ٹھہرا]

انتھی کلام شیخ الاسلام مختصراً۔[1]

---

[1] یہاں پر امام ابن رجب رحمہ اللہ کے رسالے "كلمة الإخلاص و تحقيق معناها" سے ماخوذ کلام کا اختتام ہو جاتا ہے۔

کلمہ توحید اور اس کے تقاضے:

بہر حال یہ کلمہ جاہ وجلال اور جملہ کمال وجمال تفصیلی واجمالی طور پر کفر واسلام اور توحید وشرک کے درمیان حد فاصل ہے۔ یہ کلمہ تقوی اور عروہ وثقی (مضبوط کڑا) ہے۔ یہی وہ کلمہ ہے جسے ابراہیم علیہ السلام اپنی نسل میں باقی چھوڑ گئے، تاکہ وہ صحیح راہ پر لگے رہیں۔ اس سے مراد صرف اسے زبان سے کہنا نہیں کہ منہ سے کلمہ کہتے جائیں اور اس کا معنی نہ جانیں، کیونکہ اس طرح تو منافقین بھی یہ کہتے ہیں، حالانکہ وہ کافروں سے بھی اسفل طبقہ جہنم میں ہوں گے، جب کہ وہ نماز پڑھتے، روزہ رکھتے اور صدقہ بھی دیتے ہیں، بلکہ یہاں مراد یہ ہے کہ اس کلمے کو دل سے پہچانیں، کلمہ اور کلمے والوں سے محبت رکھیں اور جو اس کلمے کے مخالف ہوں، ان کو دشمن سمجھیں۔

ایک مرفوع حدیث میں آیا ہے کہ جس نے "لا إله إلا الله" مخلص ہو کر کہا۔ دوسرے لفظ میں ہے کہ "خالص دل سے کہا" تیسرے لفظ میں یہ بھی آیا ہے کہ "اللہ کے سوا معبودوں کا انکار کیا تو وہ جنت میں جائے گا۔"[1]

افسوس ناک صورت حال:

یہ بہت ہی افسوسناک بات ہے کہ اکثر لوگ اس کلمے کے معنی ومطلب سے ناواقف اور بے خبر ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ اس کلمے میں نفی اور اثبات دونوں چیزیں ہیں۔ کلمے کے آغاز میں اللہ کے ما سوا کی الوہیت ومعبودیت کی نفی ہے، چاہے انبیا ہوں، یہاں تک کہ خاتم النبیین، سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم بھی یا ملائکہ ہوں، یہاں تک کہ جبرئیل امین علیہ السلام بھی معبود نہیں ہو سکتے، اولیا وصلحا کا تو کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ کلمے کے آخری جز میں اللہ رب العالمین کے لیے الوہیت ومعبودیت کا اثبات ہے۔ اس الوہیت میں اللہ کے مقربین میں سے کسی کا کچھ حق نہیں ہے۔ جس الوہیت کو اللہ نے خاص اپنے نفس مقدس کے لیے ثابت کیا ہے، اس کی نفی حضرت محمد وجبرئیل علیہما السلام تک سے کی ہے۔ اللہ کی معبودیت میں رائی کے ایک دانے برابر بھی کسی کا حصہ نہیں ہے، اس کو خوب اچھی طرح سمجھنا اور غور کرنا چاہیے۔

دور حاضر اور زمانہ جاہلیت کے مشرکین میں مماثلت:

اس زمانے میں عام لوگوں نے ایک نئی الوہیت رائج کر کے اس کا نام ولایتِ سِرّ بلکہ

[1] ان تمام روایات کی تخریج پہلے گزر چکی ہے۔

''سر السر'' رکھا ہے اور اس سے وابستہ لوگوں کو فقرا، مشائخ، اولیا، اصحاب سر، ارباب سلوک اور اہلِ باطن جیسے الفاظ والقاب سے موسوم کرتے ہیں۔ وہ یہ گمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں ان خواص کو ایسا رتبہ بخشا ہے جس سے عوام ان کے پاس التجائیں کرتے ہیں، ان سے امید وخوف رکھتے ہیں، قضائے حوائج کے لیے ان سے فریاد طلب کرتے ہیں اور ان کو اللہ اور مخلوق کے درمیان وسائط ووسائل مانتے ہیں۔ عوام کا یہ اعتقاد شرک جلی ہے جو کبھی بخشا نہیں جائے گا۔ اس وقت کے مشرک جن کا نام وسائط ووسائل رکھتے ہیں، انھیں کا نام اگلے مشرکین نے ''آلہہ'' رکھا تھا۔ وہ بھی یہی کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے۔ ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ "لا إله إلا الله" کہنے میں ان تمام واسطوں اور وسیلوں کا ابطال وتردید ہے، جن کا نام انھوں نے ''آلہہ'' رکھا تھا۔

اگر اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت ہے تو وہ بھی حاضر ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن کافروں سے لڑے تھے، ان کو قتل کیا تھا، ان کے مال لوٹے تھے، ان کے بچے قید کر لیے تھے اور ان کی عورتوں کو حلال کر لیا تھا، وہ سب توحیدِ ربوبیت کے معترف تھے اور یہ بالکل واضح بات ہے۔ وہ اللہ کی خالقیت، رزاقیت اور مدبریت کا اقرار کرنے کے باوجود داخلِ اسلام اور کفر سے باہر ہوئے نہ ان کے خون و مال حرام ہوئے، حالانکہ وہ حج وعمرہ کرتے، صدقہ دیتے اور اللہ کے ڈر سے بہت سے محرمات وممنوعات سے بچتے بھی تھے، لیکن یہ سب کچھ ان کے کسی کام نہیں آیا، وہ مشرک کے مشرک اور کافر کے کافر ہی رہے۔ ایک بات تو یہ رہی، دوسری بات یہ ہے کہ ان سے لڑائیاں ہوئیں، وہ مارے پیٹے گئے، ان کی عورتیں و بچے پکڑے گئے اور ان کا خون ومال حلال ہوا، جس کا سبب یہ تھا کہ وہ توحیدِ الوہیت کی گواہی نہیں دیتے تھے، یعنی وہ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ اللہ کے سوا اور کوئی دعا، عبادت، خوف ورجا اور استعانت واستغاثے کے لائق نہیں ہے، جس کے لیے جانور ذبح کیا جائے یا نذر مانی جائے، نہ کوئی مقرب فرشتہ اور نہ کوئی نبی مرسل ہی اس کے لائق ہے، بلکہ وہ لوگ اللہ کے علاوہ دوسروں کو بھی اس لائق سمجھتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ جو شخص سختیوں، مصیبتوں، آفتوں، بلاؤں اور طوفانوں میں اللہ کے سوا کسی اور سے فریاد رسی چاہتا ہے، وہ کافر ہے، یا جو کوئی غیر اللہ کے لیے کوئی جانور ذبح کرتا ہے یا نذر مانتا ہے، وہ

کلمۂ توحید کا مخالف اور فعل کفر کا مرتکب ہو جاتا ہے، کیونکہ یہ بعینہٖ وہی شرک و کفر ہے، جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں، بت پرستوں اور آبا واجداد کے اعتقاد پر چلنے والوں سے قتال و جہاد کیا تھا۔

اگر کوئی مشرک یہ کہے کہ ہم تو اللہ ہی کو خالق، رازق اور مدبرِ عالم جانتے ہیں، لیکن یہ صلحا واولیا مقرب الٰہی ہیں، ہم ان کی نذر و نیاز، دعا والتجا اور استغاثہ اس لیے کرتے ہیں کہ ان کی وجاہت وشفاعت اور قرب سے ہم کو اللہ کے غصے وناراضی سے نجات ملے گی اور اللہ کا قرب بھی حاصل ہوگا۔ ہم کب ان کو الٰہ، یا مدبر عالم یا خالق و رازق کہتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات جو تم نے کہی ہے یہ حرف بہ حرف ابوجہل اور ابولہب کا مذہب ہے، کیونکہ جو کفار عیسیٰ، عزیر، ملائکہ علیہم السلام اور اولیا کو ماننے اور پکارنے والے ہیں، وہ بھی یہی کہا کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ٣]

[اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو دوست بنایا، وہ کہتے ہیں کہ ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب پہنچا دیں گے]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ وَ يَقُوْلُوْنَ هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [يونس: ١٨]

[اور یہ مشرک اللہ کے سوا ان کو پوجتے ہیں جو ان کا نقصان وفائدہ نہیں کر سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ لوگ اللہ کے پاس ہمارے سفارشی ہوں گے]

ان آیتوں میں صحیح طور پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار توحیدِ ربوبیت کی گواہی دیتے تھے، اسی طرح نصاریٰ میں بعض لوگ عابد و زاہد، اللہ کی راہ میں صدقہ وخیرات کرنے والے اور لوگوں سے کنارہ کش ہو کر گرجاؤں میں گوشہ نشین رہے، اس کے باوجود وہ اللہ کے دشمن اور دائمی جہنمی قرار پائے، کیونکہ یہ لوگ عیسیٰ علیہ السلام اور دیگر اولیا کو پکارتے اور ان کے لیے جانور ذبح کرتے اور نذر مانتے تھے۔ ان کے علاوہ بعض لوگ ظلمت ونور کی پرستش کرتے ہیں یا کسی اور چیز کے پجاری ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان کے ہنود سے کائنات ومخلوقات میں سے کوئی چیز نہیں بچی، جس کو انھوں نے نہیں

پوجا ہے۔ البتہ ایک اللہ کو نہیں پوجا۔ الغرض غیر اللہ کے پرستار اَن گنت ہیں، اسی طرح موحدِ ربوبیت بھی بے شمار ہیں، مگر ایک قلیل جماعت توحیدِ عبادت و الوہیت کا اقرار کرتے ہوئے بھی اس میں کمزوری وکوتاہی کا شکار اور راہِ ہدایت سے الگ ہے۔

کمالِ توحید:

اس سے معلوم ہوا کہ توحید اسی وقت کامل ہوتی ہے جب وہ اخلاصِ ربوبیت و الوہیت کے ساتھ ہو۔ یہ توحید اِس زمانے میں بلکہ ایک عرصۂ دراز سے اکثر لوگوں میں نایاب بلکہ معدوم ہوگئی ہے۔ یہی مطلب ہے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا «بَدَأَ الْإِسْلَامُ غَرِيبًا، وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ» [اسلام غربت سے شروع ہوا، پھر اسی طرح اخیر میں غریب ہو جائے گا جس طرح شروع ہوا تھا] پھر اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: «فَطُوبٰى لِلْغُرَبَاءِ» [خوشی ہو غریبوں کے لیے][1]

اس حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن اہلِ توحید خالص کے لیے جنت بنائی گئی ہے، وہ بہت تھوڑے ہیں، نیز اس میں مخلص موحدین ومتبعین کے لیے بشارت بھی ہے، جو اگرچہ قلیل التعداد اور شکستہ حال اور لوگوں میں ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

اصلِ دین:

اللہ کے بندو! اللہ کے لیے اپنے اصل دین کو پکڑو، جسے اللہ نے تمھارے لیے پسند کیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس کی طرف تم کو بلایا ہے اور جس کی خاطر وہ مشرکوں سے لڑے تھے۔ اس دین کی جڑ یہی شہادت "لا إله إلا الله" ہے، یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ لوگو! اس کا معنی اچھی طرح سمجھ کر اس پر مضبوطی سے جم جاؤ اور رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرکے لوگوں کو اسی شریعت حقہ کی طرف بلاؤ، اسی بات کو اپنے زمانے والوں میں کلمہ باقیہ کر جاؤ، اتمامِ حجت اور ایضاحِ ہدایت کرکے اہلِ توحید خالص بن جاؤ۔ موحدین کو اپنا دینی بھائی سمجھو، چاہے وہ تمھارے قریب نہ ہوں، بلکہ تم سے دور ہوں۔ طواغیت اور معبودانِ باطلہ کو اپنا دشمن ومعاند بناؤ اور اہلِ طاغوت سے دوستی نہ رکھو، چاہے وہ تمھارے عزیز وقریب ہوں۔

---

[1] یہ حدیث مع حوالہ پہلے گزر چکی ہے۔

مسلمانوں کی حالتِ زار:

اس بیان سے تم نے یہ بات جان لی ہوگی کہ سارے عرب وعجم کے مسلمانوں میں جو مشرکین ہیں، وہ کفر وشرک میں ان مشرکوں سے بڑھ چڑھ کر ہیں جن سے رسول اللہ ﷺ نے قتال کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کافروں کی یہ بات نقل کی ہے کہ وہ مصیبت پہنچنے کے وقت صرف اللہ ہی کو پکارتے تھے، کسی طاغوت یا ولی یا سید کا نام نہیں لیتے تھے، لیکن اس وقت کے مسلمانوں کو دیکھو کہ وہ نزولِ بلا ومصیبت کے وقت غیر اللہ کو پکارتے اور ان سے استغاثہ واستعانت کرتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھیں بڑے علم وفضل کا دعوی ہے، پھر بھی کوئی معروف کرخی رحمہ اللہ کا نام لیتا ہے، کوئی شیخ عبد القادر جیلانی رحمہ اللہ کو پکارتا ہے، کوئی سالار مسعود غازی کو، کوئی شاہ بدیع الدین مدار کو، کوئی شیخ معین الدین چشتی کو، کوئی قطب الدین کاکی کو، کوئی نظام الدین اولیا اور کوئی شیخ فرید گنج شکر کو پکارتا اور اَن داتا کہتا ہے۔ میں نے سمندری سفر میں خود اپنے کانوں سے سنا کہ بادِ مخالف چلنے اور طوفان کے خطرے کے وقت جہاز میں شیخ عیدروس کو "يا محيي النفوس" [اے لوگوں کو زندگی دینے والے] کے لفظ سے پکارا گیا۔ إنا لله ... اللهم اغفرلنا.

حالانکہ ان سارے اولیا سے خلفاے راشدین، صحابہ وتابعین اور تبع تابعین یقینی طور پر بہت بڑے بزرگ اور افضل واولی تھے، پھر ان سب سے جناب رسالت مآب ﷺ بہت ہی اشرف واعلی ہیں، مگر امت کی یہ افضل واعلی ہستیاں اس شرکیہ بلا سے محفوظ اور عافیت میں رہیں۔ جرم وضلالت اور گناہ ومعصیت میں سب سے بدتر انتہائی شنیع وقبیح اور عظیم ترین جرم استغاثہ (غیر اللہ سے فریاد رسی چاہنا) ہے، لیکن یہ بیماری اس قدر عام ہے کہ جگہ جگہ اس کے بدترین مناظر موجود ہیں۔ جدھر دیکھو طاغوتوں، مزاروں، قبر والوں اور سرکش جنوں وشیطانوں سے فریاد کرنے اور مرادیں مانگنے کا بازار گرم ہے۔ کوئی ان کے لیے مرغا، بکرا یا گاؤ ذبح کرتا ہے، کوئی نذر ونیاز لاتا ہے، کوئی منت مانتا ہے، کوئی چراغ روشن کرتا ہے، کوئی پھولوں کی چادر چڑھاتا ہے، کوئی قبر کا گنبد بناتا یا اس کی مرمت کرتا ہے، کوئی دور دور سے چل کر ان کی زیارت کرنے آتا ہے، پھر کوئی قبر پر یا قبر کی طرف سجدہ یا رکوع کرتا ہے، اپنی حاجت مانگتا ہے، کوئی عرس کا نگران ہے، کوئی روحانی فیض حاصل کرانے کا ٹھیکیدار ہے، دراصل ان سب کی بنیاد گرنے والی اور ہلاکت کنارے پر ہے۔ إنا لله...!

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے جنت اور دوزخ کے لیے کچھ لوگ بنائے ہیں اور ان سے وہی کام بن پڑتے ہیں جس کے لیے وہ پیدا کیے گئے ہیں۔ اللہ نے ان کے نام اور ان کے آبا و قبائل کے نام ایک کتاب میں لکھ کر آخر کتاب میں جمع کر کے مہر لگا دی ہے، اب ان میں کوئی زیادہ ہوگا نہ کم۔[1]

اہلِ جنت کی اصل متاع اور اہلِ جہنم کا بنیادی جرم:

اہلِ جنت کی اصل پونجی اللہ پاک کی توحید محض ہے، جو صرف اخلاص و یقین کے ساتھ ثابت ہوتی ہے۔ جو بندہ قیامت کے دن اس توحید خالص کو لے کر آئے گا، وہی اہلِ جنت میں سے ہوگا، جس میں کسی شک اور شبہے کی گنجایش نہیں ہے۔ یہ امر یقینی اور قطعی ہے، گو اس کے گناہ کوہِ قاف کے برابر بلکہ آسمان کی چوٹی تک یا زمین کی تہ تک پہنچ گئے ہوں۔ ولله الحمد، اللّٰهم اجعلنا منهم.

اسی طرح اہلِ جہنم کا بنیادی جرم اور اصل متاع شرک باللہ ہے، چاہے یہ شرک اللہ کے اسما و صفات میں ہو یا خلق و رزق اور ربوبیتِ عالم میں ہو۔ یہ شرک جلی ہو یا خفی، علانیہ ہو یا پوشیدہ، جو کوئی اس شرک پر مرے گا، وہ قطعاً و یقیناً بلا شک و شبہہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں جائے گا، اگرچہ وہ رات دن عبادت کرتا ہو یا علانیہ و پوشیدہ طور پر خیرات و صدقات دیتا رہتا ہو، جس طرح یہود و نصاریٰ اور مجوس و ہنود وغیرہ کیا کرتے ہیں، لیکن جب ان اعمال میں شرک کی ملاوٹ ہوئی یا ریا و نمایش درآئی تو یہ سب اعمالِ خیر بے کار ہو جائیں گے، کچھ کام نہیں آئیں گے، کیونکہ اس کی وہ عبادت غیر اللہ کے لیے تھی، اب وہی اعمالِ صالحہ اس کے لیے وبالِ جان ہو کر موجبِ عذاب ہو جائیں گے۔ عياذاً بالله.

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَقَدِمْنَآ إِلَىٰ مَا عَمِلُوا۟ مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنَٰهُ هَبَآءً مَّنثُورًا ﴾ [الفرقان: ٢٣]

[اور ہم ان کے اعمال کی طرف آئے جو انھوں نے کیے تھے، پس ہم نے ان کو اڑتے ہوئے ذروں کی طرح کر دیا]

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ مَّثَلُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟ بِرَبِّهِمْ ۖ أَعْمَٰلُهُمْ كَرَمَادٍ ٱشْتَدَّتْ بِهِ ٱلرِّيحُ فِى

---

[1] حدیث کا پہلا حصہ صحیح مسلم (٤/ ٢٠٥٠) میں ہے اور بقیہ حصہ مسند أحمد (٢/ ١٦٧) اور سنن الترمذي (٣/ ٣٠٥) میں مروی ہے۔

يَوْمٍ عَاصِفٍ لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ﴾

[إبراهيم: ١٨]

[جن لوگوں نے مالک کو نہیں مانا، ان کے اعمال کا حال اس راکھ کی طرح ہے جس پر آندھی کے دن زور کی ہوا چلے، انھوں نے جو کچھ کیا ہے اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہوں گے، یہی پرلے سرے کی تباہی ہے]

کلمہ طیبہ کا معنی:

پہلے گزر چکا ہے کہ کلمہ طیبہ کا معنی دو چیزوں کو شامل ہے: ایک نفی اور دوسرا اثبات، یعنی اللہ کے ماسوا سے الوہیت کی نفی کرنا اور اللہ وحدہ لا شریک لہ کے لیے الوہیت کو ثابت کرنا۔ اس الوہیت میں کسی فرشتے، نبی، ولی اور صالح شخص کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ [مريم: ٩٣]

[آسمان و زمین میں جتنے لوگ ہیں سب اللہ کے یہاں غلام بن کر حاضر ہوں گے]

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ کوئی مخلوق کتنے ہی بلند مرتبے والی ہو اور کیسے ہی اونچے درجے تک پہنچی ہوئی ہو، چاہے فرشتہ ہو یا پیغمبر، استاد ہو یا پیر، ولی صالح ہو یا امیر کبیر، اس کے لیے اس سے زیادہ کوئی شرف نہیں ہے کہ وہ معبودِ مطلق فردِ واحد کا ایک بندۂ ناچیز ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ وَ مَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبياء: ٢٩]

[اور ان میں سے جو کہے کہ اللہ کے سوا میں معبود ہوں تو ہم اس کو جہنم کی سزا دیں گے]

آج تک کسی بندۂ صالح نے یہ نہیں کہا ہے کہ میں معبود ہوں، نہ اس نے اللہ کی عبادت میں اپنی شرکت کا دعویٰ کیا ہے اور نہ اس کی ذات وصفات میں اپنے آپ کو شریک بتایا ہے۔ ان کو تو ان ظالموں اور مشرکوں نے زبردستی اپنی طرف سے معبود قرار دے دیا اور بداعتقادی سے ان کے معتقد و مرید، دست نگر اور فقیر و سائل بن گئے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جن کو یہ جاہل پوجتے مانتے اور سفارشی سمجھتے ہیں، خود انھوں نے اپنے مقالوں، وعظوں اور کتابوں میں ان افعال واعتقادات کو خالص شرک وکفر لکھا

ہے اور کہا ہے کہ ان کاموں کو کرنے والا مشرک، بد دین، کافر اور خارج از ایمان ہے۔

لفظِ ''اللہ'' کا معنی:

لفظِ ''اللہ'' بہت ہی مبارک، مقدس، مطہر، منور اور معطر لفظ ہے۔ اس کا معنی ''معبود'' ہے۔ اسم جلالہ (اللہ) کے اس معنی پر تمام سلف وخلف اہلِ علم کا اجماع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس نے کسی چیز کو پوجا، اس نے اللہ برحق اور معبود مطلق کے سوا اس چیز کو اپنا اللہ بنایا، جو بالکل باطل وفاسد اور اس دین حنیف کے مخالف و مغایر ہے، جس کے لیے آدم علیہ السلام سے رسول خاتم صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے رسول آئے اور قرآن پاک تک ساری کتابیں نازل ہوئی ہیں، پھر سارے ہنگامے، دھوم دھام اور جہاد وقتال اسی کے لیے تو واقع ہوئے ہیں۔ اس کلمہ مسعود اور جملۂ محمود ''لا الٰہ الا اللہ'' میں جو معبود مراد ہے، وہ ''اللہ أحد صمد'' ہے، جو کسی کا باپ ہے نہ کسی کی اولاد، اس جیسا کوئی بھی نہیں ہے، اسی اکیلے یکتا کی عبادت کرنی چاہیے تھی، مگر مشرکوں، ظالموں اور بدعہدوں نے خشکی وتری میں دوسروں کی عبادت اختیار کرلی اور غیر اللہ سے مدد مانگنے لگے، اولیا، صلحا واتقیا سے فریاد رسی کرنے لگے اور یہ نہ سمجھے کہ مصیبت وآفت کے وقت کسی کو پکارنا اور اس کا نام لینا یہی تو اللہ کے ماسوا کی عبادت ہے۔ سوچنے کی بات ہے کہ کسی غائب اور مردہ مخلوق کو پکارنا کہاں کی دانش مندی ہے؟ جسے خود معلوم نہیں ہے کہ وہ کب اٹھایا جائے گا؟ اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟ اللہ جو معبود حقیقی، حاضر وناظر، نافع وضار، متصرف ومختار، معطی ومانع، کاشف ضرا، دافع بلایا اور قاضی حاجات ہے، اس کو چھوڑنا دیدہ ودانستہ مشرک ہونا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ﴾ [المائدة: ٧٦]

[کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ایسے کو پوجتے ہو جو نہ تمھارے برے کا مالک ہے نہ بھلے کا، اور اللہ تعالیٰ ہی سنتا جانتا ہے]

﴿مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ کا معنی:

اس آیت میں لفظ ﴿دُوْنِ﴾ اللہ کے سوا ہر چیز کو شامل ہے، چاہے حیوان ہو یا جمادات

ونباتات، صالح ہو یا طالح، ان میں سے کسی کو بھی پکارنا، اس کو اللہ بنانا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود عیسی علیہ السلام سے الوہیت کی نفی کر کے ان کی عبدیت کا اثبات کیا ہے تو اولیا وصلحا اور مشائخ وعلما کس قطار میں آسکتے ہیں؟ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار سے جہاد کیا تھا تو ملائکہ وانبیا وصلحا کے معتقدین اور احجار واشجار اور قبور کے پجاریوں کے درمیان کوئی فرق نہیں فرمایا تھا۔ سب کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا تھا اور ایک ہی طرح پچھاڑ کر سب کی کھالیں اتاریں۔ سب پر کسی فرق کے بغیر شرک وکفر کا حکم لگایا۔ یہ بات بحمد اللہ تعالیٰ نہایت واضح وروشن ہے۔ جس کو ذرا بھی ادراک ہے یا ذرا سی عقل یا دین کا کچھ علم وفہم ہے، وہ اس بات کو خوب جانتا پہچانتا ہے۔

شرک کا انجام:

شرک کی قسموں میں ایسی اشیا بھی ہیں جن کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سالہا سال کے بعد پہچانا تھا، پھر بھلا وہ کون ہے جس کو بتائے بغیر اقسام شرک کی شناخت ہو جائے؟ جب کہ اللہ نے اپنے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہا ہے:

﴿ فَاعْلَمْ أَنَّهُ لَآ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ﴾ [محمد: ١٩]

[اے نبی یقین رکھئے کہ اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے اور اپنے گناہ کی بخشش مانگتے رہیے]

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ وَلَقَدْ أُوْحِيَ إِلَيْكَ وَإِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ أَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٦٥]

[تمھاری طرف اور تم سے پہلے کی طرف یہ حکم بھیجا جا چکا ہے کہ اگر (اللہ کے ساتھ) شرک کروگے تو تمھارا عمل برباد ہو جائے گا اور تم نقصان میں پڑ جاؤ گے]

جب نبی ورسول کا حال یہ ہے تو پھر کسی اور کی کیا ہستی وحقیقت ہے جو دم مار سکے اور بڑھ بڑھ کر باتیں بنائے؟ ان آیتوں میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ شرک اعمال صالحہ کو اکارت کر دیتا ہے۔ کوئی عمل کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو، مگر مشرک کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کا کیا کرایا ہوا سب غارت واکارت ہے۔ بالفرض پیغمبر ہی کیوں نہ ہو، بلکہ افضل انبیا ہو، اس کے لیے بھی یہی حکم ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام کے بیٹے پیغمبر تھے، اس کے باوجود ان کو تاکیدی حکم دیا گیا تھا:

﴿ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ۱۳۲]

[موت کے وقت تم مسلمان ہی رہ کر مرنا]

لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت کی تھی:

﴿ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ۱۳]

[اے میرے بیٹے! کسی کو اللہ کا شریک مت بنانا، بے شک شرک بہت بڑا گناہ ہے]

خود ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی تھی:

﴿ وَ اجْنُبْنِيْ وَ بَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ﴾ [إبراهيم: ۳۵]

[اور مجھ کو اور میرے بیٹوں کو بتوں کی پرستش سے بچائے رکھ]

غور کرنے کا مقام ہے کہ جب ابو الانبیاء ابراہیم علیہ السلام کو اپنی جان اور اپنی اولاد پر، جو پیغمبر تھی، شرک کا اندیشہ ہوا تو ہم جیسے افراد و عوام کے لیے کتنا خطرہ ہو سکتا ہے جو نبی ہیں نہ رسول؟ بلکہ اللہ نے اکثر لوگوں کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اور وہ اندھے بہرے ہو گئے ہیں۔ میرے بھائی تم پر تو اللہ نے احسان کیا ہے کہ تم ایمان لائے ہو اور ابراہیم علیہ السلام نے تمھارا نام مسلمان رکھا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ﴾ [الحج: ۷۸]

[اسی نے پہلے سے تمھارا نام مسلمان رکھا ہے]

عبدیت کا تقاضا:

اب تمھارا فرض ہے کہ ایک واحد قہار کو معبود سمجھو اور وہی اعتقاد رکھو جو سارے انبیا و رسل کا اعتقاد تھا اور جس پر اوّل سے تا آخر تمام پیغمبروں نے اجماع کیا ہے، یعنی توحیدِ الوہیت کا اعتقاد اصل دین ہے۔ اس لیے قیل و قال، سوال و اشکال اور بے بنیاد خیالات کو چھوڑ کر اکیلے اللہ پاک کے بندے بن جاؤ۔ اللہ کے بندے بنو، ورنہ کچھ نہ بنو۔ اللہ کی معبودیت اور تمھاری عبدیت کا یہ تقاضا ہے کہ خوف و رجا، حب و بغض، طمع و حرص؛ سب اللہ ہی کے لیے ہو۔ اہلِ شرک اور انواعِ شرک سے نفرت و بے زاری رہے۔ جو شخص اللہ کے سوا اور کی محبت میں ڈوبا ہوتا ہے، وہ اس محبوب کو اللہ کا ہم سر سمجھتا ہے اور وہ مشرک ہو جاتا ہے۔

علما و مشائخ کے لیے وعید:

جو علما و مشائخ ایسے اعمال و افعال اور احوال و اقوال پر سکوت اختیار کرتے ہیں، وہ عوام الناس اور جہلائے خلق میں داخل ہیں۔ فرمایا:

﴿ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ﴾ [الأعراف: ۱۷۹]

[یہ لوگ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں]

ایسے ہی مولویوں اور درویشوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِنْدَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ ﴾ [الأنفال: ۲۲]

[سب جانوروں میں بدتر اللہ کے نزدیک بہرے گونگے ہیں]

حقیقت میں یہ لوگ علما ہیں نہ مشائخ، بلکہ اللہ کی مخلوق میں سب سے بڑے جاہل ہیں۔ شرکیہ امور میں ان کی خاموشی کا مطلب باطل اور ناجائز طریقے سے مال کھانا اور وصول کرنا ہے۔ درحقیقت وہ انسان کے بھیس میں شیاطین ہیں۔

اینکہ می بینی خلاف آدم اند
نیستند آدم غلاف آدم اند

[یہ جنھیں آدمی دیکھ رہے ہو، آدمی نہیں بلکہ آدمی کا خول ہیں]

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ان کا حال اس طرح واضح کر دیا ہے جس میں کسی صاحبِ بصیرت کو کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا ہے، چنانچہ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ﴾ [التوبة: ۳۴]

[اے مسلمانو! بیشک بہت سے علما و مشائخ ناحق طریقے سے لوگوں کے مال کھاتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں]

اس آیت میں ''احبار'' سے مراد علما ہیں اور ''رہبان'' سے مراد مشائخ ہیں۔ یہ آیت اگرچہ یہود و نصاریٰ کے حق میں آئی ہے، لیکن اعتبار عمومِ لفظ کا ہوتا ہے، خصوصِ سبب کا نہیں۔

اسی لیے حدیث میں آیا ہے:

«لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ»[1]

[تم لوگ پہلی امتوں کے طریقے پر چلوگے، بالکل اس طرح جیسے ایک بالشت دوسرے بالشت اور ایک بازو دوسرے بازو کے برابر برابر ہوتا ہے]

جو لوگ دین کے چور، شرع کے مفسد اور توحید کے دشمن ہیں، ان کی مذمت پر قرآن وحدیث دونوں متفق ہیں۔ جس کو اللہ نے عقلِ مستقیم اور قلبِ سلیم دیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ اللہ کی حمد کرے کہ اسلام جیسی نعمت سے اس نے نوازا ہے۔ اسے اگر کوئی مشکل پیش آئے تو اہلِ ذکر سے دریافت کرے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ [النحل: ٤٣]

[اگر نہیں جانتے ہو تو اہلِ ذکر سے پوچھ لو]

مذکورہ آیت میں "اہلِ ذکر" سے مراد اہلِ قرآن وحدیث ہیں۔

مدحِ رسالت میں غلو:

بعض شعرا وغیرہ نے مدحِ رسالت میں ایسا مبالغہ اور استغاثہ کیا ہے، جو حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم مداح نبوت ہیں، حالانکہ وہ شرکِ خفی میں بلکہ جلی میں جا گرے ہیں، جیسا کہ صاحبِ قصیدہ بردہ نے کہا ہے:

يا أكرم الخلق ما لي من ألوذ به
سواك عند حدوث الحادث العمم

[اے مخلوق میں سب سے بزرگ (رسول ﷺ) عام مصیبت نازل ہونے کے وقت میرے لیے آپ کے سوا کوئی جاے پناہ نہیں ہے]

"قصیدہ ہمزیہ" میں بھی اس طرح کی بہت سی کارروائی ہوئی ہے۔ فارسی اور اردو میں مبالغہ اور غلو حد سے زیادہ کر دیا گیا ہے۔ تعجب ہے کہ کیا نعتِ رسول شرک کے ارتکاب کے بغیر ادا نہیں ہو سکتی ہے؟ کیا شرک قول میں نہیں ہوا کرتا ہے؟ آیا وہ صرف فعل ہی میں ہوتا ہے؟ درحقیقت اس

[1] یہ حدیث مع حوالہ پہلے گزر چکی ہے۔

طرح کا نعتیہ کلام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کمال بے ادبی ہے۔ قرآن وحدیث میں رسالت مآب ﷺ کے جو اوصاف ونعوت آئے ہیں، ان سے زیادہ وصف ومدح کوئی کیا بیان کر سکتا ہے؟

﴿ وَ مَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ﴾ [الأنبياء: ١٠٧]

[اے نبی! ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے]

مذکورہ آیت ایسی ہے کہ اس کے مقابلے میں سارے جہان کے مدائح کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہیں۔ آپ کے اوصاف میں سید ولدِ آدم، شفیعِ امم، خاتم الانبیاء اور سید الرسل جیسے القاب مدح کے لیے کچھ کم ہیں؟ رسول اللہ ﷺ تو اللہ کے ماسوا سے استغاثہ کرنے کو منع کرنے کے لیے آئے تھے، لیکن یاروں نے خود آپ ﷺ سے استغاثہ کرنا آپ کی مدح سمجھ لیا۔ رسول کو مرسل کے برابر اور عبد کو معبود بنا دیا۔ إنا للّٰه...!

کتاب ''قاموس'' میں لکھا ہے:

''التوحيد إيمان بالله وحده''[1] [توحید کا معنی صرف ایک اللہ پر ایمان لانا ہے]

[1] القاموس المحيط للفيروز آبادي (ص: ٤١٤)

تیسرا باب

موحدین کے درجات اور مشرکین کے درکات کا بیان

توحید کے کئی درجے ہیں جنھیں طے کر کے موحد شخص بلند مقام تک پہنچتا ہے۔

پہلا درجہ:

ان میں سے ایک توحیدِ الوہیت کا اقرار واعتراف ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ساری عبادت ایک اللہ کے لیے ہو اور ہر قسم کے شرک کی نفی ہو۔ اس دعوی کی بعض دلیلیں شرح و بیان کے ساتھ پہلے گزر چکی ہیں۔

دوسرا درجہ:

یہ ہے کہ الوہیت سے مراد عبادت ہے اور عبادت کے معنی توحید کے ہیں۔ قرآن مجید میں عبادت ہر جگہ اسی معنی میں آیا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظاہری وسری اور قلبی وبدنی ساری عبادت خالص اللہ کے واسطے ہو اور غیر کا تصور بھی جی میں نہ آئے۔ استعانت ہو یا استعاذہ، ذبح ہو یا نذر، دعا ہو یا التجا، طواف ہو یا کوئی اور طاعت؛ ہر ایک صرف اللہ کے لیے ہو، کسی غیر کے لیے نہیں۔

تیسرا درجہ:

یہ ہے کہ الوہیت کے ساتھ ربوبیت کا بھی اقرار ہو، تاکہ مشرکین سے موحد الگ ہو جائیں، کیونکہ صرف اسی ایک توحیدِ الوہیت میں سارے مشرکین اس کے شریک ٹھہراتے ہیں، لیکن صرف توحیدِ ربوبیت کے اعتراف سے وہ داخل اسلام نہیں ٹھہرتے اور نہ کفر سے باہر ہوتے ہیں۔ قرآن پاک میں اس کی دلیلیں بے حساب ہیں۔

چوتھا درجہ:

یہ ہے کہ اسم جلالہ (اللہ) سے مراد معبود ہے، اس پر اہلِ علم کا اجماع ہے۔ قرآن مجید کی بہت

سی آیتیں بھی اس پر دلالت کر رہی ہیں۔ صوفیہ میں جو وحدۃ الوجود کے قائل ہیں، وہ کہتے ہیں کہ "لا إله إلا الله" کا کلمہ "لا موجود إلا الله" کے معنی میں ہے، جو بالکل باطل ہے۔

پانچواں درجہ:

پانچواں درجہ یہ ہے کہ دعا عبادت کے معنی میں ہے، بلکہ وہ عبادت کا مغز اور افضل عبادت ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

«أَكْرَمُ شَيْئٍ عَلَى اللّٰهِ الدُّعَاءُ»[1] [اللہ کے نزدیک اشرف چیز دعا ہے]

دوسری حدیث میں ہے کہ "افضل عبادت دعا ہے۔"[2] (اس کو حاکم نے صحیح کہا ہے)

ایک اور حدیث میں یوں آیا ہے کہ "دعا ہی عبادت ہے۔"[3] (اس کو ترمذی نے روایت کیا ہے)

اس حدیث کے الفاظ حصر پر دلالت کرتے ہیں، جس سے دعا کی افضلیت اور عبادات میں اس کی عظمتِ شان کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ توحید کی خاص چیز دعا ہے، لہٰذا جو کوئی اللہ کے سوا کسی اور کو پکارتا ہے یا اس سے کچھ مانگتا ہے، وہ مشرک ہے۔ غیر اللہ کو پکارنا بلا شک وشبہہ شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً ﴾ [الأعراف: ٥٥]

[اپنے رب کو گڑ گڑا کر اور چپکے سے پکارو]

پھر فرمایا:

﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ﴾ [الأعراف: ٥٦]

[اور اپنے رب کو ڈر کر اور امید رکھ کر پکارو]

اس جگہ دعائے عبادت اور دعائے مسئلہ دونوں کو جمع فرما دیا ہے۔ یہ دونوں اللہ کے ساتھ خاص ہیں، اس کے علاوہ کسی کے لائق نہیں ہیں، یعنی عبادت بھی اسی کی کرو اور سوال بھی اسی سے کرو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

1. سنن الترمذي (٥/١٢٥) سنن ابن ماجه (١: ٢/١٢٥٨)
2. المستدرك للحاكم (١/٤٩١)
3. سنن الترمذي (٢، ٥/ ١٦٢) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (١٢٥٨) مسند أحمد (٤/ ٢٦٧)

﴿أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ﴾ [البقرة: ١٨٦]

[جب دعا کرنے والا مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں قبول کرتا ہوں]

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں پر دعا ندا اور سوال کے معنی میں ہے، کیونکہ انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگر ہمارا رب قریب ہو تو ہم چپکے چپکے مانگیں اور اگر دور ہو تو اس کو پکاریں، اسی بات پر یہ آیت نازل ہوئی۔ معلوم ہوا منادیٰ (پکاری جانے والی ہستی) اللہ ہی ہے، جس نے اس کے سوا کسی اور کو پکارا یا اس سے کچھ مانگا تو اس نے کھلا شرک کیا۔ قصہ آدم وحوا علیہما السلام میں آیا ہے کہ ان دونوں نے اللہ سے یہ دعا کی تھی کہ اگر تو ہم کو ولد صالح دے گا تو ہم تیرا شکر بجا لائیں گے، جب اللہ نے بچہ دیا تو انھوں نے شرک کیا۔[1] ان سے یہ شرک طاعت میں ہوا تھا، عبادت میں نہیں۔

مفسرین نے دعا کے پانچ معنی حسب مقام ہر آیت کے تحت لکھے ہیں، لیکن دعا کے اصل معنی ایمان ہیں۔ قاموس میں ہے: "الدعاء رغبة إلى الله"[2] دعا کے معنی اللہ کی طرف جھکنا اور ذلت وعاجزی سے مانگنا ہے۔

مشہور معنی یہ ہے کہ اللہ رفیع الدرجات کے سامنے حاجات کو پیش کرنا۔ احادیث میں اس بات پر سخت وعید اور ممانعت بھی آئی ہے کہ کوئی آدمی کسی سے مال کا سوال کرے، جب کہ اس کے پاس صبح وشام کا کھانا موجود ہو۔ اب اگر کوئی شخص مردوں سے قضاے حاجات کا سوال کرتا ہے اور خالقِ ارض وسماوات سے نہیں مانگتا تو یہ کب اور کیسے جائز ہوسکتا ہے؟ یہ تو بالکل شرک ہوا۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ﴾ [الأحقاف: ٥]

[اور اس سے بڑھ کر گمراہ کون ہوگا جو اللہ کے سوا ان کو پکارتے ہیں جو قیامت تک ان کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے، وہ تو ان کا پکارنا سنتے تک نہیں ہیں]

یہ آیت محل نزاع میں نص اور اس بات پر دلیل ہے کہ دعا عین عبادت ہے اور عبادت عین دعا

[1] اس قصے میں مذکور ہے کہ انھوں نے بیٹا ملنے پر اسے شیطان کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کا نام "عبد الحارث" رکھا تھا، لیکن یہ روایت ضعیف سند سے مروی ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

[2] القاموس المحيط (ص: ١٦٥٥)

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [يونس: ١٠٦]

[اللہ کے سوا ایسی چیز کو نہ پکارو جو تمھارا فائدہ ونقصان نہیں کر سکتی، اگر ایسا کرو گے تو تم بھی اس وقت ظالموں میں سے ہو گے]

معلوم ہوا کہ دعا عبادت ہوتی ہے اور غیر اللہ کی عبادت ظلم ہے اور ظلم شرک ہے۔ عمومِ آیت سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مدعو (جسے پکارا جائے) کوئی بھی ہو، فرشتہ یا نبی یا نیک بزرگ؛ ان میں سے کسی کو نہیں پکارنا چاہیے، کیونکہ نہی تحریم کے واسطے آئی ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ کسی مدعو کو داعی (پکارنے والے) کے نفع وضرر پر قدرت حاصل نہیں ہے، اس پکارنے سے بے فائدہ شرک میں گرفتار ہونا ہے۔ یہ آیت قبر پرستوں، پیر پرستوں اور ان کے اعتقاد وعمل کا رد کرتی اور یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ یقینی طور پر مشرک ہیں، اسی لیے اللہ نے ایسے پکارنے والوں کو کافر فرمایا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ [المؤمنون: ١١٧]

[جو کوئی اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں ہے، تو اس کا حساب اللہ کے یہاں ہونا ہے، بیشک کافر فلاح نہیں پا سکیں گے]

غرض کہ دعا دین ہے اور خالص دعا ہی توحید ہے، غیر اللہ سے دعا وسوال شرک ہے۔ اگر کوئی کہے کہ اگر یہ شرک ہے تو شرک اصغر ہے نہ کہ شرک اکبر، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ دوسرے پکارے جانے والوں کی طرف سے نفع وضرر حاصل ہونے کا اعتقاد رکھ کر قضائے حاجات، مظلوم کی فریاد رسی، بیمار کی شفایابی اور ادائے قرض وغیرہ کے لیے غیر اللہ کو پکارنا ہی مشرکین عرب کا طریقہ اور یہی ان کی عبادت تھی اور یہی ان کا شرک تھا، جس کے نتائج وثمرات اور فروع واَشکال بہت سے ہیں۔

چھٹا درجہ:

توحید کا یہ درجہ اس کے بالکل متضاد ہے، یعنی غیر اللہ کی عبادت شرک محض اور کفر خالص ہوتی

ہے، جسے شرک اکبر کہا جاتا ہے، اس کی وجہ سے غیر اللہ کے پجاریوں کا خون و مال حلال ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے جہنمی قرار پاتے ہیں۔ جب کسی کو دعوتِ توحید پہنچ گئی اور اس پر حجت قائم ہو گئی، لیکن پھر بھی وہ شرک پر جما رہا اور کفر کا اظہار کرتا رہا تو وہ کافر و مشرک ہو گیا۔ اب اس کی نجات کی کوئی صورت باقی نہیں رہی، سوائے اس کے کہ وہ توبہ کرے اور اسلام لائے۔ اگر نام کا مسلمان ہے تو تجدیدِ اسلام کرے۔ احادیثِ نبویہ میں کلمہ توحید کے لیے کچھ قیود و شروط بیان ہوئی ہیں۔ انسان جب ان میں غور کرے گا تو ضرور اپنی جان کی ہلاکت سے ڈرے گا۔ اس صورت میں شرک و کفر اور طغیان والوں کا کیا حال بنے گا؟ اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے، مثلاً توحید کی شروط میں ایک شرط یہ ہے کہ اللہ کی معبودیت میں کسی طرح کا شک و شبہہ نہ کرے، متکبر نہ بنے، راہِ اعتدال سے تجاوز کر کے ظلم و جور کی طرف مائل نہ ہو، کلمہ اس کو گناہوں سے روکے اور وہ کلمے کو اخلاصِ قلب سے کہے۔

بعض ائمہ نے کہا ہے کہ تم علم کی اس کی قیود سمیت حفاظت کرو، بلکہ ائمہ اربعہ نے تصریح کی ہے کہ مانعِ زکات یا تارکِ صلات یا تارکِ اذان یا تارکِ نمازِ عیدین سے قتال کرنا واجب ہے، اس لیے کہ یہ شعائرِ اسلام ہیں، پھر اس جگہ اہلِ شرک و کفر سے قتال میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ بلکہ بعض نے اس پر اجماع بھی نقل کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ پانچ امور جن پر اسلام کی بنیاد ہے، ان میں سے جس کو بھی قدرت ہوتے ہوئے بلا عذر قصداً ترک کرے گا، احادیث صحیحہ کی رو سے کافر ہو جائے گا، چاہے نماز کا ترک ہو یا زکات یا روزے یا حج کا۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان اعمال کے ترک سے کفر لازم آتا ہے تو توحید و اخلاص کو ترک کرنے سے شرک کیوں لازم نہیں آئے گا؟

ساتواں درجہ:

ساتواں درجہ یہ ہے کہ کوئی یہ کہے کہ یہ آیتیں اور حدیثیں ان کفار و مشرکین اور اصنام و اوثان کے پجاریوں کے بارے میں آئی ہیں جو اللہ و رسول سے محاربہ و مخاصمہ کیا کرتے تھے، لہٰذا ان کا مصداق مومنین کو ٹھہرانا غلط ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مشرکین اولین اور مشرکین آخرین کے درمیان علت جامعہ (شرک باللہ) موجود ہے، پس دونوں کا حکم بلا فرق ایک ہی ہوگا، کیونکہ جامع موجود ہے اور فارق معدوم۔ اصول میں یہ قاعدہ مقرر ہو چکا ہے کہ عمومِ لفظ کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ خصوصِ سبب کا۔ سارے شرائع و احکام کا مدار اسی قاعدے پر ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

«حُكْمِي عَلَى الْوَاحِدِ كَحُكْمِي عَلَى الْجَمَاعَةِ»[1]

[ایک شخص پر میرا حکم جماعت پر حکم کی طرح ہے]

بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ کسی گذشتہ قصے کے بارے میں جو حکم کسی خاص سبب کی بنا پر نازل ہوا ہے، وہ لازم ہے نہ کہ متعدی الی الغیر، تو یہ قول سب سے بڑا باطل اور سب جھوٹوں میں سے بڑا جھوٹ ہے، اس سے سارے احکام شرعیہ کا معطل ہونا لازم آتا ہے، کیونکہ حدود و جنایات اور مواریث و دیات کی آیات خاص واقعات و معاملات کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو گزر چکے ہیں اور ان معاملات والے بھی دنیا سے رخصت ہو گئے ہیں جن کے حق میں وہ آیتیں نازل ہوئی تھیں، لیکن ان کا حکمِ عام قیامت تک کے لیے باقی ہے۔ عام اپنے سبب پر محدود نہیں ہوتا ہے۔ مکلّف معدوم سے شرعی خطابات کا تعلق ایک معنوی تعلق ہے اور مکلّف موجود ہر دور میں ان کا مخاطب ہوا کرتا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بنی اسرائیل کے بارے میں نازل شدہ آیات سے متعلق کہا ہے:

"إنه علينا مثلهم" [یہ انھیں کی طرح ہمارے لیے نازل ہوئی ہیں]

بعض لوگوں کا کہنا ہے:

"نعم الإخوة بنو إسرائيل إذا كان كل حلوة لكم، ولهم كل مرة"

[بنی اسرائیل کیا اچھے بھائی ہیں کہ ہر میٹھا تمھارا اور ہر کڑوا ان کے لیے ہوتا]

اصولِ فقہ میں لکھا ہے کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک پہلی شریعتیں ہمارے لیے بھی شریعت ہیں۔[2] امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک شرط یہ ہے کہ پہلی شریعتوں کی تقریر و تصدیق ہماری شریعت میں وارد ہوئی ہو۔ اس میں شک نہیں ہے کہ ہماری شریعت میں ان مسائل کو مقرر رکھا گیا ہے اور اس پر کتاب و سنت بھی ناطق ہیں۔ یہ تو مذکورہ بالا سوال کا جواب ہے۔ رہا یہ مسئلہ کہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں سے منع فرمایا ہے اور جس بات پر مشرکینِ عرب سے قتال کیا تھا، نیز ان کے بارے میں قرآن کی محکم آیتیں نازل ہوئی تھیں اور وہ منسوخ نہیں ہیں، تو یہ احکام و مسائل اول و آخر سب کے لیے یکساں ہیں، بلکہ

---

[1] امام شوکانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "حديث: « حُكْمِي عَلَى الْوَاحِدِ حُكْمِي عَلَى الْجَمَاعَةِ » قال العراقي في تخريج البيضاوي: لا أصل له، انتهى، وقد ذكره أهل الأصول في كتبهم الأصولية، واستدلوا به فأخطأوا، وفي معناه مما له أصل: « مبايعتي لامرأة كمبايعتي لمائة امرأة » وهو في الترمذي" (الفوائد المجموعة، ص: ٢٠٠)

[2] دیکھیں: روضة الناظر لابن قدامة (١/١٦١)

پہلی امتوں کے حق میں نازل ہونے والی آیات ہمارے ہی حق میں اتری ہیں، کیونکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ عمومِ الفاظ کا اعتبار ہوتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن پاک میں ایسی آیتیں ہیں جو خاص طور پر انبیا بلکہ افضل الانبیا اور اس امت کے مومنین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ ان میں یہ واضح طور پر بتایا بلکہ خبر دار کیا گیا ہے کہ شرک سے اعمالِ صالحہ تباہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ﴾ [الزمر: ٦٥]

[اے پیغمبر اگر شرک کرو گے تو تمھارا عمل برباد ہو جائے گا]

یہ خطاب خاص رسول اللہ ﷺ کو ہے، نیز فرمایا ہے:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [یوسف: ١٠٦]

[اکثر لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، پھر بھی وہ شرک کرتے ہیں]

اس آیت میں خاص اہلِ ایمان کے حال کی خبر دی گئی ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے شرک اکبر کی بحث میں کہا ہے کہ سورت سبا میں یہ آیت آئی ہے:

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ﴾

[سبأ: ٢٢]

[اے نبی! کہہ دو کہ جن کو تم اللہ کے سوا (معبود) سمجھتے ہو ان کو پکارو، وہ تو ایک ذرہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے ہیں نہ آسمان میں نہ زمین میں، اور نہ آسمان وزمین میں ان کا کوئی ساجھا ہے، اور نہ ان میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے]

اس طرح کی آیتیں قرآن میں بہت ہیں، لیکن اکثر لوگ اس کے تحت اپنے آپ کو داخل نہیں جانتے، بلکہ ایسی آیتوں کو گذشتہ قوموں کے حق میں قرار دیتے ہیں۔[1]

آٹھواں درجہ:

یہ ہے کہ مشرک کا خون ومال حلال ہے اور اس پر حجت قائم ہونے، دعوت پہنچنے، علم حاصل

[1] مدارج السالکین لابن القیم رحمہ اللہ (١/٣٤٣)

ہونے اور کفر ظاہر ہونے کے بعد اس کے ساتھ جہاد وقتال واجب ہو جاتا ہے، لیکن ان چیزوں کے لیے کچھ قیود وشروط ہیں جو اپنے مقام پر مذکور ہیں۔[1]

شرک کی مذمت اور انواعِ شرک کا بیان:

① اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ذکر کیا ہے:

﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [البقرة: ٩٦]

[یہود زندگی کے بہت زیادہ حریص ہوتے ہیں اور مشرکین عرب یا مجوس یہ چاہتے ہیں کہ ہزار برس کی عمر ہو]

معلوم ہوا کہ طولِ عمر کی محبت کفار ومشرکین کی عادت ہے، رہے اہلِ ایمان تو یہ اللہ پاک سے ملاقات کی تمنا ومحبت رکھتے ہیں۔ حدیث میں آیا ہے:

«مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ لِقَاءَهُ»[1]

[جو شخص اللہ کی ملاقات کو دوست رکھتا ہے، اللہ بھی اس کی ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو اللہ سے ملنا نہیں چاہتا تو اللہ بھی اس کی ملاقات سے نفرت کرتا ہے]

② دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ [البقرة: ١٠٥]

[اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) اور مشرکین نہیں چاہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے تم پر کوئی خیر اترے]

③ تیسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ﴾ [البقرة: ٢٢١]

[تم مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک کہ وہ ایمان نہ لائیں]

---

① مذکورہ بالا صفحات میں توحید کے آٹھ درجات کا بیان علامہ محمد بن احمد الحفظی کی کتاب "درجات الصاعدين إلى مقامات الموحدين" سے مستفاد ہے۔

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٠٦٥، ٢٠٦٦)

اس آیت میں مشرکات سے مراد بت پرستوں یا اہلِ کتاب کی عورتیں ہیں، لیکن عموم لفظ کا تقاضا ہے کہ جس مسلمان عورت کے عقیدے میں شرک ہو، اس سے بھی نکاح نہیں کرنا چاہیے، اسی آیت میں مشرکین کے نکاح سے بھی منع فرمایا ہے، یعنی مسلم عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو۔ جو شخص مسلمان ہوتے ہوئے اعتقاداً یا عملاً مشرک ہو، اس سے رشتے داری کرنا منع ہے۔

سجدۂ غیر اللہ:

④ چوتھی آیت میں فرمایا ہے:

﴿وَ لَا یَاْمُرَکُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِکَةَ وَ النَّبِیّٖنَ اَرْبَابًا﴾ [آل عمران: ۸۰]

[اللہ نے تمھیں یہ حکم نہیں دیا ہے کہ تم ملائکہ اور انبیا کو ارباب (خدا) بناؤ]

یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی کہ بعض مسلمانوں نے چاہا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کو سجدہ کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیر اللہ نبی ہو یا فرشتہ، اس کو سجدہ کرنا کفر ہے۔ مسلمان ہونے کے بعد جب پیغمبروں اور فرشتوں کو سجدہ کرنا کفر ہے تو دنیا کے بادشاہ کس قطار وشمار میں ہیں کہ ان کو سجدہ کرنا درست ہو؟

حکایت:

ہندوستان کے بادشاہ جہانگیر کو لوگ دربار میں سجدہ کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اس سجدے سے انکار کر دیا تھا، جس پر بادشاہ نے ان کو قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ تین برس کے بعد جب شاہ جہاں بادشاہ ہوئے تو انھوں نے شیخ مجدد کو رہا کر دیا۔

حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں آیا ہے:

''رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار میں بیٹھے تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ کو سجدہ کیا۔ صحابہ نے عرض کی کہ آپ کو چوپائے اور درخت سجدہ کرتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم بھی آپ کو سجدہ کریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اللہ کو پوجو اور اپنے بھائی کی تعظیم کرو۔'' (رواہ أحمد)[1]

معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی کو سجدہ کرنا درست نہیں ہے۔ عبادتِ سجدہ صرف اللہ پاک کے ساتھ خاص ہے۔

قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے:

''انھوں نے دیکھا کہ حیرہ کے لوگ اپنے راجہ کو سجدہ کرتے ہیں تو انھوں رسول اللہ ﷺ

[1] مسند أحمد (۷۶/۱) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' راوی ضعیف ہے۔

سے عرض کی: "فأنت أحق أن نسجد لك" (آپ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کریں) آپ ﷺ نے فرمایا: ''ذرا خیال کرو، اگر تم میری قبر پر گزرو تو کیا تم میری قبر پر سجدہ کرو گے؟'' میں نے کہا: ''نہیں۔'' تو فرمایا: ''مت کرو۔''[1]

یعنی ایک روز وفات پا کر میں بھی مٹی کے ساتھ ملنے والا ہوں، تو میں کب سجدے کے لائق ہوں؟ سجدہ تو صرف اسی ذات کے لائق ہے جو کبھی نہ مرے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سجدہ کسی زندے کو کرنا ہے نہ کسی مرے کو، نہ کسی قبر کو اور نہ کسی استھان کو، کیونکہ جو زندہ ہے وہ ایک دن مرنے والا ہے اور جو مر گیا وہ کبھی زندہ تھا اور بشریت کی قید میں گرفتار تھا، اب مر کر وہ کوئی خدا نہیں بن گیا ہے، وہ بندہ ہی بندہ ہے۔

⑤ پانچویں آیت[2] ﴿سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ﴾ [آل عمران: ١٥١] سے معلوم ہوا کہ اشراک باللہ کسی ملت میں نہ تھا۔

⑥ چھٹی آیت ﴿لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ وَ لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا وَ اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ﴾ [آل عمران: ١٨٦] سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تم اہلِ کتاب اور مشرکین سے ایذا دہی کی باتیں سنو گے۔ وہ تمھارے دین پر طعن کریں گے اور تم کو جان و مال اور آبرو کا نقصان پہنچائیں گے، اس صورت میں اگر تم ان کی ایذا دہی اور طعنہ زنی پر صبر و تحمل کر کے تقوی اختیار کرو گے تو بلا شبہہ یہ ہمت کا کام ہے۔

⑦ ساتویں آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النساء: ١١٦] میں یہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا ہے، چاہے کسی کافر سے شرک ہو یا مومن سے صادر ہو، البتہ شرک کے سوا جو

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٢١٤٠)

[2] مولف رحمہ اللہ نے یہاں پر صرف آیات کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن اپنی دوسری تالیف "الدين الخالص" (١٧٣/١) میں مکمل آیات ذکر کی ہیں، اس کتاب کی مدد سے یہاں پر مکمل آیات ذکر کر دی گئی ہیں، تاکہ مولف رحمہ اللہ کا مقصود و مدعا سمجھنے میں آسانی ہو۔

گناہ ہوتا ہے وہ بخش دیتا ہے، جس کو چاہے، ہر کسی کو نہیں۔

⑧ آٹھویں آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٨] میں یہ بتایا ہے کہ شرک کرنا گناہ عظیم گھڑنا ہے۔ معلوم ہوا کہ شرک سارے گناہوں سے بڑھ کر ہے، جو کسی حال میں بھی بخشا نہیں جاتا۔

⑨ اسی لیے نویں آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النساء: ١١٦] میں اس کو ضلالت بعیدہ قرار دیا ہے۔

⑩ دسویں آیت ﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا﴾ [النساء: ١١٧] میں یہ فرمایا ہے کہ یہ مشرکین ''اناث'' کو پکارتے اور شیطان کی عبادت کرتے ہیں۔ ''اناث'' سے مراد بت ہیں، جیسے لات وعزیٰ یا اموات بے روح مراد ہیں، جیسے لکڑی اور پتھر ہیں یا ملائکہ مراد ہیں۔

⑪ گیارھویں آیت ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ﴾ [الأنعام: ٨٢] میں بیان کیا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے ہیں اور انھوں نے اپنے ایمان میں ظلم یعنی شرک کی ملاوٹ نہیں کی ہے، ان کے لیے امن ہے اور وہ راہ یاب ہوئے۔ ظلم کی تفسیر اس جگہ خود رسول اللہ ﷺ نے شرک سے کی ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اس جگہ ظلم سے مراد معصیت ہے۔ ان کا یہ قول مردود ہے۔ ان کے رد میں حدیث کی نصوص اور تفاسیرِ صحابہ موجود ہیں۔

⑫ بارھویں آیت میں اٹھارہ پیغمبروں کا نام لے کر فرمایا ہے:

﴿وَلَوْ أَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأنعام: ٨٨]

[اور اگر یہ لوگ شرک کرتے تو جو کچھ کرتے تھے وہ سب ان سے اکارت ہو جاتا]

یہ آیت بڑی وعید پر مشتمل اور بہت ہی عبرت وموعظت کا مقام ہے۔ یہاں یہ بات کہنے کی گنجایش نہیں ہے کہ مذمتِ شرک کی آیات جو کفار کے بارے میں نازل ہوئی تھیں، ان کو مسلمانوں

کے حق میں پیش کرنا نہیں چاہیے، بھلا انبیا سے بڑھ کر کس کا ایمان اور اسلام واحسان معتبر ہوتا ہے؟ جب شرک کرنے سے ان کے اعمال اکارت ہونے کی وعید سنائی گئی ہے تو پھر کسی اور کی کیا ہستی ہے کہ وہ کلمہ گو ہو کر شرک سے نہ بچے اور فقط توحید زبانی پر اپنے آپ کو مغفور سمجھ لے۔ معلوم ہوا کہ مشرکین کے حق میں نازل شدہ آیات سے ہر شرک کرنے والے کے خلاف علما کا استدلال کرنا نہایت صحیح ہے، کیونکہ اعتبار عمومِ لفظ کا ہوتا ہے، خصوصِ سبب کا نہیں۔ اگر ان آیات سے قطع نظر کیا جائے تو یہی ایک آیت، جو اٹھارہ انبیا کے حق میں آئی ہے اور وہ افاضل مومنین تھے، ردشرک کے لیے کافی ہے۔

⑬ تیرھویں آیت ﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَ خَلَقَهُمْ وَ خَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَ بَنٰتٍۭ بِغَيْرِ عِلْمٍ سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٠٠] میں فرمایا ہے کہ مشرکین اللہ کے لیے جنوں کو شریک ٹھہراتے ہیں اور انھیں بیٹا و بیٹی بتاتے ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ اولاد اور بیوی سے پاک و برتر ہے۔ مشرکین نے فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہہ کر پوجا تھا اور اہلِ کتاب نے عیسی و عزیر علیہما السلام کو اللہ کے بیٹے قرار دیا تھا۔

⑭ چودھویں آیت ﴿سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَاۤ اَشْرَكْنَا وَ لَاۤ اٰبَآؤُنَا وَ لَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتّٰى ذَاقُوْا بَاْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْهُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَخْرُصُوْنَ ۝ قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [الأنعام: ١٤٨-١٤٩] میں فرمایا ہے کہ مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادے اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے، اسی طرح کی تکذیب گزشتہ لوگوں نے بھی کی تھی۔ یہ بات اپنی جگہ پر سچ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب کو ہدایت دیتا، لیکن اللہ کو اپنی حجت پوری کرنا اور امتحان لینا منظور ہے، اس لیے اس نے ایسا نہ چاہا۔

⑮ پندرھویں آیت ﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ وَ الْاِثْمَ وَ الْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ اَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ میں فرمایا کہ اللہ نے سارے فواحش ظاہر و باطن، گناہ و سرکشی اور شرک کو حرام کیا ہے۔ یہ ایک طرح سے مشرکوں کے حق میں ڈانٹ ڈپٹ اور ان کو ندامت دلانا ہے۔

⑯ سولھویں آیت ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هَٰذَا﴾ [التوبة: ٢٨] میں کہا ہے کہ مشرک نجس ہیں۔ اللہ نے شرک کو نجاست قرار دیا ہے۔ بعض اہلِ ظاہر نے اس آیت سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ مشرک نجس الذات ہوتا ہے، لیکن مذاہبِ اربعہ کے نزدیک وہ نجس الذات نہیں ہے، اس لیے ان کا کھانا ہمارے لیے حلال ہے اور ان کے برتنوں کو استعمال میں لانا جائز ہے۔ حدیث سے بھی اسی طرح معلوم ہوتا ہے[1] اور یہی حق بات ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ مشرکوں میں دو طرح کی نجاست ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ طہارت اور غسلِ جنابت نہیں کرتے، رات دن نجاستوں میں ملوث رہتے ہیں۔ دوسری نجاست یہ کہ شرک کی وجہ سے ان کا باطن ناپاک رہتا ہے۔

⑰ سترھویں آیت ﴿وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ [یونس: ١٠٦] میں رسول اللہ ﷺ کو خطاب فرمایا ہے کہ آپ شرک کرنے والوں میں شامل نہ ہوں اور اللہ کے سوا کسی کو نہ پکاریں، اگر ایسا کریں گے تو ظالم ہو جائیں گے۔ پکارنے سے مراد غیر اللہ کی عبادت ودعا ہے۔

⑱ اٹھارھویں آیت ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ﴾ [النحل: ٣٦] میں فرمایا کہ ہم نے ہر امت میں رسول بھیج کر یہ حکم دیا تھا کہ تم سب اللہ کی پرستش کرو اور طاغوت سے بچو۔ طاغوت اللہ کے سوا ہر باطل معبود کو کہتے ہیں، جیسے شیطان، کاہن، صنم ہیں۔ ہر گمراہی کی طرف بلانے والا طاغوت کہلاتا ہے، چاہے کوئی ہو، کہیں ہو، کسی جگہ اور زمانے میں ہو۔ امام مالک رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ طاغوت سے مراد اللہ کے سوا ہر معبود ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"ہر قوم کا طاغوت وہ ہے جس کے پاس وہ اللہ کے سوا اپنے مسائل ومقدمات لے جائیں اور اس سے حل کرنے کی درخواست کریں یا اس کو پوجیں یا بصیرت کے بغیر اس کی پیروی کریں یا جس بات کو نہیں جانتے، اس میں اس کے فرماں بردار بنیں۔ ان طواغیتِ عالم میں جب کوئی غور کرے گا اور لوگوں کا حال دیکھے گا تو جان لے گا کہ اکثر

[1] دیکھیں: صحيح البخاري، رقم الحديث (٥١٦١) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣٠)

لوگ جو اللہ کی عبادت سے اعراض کرتے ہیں، وہ طواغیت کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ ورسول کی طاعت چھوڑ کر طواغیت کے مطیع ہو گئے ہیں۔"[1]

⑲ انیسویں آیت ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئِيْنَ وَ النَّصٰرٰى وَ الْمَجُوْسَ وَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ [الحج: ١٧] میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اہلِ ایمان اور ان کے مخالفین یہود، نصاریٰ، صابئین، مجوس اور مشرکین کے درمیان فیصلہ فرمائے گا جس سے حق وباطل دونوں الگ الگ ہو جائیں گے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ جھگڑا دنیا میں ایسے ہی چلتا رہے گا۔

⑳ بیسویں آیت ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ الْمَطْلُوْبُ﴾ [الحج: ٧٣] میں فرمایا ہے کہ تم اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہو وہ سب مل کر بھی ایک مکھی تک پیدا نہیں کر سکتے ہیں اور اگر مکھی ان سے کچھ لے بھاگے تو اس سے چھین نہیں سکتے، طالب ومطلوب دونوں ہی ضعیف ہیں، یعنی مشرکین وکفار کے معبود عاجزی وکمزوری میں مکھی سے بھی کم تر ہیں۔

㉑ اکیسویں آیت صحابہ کرام کے بارے میں آئی ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا﴾ [النور: ٥٥]

[وہ میری عبادت کرتے ہیں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتے ہیں]

یعنی وہ مشرک فی العبادۃ نہیں ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اس امت میں شرک زمانہ صحابہ کے بعد آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قبر پرستوں اور پیر پرستوں کے جو اعمال واقوال اور افعال واحوال ہیں، ان کی سند ودلیل گذشتہ امتِ اسلام سے نہیں ملتی ہے۔

㉒ بائیسویں آیت ﴿وَ اِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا وَّاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ

[1] إعلام الموقعين (١/ ٥٠)

مَرْجِعُكُمْ فَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [لقمان: ١٥] میں فرمایا ہے کہ اگر ماں باپ تمھیں شرک کرنے کا حکم دیں تو ان کا کہنا نہ مانو، یعنی اللہ کے بعد والدین کا حق اولاد پر سب سے زیادہ ہوتا ہے، مگر کفر وشرک کرنے میں ان کی طاعت درست نہیں ہے۔ یہی حکم سارے معاصی اور خلاف شرع کاموں کا ہے، کیوں کہ حدیث میں آیا ہے:

«لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ»[1]

[اللہ کی نافرمانی کرنے کے بارے میں کسی مخلوق کی بات نہیں ماننی چاہیے]

مخلوق کا لفظ عام ہے جو اللہ کی ساری مخلوق کو شامل ہے، چاہے ماں باپ ہوں یا پیر واستاد یا حاکم وامیر یا ازواج واولاد واقربا وغیرہ۔

(٢٣) تیئیسویں آیت ﴿مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [الروم: ٣١] میں فرمایا ہے کہ تم نماز قائم رکھو اور مشرک نہ بنو، معلوم ہوا کہ نمازی کے لیے مشرک ہونا بالکل جائز نہیں ہے۔

(٢٤) چوبیسویں آیت میں کہا ہے:

﴿وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٦٥]

[اے پیغمبر آپ کو اور آپ سے پہلے والوں (پیغمبروں) کو یہ حکم دیا جا چکا ہے کہ اگر تم شرک کرو گے تو تمھارے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور تم نقصان پانے والوں میں ہو جاؤ گے]

یہ خطاب خاص جناب رسالت مآب ﷺ کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جتنے رسول آئے، سب کو یہی پیغام دیا گیا تھا کہ توحید اختیار کرو اور شرک سے بچو، پھر خصوصی طور پر رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ اگر آپ شرک کریں گے تو آپ کے اعمال اکارت ہو جائیں گے اور خود بھی نقصان میں پڑ جائیں گے۔ اس آیت میں ایسی تخویف وتہدید ہے جس کا کچھ اندازہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ جب خود سید المرسلین افضل النبیین ﷺ سے یہ سخت گفت وشنید ہے تو پھر کسی اور کی کیا حقیقت ہو سکتی

[1] مسند أحمد (٥/ ٦٦)

ہے؟ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ﴾ [الزمر: ٦٦]

[بلکہ اللہ ہی کی پوجا کرتے رہیں اور اس کا شکرادا کرتے رہیں]

کہ اس نے آپ کو موحد بنایا اور شرک سے بچایا۔

㉕ پچیسویں آیت ﴿وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّآنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴾ [الفتح: ٦] میں فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ منافق مردوں عورتوں اور مشرک مردوں عورتوں کو عذاب دے گا جو اللہ سے بدگمانی رکھتے ہیں۔ یہ سب برے چکر میں آئیں گے، اللہ نے ان پر غضب فرمایا اور لعنت کی ہے اور ان کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے، یہ بری جگہ ہے۔ معلوم ہوا کہ اہلِ نفاق اور شرک والے اللہ کے مغضوب وملعون اور جہنمی ہوتے ہیں۔

ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟

غرض کہ قرآن پاک میں اہلِ شرک کی مذمت بے شمار آیتوں میں آئی ہے۔ یہ آیتیں کھلی ہوئی باتیں ہیں جن کا منکر فاسق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ﴾ [البقرة: ٩٩]

[ہم نے آپ کی طرف روشن آیتیں بھیجی ہیں اور ان کا انکار فاسق لوگ ہی کرتے ہیں]

یعنی ان آیتوں کو سمجھنا کوئی مشکل امر نہیں ہے، لیکن ان پر عمل کرنا نفس پر مشکل ہے، کیونکہ نفس کو کسی کی حکم برداری بری لگتی ہے، اس لیے جو لوگ فاسق و بے طاعت ہیں، وہ ان باتوں پر نہیں چلتے اور اس پر نہ چلنے کے لیے طرح طرح کی باتیں نکالتے ہیں، حالانکہ اللہ ورسول کے کلام کو سمجھنے کے لیے بہت بڑا علم درکار نہیں ہوتا۔ پیغمبر تو اسی لیے آئے تھے کہ نادانوں، گنواروں اور جاہلوں کو راستہ بتائیں اور بے علموں، بے شعوروں اور بے وقوفوں کو علم سکھائیں۔ جو کوئی یہ بات کہے کہ پیغمبر کی بات علما کے سوا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا اور ان کے طریقے پر بزرگوں کے علاوہ اور کوئی نہیں چل سکتا تو وہ قرآن پاک کا منکر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں فرمایا ہے: ﴿وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ﴾ [آل عمران: ١٦٤] یعنی یہ رسول امی ان پڑھوں کو کتاب وحکمت سکھاتے ہیں۔ کتاب سے مراد

قرآن کریم ہے اور حکمت سے سنت یعنی حدیث مراد ہے۔ معلوم ہوا کہ قرآن وحدیث کا سیکھنا آسان ہے اور یہ دونوں چیزیں بے علموں اور جاہلوں کو سکھانے کے لیے آئی ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ عالم ہی ان کو جانتے ہیں اور کوئی ان کو سمجھ بوجھ نہیں سکتا یا ان پر چل نہیں سکتا، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ جاہل لوگ یہ کلام سمجھ کر عالم ہو جاتے ہیں۔ گمراہ لوگ صحیح راستے پر چل کر بزرگ بن جاتے ہیں۔ جو شخص زیادہ جاہل ہو، اس کو اللہ و رسول کا کلام سمجھنے میں زیادہ رغبت کرنا چاہیے اور جو بڑا گناہ گار ہو، اسے اللہ ورسول کی راہ پر چلنے میں زیادہ کوشش کرنی چاہیے۔ ہر خاص وعام پر فرض ہے کہ اللہ ورسول ہی کے کلام کی تحقیق کریں، اسی کو سمجھنے کی کوشش کریں، اسی پر چلیں اور اسی کے موافق اپنا ایمان، اسلام اور احسان درست کریں۔

ایمان کے دو اجزا:

ایمان کے دو جزو ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کو اللہ یعنی معبود مطلق جاننا۔ دوسرے رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا رسول سمجھنا۔ اللہ کو اللہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات وصفات اور افعال میں کسی کو اس کا شریک نہ سمجھیں۔ رسول کو رسول سمجھنا یوں ہوتا ہے کہ رسول کے سوا کسی کا راستہ نہ پکڑیں۔ پہلی بات کو توحید کہتے ہیں اور اس کے خلاف کو شرک کہا جاتا ہے۔ دوسری بات کو اتباع سنت کہتے ہیں اور اس کے خلاف کرنے کو بدعت بولا جاتا ہے۔ لہٰذا ہر مسلمان مومن پر واجب ہے کہ توحید واتباع سنت کو دانتوں سے خوب مضبوط پکڑے اور شرک وبدعت سے بالکل بچے، کیوں کہ یہی دونوں چیزیں اصل ایمان اور صحتِ اسلام میں خلل ڈالتی ہیں۔ باقی گناہ سب ان سے نیچے اور پیچھے ہیں، کیونکہ وہ فقط عمل میں خلل انداز ہوتی ہیں، اصل ایمان میں نہیں۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو شخص توحید واتباع سنت میں کامل اور شرک وبدعت سے بہت دور ہو اور لوگوں کو اس کی صحبت میں اسی قسم کی باتوں کی معلومات حاصل ہوتی ہو تو اسی کو اپنا پیر استاد سمجھیں اور کسی مشرک وبدعتی کے دھوکے میں آکر اپنا ایمان برباد کریں نہ اس کے شاگرد ومرید ہو کر راہ حق سے دور ہوں۔

اے بسا ابلیس آدم روے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

[بہت دفعہ ابلیس آدمی کی شکل میں ہوتا ہے، اس لیے ہر ایک سے بیعت نہیں کرنی چاہیے]

پہلے بھی یہ بات گزر چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرما دیا ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النسآء: ١١٦]

[اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا ہے، اس کے علاوہ گناہوں کو جس کے لیے چاہے بخش دے، اور جس نے اللہ کا شریک بنایا وہ راستے سے بہت دور بھٹک گیا]

راہ بھٹکنا یوں ہوتا ہے کہ حلال وحرام میں تمیز نہ کرے۔ چوری، بدکاری اور شراب خوری میں پھنس جائے۔ نماز وروزہ چھوڑ دے۔ زکات نہ دے۔ وسعت وقدرت کے باوجود حج نہ کرے۔ بیوی بچوں کا حق تلف کرے۔ ماں باپ کی بے ادبی کرے۔ یہ وہ گناہ ہیں جو اللہ کی مشیت سے معاف ہو سکتے ہیں، مگر جس نے شرک کا ارتکاب کیا، وہ سب سے زیادہ راہ بھولا اور بھٹک گیا، اس لیے کہ وہ ایسے عظیم گناہ میں گرفتار ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کو نہیں بخشے گا۔

معلوم ہوا کہ شرک ہرگز بخشا نہیں جائے گا۔ شرک کی جو سزا مقرر ہے، وہ ضرور اسے ملے گی۔ پھر اگر شرک اس درجے کا ہے کہ اس سے انسان کافر ہو جاتا ہے تو اس کی سزا یہی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہے گا، کبھی اس سے باہر نکلے گا اور نہ کسی طرح کا آرام پائے گا، البتہ جو شرک اس سے کم درجے کے ہیں، ان کی جو سزا اللہ کے یہاں مقرر ہے، وہ اسے ملے گی، اسی طرح باقی گناہوں کی جو سزا و جزا ہے، وہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے، چاہے وہ سزا دے یا معاف کر دے۔

شرک کی سنگینی:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرک سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہوتا۔ دنیا کے حاکم و بادشاہ بھی سب غلطیوں سے درگزر کر جاتے ہیں، مگر جو جرم بغاوت کی قسم کا ہوتا ہے، اس کو معاف نہیں کرتے۔ جیسے کوئی شخص کسی ادنا رعایا کو ظلِ سبحانی کہے اور اس کے لیے کوئی تاج وتخت بنا کر بادشاہ کی طرح اس کو ہدیہ کرے۔ یہ سب سے بڑی تقصیر ہے۔ بادشاہ اسے کبھی معاف نہیں کر سکتا اور اگر کرے تو بے غیرت سمجھا جائے گا، اس کی حکومت نہایت کمزور اور بے جان تصور کی جائے گی۔ اس کے برعکس اللہ جل شانہ مالک الملک وحدہ لاشریک لہ شہنشاہ غیور ہے۔ وہ انتہا درجے کا زور آور اور غیرت مند ہے۔ بھلا وہ کیونکر مشرکوں سے چشم پوشی کر کے ان کے شرک کی سزا ان کو نہیں دے گا؟ عبادت خاص اللہ کا حق ہے، جس کسی نے یہ حق اس کی مخلوق کو دیا تو اس نے بڑے سے بڑا حق ایک ذلیل سے ذلیل تر کے

حوالے کیا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ظلم اور نا انصافی ہو گی؟ اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ مخلوق میں کوئی کتنا ہی بڑے سے بڑا ہو، اللہ کی شان کے آگے وہ ایک ذلیل بندہ ہے۔ عقل و نقل دونوں اعتبار سے شرک سب عیبوں سے بڑا عیب ہے اور اس میں اللہ کے ساتھ بہت بڑی بے ادبی و گستاخی ہے۔ حدیث میں آیا ہے:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: میں ساجھیوں میں بڑا بے پروا اور ان کی شرکت سے سخت بے زار ہوں۔ جو شخص کوئی عمل کرے اور اس میں کسی اور کو بھی میرا ساجھی بنائے تو میں اس کو اور اس کے شرکت والے عمل کو چھوڑ دیتا ہوں۔''[1] (رواہ مسلم عن أبي هريرة)

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ کے لیے کوئی کام کرے، پھر ویسا ہی کام دوسرے کے لیے بھی کرے تو اس سے شرک ثابت ہو جاتا ہے اور مشرک کی کوئی عبادت و عمل اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہوتا۔

شرک کی ممانعت بعثتِ انبیا کا اساسی مقصد ہے:

اُبی بن کعب کی حدیث میں آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ذریت کے نکالنے کا قصہ بیان ہوا ہے، جس کو امام احمد نے مطولاً روایت کیا ہے۔[2] تفاسیرِ قرآن میں بھی اس واقعے کو لکھا گیا ہے۔ اس حدیث سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ پاک نے عالمِ ارواح میں ہر شخص کو اصل توحید کا حکم دیا اور شرک سے منع کر دیا تھا۔ پھر سارے انبیا اسی کی تاکید و تعلیم کے لیے آئے اور تمام کتابیں اسی کے بیان میں نازل ہوئیں۔ مشہور قول کے مطابق ایک یا دو لاکھ چوبیس ہزار انبیا اور ایک سو چار آسمانی کتابوں کی تعلیمات اسی ایک نقطے پر مرکوز ہیں کہ لوگ توحید کو مکمل طور پر درست کریں، شرک سے بہت دور رہیں اور اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بنائیں۔ کسی حاکم سے متعلق سمجھیں کہ کسی چیز میں وہ تصرف کر سکتا ہے نہ کسی کو اپنا مالک و آقا بنائیں کہ اس سے اپنی مرادیں مانگیں اور اس کے پاس اپنی حاجت لے کر حاضری دیں۔ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ وَإِنْ قُتِلْتَ أَوْ حُرِّقْتَ»[3] (رواہ أحمد)

---

[1] صحيح مسلم (٤/٢٢٨٩)

[2] مسند أحمد (٥/١٣٥)

[3] مسند أحمد (٥/٢٣٨)

[اللہ کے ساتھ شرک نہ کرو، چاہے جان سے مارے جاؤ یا آگ میں جلائے جاؤ]

جس طرح کبھی پرہیز گاروں کو فاسقوں وفاجروں کے ہاتھ سے اور مسلمانوں کو مشرکوں وکافروں کے ہاتھ سے مشیت الٰہی کے تحت کچھ ایذا وتکلیف پہنچ جاتی ہے تو وہ صبر کرتے ہیں اور بے صبری سے اپنا دین بگاڑنا نہیں چاہتے ہیں، اسی طرح کبھی کسی نیک آدمی کو جنوں اور شیطانوں کے ہاتھ سے ارادہ الٰہی کے تحت کچھ آفت پہنچتی ہے تو اس پر بھی صبر کرنا چاہیے، ایسا نہ کرے کہ اس جن وشیطان سے ڈر کر اس کی نذر ونیاز بجا لائے اور شرک میں پھنس جائے، بلکہ یہ اعتقاد رکھے کہ اللہ میرے دین کا امتحان لے رہا ہے۔

سب سے بڑا گناہ:

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

''سب سے بڑا گناہ اللہ کے یہاں یہ ہے کہ بندہ کسی کو اللہ کا ہمسر ومقابل قرار دے، حالانکہ اللہ ہی نے اس کو پیدا کیا ہے۔'' (رواہ الشیخان)[1]

یعنی جب ہمارا خالق اللہ ہے تو ہم کو یہی چاہیے کہ ہم اسی کو ہر وقت پکاریں، اسی کو حاضر وناظر جان کر اپنی ہر مراد اس سے مانگیں۔ ہمیں کسی اور سے کیا کام ہے؟ جس طرح کوئی شخص کسی ایک بادشاہ کا غلام ہوگیا تو وہ اپنے ہر کام کا تعلق اسی بادشاہ سے رکھتا ہے، دوسرے بادشاہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا، پھر کسی خدمت گار، چپراسی اور چوب دار کا کیا ذکر ہے؟ اسی لیے قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [الزمر: ٢٩]

[مشرک کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کئی آدمیوں کا غلام ہو، ہر آدمی اس سے اپنی خدمت لینا چاہے، وہ اسی کش مکش میں پڑا رہے، موحد کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی ایک خاص آدمی کا خالص فرماں بردار ہو، دوسرے سے اس کو کچھ سروکار نہ ہو، بھلا یہ دونوں کب برابر ہوسکتے ہیں؟ (ایک سخت عذاب میں گرفتار ہے، دوسرا نہایت آرام میں ہے) الحمد للہ، لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے]

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٧٧) صحيح مسلم (١/ ٩٠، ٩١)

دورِ جاہلیت اور زمانہ حاضر کا مشرک برابر کیسے ہے؟

شرک لوگوں میں اس قدر عام ہو گیا ہے کہ اصل توحید نایاب ہوتی جا رہی ہے، بلکہ بیشتر انسانی مخلوق توحید و شرک کے معنی بھی نہیں سمجھتی، مگر ایمان کا دعوی رکھتی ہے۔ پیروں، پیغمبروں، اماموں، شہیدوں، فرشتوں، پریوں اور مُردوں کو مشکل کے وقت پکارنا، ان سے مرادیں مانگنا، ان کی منتیں ماننا، حاجت برآری کے لیے ان کی نذر و نیاز قبول کرنا، بلا ٹلنے اور برکت کے لیے اپنی اولاد کو ان کی طرف منسوب کرنا، جیسے عبد النبی، علی بخش، عبد الحسین، حسین بخش، پیر بخش، مدار بخش، سالار بخش نام رکھنا اور ان کی زندگی کے لیے کسی کے نام کی چوٹی رکھنا، بدھی (گلے میں پٹکا یا زیور) پہننا، کپڑے پہنانا، بیڑی ڈالنا، جانور ذبح کرنا، دہائی دینا، ان کے نام کی قسم کھانا؛ یہ تمام افعال وحرکات شرک محض ہیں۔ جو کام ہنود و مشرکین اپنے بتوں کے لیے کرتے ہیں، وہی سب کچھ نام کے مسلمانوں اور جھوٹے مومنوں نے اولیا، ائمہ، شہدا، جنوں، پریوں، نبیوں اور فرشتوں کے لیے کیے اور کر رہے ہیں، پھر بھی وہ مومن مسلم ہیں۔ سبحان اللّٰہ و بحمدہ! اللہ نے سچ فرمایا ہے:

﴿ وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [يوسف: ١٠٦]

[اللہ پر ایمان رکھنے والوں میں اکثر شرک کرتے ہیں]

گمراہی کا سبب:

یعنی بہت سے ایمان کا دعوی کرنے والے طرح طرح کے شرک اور قسم قسم کے کفر میں گرفتار ہیں۔ اس کا سبب محض یہ ہے کہ انھوں نے اللہ و رسول کے کلام کو چھوڑ کر اپنی عقل کو دخل دیا، جھوٹے قصے کہانیوں کے پیچھے پڑے اور غلط رسموں کو دلیل و سند بنایا۔ اگر یہ لوگ اللہ و رسول کا کلام سمجھے ہوتے تو جان لیتے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بھی کافر لوگ ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے، مگر اللہ نے ان کی ایک نہ مانی، بلکہ ان پر ناراض ہوا اور ان کو جھٹلاتے ہوئے فرمایا کہ تم اللہ کے سوا جن کی پوجا کرتے ہو، وہ کچھ نفع پہنچا سکتے اور نہ نقصان دے سکتے ہیں، یعنی وہ بالکل بے قدرت اور مکمل عاجز ہیں۔ اب بتاؤ! وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا تصرف و اختیار ہے اور وہ پناہ دیتا ہے، اس کے مقابل کوئی پناہ و حمایت دینے والا نہیں ہے؟ اس پر وہ یہی کہیں گے کہ وہ اللہ ہی ہے، پھر یہ کہاں سے خبطی اور پاگل ہوئے پھرتے ہیں؟

یعنی تمام عالم میں کافر بھی اللہ ہی کے تصرف کے قائل ہیں اور اس کے سامنے کسی کو حمایتی نہیں بتاتے، لیکن ان کا کفر وشرک یہی تھا کہ وہ غیر اللہ کو، جسے تصرف وحمایت کی خاک برابر قدرت نہیں ہے، اس کو پکارتے ہیں، اسی کی منت مانتے، نذر ونیاز لاتے اور اسے ہی اپنا وکیل وسفارشی سمجھتے ہیں، تو جب کوئی خالق کو چھوڑ کر یہ معاملہ کسی مخلوق سے کرے، گو اس کو اللہ ہی کا بندہ کیوں نہ کہے تو وہ اور ابوجہل وابولہب دونوں شرک میں برابر ہیں، کیونکہ شرک صرف اسی چیز کا نام نہیں ہے کہ کسی کو اللہ کے برابر سمجھے اور اس کے مقابل جانے، بلکہ شرک کے معنی یہ ہیں کہ جو چیزیں اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کی ہیں اور اپنے بندوں کے لیے ان کو نشانِ بندگی قرار دیا ہے، وہ چیزیں کسی اور کے لیے کرے، جیسے غیر اللہ کو سجدہ کرنا، اس کے نام پر جانور ذبح کرنا، مشکل کے وقت اس کو پکارنا، ہر جگہ اس کو حاضر وناظر جاننا اور اس کے لیے تصرف کی قدرت ثابت کرنا وغیرہ۔

اس قسم کی باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے، اگرچہ جسے پکارتا ہے، اس کو اللہ سے چھوٹا سمجھے اور اسی کا بندہ ومخلوق جانے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، کیونکہ کسی بھی مخلوق کے ساتھ اگر کوئی اس طرح کا معاملہ کرے گا، چاہے وہ پیغمبر ہو یا ولی، پیر ہو یا شہید، بھوت ہو یا پری، زندہ ہو یا مردہ، دور ہو یا نزدیک، اپنا ہو یا بیگانہ؛ وہ مشرک ہو جائے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ پاک نے بت پرستوں پر جیسا غصہ فرمایا ہے، ویسا ہی غصہ اہلِ کتاب پر بھی کیا ہے، حالانکہ یہ لوگ بت پرست تھے نہ کسی کو اللہ کے برابر جانتے تھے، مگر وہ انبیا و اولیا کے لیے وہی اعمال بجا لاتے تھے جو اللہ کے لیے خاص ہیں، اس لیے ان کو بھی مشرک قرار دیا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَھُمْ وَ رُھْبَانَھُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ وَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَ مَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوْٓا اِلٰھًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ﴾

[التوبة: ٣١]

[ان لوگوں نے اللہ کے سوا مولویوں، درویشوں اور مسیح ابن مریم کو اپنا خدا بنایا، حالانکہ ان کو یہی حکم دیا گیا تھا کہ ایک ہی معبودِ حقیقی کی پوجا کریں، اللہ کے سوا کوئی سچا معبود نہیں ہے، وہ ان کے شرکیہ کاموں سے پاک ہے]

اس آیت میں اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ) کا ذکر ہے کہ یہ لوگ اللہ کو بڑا مالک سمجھتے ہیں،

لیکن انھوں نے اس سے چھوٹے اور مالک بھی بنا لیے ہیں، اسی سے ان پر شرک ثابت ہو گیا ہے، کیونکہ اللہ کا کوئی شریک نہیں، وہ نرالا ہے اور سب چھوٹے بڑے اس کے عاجز وناچیز بندے ہیں۔ اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ علما و اولیا کی تقلید شرک کی ایک قسم ہے۔

تقلید کی تعریف:

تقلید کہتے ہیں کسی بڑے بزرگ کی بات کو بے سند مان لینا اور قرآن وحدیث کے حکم کو اس کے مقابلے میں چھوڑ دینا۔ کسی عالم یا درویش کی وہ بات ماننا جس کو وہ قرآن وحدیث سے بیان کرتا ہے، تقلید نہیں، بلکہ یہ اتباع ہے، کیونکہ تقلید میں غیر کی رائے کو قبول کرنا، جب کہ اتباع میں غیر کی روایت کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ ہم پر جو بات لازم ہے وہ یہی ہے کہ ہم روایتِ حدیث کو صحتِ سند کے بعد قبول کر کے اس پر عمل کریں، ہم پر یہ لازم نہیں ہے کہ کسی کی رائے لے کر اس پر چلیں۔

اشراک فی العلم:

جو چیزیں اللہ نے اپنے لیے خاص کر رکھی ہیں اور ان میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرانا چاہیے، وہ بہت ہیں۔ ان میں سے چند باتوں کا ذکر بطور نمونہ کیا جاتا ہے، باقی کو انھیں سے سمجھ لینا چاہیے۔

ایک بات یہ ہے کہ ہر جگہ حاضر وناظر رہنا اور ہر چیز کی ہر وقت برابر خبر رکھنا، چاہے وہ چیز دور ہو یا نزدیک، چھپی ہو یا کھلی، اندھیرے میں ہو یا اجالے میں، آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں، پہاڑوں کی چوٹی پر ہو یا سمندر کی تہ میں؛ یہ اللہ ہی کی شان ہے، کسی دوسرے کی یہ شان نہیں ہے، خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، نیک ہو یا بد، زندہ ہو یا مردہ؛ کسی میں یہ شانِ الٰہی نہیں ہے۔ اس لیے جو کوئی کسی زندہ یا مردے کا نام اٹھتے بیٹھتے لیا کرے یا دور ونزدیک سے اس کو پکارے، آفت وبلا کا مقابلہ کرتے وقت اس کی دہائی دے، اس کا نام لے کر دشمن پر حملہ کرے، اس کے نام کا ختم پڑھے، یعنی کسی بزرگ کے نام کو اپنا وظیفہ بنائے یا اس کی صورت کا خیال باندھے جس کو "تصورِ شیخ" کہتے ہیں اور یوں سمجھے کہ جب میں اس کا نام زبان یا دل سے لیتا ہوں یا اس کی صورت یا قبر کا خیال باندھتا ہوں تو وہیں اس کو خبر ہو جاتی ہے اور اس پر میری کوئی بات چھپی نہیں رہتی ہے، اسی طرح جو احوال مجھ پر گزرتے ہیں، جیسے بیماری یا تندرستی، آسودگی یا تنگدستی، موت یا زندگی، غم یا خوشی؛ ان سب باتوں کی ہر وقت اس کو خبر رہتی ہے، یہاں تک کہ جو بات میرے منہ سے نکلتی ہے، وہ سب سن لیتا یا جان لیتا ہے اور جو

خیال میرے دل میں گزرتا ہے، وہ اس سے واقف ہوتا ہے یا جس وقت میں اس کو پکارتا یا یاد کرتا ہوں تو وہ میری مدد کرتا ہے؛ ان سب باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا اور آدمی مشرک بن جاتا ہے۔ اس قسم کی سب باتیں شرک ہوتی ہیں اور اس کا نام ''اشراک فی العلم'' ہے، یعنی اللہ جیسا علم کسی اور کے لیے ثابت کرنا۔ یہ عقیدہ خواہ انبیا و اولیا یا کسی پیر و مرشد یا امام و امام زادے کے حق میں ہو یا کسی بھوت، پری اور شیطان خبیث کے بارے میں ہو، پھر خواہ یہ عقیدہ اس طرح پر ہو کہ یہ بات ان لوگوں کو اپنی ذات سے حاصل ہے یا اللہ کے دینے سے ملی ہے، بہر حال اس عقیدے سے شرک لازم ہو جاتا ہے، اس لیے کہ علم غیب اللہ کے لیے مخصوص ہے، مخلوق کو یہ علم دیا ہی نہیں گیا ہے۔ خود اللہ پاک نے رسول اللہ ﷺ سے متعلق فرمایا ہے:

﴿ وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْءُ ﴾ [الأعراف: ۱۸۸]

[اگر میں غیب کی باتوں کو جانتا تو بہت سی بھلائی حاصل کر لیتا اور مجھے تکلیف نہیں پہنچتی]

جب نصوصِ قرآن بول رہی ہیں کہ سید المرسلین ﷺ بلکہ جبرئیل امین بھی غیب داں نہیں ہیں، تو پھر کسی اور نبی و ولی کا یہاں کیا ذکر ہے؟

اشراک فی التصرف:

دوسری بات یہ ہے کہ جہاں میں اپنے ارادے سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا، اپنی خواہش سے مارنا جلانا، رزق کی کشادگی اور تنگی کرنا، تندرست رکھنا یا بیمار کر دینا، فتح اور شکست دینا، اقبال و ادبار میں ڈالنا، مرادیں پوری کرنا، حاجتیں بر لانا، بلائیں ٹالنا، مشکل میں دستگیری کرنا، برے وقت میں آڑے آنا؛ یہ سب اللہ ہی کی شان ہے۔ اس کے سوا نبی ہو یا ولی، پیر ہو یا شہید، مرید ہو یا مرشد، بھوت ہو یا پری، کسی کی یہ شان نہیں ہے۔ اگر کوئی کسی کے لیے کائنات میں ایسا تصرف ثابت کرے، اس سے مرادیں مانگے اور مراد کی توقع پر نذر و نیاز بجالائے، منت مانے، مصیبت کے وقت اس کو پکارے، بلا ٹلنے کے لیے کسی پیر فقیر سے التجا کرے، تو ایسا شخص مشرک ہو جاتا ہے۔ اس شرک کو ''اشراک فی التصرف'' کہتے ہیں۔ یعنی اللہ جیسا تصرف دوسرے کے لیے ثابت کرنا بالکل شرک ہے، چاہے یہ سمجھے کہ ان کاموں کی طاقت اس غیر اللہ کو خود بخود حاصل ہے یا اللہ نے یہ طاقت اس کو

بخشی ہے، ہر طرح پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف سے کسی مخلوق کو ایسی قدرت کا حاصل ہونا مان لیا جائے تو یہ بات لازم آئے گی کہ جہاں کا کچھ بندوبست اللہ کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اس کے وزیروں اور نائبوں کے ہاتھوں میں ہے، جس کا انجام یہ ہوا کہ اللہ بڑا حاکم ومتصرف ہے اور وہ چھوٹے حاکم وفرماں روا ہیں، جیسے کسی بادشاہ اور امیر ورئیس کے ارکانِ دولت ہوا کرتے ہیں، حالانکہ اللہ پاک نے فرمایا ہے:

﴿يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ﴾ [السجدة: ٥]

[اللہ ہی آسمان کے اوپر سے زمین کا انتظام رکھتا ہے]

نیز فرمایا:

﴿لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾ [الأعراف: ٥٤]

[اللہ ہی کا کام ہے پیدا کرنا اور حکم دینا]

یعنی آسمان وزمین اور اس کے مابین کا مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا حاکم ہے۔ عوام کا یہ کہنا کہ ملک اللہ کا ہے اور حکم فلاں کا ہے، یہ شرک جلی اور خبث واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ [یوسف: ٤٠] [اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں]

اسی طرح ملک وحکومت بھی اسی اللہ کی ہے، کسی اور کی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [الغافر: ١٦]

[اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، آج کس کی بادشاہی ہے؟ اکیلے اللہ کی جو زبردست ہے]

ساری مخلوق میں کس کو یہ قدرت ہے کہ یہ بات کہہ سکے کہ ہم ہی مالک یا حاکم ہیں؟

اللہ تعالیٰ اپنی شان میں فرماتا ہے:

﴿وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ﴾ [الزخرف: ٨٤]

[اور وہ اللہ وہی ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں بھی معبود ہے]

یعنی زمین وآسمان کا معبود وہی ایک اللہ ہے جو اکیلا، نرالا اور یکتا ہے، اس کا کوئی ساجھی یا وزیر اور ظہیر نہیں ہے۔ اسی کا تصرف ہر جگہ ہے اور اسی کے نام کا ڈنکا ہر طرف بجتا ہے۔ کوئی اور معبود ہے نہ رب ہے اور نہ حاکم متصرف ہے۔

توحید فی العبادۃ:

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ پاک نے بعض کام خاص اپنی تعظیم کے لیے مقرر فرمائے ہیں، ان کو عبادت کہتے ہیں، جیسے سجدہ اور رکوع کرنا، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا، اس کے نام پر مال خرچ کرنا، اس کے نام کا روزہ رکھنا، اس کے گھر (بیت اللہ) کی طرف دور دور سے چل کر آنا، ایسی صورت بنا کر چلنا کہ ہر کوئی یہ جان لے کہ اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے جا رہے ہیں، اسی طرح راستے میں اس مالک کا نام پکارتے رہنا اور بے ہودہ باتوں سے باز رہنا، شکار کرنے سے بچنا اور اسی پابندی سے بیت اللہ پہنچ کر طواف کرنا، اسی گھر کی طرف سجدہ کرنا، وہاں اس کے نام کا جانور لے کر جانا، کعبے کی چوکھٹ کے پاس کھڑے ہوکر دعا مانگنا اور التجا کرنا، دین و دنیا کی مرادیں چاہنا اور ایک پتھر کو بوسہ دینا، مزید یہ کہ اس گھر کا مجاور بن کر خدمت میں مشغول رہنا، جیسے اس میں جھاڑو دینا، روشنی کرنا، فرش بچھانا، پانی پلانا، وضو وغسل وغیرہ کا سامان درست کرنا، زمزم کا پانی تبرک سمجھ کر خوب پینا اور بدن پر ڈالنا، آپس میں بانٹنا، دور والوں کے لیے لے جانا اور بیت اللہ شریف کے اردگرد کے جنگل جھاڑی کا ادب کرنا، یعنی وہاں شکار نہ کھیلنا، نہ درخت وگھاس اکھاڑنا، نہ مویشی چرانا اور نہ لڑائی جھگڑا کرنا؛ یہ سب کام اللہ پاک نے خاص اپنی عبادت کے لیے اپنے بندوں کو بتائے ہیں۔

اشراک فی العبادۃ:

پھر جو کوئی یہ کام کسی پیغمبر یا ولی یا بھوت پری کے لیے کرے، یا کسی سچی جھوٹی قبر یا کسی کے تھان یا مکان یا کسی کے تبرک ونشان کے لیے کرے، یا کسی کے تابوت کو سجدہ یا رکوع کرے، یا کسی قبر کا بوسہ لے، یا اس کے نام کا روزہ رکھے، یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو، یا اس پر جانور چڑھائے، یا اس کے نام کی چھڑی، نیزہ اور نشان کھڑا کرے، یا رخصت کے وقت الٹے پاؤں چلے، یا مورچھل جھلے، یا اس پر شامیانہ کھڑا کرے، وہاں کی چوکھٹ چومے، ہاتھ باندھ کر التجا کرے، مراد مانگے، یا کسی کی قبر پر مجاور بن کر بیٹھ رہے، یا وہاں کے جنگل کا ادب واحترام کرے یا اس قسم کا کوئی اور کام بجالائے تو اس پر شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کو ''اشراک فی العبادۃ'' کہتے ہیں۔ یعنی اللہ پاک کی طرح کسی دوسرے کی تعظیم کرنا اور اس کے سامنے اپنی جان کو ذلیل وخوار اور حقیر وفقیر کر دینا۔ غیر اللہ کی یہ تعظیم چاہے یہ سمجھ کر کی جائے کہ وہ بذات خود اس کا مستحق ہے، یا اس کی تعظیم بجا لانے سے اللہ خوش ہوتا

اور اس کی تعظیم کی برکت سے ساری مشکلیں آسان کر دیتا ہے، ہر صورت میں شرک ثابت ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے بڑی، چھوٹی اور جسمانی وقلبی؛ جتنی عبادتیں مقرر فرمائی ہیں، ان میں سے کسی عبادت کو بھی غیر اللہ، وہ کوئی ہو، کہیں ہو، کے لیے بجالانا شرک ہے۔ کسی زندہ یا مردہ بزرگ کی عزت وتوقیر کرنا اور بات ہے۔ مثال کے طور پر ہم کسی سے متعلق یہ جانتے ہیں کہ وہ عمل صالح میں ہم سے زیادہ ہے، تو اس کے لیے دعاے مغفرت کریں، زندہ شخص ہے تو اس سے اپنے لیے دعا کرنے کو کہیں، اس سے اللہ کے لیے قلبی محبت رکھیں، اس کے دشمن نہ بنیں اور اچھے انداز میں اس کا تذکرہ کریں۔ اگر وہ زندہ بزرگ مال کا ضرورت مند ہے تو اللہ کی رضا کے لیے مال سے اس کی خدمت کریں، یہ شرک نہیں ہے۔

توحید فی العادۃ:

چوتھی بات یہ ہے کہ اللہ نے اپنے بندوں کو سکھایا ہے کہ اپنے دنیوی کاموں میں اللہ کو یاد کرتے رہیں اور اس کی تعظیم کا گن گاتے رہیں، تاکہ ایمان درست رہے اور ان کاموں میں برکت بھی پیدا ہو، جیسے پریشانیوں میں اللہ کی نذر ماننا، مشکل کے وقت اس کو پکارنا، ہر کام اس کا نام لے کر شروع کرنا، جب اولاد پیدا ہو تو اس کے شکر میں اللہ کے نام پر جانور ذبح کرنا، اولاد کا نام عبد اللہ، عبد الرحمٰن، الٰہ بخش اور امۃ اللہ رکھنا، کھیت باغ میں تھوڑا بہت اللہ کے نام پر صدقہ کرنا اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز نکالنا، کھانے، پینے، پہننے، مکان بنانے اور لینے دینے میں اس کے حکم پر چلنا، جو بھلائی وبرائی، رنج وخوشی دنیا میں پیش آتی ہے جیسے قحط و ارزانی، صحت وبیماری، فتح وشکست، اقبال وادبار، شادی وغمی، دوستی و دشمنی؛ ان سب کو اللہ کے اختیار وارادے کے تحت سمجھنا اور یوں کہنا کہ اگر اللہ چاہے گا تو ہم یوں کریں گے یا یوں ہوگا، اللہ کا نام ایسی تعظیم وادب سے لینا جس سے اس کی مالکیت اور اپنی بندگی ظاہر ہو، مثلاً اس طرح کے الفاظ کہنا: ہمارا رب، ہمارا مالک، ہمارا خالق، ہمارا اللہ پاک، اگر کبھی قسم کھانے کی ضرورت پڑے تو اللہ ہی کے نام کی قسم کھانا، اپنا ہر کام اسی کے حوالے کرنا، ہر خیر وشر کو اسی کی طرف سے سمجھنا، ہر کام میں اسی پر اعتماد رکھنا، غرض اس طرح کی سب چیزیں اللہ نے اپنی تعظیم کے لیے بتائی ہیں۔

اشراک فی العادۃ:

جو کوئی شخص مذکورہ امور میں سے کوئی کام کسی غیر اللہ کے ساتھ کرے، جیسے نبی، ولی، امام،

شہید، بھوت، پری، شیطان، حاکم وقت، رئیس و بادشاہ کے ساتھ اللہ جیسی عظمت بجالائے اور اس کا نام بڑی تعظیم سے لے، جیسے غریب پرور، ولیِ نعمت، خداوندِ نعمت، شہنشاہ، مہاراج، ان داتا وغیرہ، یا غیر اللہ کی قسم کھائے تو ان سب باتوں سے شرک ثابت ہو جاتا ہے۔ اس کو "اشراک فی العادۃ" کہتے ہیں۔ یعنی اپنی عادت کے کاموں میں جو تعظیم اللہ کے لیے چاہیے تھی، ویسی غیر اللہ کے لیے کی جائے۔ ان چاروں اقسام کے شرک کا ذکر صراحت کے ساتھ قرآن پاک میں آیا ہے۔ صاحب "تقویۃ الایمان" نے ہر قسم کے لیے ایک علاحدہ فصل لکھی ہے، قرآنی آیات نقل کر کے ترجمہ وفائدہ لکھا اور شرک کی چاروں قسموں کی برائی ثابت فرمائی ہے۔ جزاہ اللہ خیرا.[1]

علمِ غیب:

اشراک فی العلم جس کا بیان گزر چکا ہے، اس میں ایک اہم مسئلہ علمِ غیب کا ہے۔ اللہ کے سوا کسی پیغمبر، ولی، فرشتے، جن، شہید، امام، یا بھوت پری و شیطان وغیرہ کے لیے علم غیب ثابت کرنا اور ان میں سے کسی کے بارے میں یہ اعتقاد رکھنا کہ وہ غیب داں ہے، یہ شرک جلی ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ﴾ [الأنعام: ٥٩]

[اللہ ہی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں، ان کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے]

غیب وہ چیز ہے جو ظاہری حواس سے غائب ہو اور اس کا اتا پتا عقل و شعور میں نہ آسکے، جیسے اللہ کے احکام جو ہر روز دنیا میں جاری ہوتے رہتے ہیں یا اللہ کی ذات وصفات کی حقیقت، یا قیامت کے آنے کا وقت، یا انسان پر مرض والم، فقر وغنا اور راحت وکلفت جیسے احوال جو گزرنے والے اور پیش آنے والے ہیں۔ یہ آیت غیر اللہ سے علم غیب کی نفی کے بارے میں نص صریح اور واضح دلیل ہے کہ علم غیب اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

مذکورہ بالا آیت میں لفظ: ﴿مَفَاتِحُ الْغَيْبِ﴾ غیب کی تمام صورتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ کوئی اور کسی قسم کی بھی غیبی بات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ دیکھو منافقین نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی تھی، جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج وقلق رہا، لیکن اصل حال معلوم نہ ہوا۔ پھر جب اللہ نے چاہا تو

[1] تقوية الإيمان (ص: ٢٧۔٨٣)

بتا دیا۔ اگر رسول اللہ ﷺ غیب داں ہوتے تو اتنا رنج و غم کیوں کرتے؟ پہلے ہی ان کی پاک دامنی جان لیتے۔

اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ میں جب چاہتا ہوں، غیب کی بات معلوم کر لیتا ہوں اور آیندہ باتوں کو جان لینا میرے قابو میں ہے تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے، جو خدائی کا دعویٰ رکھتا ہے۔ ایسا اعتقاد کسی نبی، ولی، جن، فرشتے، برہمن آشٹی، بھوت پری، پیر، امام، شہید، نجومی، جوتشی اور فال دیکھنے والے کے حق میں رکھنا شرک ہے۔ یہی حال استخارۂ تسبیح اور کشف والہام نیز قرآن شریف سے فال نکالنے کا ہے، جو شرک کی آلایش سے خالی نہیں ہے۔ فقہا نے قرآن پاک سے فال نکالنے کو مکروہ لکھا ہے، کیونکہ قرآن عمل کرنے کے لیے آیا ہے، اس لیے نہیں نازل ہوا کہ اس سے فال حاصل کریں، اس کو چومیں چاٹیں، کمخواب اور اطلس کا غلاف پہنا کر طلائی و سنہری بنا کر طاق یا الماری میں رکھ چھوڑیں۔

مذکورہ بالا آیت سے زیادہ صریح یہ آیت ہے:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النمل: ٦٥]

[اے نبی! آپ کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین میں جتنے لوگ ہیں وہ غیب نہیں جانتے سوا اللہ کے اور انھیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ کب جی اٹھیں گے]

اس آیت میں ساری مخلوقات و کائنات سے علم غیب کی نفی کی گئی اور بتایا گیا ہے کہ غیب نہ جاننے میں ہر بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی مخلوق برابر ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم علوی و سفلی دونوں علم غیب سے بالکل بے بہرہ ہیں۔ جب اللہ پاک نے یہ صراحت فرما دی تو اب وہ کون ہے جو یہ کہہ سکے کہ مجھے غیب کی بات معلوم ہو جاتی ہے؟ سارے جہان میں چاہے کوئی صالح ہو یا طالح، رسول ہو یا فرشتہ یا اور کوئی؛ کسی کے لیے روا نہیں ہے کہ وہ اپنے بارے میں غیب دانی کا تصور کرے یا کوئی دوسرا اس کے بارے میں اس کا اعتقاد رکھے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ فتح و شکست، تندرستی و بیماری، قحط و بارانی، غنا و فقر وغیرہ امور کا حال کسی کو معلوم نہیں ہے۔ کشف و استخارہ اور تقویم کے مدعی اور علم رمل و جفر و فال والے جو غیب دانی کا دعویٰ کرتے ہیں، یہ سب جھوٹے، دغا باز اور مکار ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اللہ کی طرف سے کبھی کسی کو کوئی بات معلوم ہو جائے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے، ہم اس کو یقین کے ساتھ سچا یا جھوٹا نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں خاص پانچ باتوں کے بارے میں اللہ

کے سوا کسی اور کی غیب دانی کا صاف انکار فرمایا گیا ہے، ایک وقتِ قیامت، دوسری وقتِ باراں، تیسری وہ چیز جو ماں کے پیٹ میں ہے، چوتھی حال فردا، پانچویں جائے موت ہے۔ ان پانچوں کا علم اللہ کے لیے خاص ہے، ان میں سے کسی چیز کے بارے میں کسی مخلوق کو قطعی علم نہیں ہو سکتا۔

دیکھو! تمام انبیا و اولیا کے سردار ہمارے رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب خاص ان سے یہ بات کہلا دی کہ میں اپنی ذات کے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، اگر میں غیب جانتا تو بہت سی بھلائی حاصل کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ چھوتی، تو اب وہ دوسرا کون ہے جو غیب داں ہو؟ البتہ کبھی کسی کو اللہ کی طرف سے کسی بات کا القا والہام ہو جائے تو یہ اور بات ہے، لیکن اس طرح سے کسی بات کی خبر ہو جانا اس کی اپنی ذاتی قدرت و اختیار سے نہیں ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے بہت سے امور واحوال کی خبر دی ہے، کسی کو بہشتی اور کسی کو دوزخی بتایا، علاماتِ قیامت بیان فرمائیں؛ یہ سب آپ ﷺ نے اللہ کی قدرت واختیار سے بتایا ہے۔

فقہا نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ انبیا و اولیا کی بابت علمِ غیب کا اعتقاد رکھنا کفر ہے، لہٰذا جو کوئی یہ کہے کہ ارواحِ مشائخ حاضر ہیں اور علم رکھتی ہیں، وہ کافر ہو جاتا ہے۔[1] حدیثِ ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا میں یہ بات مذکور ہے کہ چند چھوکریاں گیت گا رہی تھیں تو ان میں سے ایک چھوکری نے اپنے گیت میں کہا:

و فينا نبي يعلم ما في غد

[ہم میں ایسا نبی ہے جو کل کی بات جانتا ہے]

رسول اللہ ﷺ نے اسے جھڑک دیا اور یہ بات کہنے سے منع کیا۔[2]

اس سے معلوم ہوا کہ کسی نبی، ولی، امام، شہید، پیر، استاد، کاہن، ساحر، نجومی اور جوتشی وغیرہ سے متعلق یہ عقیدہ رکھنا جائز نہیں ہے کہ وہ غیب کی بات جانتا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی جناب میں بھی یہ اعتقاد رکھنا درست نہیں ہے، بلکہ آپ کی تعریف میں بھی ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ نعتیہ کلام کے متعلق شعرا کا یہ عذر پیش کرنا کہ شعر میں مبالغہ ہوتا ہے، غلط بات ہے، اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے شعر مذکور میں اپنے علمِ غیب کے ذکر ہی پر منع وتوبیخ کیا تھا۔ آپ ﷺ نے جب ایک بچی کو ایسی

---

[1] البحر الرائق لابن نجيم الحنفي (٥/ ١٣٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٠٠١، ٥١٤٧)

بات کہنے سے روک دیا تو مرد عاقل کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ایسا شعر کہے یا کوئی اس کو سن کر پسند کرے؟ جس طرح یہ شعر ہے:

بقلم گر نرسید انگشتش
بود لوح وقلم اندر مشتش

[آپ کی انگشت مبارک نے قلم سے اگر چہ لکھا نہیں، لیکن لوح وقلم آپ کی مٹھی میں تھے]

اس مضمون کو صاحبِ قصیدہ بردہ اور میر آزاد بلگرامی نے بھی عربی زبان میں باندھا ہے، جو اللہ اور رسول دونوں کی شان میں بالکل بے ادبی ہے۔ بخاری شریف میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا: ''جس نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ غیب جانتے ہیں، اس نے جھوٹ کہا۔''[1]

سنن ترمذی میں ہے کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا:

''جو کوئی تم سے یہ کہے کہ رسول اللہ ﷺ ان پانچ باتوں کو جانتے تھے جو سورت لقمان کی آیت: ﴿إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ ... الآية﴾ میں مذکور ہیں تو اس نے بڑا جھوٹ باندھا، کیونکہ اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا ہے۔''[2]

اس سے ثابت ہوا کہ جو کوئی یہ بات کہے کہ پیغمبر یا امام غیب کی بات جانتے تھے، مگر ادبِ شریعت کی وجہ سے زبان سے نہیں نکالتے تھے تو وہ بہت بڑا جھوٹا ہے، کیونکہ غیب کی بات اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ ہم ایسا کہنے والے کو سچا کہیں یا رسول اللہ ﷺ کو سچا سمجھیں؟ جنھوں نے یہ فرمایا ہے:

«وَاللّٰهِ لَا أَدْرِيْ، وَأَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ، مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ؟» (أخرجه البخاري)[3]

[اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہونے کے باوجود یہ نہیں جانتا کہ میرے اور تمھارے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟]

یہ کس قدر اہم اور تاکیدی بات ہے جو آپ ﷺ نے اللہ کی قسم کھا کر اور اپنی ذات کو اس کا رسول بتا کر فرمائی ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے اور اس بات کی دلیلِ صریح ہے کہ اللہ پاک اپنے بندوں سے خواہ دنیا میں یا قبر میں یا آخرت میں جو کچھ معاملہ کرے گا، اس کی حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٣٨٠)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٢٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٢٤٣، ٧٠١٨)

یہ کسی نبی کو معلوم ہے نہ ولی کو، نہ اپنا حال نہ دوسرے کا، ہاں وحی یا الہام کے ذریعے کسی کا اچھا یا برا انجام معلوم ہو جانا اور بات ہے، پھر بھی اس کی تفصیل معلوم ہونا، ان کے اختیار سے باہر ہے۔

اشراک فی التصرف کی مزید وضاحت:

اشراک فی التصرف میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کو ساری خدائی میں کسی کو نفع وضرر پہنچانے کا مختار مانا جائے۔ سب کو چھوڑو، سب سے بہتر واکمل ہمارے رسول ﷺ ہیں، خود ان کو اللہ نے یہ حکم دیا کہ آپ یہ بات کہہ دیں کہ میں تمھارے نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں۔ مجھ کو اللہ کے سوا ہرگز کوئی بچا سکتا ہے نہ میں اللہ کے سوا کوئی پناہ گاہ پاتا ہوں۔ یہ آیت سورۃ الجن [آیت:۲۲] میں ہے۔

یہ آیت جب بتا رہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کسی شخص بلکہ اپنے نفع ونقصان کے مالک بھی نہیں ہیں تو پھر وہ دوسرا کون ولی، امام، شہید، پیر، مرید یا جن بھوت ایسا ہے جو کسی کا کچھ بھلا برا کر سکے؟ گویا یہ تنبیہ کی گئی ہے کہ کہیں تم اس دھوکے میں نہ پڑنا کہ ہمارا پایہ بڑا مضبوط ہے، ہمارا وکیل بڑا زبردست ہے اور ہمارا شفیع بڑا محبوب ہے، لہٰذا ہم جو چاہیں سو کریں، وہ ہمیں اللہ کے عتاب سے بچالے گا، یہ بات بالکل غلط ہے۔ میں اپنے ہی لیے ڈرتا ہوں اور اللہ کے سوا کہیں اپنا بچاؤ اور پناہ نہیں پاتا تو دوسرے کو اللہ کی مرضی کے خلاف کیا بچا سکوں گا؟

سورت یونس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَ لَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَ لَا يَضُرُّكَ فَاِنْ فَعَلْتَ فَاِنَّكَ اِذًا مِّنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [يونس: ١٠٦]

[اے نبی! اللہ کے سوا ان کو نہ پکارو جو تمھیں فائدہ ونقصان نہ دیں، اگر تم نے ایسا کیا تو بیشک تم بے انصاف ہوئے]

یعنی اللہ جیسے زبردست کے ہوتے کسی عاجز کو پکارنا جو نفع ونقصان کی طاقت سے بالکل محروم ہو، محض ظلم ونا انصافی ہے کہ ایسی بڑی ہستی کا مرتبہ ایسے عاجز کے لیے ثابت کیا جائے۔

سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ایک حدیث سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

"اے لڑکے! اللہ کو یاد رکھ تو وہ تجھے یاد رکھے گا، اس پر نگاہ رکھ تو اس کو اپنے سامنے پائے گا، جب

کچھ مانگنا ہو تو اسی اللہ سے مانگ اور جب مدد چاہے تو اسی سے مدد طلب کر۔ اچھی طرح جان لے کہ اگر سارے لوگ اس بات پر اکٹھے ہو جائیں کہ تجھ کو کچھ فائدہ پہنچائیں تو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتے، مگر جتنا اللہ نے تیرے لیے لکھ رکھا ہے اور اگر اس پر اکٹھے ہو جائیں کہ تجھ کو کچھ نقصان پہنچائیں تو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، مگر اتنا ہی جو اللہ نے تیرے لیے لکھ دیا ہے۔ قلم اٹھا لیے گئے اور کاغذ خشک ہو گئے ہیں۔"[1]

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اللہ کے سوا ہم کسی کو نفع دینے والا، نقصان کرنے والا اور تصرف والا نہ سمجھیں، بلکہ سب کو اللہ کے سامنے عاجز اور بیکار جانیں۔ جو قلبی مراد یا ظاہری حاجت ہو، وہ سب اللہ ہی سے مانگیں۔ کوئی مخلوق چھوٹی ہو یا بڑی، اس سے ہرگز نہ مانگیں اور اس قسم کا خیال دل میں نہ لائیں کہ اللہ تعالیٰ جو سب بادشاہوں سے بڑا بادشاہ ہے، دوسرے بادشاہوں کی طرح مغرور ہے کہ اس کی رعیت کتنا ہی التجا کرے، وہ اس کی طرف مارے غرور کے خیال نہیں کرتا ہے، اس لیے وہ وزرا اور امرا کا محتاج بن کر ان کا وسیلہ، ذریعہ اور واسطہ ڈھونڈتا پھرتا ہے کہ انھیں وسیلوں سے التجا قبول ہو جائے، یہ ایک باطل سوچ ہے، کیونکہ اللہ تو تمام رحم و کرم کرنے والوں سے بڑا رحیم و کریم ہے۔ وہاں کسی کی وکالت و سفارت کی ضرورت نہیں ہے، جو اسے یاد دلایا کرے۔ وہ تو ایسی ہستی ہے جو آپ ہی سب کی التجا جانتا اور یاد رکھتا ہے، کوئی سفارش کرے نہ کرے، اس کا دربار اہلِ دنیا کے دربار کی طرح نہیں ہے کہ وہاں تک رعیت کی رسائی نہ ہو، امیر و وزیر حکم چلائیں اور رعایا کو ان کے دربار کا سہارا لینا پڑے، بلکہ وہ اللہ تو اپنے بندوں سے بہت نزدیک ہے۔

ایک ادنا اور حقیر بندہ بھی جب دل سے اس کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہیں اس کو اپنے سامنے پاتا ہے۔ اپنی غفلت کے سوا وہاں اور کوئی پردہ نہیں ہے۔ ہم اپنے آپ کو جو اس سے دور سمجھے ہوئے ہیں، یہ ہماری غفلت کا سبب ہے، ورنہ اللہ ہم سے ہر چیز سے زیادہ قریب بلکہ ہر لمحے ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے باوجود جو شخص کسی پیر، پیغمبر، ولی، شہید، امام یا جن پری کو پکارتا ہے، تاکہ وہ اس کو اللہ کے نزدیک کر دیں تو وہ بہت بڑا احمق ہے، جو یہ نہیں سمجھتا کہ وہ پیر و پیغمبر وغیرہ اس پکارنے والے سے بہت دور ہیں اور اللہ اس سے بہت قریب ہے۔ یہ نزدیک کو چھوڑ کر کہاں اتنی دور جاتا ہے؟ سوچو! ایک آدمی بادشاہ کے پاس اکیلا بیٹھا ہو اور وہ بادشاہ اس کی غرض سننے کو متوجہ ہو، لیکن وہ آدمی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٦٣٥)

کسی امیر یا وزیر کو کہیں دور سے پکارے کہ تو میری طرف سے فلاں بات بادشاہ کے حضور میں عرض کر دے تو کیا اس آدمی کو اندھا یا دیوانہ نہیں کہا جائے گا؟

غرض کہ حدیث مذکور اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بندہ اپنی ہر مراد اللہ ہی سے بلا واسطہ مانگے، ہر مشکل میں بلا وسیلہ اسی کی مدد چاہے اور یقین رکھے کہ تقدیر کا قلم ہرگز نہیں بدلتا اور قسمت کا لکھا کبھی نہیں مٹتا۔

ایک شبہہ:

عوام کا یہ کہنا کہ اللہ نے اولیا کو یہ طاقت بخشی ہے کہ تقدیر کو بدل ڈالیں، جس کی تقدیر میں اولاد نہیں لکھی ہے، اس کو اولاد دیں، جس کی عمر تمام ہو چکی ہے اس کی عمر بڑھا دیں تو یہ بات بالکل شرک اور اللہ کے تصرف کو دوسرے کے لیے ثابت کرنا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی اللہ کسی بندے کی دعا قبول کر لیتا ہے، مگر اس دعا کا قبول کرانا بندے کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یہ دونوں باتیں کہ دعا کرنے کی توفیق ہوئی، پھر وہ دعا قبول ہو کر مراد ملی، تقدیر میں لکھی ہیں۔ تقدیر سے باہر دنیا میں کوئی کام نہیں ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مالک مختار ہے، چاہے از راہِ مہربانی وہ دعا قبول کرے یا حکمت کے تحت وہ دعا قبول نہ کرے، یہ سب اسی کی مرضی پر موقوف ہے۔

سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ ہر کسی کو چاہیے کہ اپنی حاجت اپنے رب سے مانگے، یہاں تک کہ نمک بھی اسی سے مانگے اور جوتی کا تسمہ جب ٹوٹ جائے تو وہ بھی اسی سے مانگے۔[1]

(رواه الترمذي)

یعنی اللہ کو دنیا کے بادشاہوں کی طرح نہ سمجھے کہ بڑے بڑے کام تو وہ کرتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے کام نوکروں چاکروں کے حوالے کر دیتے ہیں، اس لیے رعایا کو اپنے کاموں کے لیے ان ملازمین سے التجا کرنی پڑتی ہے، لیکن اللہ پاک کے یہاں ایسا کارخانہ ایسا نہیں ہے، بلکہ وہ تو اتنا بڑا قادرِ مطلق ہے کہ ایک آن میں چھوٹے بڑے کروڑوں کام درست کر سکتا ہے، اس کی سلطنت میں کسی کی قدرت نہیں ہے، وہاں کسی کا تصرف ہے نہ کسی کا دخل، پس ضروری ہے کہ ہر چھوٹی بڑی چیز اسی سے مانگی جائے، کیونکہ اس کے سوا کوئی چھوٹی چیز دے سکتا ہے نہ بڑی عطا کر سکتا ہے۔

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٦٨٢، ٣٦٨٣)

شرک فی العبادۃ کی مزید شکلیں:

اشراک فی العبادۃ میں ایک امر یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس کسی کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کے لیے لوگ کھڑے ہوں تو وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنائے۔'' (اس کو ترمذی نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے)[1]

یعنی جو شخص یہ چاہے کہ لوگ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر ادب سے کھڑے رہیں، ہلیں جلیں نہ ادھر ادھر دیکھیں، بلکہ بے روح تصویر کی طرح بن جائیں تو ایسا آدمی دوزخی ہوتا ہے، کیونکہ یہ ایک طرح سے خدائی کا دعوی ہے، کیوں کہ جو تعظیم اللہ پاک کے لیے مخصوص ہے، جیسے اس کے بندے اس کے سامنے نماز میں ہاتھ باندھ کر نہایت ادب سے کھڑے ہوتے ہیں، یہی صورت اس شخص نے اپنے لیے چاہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ محض کسی کی تعظیم کے لیے اس کے روبرو کھڑے رہنا ان کاموں میں سے ہے جو اللہ پاک نے اپنی تعظیم کے لیے مقرر کیے ہیں۔ یہ کام کسی اور کے لیے کرنے والا عبادت گزار کے برابر اور معظم شخص معبود کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ جب تعظیمی قیام کا حکم یہ ہے تو کسی مخلوق کے سامنے رکوع و سجود کرنا اور بھی بدتر ہوا اور ایسا کرنے والا مشرک ہوا۔

امتِ محمدیہ میں شرک کا انتشار:

ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ میری امت کی کئی قومیں مشرکوں سے مل جائیں اور میری امت کی کچھ قومیں بتوں کو پوجنے لگیں۔''[2]

شرک دو طرح پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کسی کے نام کی صورت بنا کر اس کی پوجا کی جائے۔ اس کو عربی میں ''صنم'' کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ کسی کے تھان کی پوجا پاٹ کریں، یعنی کسی کے مکان یا نشان یا درخت یا پتھر یا لکڑی یا کاغذ کو پوجیں۔ اس کو عربی میں ''وثن'' کہتے ہیں، اس میں قبر، چلہ، لحد، تعزیہ، کسی کے نام کی چھڑی، مہدی، امام قاسم، پیر دستگیر، چبوترہ، امام بارہ، نبی خانہ، استاد اور پیر وغیرہ کی نشست گاہ وغیرہ داخل ہیں، جن کی لوگ تعظیم کریں یا وہاں جا کر نذر چڑھائیں اور منت مانیں، اسی طرح شہید کے نام کا طاق یا نشان اور توپ جس پر بکرا چڑھاتے ہیں اور اس کی قسم کھاتے

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۲۹۰۳)

[2] سنن أبي داود (۴۲۳۲) سنن الترمذي (۲۳۱۶) سنن ابن ماجه (۳۹۵۲) مسند أحمد (۵/۲۷۸، ۲۸۴)

ہیں، یا سیتلا کا تھان یا بھوانی کا مکان وغیرہ یہ سب اوثان ہیں، جن کو قرآن اور حدیث کا بیان شامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ بالا حدیث میں خبر دی ہے کہ جو مسلمان قیامت کے نزدیک مشرک ہو جائیں گے، ان کا شرک اسی قسم کا ہوگا اور وہ ایسی چیزوں کو مانیں گے۔ یہ حدیث گویا رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے کہ جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی آخر امت میں ہوا۔ یہ امر قیامت کے انتہائی قریب ہونے کی دلیل ہے۔

قربِ قیامت زمانہ جاہلیت جیسا شرک ہوگا:

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی طویل حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''دن اور رات ختم نہیں ہوں گے، یعنی قیامت نہیں آئے گی، یہاں تک کہ لوگ لات وعزی (دو بتوں کے نام) کی پوجا کریں۔ ... پھر اللہ تعالیٰ ایک عمدہ ہوا بھیجے گا جو ہر اس شخص کی جان نکال لے گی جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر ایمان ہوگا اور ایسے لوگ باقی رہ جائیں گے جن میں کوئی اچھائی نہیں ہوگی۔ یہ لوگ اپنے باپ دادوں کے دین کی طرف پلٹ جائیں گے۔''[1] (اس کو مسلم نے روایت کیا ہے)

یعنی ایسے لوگ رہ جائیں گے جن میں اللہ کی تعظیم ہوگی نہ رسول اللہ ﷺ کی راہ پر چلنے کا شوق، بلکہ وہ باپ دادوں کی رسموں کو سند بنائیں گے اور اس طرح وہ شرک میں پڑ جائیں گے، کیونکہ اکثر پرانے باپ دادے جاہل مشرک گزرے ہیں، تو جو کوئی ان کی راہ ورسم کی سند پکڑے، وہ بھی مشرک ہو جائے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آخر زمانے میں قدیم شرک رائج ہو جائے گا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ہوا بھی ایسا ہی ہے، جس طرح بہت سے مسلمان اپنے نبی، ولی اور امام وشہید کے ساتھ شرک کا معاملہ کرتے ہیں، اسی طرح قدیم شرک بھی پھیل رہا ہے۔ اب مسلمان کافروں کے بتوں کو مانتے ہیں اور ان کی رسموں پر بھی چلتے ہیں، جیسے برہمن سے اپنے امور کا حال پوچھنا، پرندوں سے شگون لینا، ساعت گھڑی ماننا، سیتلا (چیچک) مسانی پوجنا، کلوا پیر کی دہائی دینا، ہولی اور دیوالی کا تہوار کرنا، مجوسیوں کے میلے نو روز ومہرجان میں شریک ہونا، چاند کا برج عقرب میں

[1] صحيح مسلم (٤/ ٢٢٣٠)

تحت الشعاع کا اعتبار کرنا؛ یہ ساری رسمیں ہنود و مجوس کی ہیں جو مسلمانوں میں رواج پا گئی ہیں۔ معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں شرک کی راہ اسی طرح کھلے گی کہ وہ قرآن وحدیث چھوڑ کر باپ دادوں کی رسموں کے پیچھے چل پڑیں گے۔

صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی طویل حدیث جس میں خروجِ دجال کا ذکر ہے، اس میں رسول اللہ ﷺ نے ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ شیطان لوگوں کے پاس آکر تھانوں کی عبادت کا حکم دے گا، ساتھ ہی ان کو خوب رزق ملے گا اور اچھی گزران ہوگی۔[1]

ان حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آخر زمانے میں ایماندار لوگ مر جائیں گے اور محض برے لوگ رہ جائیں گے، جو نہ بھلا سمجھیں گے نہ برا، رات دن پرائے مال کھانے کی فکر میں ہوں گے۔ ان کو شیطان بتا دے گا کہ بے دین ہو جانا بڑے شرم کی بات ہے، اس لیے دین کا کچھ شوق تو ان میں ہوگا، مگر اللہ ورسول کے فرمان پر نہیں چلیں گے، بلکہ اپنی عقل سے دین میں نئی راہیں نکالیں گے اور شرک میں پڑ جائیں گے، اس حالت میں بھی ان کو روزی کی فراوانی اور زندگی کا آرام ملے گا۔ اس خوش حالی کے سبب وہ اور زیادہ شرک میں پڑیں گے کہ جوں جوں ہم ان چیزوں کو مانتے ہیں، ویسے ہی ہمیں ہماری مرادیں ملتی ہیں۔ یہ اللہ کی طرف سے ڈھیل ہوتی ہے۔ اس کے داؤ سے ڈرنا چاہیے کہ بعض وقت بندہ شرک میں پڑا ہوتا ہے اور غیر سے مرادیں مانگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو بہلانے اور اس کی غفلت بڑھانے کے لیے اس کی مرادیں پوری کرتا ہے، جس سے وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں سچی راہ پر ہوں، اس لیے مومن کو خبردار رہتے ہوئے مراد ملنے نہ ملنے کا اعتبار نہیں کرنا چاہیے اور چاہیے کہ سچا دینِ توحید ہاتھ سے نہ چھوڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کتنا ہی گناہوں میں ڈوب جائے اور محض بے حیا بن جائے، پرایا مال کھانے میں کوئی شرم نہ کرے، بھلے برے میں کوئی امتیاز نہ رکھے، پھر بھی شرک کرنے اور اللہ کے سوا کسی اور کو ماننے سے بہتر ہے، کیونکہ شیطان وہ بری باتیں چھڑا کر شرک کی بات سکھاتا ہے۔

امتِ محمدیہ میں بت پرستی:

حدیثِ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

[1] صحیح مسلم (٤/٢٢٥٩)

''قیامت نہیں آئے گی یہاں تک کہ قبیلہ دوس کی عورتوں کے سرین ذو الخلصہ (بت) کے گرد حرکت کریں گے۔''[1]

ایک عرب قبیلے کا نام دوس ہے، ان میں ایک بت تھا جس کا نام ''ذو الخلصہ'' تھا۔ وہ بت رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں برباد ہو گیا تھا، آپ نے فرمایا کہ قیامت کے قریب اس کو لوگ پھر ماننے لگیں گے اور عورتیں اس کے گرد طواف کریں گی۔ ان کے سرین حرکت کرنے کا یہی مطلب ہے۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے گھر کے سوا کسی اور کا طواف کرنا شرک کی بات اور کافروں کی رسم ہے، اس لیے یہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے، خواہ کوئی بت ہو یا کوئی مشہد یا وہ کسی نبی، ولی، امام اور شہید کی قبر ہو، یا کوئی تھان یا مکان یا کسی مخلوق کا نشان ہو۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧١١٦) صحيح مسلم (٤/ ٢٢٣٠)

چوتھا باب

شرک کے بعض احوال اور عبادت کی اقسام کا بیان

افعال میں شرک اس طرح ہوتا ہے کہ غیر اللہ کو سجدہ کریں، کعبہ کے سوا کسی اور مکان کا طواف کریں، کسی کے لیے سر منڈوائیں، حجر اسود کے سوا کسی اور پتھر کا بوسہ لیں یا کسی قبر کو چومیں یا اسے سجدہ و رکوع کریں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں پر لعنت فرمائی ہے جو انبیا کی قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں۔[1]

پھر سوچنا چاہیے کہ جو قبر پرست ہیں ان کا کیا حال ہوگا؟ ان کو تو ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کا معنی ہی معلوم نہیں ہے۔ دوسری حدیث میں آیا ہے کہ بدترین لوگ وہ ہیں جو قبروں کو مساجد (سجدہ اور عبادت کی جگہ) بناتے ہیں۔ گذشتہ امتوں نے ایسا ہی کیا تھا، میں تم کو ان کاموں سے منع کرتا ہوں۔[2]

مسند احمد کی حدیث میں ان عورتوں پر لعنت آئی ہے جو قبروں کی زیارت کرتی پھرتی ہیں اور ان لوگوں پر بھی جو قبروں پر چراغ جلاتے ہیں۔[3]

زیارتِ قبور:

قبروں کی زیارت کرنے والے تین طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو قبر پر جا کر مُردوں کے لیے دعا کرتے ہیں، ان کے حال و مآل سے عبرت پکڑتے ہیں، دنیا سے بے رغبت رہتے ہیں اور موت کو یاد کرتے ہیں۔ یہ زیارت کا شرعی طریقہ ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو مُردوں کا نام لے کر

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٣٥، ٤٣٦، ١٣٣٠، ١٣٩٠) صحيح مسلم (١/٣٧٦، ٣٧٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٦٧، ٤٣٤) صحيح مسلم (١/٣٧٦)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣١٩) سنن النسائي (٤/٩٥) مسند أحمد (١/٢٢٩، ٢٨٧، ٣٢٤) اس حدیث کی سند میں "أبو صالح" راوی ضعیف ہے۔ البتہ ایک حدیث ان الفاظ "لعن رسول اللہ ﷺ زوارات القبور" سے حسن سند کے ساتھ مروی ہے۔ (سنن الترمذي، رقم الحديث: ١٠٥٦)

دعا مانگتے ہیں، یہ الوہیت ومحبت میں شرک کے مرتکب ہیں۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو خود ان مُردوں سے دعا کرتے ہیں۔ یہ ربوبیت میں مشرک ہیں۔ اسی طرح غیر اللہ کو سجدہ کرنا یا اس کی قسم کھانا یا کسی کام کو غیر اللہ کی مشیت پر رکھنا یا اس کو پکارنا یا اس کا نام لے کر دعا کرنا شرک ہے۔ آیت کریمہ کے الفاظ ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ میں عبادت سے مراد یہ ہے کہ سجدہ، توکل، انابت، تقوی، خوف وخشیت، رجا ورضا، توبہ، نذر، تسبیح، تکبیر، تہلیل، تحمید، تمجید، استغفار، سر منڈوانا، دعا، خشوع اور خضوع سب اللہ وحدہ کے لیے ہو، کسی اور کے لیے نہیں۔

شرک کی بنیادی اقسام:

جو شرک ارادوں اور نیتوں میں ہوتا ہے، وہ ایک بحرِ بے کراں ہے، اس سے نجات پانا بہت دشوار ہے۔ جس نے غیر اللہ کے ارادے اور نیت سے کوئی عمل کیا، اس نے ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کا معنی نہیں سمجھا، کیونکہ شرک دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کا تعلق معبود کی ذات اور اس کے اسما وصفات وافعال سے ہوتا ہے۔ دوسری قسم کا شرک عبادت میں ہوتا ہے۔ ایسا مشرک اگر یہ اعتقاد رکھتا ہو کہ ذات وصفات الٰہی میں کوئی شریک نہیں ہے تو بھی اس میں اور شرک فی العبادۃ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔

شرکِ تعطیل:

شرک کی پہلی قسم بنیادی طور پر دو طرح کی ہے۔ ایک شرکِ تعطیل ہے۔ یہ شرک کی تمام اقسام میں بدترین ہے۔ فرعون کا شرک یہی تھا کہ وہ صفاتِ الٰہی کا منکر تھا۔ شرک اور تعطیل ایک دوسرے کو لازم ملزوم ہیں، یعنی ہر مشرک معطل اور ہر معطل مشرک ہوتا ہے۔ اگرچہ شرک اصل تعطیل کو مستلزم نہیں ہے، کیونکہ بعض مشرکین خالق اور صفاتِ خالق کا اقرار بھی کرتے ہیں، مگر اصل شرک یہی تعطیل ہے، اس لیے یہاں اس کو بیان کیا جا رہا ہے۔

تعطیل کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مصنوع کی صانع سے تعطیل اور نفی کرنا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ صانع کو اس کمال سے معطل کر دینا جو اس کے لیے ثابت ہے۔ تیسری تعطیلِ معاملہ ہے، یعنی جو توحید بندے پر واجب ہے، اس کی حقیقت کو بے کار کر دینا۔ مشرکین کی ایک قسم وحدۃ الوجود والے ہیں، پھر انھیں میں سے ایک قسم وہ ملحدین ہیں جو عالم کی قدامت وابدیت کے قائل ہیں اور سارے

حوادث کی نسبت عقول ونفوس کی طرف کرتے ہیں۔ نیز ان میں وہ بھی شامل ہیں جو اللہ کے اسما وصفات کو بے کار قرار دیتے ہیں، جیسے فرقہ جہمیہ، قرامطہ اور غالی قسم کے معتزلہ۔

شرکِ تمثیل:

دوسرا شرک تمثیل ہے جو تعطیل کے مقابل ہے۔ تمثیل سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے مثل دوسرے کو بھی سمجھنا، جیسے نصاریٰ کا یہ اعتقاد رکھنا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ یا اللہ کے بیٹے ہیں، یہود کا یہ اعتقاد رکھنا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں۔ اسی طرح مجوس کا نور وظلمت کی طرف حوادث کی نسبت کرنا، یہ شرک تمثیل ہے۔ فرقہ قدریہ کا شرک اسی شرک کا خلاصہ ہے۔ دنیا میں بڑے مشرک یہی لوگ ہیں۔ یہ کئی گروہ ہیں۔ ان میں کوئی اجزاے سماویہ کا پرستار ہے اور کوئی اجزاے ارضیہ کا پجاری ہے۔ کسی کو یہ زعم ہے کہ اس کا معبود سب خداؤں سے بڑا خدا ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ ہمارا معبود منجملہ خداؤں کے ایک خدا ہے۔ جب ہم ایک کو خاص کر کے اس پر تکیہ کر لیتے ہیں تو وہ ہماری طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ کسی کا اعتقاد یہ ہے کہ ادنا معبود اعلا معبود تک پہنچا دیتا ہے اور وہ اپنے سے اعلا معبود تک یہاں تک کہ خدا تک رسائی ہو جاتی ہے، اس لیے کبھی زیادہ اور کبھی کم وسائط ہوتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے افعال واقوال اور ارادات کے شرک کی تمام قسموں پر سخت انکار فرمایا ہے۔ جس نے غیر اللہ پر توکل کیا وہ مشرک ہوا۔ جس نے کسی غیر کے سامنے توبہ کی، اس نے اس غیر کو اللہ کے مشابہ بنایا۔ جس نے کسی طرح کا تکبر وغرور کیا، اس نے گویا خدائی کا دعوی کیا، غرض کہ تشبہ وتشبیہ دونوں شرک ہوتے ہیں۔

کسی کو اس لیے پوجنا کہ وہ اللہ تک ہماری رسائی کرا دے گا، اللہ کے ساتھ بدگمانی کرنا ہے، ایسی بدگمانی والے شخص پر قرآن پاک میں اللہ کا غضب ولعنت آئی ہے۔ ضلالت وبدعت میں مبتلا جتنی جماعتیں ہیں، ان سب کی ضلالت کی بنیاد یہی دو چیزیں ہیں، ایک اللہ کے ساتھ بدگمانی کرنا، دوسرے اللہ کی ناقدری کرنا، مثلاً جس نے یہ گمان کیا کہ اللہ نے کوئی رسول بھیجا ہے نہ کوئی کتاب اتاری ہے، بلکہ یونہی مخلوق کو پیدا کر کے آزاد چھوڑ دیا ہے تو وہ اللہ کا ناقدر داں ہے، اسی طرح جس کسی نے شریعت حقہ کے کسی ثابت شدہ امر میں انکار، شک، تردد یا حیرت کا اظہار کیا تو اس نے اللہ پاک کی کوئی قدر نہ جانی، جیسے اللہ کی قدرت عامہ کا انکار اور اس کی رحمت ومحبت اور غضب وناراضی کی نفی کرنا یا قیامت کے دن جی اٹھنے اور حشر ونشر پر یقین نہ رکھنا وغیرہ۔

عبادت و استعانت:

اللہ کی عبادت اور اس سے استعانت کے متعلق لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

1. جن میں افضل اور اعلاقسم کے وہ لوگ ہیں جو صرف اللہ کو پوجتے ہیں، اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی سے فریاد کرتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی مراد اکیلے اللہ کی عبادت کرنا اور اس کی مدد چاہنا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ تم ہر نماز کے بعد یہ دعا کیا کرو:

«اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلىٰ ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[1]

[میرے رب میری مدد فرما اپنے ذکر اور شکر پر اور اچھی طرح عبادت کرنے پر]

2. دوسری قسم وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کریں نہ اس سے مدد چاہیں۔ اگر ان میں سے کوئی اتفاقاً اللہ سے کچھ سوال کرتا ہے تو اپنا ہی مطلب اور اپنی ہی خواہش کی چیز مانگتا ہے، حالانکہ سارے زمین و آسمان والے اور اللہ کے سارے دوست و دشمن اسی کے در کے بھکاری ہیں، وہی سب کی مدد کرتا ہے۔ اللہ کا سب سے بڑا دشمن ابلیس ہے، مگر اللہ نے اس کی دعا بھی قبول کی اور اسے مہلت دی، لیکن وہ دعا رضائے الٰہی کے خلاف تھی، اس لیے اس کے قبول سے ابلیس کی شقاوت اور دھتکار کو اور زیادہ ترقی ہوئی۔ اسی طرح جو کوئی اللہ سے ایسی چیز پر مدد طلب کرے جو اس کی مرضی و طاعت کے خلاف ہو تو وہ سوال اس کے لیے وبال ہو جاتا ہے۔ کوئی آدمی قبولِ دعا پر یہ گھمنڈ نہ کرے کہ اس کی بزرگی کی وجہ سے وہ سوال قبول ہوا ہے، بلکہ بعض سوال قبول ہونے میں بندے کی ہلاکت ہوتی ہے۔

3. تیسری قسم عبادت بلا استعانت ہے۔ اس قسم کی عبادت والے دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک اہلِ قدر (فرقہ قدریہ) ہیں، جو کہتے ہیں کہ اللہ کو جو کچھ بندے کے ساتھ کرنا تھا، وہ کر چکا، اب اس کو بندے کے لیے کسی طرح کی اعانت کرنا باقی نہیں رہ گیا ہے۔ یہ لوگ اللہ سے استعانت چھوڑ کر اپنے نفس پر اعتماد کر بیٹھے ہیں، ان پر استعانت و توحید کا دروازہ بالکل بند ہو گیا ہے۔ سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا فرمان ہے کہ تقدیر پر ایمان لانا توحید کا نظام ہے، جو اللہ پر

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٠٧) سنن النسائي (١٣٠٣) مسند أحمد (٥/٢٤٤، ٢٤٥)

ایمان لایا اور تقدیر پر ایمان نہ لایا تو وہ مکذب توحید ہے۔[1]

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جو بڑے عبادت گزار اور اوراد و وظائف والے ہیں، لیکن توکل واستعانت میں ناقص ہیں۔ ان کی نظر اسباب سے مسبب کی طرف نہیں جاتی اور وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اسباب تقدیر سے مرتبط ہوتے ہیں۔ اگر وہ اللہ پر پورا بھروسا کرتے تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے سرک جاتا۔ اگر کوئی سوال کرے کہ استعانت کی حقیقت عملی طور پر کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ حقیقت یہی ہے جسے توکل کہتے ہیں۔ یہ دل کی ایک حالت ہے جو اللہ کی معرفت، خلق، امر، تدبیرِ نفع اور ضرر میں اس کی یکتائی کے تصور سے پیدا ہوتی اور یہ یقین حاصل ہوتا ہے کہ اللہ نے جو چاہا ہوا اور جو نہ چاہا نہیں ہوا۔ یہ حالت اللہ پر یقینی اعتماد پیدا کر کے ہر کام اس کے حوالے کرا دیتی ہے۔

کارساز ما بفکر کار ما
فکر ما در کار ما آزار ما

[ہمارا کارساز (اللہ) ہمارے کام کی تدبیر میں لگا ہوا ہے، ہمیں اپنے کام کی فکر کرنا اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا ہے]

توکل کی حالت میں بندہ اپنے معبود برحق کے سامنے ایک بچے کی مثل ہے، جو رغبت وخوف کے وقت ماں باپ کے سامنے ہوتا ہے۔ کوئی بھی آفت آئے، بچہ ماں باپ کی طرف جھکتا ہے، ان کو چھوڑ کر کسی اور کے سامنے التجا نہیں کرتا، پھر اگر بندے کو اس اعتماد کے ہمراہ تقویٰ بھی نصیب ہو گیا تو پھر عاقبت محمودہ کا کیا پوچھنا! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا ۝ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَهُوَ حَسْبُهُ﴾ [الطلاق: ۲، ۳]

[اور جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے راستہ نکال دیتا ہے، اور اس کو رزق وہاں سے دیتا ہے جہاں اسے گمان نہیں ہوتا، اور جو شخص اللہ پر بھروسا کرے تو وہ اسے کافی ہے]

نیز فرمایا:

---

[1] السنة لعبد الله بن أحمد (۲/۴۲۲) اعتقاد أهل السنة للالكائي (۴/۶۷۰) اس کی سند میں ایک راوی مجہول ہے۔ یہ روایت مرفوعاً بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔ دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (۲۲۴۴، ۴۰۷۲)

﴿وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ﴾ [آل عمران: ۱۲۲]

[اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسا کرنا چاہیے]

۴ چوتھی قسم استعانت بلا عبادت ہے۔ یہ حالت اس شخص کی ہوتی ہے جو یہ جانتا ہے کہ نفع وضرر کا مالک صرف اللہ اکیلا ہے، لیکن یہ نہیں جانتا کہ اللہ کی مرضی ونا مرضی اور محبوب ومکروہ کیا ہے؟ لیکن اپنی خواہشوں اور چاہتوں کے بارے میں اللہ پر توکل کرتا ہے اور اس توکل سے اس کا کام چل جاتا ہے، مگر وہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ چاہے اسے مال و دولت حاصل ہو یا ریاست وحکومت ملے یا لوگوں کے نزدیک جاہ ومنزلت والا ہو، دنیا وآخرت میں اس کا حصہ اتنا ہی ہے۔

قبولیتِ عبادت کے دو اصول:

بندے کی بندگی اور عبادتِ الٰہی کا تحقق وثبوت دو مضبوط اصول کے بغیر نہیں ہوسکتا ہے:

① ایک اخلاصِ عبادت ② دوسرے متابعتِ رسول۔

ان دونوں اصلوں کے اعتبار سے لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

۱ ایک اہلِ اخلاص ومتابعت ہیں، جو ایک اللہ کے لیے خالص عبادت کرتے ہیں اور رسول ﷺ کی سنت وطریقے کے بالکل موافق کرتے ہیں۔ ان کے سارے اعمال واقوال اللہ ہی کے لیے ہوتے ہیں، لینا دینا ہو یا دوستی ودشمنی کا معاملہ ہو، وہ کسی بشر سے شکر وجزا کے طالب نہیں رہتے۔ وہ سب لوگوں کو قبروں میں مدفون مُردوں کی طرح جانتے ہیں اور اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کو کسی کے نفع وضرر، موت وحیات ونشور اور امور واشیا پر کوئی قدرت نہیں ہے۔

اخلاص وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی عامل کا اچھا عمل جو اخلاص سے خالی ہو، قبول نہیں کرتا ہے۔ احسن اور بہترین عمل وہی ہے جو زیادہ سے زیادہ خالص اور صحیح تر ہو۔ خالص وہ کام ہوتا ہے جو صرف ایک اللہ کے لیے ہو اور صواب وہ کام ہے جو سنتِ نبویہ کے موافق ہو۔ فرمایا:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا﴾ [الكهف: ۱۱۰]

[جو اپنے رب سے ملاقات کی امید رکھتا ہو، اسے نیک عمل کرنا چاہیے]

اس آیت میں عمل صالح سے مراد یہی خالص وصواب عمل ہے۔ مزید فرمایا:

﴿وَ مَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَ هُوَ مُحْسِنٌ﴾ [النساء: ۱۲۵]

[اور کس کا دین اس شخص سے اچھا ہو سکتا ہے جس نے اپنا منہ اللہ کے سامنے جھکا دیا اور وہ نیکی میں لگا ہوا ہے]

مذکورہ آیت کریمہ میں عمل حسن سے مراد بھی عمل مذکور ہے۔ حدیث: «كُلُّ عَمَلٍ لَيْسَ عَلَيْهِ أَمْرُنَا فَهُوَ رَدٌّ»[1] [ہر وہ عمل جس کا ثبوت ہمارے دین وشریعت میں نہ ہو، مردود ہے] میں اسی عمل کا ذکر ہے، کیونکہ ہر عمل رسول کی متابعت کے بغیر اللہ سے دوری زیادہ کر دیتا ہے۔ اللہ کی عبادت اس کے حکم کے مطابق کی جاتی ہے، کسی اور کی خواہش اور رائے سے نہیں۔

② دوسری قسم یہ ہے کہ عبادت میں اخلاص ہو نہ متابعتِ رسول۔ اس قسم کے لوگ بدترین مخلوق ہیں۔ ان کے اعمالِ خیر دکھانے، سنانے اور جتانے کے لیے ہوتے ہیں اور وہ صراطِ مستقیم سے منحرف ہوتے ہیں۔ یہ ریا کاری اہلِ فقہ وعلم اور اصحابِ فقر وعبادت میں سب سے زیادہ ہوتی ہے، الا ما شاء اللہ۔ یہی لوگ بدعت و ضلالت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی کام کیے بغیر ہی ان کی تعریف کی جائے۔

③ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جو اعمال میں مخلص ہیں، مگر متابعتِ رسول کے بغیر عمل کرتے ہیں، جیسے جاہل عابد زاہد فقیر اور پیر بن جاتے ہیں۔ اسی طرح ہر وہ عابد ہے جو اللہ کی منشا و مراد کے خلاف عبادت کرے، حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس کی مراد کے مطابق کرنی چاہیے۔ اس طبقے میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو خلوت میں بیٹھ جاتے ہیں۔ جمعہ، جماعت اور عید وحج سے کوئی مطلب نہیں رکھتے، اپنی خلوت نشینی کو قربت وعبادت سمجھتے ہیں، یہ لوگ صومِ وصال بھی رکھتے ہیں اور اس روزے کو اللہ کے ہاں تقرب کا ایک بڑا وسیلہ کہتے ہیں۔

④ چوتھی قسم یہ ہے کہ اعمال اللہ ورسول کے حکم کے موافق ہیں، لیکن غیر اللہ کے لیے کیے گئے ہیں، جیسے اہلِ ریا وشہرت کی طاعات وخیرات کہ ہر چند بہ ظاہر جہاد وحج اور علم وتالیف میں مشغول رہتے ہیں، لیکن مقصد یہ ہوتا ہے کہ بہادر، حاجی، مولانا اور مصنف کہلائیں۔ ان کے یہ اعمال اگرچہ صالحہ ہیں، لیکن مقبول نہیں، بلکہ مردود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ﴾ [البينة: ۵]

[لوگوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں، یکسو ہو کر خالص اسی کی بندگی کریں]

معلوم ہوا کہ لوگ عبادت کے مامور ہیں، لیکن اس پابندی کے ساتھ کہ عبادت اخلاص، توحید اور متابعت کے طریقے پر ہو۔ جو کوئی ان دو اصلوں اخلاص و متابعت پر قائم دائم ہے، وہی ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کا اہل ہے۔

اہلِ عبادت کی اقسام:

اہلِ عبادت چار طرح کے لوگ ہیں:

① ایک وہ ہیں جن کے نزدیک عبادات میں افضل اور سب سے زیادہ نفع والی عبادت وہ ہے جو نفس پر زیادہ مشقت والی اور سخت دشوار ہو، کیوں کہ یہ خواہشاتِ نفس سے متعلق اشیا سے بعید تر ہوتی ہے اور یہی عبادت کی حقیقت ہے، کیونکہ عبادت کا اجر مشقت کے مطابق ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے: «أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ أَحْمَزُهَا»[1] [افضل عمل وہ ہے جو سخت اور مشقت ہو) لیکن یہ حدیث بے اصل ہے۔ اس قسم کے لوگ سخت مجاہدے اور ریاضتیں کرتے اور اپنی جانوں پر ظلم و جبر سے کام لیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مشقتیں برداشت کیے بغیر طبیعت کی کاہلی اور نفس کی آرام طلبی دور نہیں ہوتی ہے۔

② دوسرے وہ لوگ ہیں جو تجرد، پرہیز گاری اور ترکِ دنیا کو افضل و انفع عبادات کہتے ہیں اور انھیں کسی چیز کی پروا نہیں ہوتی۔ یہ لوگ دو طرح کے ہیں:

[1] ایک وہ عوام ہیں جن کا یہ گمان ہے کہ تجرد اور دنیا سے بے زاری ہی کمال کی انتہا ہے، اسی لیے وہ اس کے لیے مستعد ہو گئے ہیں۔ وہ اس کام کو علم و عبادت سے افضل جانتے ہیں اور دنیا بے زاری کو ہر عبادت کی غایت اور طاعت کی اساس سمجھتے ہیں۔

[2] دوسرے وہ خواص ہیں جنھوں نے اس زہد و تجرد کو مقصود لغیرہ قرار دیا ہے۔ اس زہد سے ان کا مقصود قلب کا اللہ تعالیٰ کی طرف مرکوز اور اس کی محبت میں مستغرق ہونا، اس کی طرف رجوع اور اس پر توکل کر کے مرضیاتِ الٰہی میں برابر مشغول رہنا ہے۔ ان کے نزدیک افضل عبادات یہی

---

① المقاصد الحسنة للسخاوي (١٣٥) المصنوع في معرفة الحديث الموضوع للملا علي القاري (٣٣) كشف الخفا للعجلوني (٤٥٩)

ہے کہ زبان و دل سے ہمیشہ ذکرِ الٰہی میں لگے رہیں۔ پھر یہ خواص بھی دو طرح کے ہیں:

① ایک وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کو بجا لانے میں جلدی کرتے ہیں، چاہے دل جمعی میں فرق وخلل پڑ جائے۔

② دوسرے وہ لوگ ہیں جو ان سے منحرف ہیں اور کہتے ہیں کہ اصل مقصود دل کی یک سوئی ہے۔ ان کے پاس جب اللہ کی طرف سے کوئی امر آتا ہے اور وہ اس کو پہچانتے بھی ہیں، تب بھی اس کی طرف التفات نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں:

يطالب بالأوراد من كان غافلا
فكيف بقلب كل أوقاته ورد

[اوراد و وظائف کا مطالبہ غافلوں سے کیا جاتا ہے، جس شخص کا دل ہمہ وقت ورد میں مشغول رہتا ہے اس کو کیا کہنا؟]

پھر ان میں بھی دو طرح کے لوگ ہیں:

◆ ایک وہ ہیں جو دل جمعی کے لیے واجبات و فرائض کے تارک ہیں۔

◆ دوسرے وہ ہیں جو فرائض و واجبات ادا کرتے ہیں، مگر سنن و نوافل کے تارک اور قلبی یکسوئی کے لیے علم نافع کی تعلیم دیتے ہیں۔

حق بات یہ ہے کہ دل جمعی دل کا حق ہے اور داعی الی اللہ کی بات قبول کرنا رب کا حق ہے، جس نے اپنے نفس کے حق کو رب کے حق پر مقدم رکھا، وہ کچھ بھی نہیں ہے۔

③ تیسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کے نزدیک افضل عبادات وہ ہے جس میں نفع متعدی ہو اور دوسرے لوگ بھی مستفید ہوں۔ یہ لوگ اس کو نفع قاصر اور محدود افادے سے افضل بتاتے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق اپنے مال وجاہ سے فقرا کی خدمت کرنا، لوگوں کے مصالح وضروریات میں مشغول رہنا اور دامے درمے قدمے قلمے ان کی مدد کرنا افضل عبادت ہے۔

اس کی دلیل میں وہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

«اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ، وَأَحَبُّهُمْ إِلَى اللّٰهِ أَنْفَعُهُمْ لِعَيَالِهِ»[1]

---

[1] مسند أبي يعلى (١٠٦/٦) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رواه أبو يعلى و البزار، وفيه يوسف بن عطية الصفار، وهو متروك" (مجمع الزوائد: ٣٥٦/٨) یہ حدیث ایک اور سند سے المعجم الأوسط (٣٥٦/٥) ←

[مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ کے نزدیک ان میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو اس کی عیال کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچائے]

ان کا کہنا ہے کہ عابد کا عمل اسی کی ذات پر قاصر ومحدود ہوتا ہے اور لوگوں کی خدمت واعانت کرنے والے کا عمل متعدی الی الغیر ہوتا ہے، پس لازم کب متعدی کے برابر ہو سکتا ہے؟ اسی لیے عالم کو عابد پر فضیلت کی مثال ایسی ہے جیسی چودھویں کے چاند کی فضیلت سارے کواکب پر ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

«لَأَنْ يَّهْدِيَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلاً وَّاحِدًا خَيْرٌ لَّكَ مِنْ حُمُرِ النَّعَمِ»[1]

[اللہ تعالیٰ تمھارے ذریعے ایک آدمی کو بھی ہدایت نصیب فرما دے تو یہ تمھارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے]

دوسری حدیث میں فرمایا:

''جو شخص کسی کو ہدایت کی طرف بلاتا ہے تو اس کو اس کی پیروی کرنے والوں کے برابر اجر ملتا ہے اور ان کے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں کی جاتی۔''[2]

نیز آپ ﷺ نے فرمایا ہے:

''اللہ اور ملائکہ معلمینِ خیر پر درود بھیجتے ہیں اور سارے زمین وآسمان والے یہاں تک کہ دریا میں مچھلیاں اور اپنے سوراخ میں چیونٹیاں عالم کے لیے دعاے استغفار کرتی ہیں۔''[3]

اس مسلک کے لوگ کہتے ہیں کہ عابد کے مر جانے سے اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے اور صاحبِ نفع کا عمل منقطع نہیں ہوتا، جب تک کہ وہ نفع جاری اور باقی رہتا ہے۔ ان کا قول یہ بھی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اسی لیے بھیجے گئے ہیں کہ مخلوق کے ساتھ احسان کریں، معاش ومعاد کے امور میں لوگوں کو نفع پہنچائیں، انھیں راہِ ہدایت پر لائیں اور ان کی تعلیم وتربیت کریں۔ انبیا علیہم السلام اس لیے نہیں بھیجے گئے تھے کہ لوگوں کو خلوت نشینی اور مخلوق سے علاحدگی کی تعلیم دیں۔ اسی لیے نبی مکرم ﷺ نے ان لوگوں پر

← میں بھی مروی ہے، لیکن اس کی سند بھی ضعیف ہے۔

[1] صحيح البخاري (٢٩٤٢، ٣٧١٠، ٤٢١٠) صحيح مسلم (١٨٧٢/٤)

[2] صحيح مسلم (٢٠٦٠/٤)

[3] مسند أحمد (١٩٦/٥) سنن ابن ماجه (٣٧٢٤) سنن الترمذي (٢٧٢٦)

نکیر فرمائی تھی جنھوں نے علاحدگی، عبادتِ شاقہ اور مخلوق سے ترکِ تعلق کا ارادہ کیا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک نفعِ خلق کے لیے اپنے آپ کو فارغ رکھنا، اس دل جمعی اور استغراق فی اللہ سے بہتر ہے جس میں دوسروں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ امورِ نافعہ میں علم و تعلیم جیسے امورِ فاضلہ بھی شامل ہیں۔

4 چوتھی قسم کے اہلِ عبادت کہتے ہیں کہ افضل عبادت وہ ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق عمل ہو اور ہر وقت اس کام میں مشغولیت رہے جو اس وقت کا تقاضا اور وظیفہ ہے، جیسے جہاد کے وقت افضل عبادت اللہ کے راستے میں جنگ کرنا ہے، اگرچہ اس جہاد کی وجہ سے رات کے اوراد و وظائف اور دن کے روزے فوت ہو جائیں۔ اس کی مزید مثالیں حسبِ ذیل ہیں:

١ مہمان کے آنے پر اس کی مہمان نوازی اور خدمت گزاری افضل عمل ہے۔

٢ اوقاتِ سحر میں افضل عمل نماز، قرآن، ذکر اور دعا میں مشغول رہنا ہے۔

٣ اذان کے وقت افضل عمل کلماتِ اذان کا جواب دینے کے لیے اوراد و وظائف کو چھوڑ دینا ہے۔

٤ نماز پنج گانہ کے وقت اول وقت میں نماز کے لیے مسجد کو جانا اور مکمل طور پر نماز ادا کرنا افضل عمل ہے۔

٥ محتاج کی ضرورت کے وقت اپنے جاہ و مال اور بدن سے اس کی کار برآری میں جلدی کرنا افضل عمل ہے۔

٦ سفر میں مساکین کی مساعدت اور رفقا کی اعانت کو اوراد و خلوت پر ترجیح دینا افضل ہے۔

٧ قرآن پڑھنے کے وقت قلبی جمعیت اور تدبرِ قرآن پر پوری طرح مستعد ہونا افضل عمل ہے، لیکن اوامر و نواہی کی پابندی کا عزم اور پختہ ارادہ قلبی جمعیت سے بھی بڑھ کر ہے۔

٨ وقوفِ عرفہ کے وقت تضرع، دعا اور ذکر میں کوشش کرنا افضل ہے۔

٩ عشرہ ذی الحجہ میں کثرت سے عبادت کرنا خاص کر تکبیر، تہلیل اور تحمید میں مشغول رہنا غیر معین جہاد سے بھی افضل ہے۔

١٠ رمضان کے آخری عشرے میں مسجد میں ٹھہر کر خلوت و اعتکاف اور لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے سے پرہیز کرنا افضل عمل ہے، یہاں تک کہ اکثر علما کے نزدیک تعلیم و تعلم اور قرآن پڑھانے سے بھی افضل ہے۔

⑪ کسی مسلمان بھائی کے بیمار ہونے پر اس کی عیادت کرنا اور اس کے مرنے پر جنازے کے ساتھ جانا افضل اور خلوت و جمعیت پر مقدم ہے۔

⑫ بلاؤں اور آفتوں کے نزول اور لوگوں کے ہاتھوں سے تکلیف پانے کے وقت افضل یہ ہے کہ صبر و تحمل سے کام لے اور لوگوں میں ملا جلا رہے جو مومن لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہتا ہے اور ان کی ایذا پر صبر کرتا ہے، وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی ایذا پر صبر نہیں کرتا۔

الغرض خیر و بھلائی میں لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا علاحدہ رہنے سے افضل ہے اور شر میں لوگوں سے الگ رہنا ان کے ساتھ مل جل کر رہنے سے بہتر ہے۔ جب یہ بات معلوم ہو کہ لوگوں سے مخالطت کی صورت میں لوگ اس کو ذلیل وحقیر کریں گے تو ان سے ملنا جلنا علاحدہ رہنے سے بہتر ہے۔ اس قسم کے لوگ اہلِ تعبد مطلق ہوتے ہیں اور پہلی قسموں کے لوگ اہلِ تعبد مقید کہلاتے ہیں۔ ان میں سے جب کوئی اپنے طریقۂ عمل اور نوعِ عبادت کو چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنی عبادت میں ناقص و نازل ہو گیا ہے۔ ایسا شخص ایک خاص طریقے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر وہ اس طرز پر عبادت نہیں کر سکا تو دوسری عبادت اور عملِ خیر میں حصہ نہیں لیتا، اس کے خلاف صاحبِ عبادت مطلق کو کسی معین عبادت سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ ضرور دوسری عبادت کے مقابلے میں اسی کو اختیار کرے، بلکہ اس کی غرض مرضیاتِ الٰہی کی جستجو اور ان پر عمل کرنے سے ہوتی ہے، چنانچہ جب تم علما کو دیکھو گے تو وہ بھی ان کے ساتھ ہی ہوگا، جب کہیں ذکر کرنے والوں اور صدقہ وخیرات کرنے والوں کو دیکھو گے تو ان میں اس کو بھی پاؤ گے، اسی طرح جب ان لوگوں کو دیکھو گے جو اپنے دل کو اللہ کی یاد میں مستغرق رکھتے ہیں تو یہ شخص بھی ان میں موجود رہے گا، غرض کہ ایسا جامع شخص جو اللہ کی جانب رخ کر کے چلتا ہے، ہر راستے میں اس کی غذا یہی ہوتی ہے۔

مثالی راہ:

اس جگہ حدیثِ ابو بکر رضی اللہ عنہ کو سامنے رکھنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سامنے یہ فرمایا: آج کے دن تم میں سے کس نے روزہ رکھا ہے؟ سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم میں سے کس نے مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: آج کس نے بیمار کی عیادت کی ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: آج کون جنازے کے ساتھ گیا ہے؟ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: میں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: تمھارے لیے جنت واجب ہوگئی۔ یہ کلمہ دو بار فرمایا۔"[1]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس نے راہِ خدا میں کسی چیز کا جوڑا خرچ کیا تو اسے جنت میں پکارا جائے گا: اے اللہ کے بندے! یہ تیرے لیے خیر ہے۔ جنت میں کئی دروازے ہیں۔ جو کوئی اہلِ نماز سے ہوگا وہ بابِ صلات (نماز کے دروازے) سے، جو اہلِ جہاد سے ہوگا، وہ بابِ جہاد سے، جو اہلِ صدقہ سے ہوگا وہ بابِ صدقہ سے اور جو روزے والوں میں سے ہوگا، وہ بابِ ریان سے بلایا جائے گا۔"

سیدنا ابو بکر رضی اللہ عنہ نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کوئی ایسا بھی ہوگا جسے سب دروازوں سے بلایا جائے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: "ہاں! مجھے امید ہے کہ تم انھیں میں سے ہوگے۔"[2]

اس حدیث کو امام مالک نے موصولاً ومسنداً اور دوسرے ائمہ حدیث نے مرسلاً روایت کیا ہے۔

حدیث مذکور میں جوڑا خرچ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک نوع کی دو چیزیں دی جائیں، جیسے دو درہم، دو روپیا، دو گھوڑے، دو کپڑے دینا یا دو قدم راہِ خدا میں چلنا یا دو روزے رکھنا وغیرہ، شاید رسول اللہ ﷺ کی مراد۔ واللہ اعلم۔ یہ ہے کہ کسی عملِ خیر پر مداومت کی اقل صورت یہ ہے کہ کوئی چیز جوڑا دی جائے، کیونکہ دو (۲) اقل جمع ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے بارش جہاں کہیں برسے گی، نفع دے گی۔ صاحبِ عبادت مطلق کا معاملہ بھی یہ ہے کہ وہ اللہ کا مصاحب بلا مخلوق کے ہے اور مخلوق کا مصاحب بلا نفس کے ہے، یعنی جب اللہ کے ساتھ ہوگا تو سب مخلوق یہاں تک کہ آل واولاد سے بھی عزلت گزیں اور خلوت نشین ہوگا اور جب مخلوق کے ساتھ ہوگا تو نفس کو درمیان سے الگ کرکے سارا دھیان اللہ کی طرف کرلے گا۔ ایسا شخص لوگوں کے درمیان سخت وحشت زدہ رہے گا اور اللہ کے ساتھ اس کو انس وسکون اور فرحت وطمانینت رہے گی۔ غرض کہ یہ طریقہ سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ہے،

[1] صحيح مسلم (٧١٣/٣، ١٨٥٧/٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٨٩٧، ٣٦٦٦) صحيح مسلم (٧١٢/٢)

اس طریقے والے صدیقین میں شمار ہوتے ہیں۔

عبادت کی حکمت ومنفعت کے لحاظ سے لوگوں کی اقسام:

عبادت کی حکمت ومنفعت اور مقصد کو سمجھنے کے لحاظ سے لوگوں کی چار قسمیں ہیں:

قسم اوّل:

ایک وہ لوگ ہیں جو حکمتوں اور علتوں کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت کا حکم صرف اللہ کی مشیت اور محض اس کا ارادہ ہے، اس میں کوئی غرض وغایت پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ لوگ عبادت کو محض حکم کی بجا آوری کے لیے ادا کرتے ہیں، اس کو معاش ومعاد کی سعادت یا نجات کا سبب نہیں جانتے اور کہتے ہیں کہ عبادت کرنا محض اللہ کے حکم اور اس کی مشیت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ مخلوق کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کی آفرینش کسی غرض وغایت اور علت کے لیے ہے نہ اس میں کوئی حکمت ہے جس کے لیے یہ کام کیا گیا ہے اور مخلوقات میں ایسے اسباب بھی نہیں ہیں جو مسببات کے مقتضی ہوں۔ ان کے نزدیک آگ میں احراق کی سببیت اور پانی میں اغراق وتبرید کی قوت نہیں ہے، یہاں تک کہ خلق وامر کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے اور نہ حقیقت میں مامور وممنوع کے درمیان کوئی تفاوت ہے، لیکن مشیتِ الٰہی کا مقتضا اسی طرح پر ہے کہ کسی بات کا حکم کیا جائے اور کسی بات سے منع کیا جائے۔ مامور میں کوئی صفت ہے جو اس کے حسن کی مقتضی ہے اور نہ منع کیے گئے کام میں کوئی صفت ہے جو اس کی خرابی کا سبب ہے۔ اس اصل کی بہت سی فروع ولوازم ہیں۔ اس قسم کے اکثر لوگوں کو عبادت کی حلاوت ولذت ملتی ہے نہ وہ اس سے کچھ آرام وسکون حاصل کر پاتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے نماز، روزے، زکات، حج اور توحید واخلاص وغیرہ کا نام تکلیف (بوجھ ڈالنا) رکھا ہے، حالانکہ اگر کوئی شخص کسی بادشاہ کی محبت کا دعوی کرے اور جو حکم وہ بادشاہ اس کو دے تو اس حکم کا نام وہ تکلیف رکھے تو ہرگز وہ اس بادشاہ کا محب نہیں سمجھا جائے گا۔ یہ نظریہ سب سے پہلے جعد بن درہم نے پیش کیا تھا۔

قسم دوم:

یہ وہ لوگ ہیں جو ''قدریہ'' کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ لوگ عبادت کی حکمت وعلت ثابت کرتے ہیں، لیکن رب العالمین سے اس کا کوئی تعلق نہیں بتاتے، بلکہ اس کا اصل مرجع مخلوق کی مصلحت ومنفعت کو ٹھہراتے ہیں۔ ان کے نزدیک عبادات کی مشروعیت حصولِ قیمت کے طور پر ہے جو بندوں کو اجر ونعمت

کی شکل میں حاصل ہوگی، جس طرح کسی مزدور کو اس کے کام کی اجرت ملا کرتی ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت کو جنت کا عوض قرار دیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ نُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ [الأعراف: ٤٣]

[اور انھیں پکارا جائے گا کہ یہ جنت ہے، تم اپنے عمل کے بدلے اس کے وارث ہوئے ہو]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: ١٠]

[صبر کرنے والوں کو ان کا پورا ثواب بے حساب دیا جائے گا]

حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

«إِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ إِيَّاهَا»[1]

[یہ تمھارے اعمال ہیں جن کو میں تمھارے لیے محفوظ رکھتا ہوں، پھر تم کو ان اعمال کا پورا بدلہ دوں گا]

ان آیات اور حدیث میں عبادت کے عوض کا نام اللہ تعالیٰ نے جزا اور اجر وثواب رکھا ہے، اس لیے کہ یہ ایک ایسی شے ہے جو عامل کو اس کے عمل کے سبب سے ملتی ہے اور اسی کے پاس لوٹ کر آتی ہے۔ قیامت کے روز اعمال کا وزن کیا جانا بھی اس کی دلیل ہے۔ اگر اعمال سے ثواب کا تعلق بہ طور عوض نہ ہوتا تو اعمال کے وزن کیے جانے کا کوئی معنی نہ ہوتا۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے متقابل اور متضاد ہیں۔

فرقہ جبریہ کے نزدیک جزا وسزا کا تعلق اعمال سے نہیں ہے، اس لیے اس فرقے نے اس بات کو جائز قرار دیا ہے کہ جس شخص کی ساری عمر طاعت میں فنا ہوگئی ہے، اس کو اللہ تعالیٰ عذاب کر سکتا ہے اور جس کی تمام عمر مخالفت میں گزری ہے، اس کو راحت دے سکتا ہے۔ یہ دونوں باتیں اللہ پاک کی بہ نسبت برابر ہیں اور ان سب کا مرجع محض مشیتِ الٰہی ہے۔ قدریہ نے اللہ پر مصالح ومفادات کی رعایت کو واجب قرار دیا ہے اور ان تمام کو محض اعمال کا نتیجہ بتایا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ بندے کو عمل کے بغیر ثواب ملنے میں ایک طرح کا نقصان ہے کہ صدقے کا احسان لے لیا اور قیمت نہیں دی۔ گویا

[1] صحیح مسلم (٤/ ١٩٩٥)

بندے پر اللہ کا فضل واحسان ایسا ہے جیسے کوئی بندہ کسی بندے پر صدقہ کرتا ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ بندے کو اس عمل کی جو اجرت دیتا ہے، وہ بندے کے لیے اس فضل واحسان سے بہتر ہے جو بلا عمل کے عطا کرتا ہے۔ پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جزا میں اعمال کی کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔

بہر حال یہ دونوں گروہ (جبریہ وقدریہ) صراطِ مستقیم سے منحرف ہیں، کیونکہ اعمال حصولِ ثواب کے اسباب ہیں۔ اعمالِ صالحہ کا ہونا محض اللہ کی توفیق وفضل سے ہوتا ہے، یہ اسباب جزا وثواب کا پیمانہ نہیں ہیں، بلکہ جب یہ اعمال کامل طور پر انجام پاتے ہیں تو اللہ کی ایک ادنا نعمت کا شکر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اگر سارے اہلِ آسمان وزمین کو عذاب کرے، تب بھی وہ ظالم نہیں ہوگا اور اگر ان سب پر رحم کرے تو اس کی رحمت ان کے عمل سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔ فرمایا:

﴿اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَ اِنْ تَغْفِرْلَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴾ [المائدة: ١١٨]

[اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کو بخش دے تو بیشک تو ہی غالب حکمت والا ہے]

ایک اعتراض کا جواب:

پہلی آیت شریفہ میں بتایا ہے کہ جنت کی وراثت عمل کے سبب ہے، جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کے سبب جنت میں نہیں جائے گا۔[1]

گذشتہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ جنت عمل سے نہیں ملتی اور حدیث اس کی نفی کرتی ہے۔ لیکن اس آیت اور حدیث میں کوئی تعارض نہیں ہے، اس لیے کہ اثبات اور نفی کا محل ایک نہیں ہے۔ یعنی اثبات اس امر کا ہے کہ جنت کا استحقاق اعمال سے ہے اور نفی اس بات کی ہے کہ جنت اور اجر وثواب اعمال کی قیمت ہیں۔ اس میں قدریہ مجوسیہ کا رد ہے، جن کو یہ زعم ہے کہ اعمال کے لیے کوئی تاثیر نہیں ہوتی۔ بائے موحدہ مثبتہ جو قرآن میں آئی ہے، وہ بائے سببیہ ہے۔ اس میں قدریہ جبریہ کا بھی رد ہے، جن کا قول یہ ہے کہ اعمال اور جزا کے درمیان کوئی ربط ہے نہ یہ اعمال جزا وثواب کے اسباب ہیں۔ غایت درجہ یہ ہے کہ اعمال ایک علامت ونشان ہیں۔ سنتِ نبویہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٦٧٣، ٦٤٦٤) صحيح مسلم (٢١٦٩/٤، ٢١٧٠، ٢١٧١)

کی مشیت وقدرت کا عموم اسباب کا ربط مسببات اور مسببات کا ربط اسباب سے ہونے کے منافی نہیں ہے۔ غرض کہ اہلِ باطل کے ہر گروہ نے ربطِ حق کی ایک نوع کو ترک کر دیا ہے، اسی ترک کی وجہ سے وہ باطل کی ایک نوع بلکہ کئی انواع کے مرتکب ہو گئے ہیں۔ ان فرقوں کے مابین مختلف فیہ حق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ سنت کو راہِ ہدایت دکھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت دیتا ہے۔

قسم سوم:

عبادت کی حکمت ومنفعت کے تعلق سے کچھ لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ عبادت کا فائدہ نفوس کی ریاضت وتربیت کر کے ان کو علوم و معارف کے لائق بنانا ہے۔ اس عبادت کی وجہ سے قوائے نفس بہیمیت سے نکل جاتے ہیں۔ اگر عبادت معطل کر دی جائے تو نفوس بشریہ درندوں اور چوپایوں کے نفوس سے مل جائیں گے۔ عبادت سے یہی فائدہ ہے کہ وہ انسانی نفوس کو اس درندگی سے نکال کر عقل وفہم کی طرف لے جاتی ہے اور اس وقت یہ نفوس اس لائق ہو جاتے ہیں کہ علوم ومعارف کی صورتیں ان میں نقش ہو سکیں۔ اس بات کے قائل دو گروہ ہیں:

1. ایک وہ فلاسفہ ہیں جو اسلام وشرائع سے قریب ہیں، لیکن عالم کے قدیم ہونے اور کسی فاعل مختار ہستی کے نہ ہونے کے قائل ہیں۔
2. دوسرے وہ صوفیۂ اسلام ہیں جو فلاسفہ سے قریب ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ یہ ساری عبادات اس لیے ہیں کہ عبادت وریاضت سے نفوس بشریہ معارف عقلیہ کے حصول اور عادات کی مخالفت کے لیے مستعد ہو جائیں۔ اس خیال کے لوگوں میں کچھ وہ ہیں جو عبادت کو اسی مطلب کے واسطے واجب قرار دیتے ہیں۔ جب یہ مطلب حاصل ہو گیا تو اب اوراد یاد کرنے اور وظائف کے شغل میں متحیر رہتے ہیں۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اوراد واذکار میں مشغول رہتے اور وظائف میں خلل واقع نہ کرنے کو واجب بتاتے ہیں۔ یہ بھی دو طرح پر ہیں:

① ایک وہ ہیں جو اس بات کو حفظِ قانون اور ضبطِ ناموس کی غرض سے واجب کہتے ہیں۔

② دوسرے وہ ہیں جو اس لیے یہ واجب بتاتے ہیں کہ ورد کرنے والا محفوظ رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ نفس آہستہ آہستہ آزاد ہو کر اور اس کیفیت سے نکل کر پہلی حالتِ بہیمیت پر آ جائے۔ اُن کے نزدیک

عبادت کی حکمت اور اس کی مشروعیت کی آخری غرض وغایت یہی ہے۔ طریقِ سلوک وتصوف سے متعلق جن لوگوں نے گفتگو کی ہے، ان کی کتابوں میں ان تین طریقوں کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

قسم چہارم:

یہ وہ لوگ ہیں جو خلق وامر اور قدر وسبب کے درمیان جمع کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک عبادت کا راز اور غایت اس بات پر مبنی ہے کہ حقیقتِ الٰہیہ کی معرفت حاصل ہو۔ اللہ کے اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عبادت موجبِ الٰہیت اور اس کا اثر وسبب ہوتی ہے اور الٰہیت سے عبادت کا تعلق اس طرح ہوتا ہے جیسے صفات سے صفات کے متعلق کا ربط ہوتا ہے اور معلوم کا ارتباط علم سے، مقدور کا قدرت سے، اصوات کا سمع سے، احسان کا رحمت سے اور عطا کا جود وسخا سے ہوتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے نزدیک جو شخص ایسی معرفت کے ساتھ قائم رہتا ہے جس کی ہم نے لغوی، شرعی اور مصدری تفاصیل بیان کی ہیں تو عبادات کی حکمت وغایت کی معرفت اس کے لیے صحیح اور مستقیم ہو جاتی ہے اور وہ یہ بات جان لیتا ہے کہ سارے بندے اسی غایت ومقصد کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، رسول اللہ ﷺ بھی اسی کام کے لیے بھیجے گئے تھے، ساری کتابیں اسی غایت کے لیے نازل ہوئی ہیں اور جنت ودوزخ اسی غرض سے بنائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیت میں اسی کی صراحت فرمائی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاريات: ٥٦]

[میں نے جن وانسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ صرف میری عبادت کریں]

غرض کہ عبادت ہی وہ چیز ہے جس کے لیے یہ ساری خلائق ایجاد کی گئی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى﴾ [القيامة: ٣٦]

[کیا انسان کو یہ گمان ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا؟]

امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ بے کار چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو نہ کوئی امر کیا جائے اور نہ کسی چیز سے منع کیا جائے۔ ایک دوسرے مفسر نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ انسان کو امر ونہی پر ثواب وعقاب نہ دیا جائے۔ معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق بے کار اور بے سبب نہیں ہے، بلکہ اس سے مطلوب ومقصود عبادت ہے اور عبادت کی حقیقت یہی فرماں برداری اور احکام کی بجا آوری ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ یَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا﴾ [آل عمران: ١٩١]

[اور آسمانوں وزمین کی پیدائش میں وہ غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں: اے ہمارے مالک تو نے یہ سب بے کار نہیں بنایا ہے]

ایک دوسرے مقام میں فرمایا ہے:

﴿مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ [الأحقاف: ٣]

[ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے، ان کو مصلحت سے اور ایک وقت مقرر تک کے لیے بنایا ہے]

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ [الجاثیة: ٢٢]

[ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے گا]

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے کہ یہ سارا کارخانہ ہم نے ایسی سچائی کے ساتھ بنایا ہے جو امر و نہی اور ثواب وعقاب پر مشتمل ہے۔ اب جب کہ آسمان و زمین اسی لیے پیدا ہوئے ہیں اور یہی ان کی تخلیق کی غایت وغرض ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس تخلیقِ عالم میں کوئی غایت مراد ہے نہ کوئی حکمتِ مقصود ہے، یا یہ کام صرف اعمال کی اجرت و قیمت دینے کے لیے ہے، تاکہ بار بار ان پر ثواب کا احسان نہ رکھا جائے، یا یہ سب صرف اس لیے ہیں کہ معارف عقلیہ کے لیے نفوس مستعد ہو جائیں۔ عقل مند آدمی جب ان اقوال اور وحیِ الٰہی کے مدلول صریح کے درمیان اس فرق میں غور کرے گا تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ مخلوق کی آفرینش اسی عبادت کے لیے ہوئی ہے، جو کامل محبت، خضوع، انقیاد اور امر کی جامع ہے۔

محبتِ الٰہی اصل عبادت ہے:

اصل عبادت اکیلے اللہ کی محبت ہے۔ اللہ ہی سے محبت رکھنا اور اللہ کے ساتھ کسی کو نہ چاہنا، بلکہ جس کسی سے محبت ہو، وہ اللہ ہی کے لیے ہو، جیسے انبیا، ملائکہ، اولیا، علما، صلحا، شہدا وغیرہم سے محبت

رکھنا من جملہ محبتِ الٰہی ہے۔ یہ ایسی محبت نہیں ہے، جو اہلِ شرک غیر اللہ سے رکھتے ہیں۔ جب یہ محبت ہی حقیقتِ عبادت اور سرِ عبدیت ٹھہری تو اس محبت کا تحقق اور وجود اسی طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ کے امر و حکم بجا لائیں اور اس کی نہی سے باز رہیں۔ پس امر و نہی کے اتباع کے وقت عبودیت اور محبت کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کے اتباع کو اس محبت کی علامت و شاہد بتایا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ٣١]

[اے پیغمبر! کہہ دو کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت رکھے گا]

یعنی اللہ نے اتباعِ رسول کو اپنے آپ سے محبت کرنے اور اللہ کے بندوں سے محبت کرنے کی شرط قرار دیا ہے اور یہ بات مسلم ہے کہ شرط کے تحقق کے بغیر مشروط کا وجود ممتنع ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب متابعتِ رسول نہ ہوگی تو اللہ کی محبت بھی معدوم ہوگی۔ یہ محبت اسی وقت کافی سمجھی جائے گی، جب اللہ و رسول اپنے ماسوا سے ہمارے نزدیک محبوب تر ہوں۔

حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ وَجَدَ بِهِنَّ حَلَاوَةَ الْإِيمَانِ: مَنْ كَانَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِمَّا سِوَاهُمَا، وَمَنْ أَحَبَّ عَبْدًا لَا يُحِبُّهُ إِلَّا لِلّٰهِ، وَمَنْ يَكْرَهُ أَنْ يَعُودَ فِي الْكُفْرِ بَعْدَ أَنْ أَنْقَذَهُ اللّٰهُ مِنْهُ كَمَا يَكْرَهُ أَنْ يُلْقَى فِي النَّارِ»[1]

[تین باتیں جس میں ہوں گی، وہ ان کی وجہ سے ایمان کی حلاوت پائے گا۔ ایک یہ کہ اس کو سب لوگوں سے زیادہ اللہ اور رسول سے محبت ہو۔ دوسرے یہ کہ کسی آدمی سے صرف اللہ کے واسطے دوستی رکھے۔ تیسرے یہ ایمان لانے کے بعد کفر سے نفرت کرے، جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی ہے، اس طرح کہ جیسے آگ میں ڈالا جانا اسے برا لگتا ہے]

اس حدیث کی شرح میں میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔[2] جب کسی کو کوئی چیز اللہ سے زیادہ محبوب ہوگی تو یہی محبت وہ شرک ہے جو بخشا نہیں جاتا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٦، ٢١) صحيح مسلم (١/ ٦٦)

[2] مولف رحمہ اللہ کے تصنیف کردہ رسالے کا نام "تقوية الإيقان بشرح حديث حلاوة الإيمان" ہے، جو انھوں نے ماہ جمادی اولیٰ ١٣٠٢ھ میں تصنیف کیا اور چھہتر (٧٦) صفحات میں مطبع مفید عام آگرہ سے طبع ہوا۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [التوبة: ٢٤]

[آپ کہہ دیں اگر تمھارے باپ دادا، بیٹے پوتے، بھائی، بیویاں، کنبے والے اور جو مال تم نے کمائے ہیں اور جس تجارت کے خراب ہو جانے سے ڈرتے ہو اور جن مکانوں کو تم پسند کرتے ہو، تم کو یہ سب اللہ و رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیجے اور اللہ گناہ گاروں کو ہدایت نہیں دیتا ہے]

اس آیت شریفہ میں جتنی چیزیں انسان کو محبوب ہوتی ہیں، ان کو ذکر فرما کر ان چیزوں کے دوست رکھنے والوں کو فاسق قرار دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی محبت کی بہ نسبت ان چیزوں سے زیادہ محبت والفت رکھنا فسق و معصیت ہے۔ ان کی محبت اس وقت مضر نہیں ہوتی جب اللہ کے لیے اور اس کی محبت کی وجہ سے ہو، لیکن جب اللہ کی محبت پر ان اشیا کی محبت و الفت غالب ہو جائے اور اللہ کے امر و نہی کے مقابلے میں ان محبوبات کو مقدم رکھا جائے تو یہ شرک ہوا۔

اسی طرح جس نے اللہ کی بات غیر کی بات پر مقدم رکھی یا اس کا حکم غیر کے حکم پر مقدم کیا یا غیر کے پاس اپنا مقدمہ لے گیا تو وہ کسی طرح اللہ کا دوست نہیں ہوگا۔ اس مسئلے میں کبھی یہ اشتباہ لاحق ہوتا ہے کہ بعض لوگ جو کسی شخص کے قول یا حکم یا طاعت کو اللہ کے قول و حکم پر اس گمان کی وجہ سے مقدم کرتے ہیں کہ اس شخص کا حکم و قول وہی ہے جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، اس لیے یہ لوگ اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس کی طرف اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں اور اس کی بات کو مانتے ہیں تو ایسے لوگ جب اس شخص سے زیادہ قدرت وصلاحیت نہ رکھتے ہوں تو ان کو کسی قدر معذور قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن جس کسی کو رسول اللہ ﷺ کی حدیثوں تک رسائی کی قدرت حاصل ہے یا وہ یہ بات جانتا پہچانتا ہے کہ جس شخص کا اتباع کر رہا ہے، دوسرا شخص اس سے زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے، چاہے بعض امور اور کسی معین مسئلے ہی میں ہو، اس کے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ یا اس افضل شخص کی طرف کوئی التفات نہیں کرتا تو اس کے لیے یہ خوفناک بات ہے۔ یہ عذر بہانہ کرنا کہ مجھے علم و فہم نہیں ہے

یا میں تفقہ فی الدین کے وسائل نہیں رکھتا یا میں اشباہ و نظائر سے استدلال کرنے کی اہلیت سے محروم ہوں، یا یہ کہے کہ میرا متبوع شخص نبی ﷺ کی مراد و منشا کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا؛ یہ سب حیلے بہانے غیر مفید ہیں، بالخصوص اس صورت میں کہ غیر معصوم شخص کی خطا کے جواز کا معترف اور اقرار کرتا ہو، پھر بھی اس قاعدے میں اختلاف کرتا ہے تو اس سے بات چیت ہی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ اللہ کی وعید کے تحت داخل ہے، کیونکہ وہ اللہ اور رسول سے زیادہ دوسرے کو محبوب رکھتا ہے۔ اگر مخالفت کے ساتھ اپنے مخالف مسلک کی آبرو ریزی اور بد دینی زبان و بیان سے کرتا ہے یا اس سے بھی تجاوز کر کے اس کی اذیت و عقوبت کے لیے کوشش کرتا ہے تو پھر وہ حد سے تجاوز کرنے والے ظالموں اور فسادی سرداروں میں شمار کیا جائے گا۔

قواعدِ عبادت:

عبادت کے چار قاعدے ہیں۔ ان قواعد کا منشا یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی پسندیدہ چیزیں متحقق اور دل و زبان اور جوارح ان کے پابند ہوں۔ عبودیت ایک ایسا لفظ ہے جو ان چاروں مراتب کا جامع ہے۔ اس بنا پر سچی عبادت والے وہی لوگ ہیں جو ان مراتب والے ہیں:

1. پہلا قاعدہ یہ ہے کہ اللہ نے یا اللہ کے رسول نے اللہ کی طرف سے جس چیز کی خبر دی ہے، اس پر دل سے اعتقاد رکھنا، جیسے اللہ کے اسما وصفات وافعال اور ملائکہ ولقائے الٰہی پر دل سے یقین رکھنا۔
2. دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ زبان سے ان باتوں کو کہے اور لوگوں کو اس کی طرف بلائے۔ جو اس کی مخالفت کرے، اس کو دفع کرے، بدعات کا بطلان واضح کرے اور اللہ کے ذکر اور اس کے امر و نہی کی تبلیغ میں لگا رہے۔
3. تیسرے مرتبے میں دل کا عمل یہ ہے کہ سچے دل سے اللہ سے محبت ہو، اللہ ہی پر توکل و اعتماد ہو، اسی کی طرف رجوع وانابت اور اسی سے خوف و امید ہو۔ صبر و اخلاص کے ساتھ اللہ کے اوامر ونواہی پر قائم رہے اور ہر حال میں اللہ سے راضی رہے، اسی کے لیے کسی سے راضی ہو اور جس سے دوستی یا دشمنی کرے، وہ اللہ ہی کے لیے کرے، اپنے یا دوسرے کے لیے نہ کرے۔ اللہ کے سامنے تواضع اور خاکساری اختیار کرے اور ایمانِ صحیح، توحیدِ خالص اور عبودیتِ حقہ پر اس کا نفس مطمئن ہو، اسی طرح دل کے دوسرے اعمال بھی ہیں، جن کی فرضیت اعضا و جوارح

کے فرض اعمال سے زیادہ موکد ہے۔

دل کے ان اعمالِ فاضلہ کے مقابل میں وہ افعالِ قلوب جن کو شرع نے کبیرہ گناہ قرار دیا ہے، بہت زیادہ ہیں۔ بعض اہلِ علم نے کبائرِ باطن کی تعداد چھیاسٹھ (٦٦) بتائی ہے۔ ان میں ایسے گناہ بھی ہیں جن سے آدمی مشرک قرار پاتا ہے، جیسے ریا کاری اور شہرت طلبی وغیرہ، باقی ایسے کبائر ہیں جن کا ارتکاب دخولِ نار کا سبب ہوتا ہے۔ میں نے ان سب کبائر قلبیہ کو ایک الگ رسالے "قوارع الإنسان من اتباع خطوات الشيطان" میں یکجا مفصل طور پر کتاب وسنت کے دلائل کے ساتھ جمع کیا ہے۔

④ چوتھا قاعدہ یا مرتبہ اعمالِ جوارح سے متعلق ہے، جیسے نماز، روزہ، حج، جہاد، جمعہ اور جماعات کے لیے چل کر جانا اور عاجز ومحتاج کی مدد کرنا وغیرہ۔

ان چاروں امور کا ثبوت اس طرح ہوتا ہے کہ بندہ جب نماز میں ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کہتا ہے تو گویا ان چاروں امور کے احکام کا التزام واقرار کرتا ہے اور جب ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کہتا ہے تو ان امور کی اعانت وتوفیق طلب کرتا ہے۔ ﴿اهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ﴾ بہ طریق تفصیل ہر دو امر کو متضمن ہے، اس کے کہنے سے اللہ کی طرف سے دل میں اس بات کا الہام ہوتا ہے کہ ان امور پر قائم رہتے ہوئے ان لوگوں کی راہ پر چلنا ہے جو اللہ کی طرف جاتے ہیں۔

اس ساری تقریر کو مقریزی نے "تجرید التوحید" میں تحریر کیا ہے، اس جگہ ٹکڑا ٹکڑا کر کے کمی وبیشی کے ساتھ اسے لکھا گیا ہے۔ وباللّٰه التوفيق.[1]

[1] تجريد التوحيد المفيد للمقريزي (ص: ٨۔٣٦) نیز دیکھیں: مدارج السالكين لابن القيم (١/٧٨۔١٠١)

پانچواں باب

شرک سے متعلق دو آیات کی تفسیر

پہلی آیت:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾ [النساء ٤٨]

[بیشک اللہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور شرک کے سوا گناہوں کو جس کے لیے چاہے بخش دے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا اس نے بڑا گناہ باندھا]

علامہ زمخشری کا قول:

علامہ زمخشری نے اس کی تفسیر یہ بیان کی ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو نہیں بخشتا ہے جس کے لیے چاہے اور شرک سے کم تر کو بخشتا ہے جس کے لیے چاہے۔ اول سے مراد وہ شخص ہے جس نے توبہ نہیں کی ہے اور دوم سے مراد وہ ہے جس نے توبہ کرلی ہے۔[1]

دوسری آیت:

دوسری آیت یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴾ [النساء:١١٦]

[بیشک اللہ نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور شرک کے ماسوا گناہوں کو جس کے لیے چاہے بخش دیتا ہے اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا تو وہ بہت دور جا بھٹکا]

[1] تفسير الكشاف للزمخشري (١/٥٥٢)

① علامہ زمخشری کی تفسیر:

علامہ زمخشری نے کہا ہے: ”آیت کا تکرار تاکید کے لیے ہے یا طعمہ کے قصے کی وجہ سے ہے جو شرک کی حالت میں وفات پا گیا تھا۔ (طعمہ بن ابیرق نامی شخص مرتد ہو کر شرک کی حالت میں مر گیا تو اس کے انجام کی بابت یہ آیت نازل ہوئی) ایک دیہاتی شخص نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں اور گناہوں میں ڈوبا ہوا ہوں، لیکن جب سے میں نے اللہ کو پہچانا اور اس پر ایمان لایا ہوں، کسی چیز کو اللہ کے ساتھ برابر نہیں ٹھہرایا ہے نہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا ولی و مالک سمجھا، نہ اللہ پر جرات کر کے اور اپنے کو بڑا سمجھ کر گناہ کیے اور نہ پلک جھپکنے کے برابر بھی کبھی یہ خیال کیا کہ میں بھاگ کر اللہ کو عاجز کر دوں گا۔ اب میں نادم اور تائب ہو کر اللہ کی مغفرت کا طالب ہوں۔ بتایئے! اللہ کے یہاں میرا کیا حال ہوگا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[1] اس حدیث سے اس شخص کے قول کی تائید ہوتی ہے جس نے ﴿من يشاء﴾ کا مصداق گناہوں سے توبہ کرنے والے کو قرار دیا ہے۔ انتہی.[2]

② امام رازی کی تفسیر:

امام رازی رحمہ اللہ نے ”مفاتیح الغیب“ میں پہلی آیت کی تفسیر میں کہا ہے:

”اللہ تعالیٰ نے جب یہود کو دھمکایا اور بتایا کہ یہ دھمکی ضرور واقع ہوگی تو یہ بھی ذکر فرمایا کہ یہ دھمکی خاص کفر سے متعلق ہے۔ کفر کے علاوہ باقی سارے گناہوں کا معاملہ کفر جیسا نہیں ہے، بلکہ کبھی اللہ تعالیٰ ان کو معاف بھی کر دیتا ہے، اسی لیے مشرک کی بخشش نہ ہونے کو نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

”اس آیت میں کئی ایک مسئلے ہیں۔ ایک مسئلہ یہ ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ یہودی کو عرفِ شرع میں مشرک کہا جا سکتا ہے، جس کی دو وجہ ہے۔ ایک یہ کہ آیتِ مذکورہ شرک کے ما سوا کے مغفور ہونے پر دلالت کر رہی ہے۔ اگر یہودیت شرک کے مغایر ہوتی تو آیتِ مذکورہ کے سبب وہ لائقِ بخشش ہوتی، حالانکہ وہ بالاجماع مغفور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیت کو اسم شرک شامل ہے۔ دوسرے یہ کہ اس آیت کا ماقبل سے

---

① حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے ”تفسیر الکشاف“ کی تخریج میں اسے ضعیف قرار دیا ہے۔

② الكشاف للزمخشري (١/٥٩٩)

یہی تعلق ہے کہ وہ آیت بھی تہدیدِ یہود کو متضمن ہے۔ اگر یہودیت اسمِ شرک کے تحت داخل نہ ہوتی تو دونوں آیتوں میں اتصال و تعلق نہ ہوتا۔

''دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ یہ آیت اصحابِ کبائر کی مغفرت پر ہمارے لیے ایک بڑی قوی دلیل ہے، جس پر کئی وجوہ سے استدلال ہوسکتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جب وحشی نے غزوہ احد کے دن سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کو قتل کیا اور قتل کرانے والوں نے وحشی سے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم تم کو آزاد کردیں گے، پھر جب انھوں نے ایفاے عہد نہ کیا، تب وحشی اور اس کے لوگ نادم ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کو اپنے گناہ کا حال لکھ بھیجا اور یہ ظاہر کیا کہ ہم کو اسلام میں داخل ہونے سے کوئی مانع نہیں ہے، مگر یہ آیت شریفہ: ﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ... الخ﴾ [الفرقان: ٦٨] [جو لوگ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود کو نہیں پکارتے ہیں] ہم نے وہ سب گناہ کیے ہیں جو اس آیت میں مذکور ہیں۔ اگر یہ آیت نہ ہوتی تو ہم آپ کی پیروی کرتے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا﴾ [مریم: ٦٠] [مگر جو لوگ توبہ کرکے ایمان لائے اور نیک عمل کیے] یہ سن کر وحشی اور اس کے اصحاب نے کہا یہ شرط نہایت سخت ہے، ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہم سے ادا نہ ہوسکے۔ تب یہ آیت اتری:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

[النساء: ٤٨، ١١٦]

[بے شک اللہ شرک کو معاف نہیں کرتا ہے، شرک کے سوا گناہوں کو جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے]

اس پر انھوں نے کہا ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہم اللہ کی مشیت کے تحت مغفرت سے محروم رہیں، اس وقت یہ آیت اتری:

﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾

[الزمر: ٥٣]

[اے نبی! کہہ دو، اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے! اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو]

اب وہ اسلام میں داخل ہوئے۔[1]

قاضی نے اس روایت پر طعن کیا ہے اور رازی نے اس کا جواب دیا ہے۔[2]

دوسری آیت کی تفسیر:

پھر آیت دوم کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ اس آیت کو مکرر ذکر کرنے میں دو فائدے ہیں:

1. ایک یہ کہ قرآن پاک میں عمومات وعد و وعید متعارض اور مختلف انداز میں مذکور ہیں اور اللہ تعالیٰ نے کسی آیت وعید کو بلفظ واحد دوبار نہیں ذکر کیا، سوائے اس آیت شرک کے جو ایک ہی الفاظ اور ایک ہی سورت میں عفو ومغفرت پر دلالت کرتی ہے۔ اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ تکرار کا فائدہ تاکید کے سوا کچھ نہیں ہے، اس بنیاد پر یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ پاک نے وعدہ ورحمت کے پہلو کو تاکید مزید کے ساتھ خاص کیا ہے جو وعید پر وعد کی ترجیح کو مقتضی ہے۔

2. دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سابقہ آیتیں زرہ چرانے والے کے حق میں نازل ہوئی ہیں اور آیت: ﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ﴾ [النساء: ١١٥] [جو رسول کی مخالفت کرے] اس چور کے مرتد ہونے کے بارے میں اتری ہے۔ اس آیت کا ماقبل سے اتصال صحیح طریقے سے اسی صورت میں ہوگا جب یہ مراد ہو کہ اگر وہ چور مرتد نہ ہو جاتا تو ہماری رحمت سے محروم نہ رہتا، لیکن جب اس نے مرتد ہو کر شرک باللہ کیا تو قطعی طور پر وہ رحمت الٰہی سے محروم ہوگیا۔ پھر اس کی تاکید یوں فرمائی کہ شرک کا معاملہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے، مشرک شخص سخت گمراہ ہو جاتا ہے، لیکن جس نے شرک نہیں کیا ہے وہ بہت بڑا گمراہ نہیں ہے۔ اب ضرور ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے محروم نہ رہے۔ یہ ساری مناسبات اور موافق حال باتیں اس بات پر قطعی دلیل ہیں کہ یہ آیت اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ شرک کے سوا جو گناہ ہوں، وہ سب قطعی طور پر لائق معافی ہیں، خواہ ان کے مرتکب نے ان سے توبہ کی ہو یا نہ کی ہو۔ انتھی.[3]

③ امام نسفی کی تفسیر:

نسفی نے "مدارک التنزیل" میں پہلی آیت ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ ... الخ﴾

---

[1] المعجم الكبير (١١/١٩٧) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني، وفيه أبين بن سفيان، وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ١٠/ ٣٦١)

[2] التفسير الكبير للرازي (١٠/٩٧)

[3] مصدر سابق (١١/ ٢١٧)

کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر کوئی شرک پر مر گیا تو اللہ اس کو نہیں بخشتا اور شرک سے کم تر گناہ کو بخش دیتا ہے، چاہے کبیرہ ہی کیوں نہ ہو اور اس سے توبہ بھی نہ کی ہو۔ حاصل یہ ہے کہ شرک توبہ سے بخش دیا جاتا ہے اور شرک کے ماسوا کی مغفرت کا وعدہ غیر تائب کے لیے ہے۔ یعنی مشرک غیر مغفور اور گناہ گار مغفور ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَلَمْ تَضُرَّهُ خَطِيئَةٌ»[1]

[جس نے اللہ سے ملاقات کی، اس حال میں کہ کسی چیز کو اس کے ساتھ شریک نہیں ٹھہرایا تو وہ جنت میں جائے گا، اس کو کوئی گناہ نقصان نہیں دے گا]

''آیت میں ﴿لمن يشاء﴾ کی قید اس کو عموم سے خارج نہیں کرتی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا قول ہے:

﴿اَللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [الشوریٰ: ١٩]

[اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے جسے چاہتا ہے روزی دیتا ہے]

''سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ قرآن میں کوئی آیت مجھے اس آیت سے زیادہ محبوب نہیں ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن غریب کہا ہے۔[2] معتزلہ کا یہ کہنا کہ آیتِ شرک میں ﴿لمن يشاء﴾ سے مراد تائب شخص ہے، باطل ہے، اس لیے کہ توبہ سے تو کفر بھی بخش دیا جاتا ہے، چنانچہ یہ آیت اس پر دلیل ہے: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ [الأنفال: ٣٨] [اے نبی! کہہ دو کافروں سے کہ اگر وہ (کفر سے) باز آجائیں تو ان کے سابقہ گناہ معاف کر دیے جائیں گے] اس سے معلوم ہوا کہ جو گناہ کفر سے کم تر ہے، وہ بدرجہ اولیٰ توبہ کرنے سے معاف ہو سکتا ہے، لیکن آیت کا سیاق ان دو صورتوں کے درمیان فرق بیان کرنے کے لیے ہے۔'' انتھی.[3]

④ امام علاء الدین خازن کی تفسیر:

تفسیر خازن میں سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے قصے کے ذکر کے بعد امام رازی رحمہ اللہ کی

① مسند أحمد (٢/ ١٧٠)

② سنن الترمذي، رقم الحديث (٥٠٢٨)

③ تفسير مدارك التنزيل للنسفي (١/ ٢٢٩، ٢٣٠)

روایت کے مطابق یہ بیان کیا گیا ہے کہ جب یہ آیت: ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ﴾ [الزمر: ٥٣] نازل ہوئی تو ایک آدمی نے کہا: اے اللہ کے رسول! شرک؟ یعنی کیا وہ بھی بخش دیا جائے گا؟ رسول اللہ ﷺ خاموش رہے، وہ پھر کھڑا ہوا اور دو تین بار یہی بات کہی، تب یہ آیت جو اس باب کے شروع میں مذکور ہے، نازل ہوئی۔ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ مشرک کو جو شرک پر مر گیا ہے، نہیں بخشتا، البتہ شرک کے سوا اور گناہ والوں میں جسے چاہتا ہے، بخشتا ہے۔ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ صاحبِ کبیرہ جب توبہ کے بغیر مر جاتا ہے تو وہ مشیتِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے۔ اگر اللہ چاہے تو اس کو معاف کر کے اپنے فضل و کرم سے بہشت میں پہنچائے یا چاہے تو عذاب دے کر پھر اپنی رحمت و احسان سے داخلِ بہشت کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان گناہوں کی مغفرت کا وعدہ کیا ہے جو شرک سے کم ہیں۔ ہاں اگر شرک پر مر جائے گا تو ہمیشہ جہنم میں رہے گا، جیسا کہ مذکورہ بالا آیت اس پر دلیل ہے۔

''شرک پر تہدید والی آیت میں فرقہ معتزلہ اور قدریہ کا رد بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ صاحبِ کبیرہ کی مغفرت حکمت کی رو سے جائز نہیں ہوتی اور اہلِ سنت یہ کہتے ہیں کہ اللہ جو چاہے سو کرے، اس پر کوئی پابندی نہیں ہے، چنانچہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ ہم عہدِ رسول ﷺ میں اس شخص کو جو گناہ کبیرہ پر مر گیا ہے، ناری کہتے تھے، یہاں تک کہ یہ آیت: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ الخ﴾ نازل ہوئی، تب ہم یہ کہنے سے رک گئے۔[1]

''ابن عباس رضی اللہ عنہما نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المومنین! ایک آدمی نے تمام اعمال صالحہ کیے اور کوئی عملِ خیر باقی نہیں چھوڑا، لیکن وہ مشرک ہے؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: وہ جہنم میں جائے گا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: ایک آدمی نے کوئی برا کام باقی نہیں چھوڑا، البتہ شرک نہیں کیا؟ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ جانے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: مجھے امید ہے کہ جس طرح شرک کے ساتھ کوئی عمل نفع نہیں دیتا، اسی طرح توحید کے ساتھ کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔

''صاحبِ گناہ کبیرہ کی عدم مغفرت سے مراد یہ ہے کہ وہ مخلد فی النار (ہمیشہ کے لیے جہنم میں

---

[1] تفسير الطبري (٨/ ٤٥٠)

رہنے والا) نہیں ہوگا، یہ مطلب نہیں کہ اس کو کسی گناہ کی سزا ہی نہ ملے گی، کیوں کہ دیگر احادیث سے ثابت ہو چکا ہے کہ گناہ گار اہلِ توحید کو جہنم کا عذاب ہوگا۔ چنانچہ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "موجبتان" کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس شخص کی موت اس حالت میں ہوئی کہ وہ شرک نہیں کرتا تھا تو وہ جنت میں جائے گا اور جو اس حالت میں مرا کہ وہ شرک کرتا تھا تو وہ آگ میں جائے گا۔"[1]

تفسیر خازن میں دوسری آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہ آیت طعمہ بن ابیرق کے بارے میں اتری جو مرتد اور مشرک ہو کر مر گیا تھا۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ذکر کیا گیا ہے کہ یہ آیت ایک بوڑھے اعرابی کے بارے میں نازل ہوئی، پھر کہا کہ یہ آیت اس بات پر نص صریح ہے کہ شرک بخشا نہیں جاتا ہے، جب اسی پر موت آجائے۔ ہاں مشرک سے توبہ مقبول ہوتی ہے اور تائب کا ایمان صحیح ہے، اس کے سارے گناہ جو اس نے حالتِ شرک میں کیے تھے، معاف کر دیے جاتے ہیں۔ اہلِ علم نے کہا کہ جب ایمان لانے اور توبہ کرنے سے شرک بخش دیا جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ جو گناہ شرک سے کمتر ہے، وہ بھی توبہ سے معاف ہو جاتا ہے۔ رہی یہ بات کہ معافی اللہ کی مشیت پر ہے تو یہ اہلِ توحید کے حق میں ہے جو توبہ کے بغیر مر جائے۔ حاصل یہ کہ صاحبِ کبیرہ یا صغیرہ جب بغیر توبہ مر جاتا ہے تو وہ مشیتِ الٰہی کے تحت خطرے میں رہتا ہے، چاہے اللہ اس کو معاف کر کے اپنے فضل وکرم سے بہشت میں داخل کرے اور چاہے تو پہلے عذاب دے اور پھر جنت میں لے جائے، لیکن جو شخص شرک پر مرا وہ سخت گمراہی میں پڑا اور ہر خیر سے محروم رہا۔

"سورۃ النساء میں اس آیت کے مکرر ذکر کا فائدہ یہی تاکید ہے، البتہ ہر آیت کا سببِ نزول علاحدہ ہے۔ پہلی آیت طعمہ بن ابیرق کی چوری کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور دوسری آیت اس کے ارتداد واشراک کے سلسلے میں وارد ہوئی کہ وہ مشرک ہو کر مر گیا۔"[2] انتھی.

5 علامہ ابو سعود عمادی کی تفسیر:

علامہ ابو السعود نے پہلی آیت: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ ... الخ﴾ [النساء: ٤٨]

[1] تفسیر الخازن (۱/ ۴۵۳) نیز دیکھیں: صحیح مسلم، رقم الحدیث (۹۳)

[2] تفسیر الخازن (۱/ ۴۹۸)

کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس جگہ شرک سے مراد مطلق کفر ہے، جس کے اول درجے میں کفرِ یہود بھی شامل ہے، اس لیے کہ شرع نے تمام اہلِ کتاب کے شرک کی صراحت کی ہے اور کفار کی تمام قسموں پر خلودِ نار کا حکم لگایا ہے۔ مقاتل کے قول کے لحاظ سے اس آیت کا نزول یہود کے بارے میں سیاقِ کلام کے زیادہ مناسب ہے، لیکن سیاقِ کلام کفرِ یہود کے خصوصی بیان کا مقتضی نہیں، بلکہ کفرِ یہود اس میں مندرج ہے۔ اس کا اقتضا یہ ہے کہ کفر سے کم تر گناہوں کی مغفرت جائز ہے اور کفر کی مغفرت اللہ تعالیٰ نہیں فرماتا ہے، پس جو شخص کفر کے ساتھ توبہ اور ایمان کے بغیر متصف رہا، اس کی بخشش نہیں ہوگی، کیونکہ حکمت شرعیہ اس بات کی مقتضی ہے کہ کفر کا دروازہ بند رہے۔ جب کفر کی مغفرت ایمان کے بغیر بھی جائز ہوگی تو یہ کفر کا دروازہ کھلنے کا ذریعہ ہوگا۔

''دوسرے یہ کہ نورِ ایمان کفر و معاصی کی ظلمتوں کو ختم کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے جو کوئی ایمان نہیں رکھتا، اس کے کفر و معاصی کی کوئی چیز بخشی نہیں جائے گی، البتہ کبائر و صغائر میں سے جو گناہ شرک سے کم قبیح ہیں، وہ اللہ کے فضل و احسان سے مغفور ہو سکتے ہیں، لیکن ہر گناہ گار کی مغفرت ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ صرف اس گناہ گار کی بخشش ہوگی جسے اللہ چاہے۔ کفر و شرک والوں کی بخشش بالکل نہ ہوگی، اس لیے کہ کفر و شرک سے متصف شخص کی مغفرت اسی طرح محال ہے جیسے حکمت تشریعیہ پر مبنی مشیتِ الٰہی کے تحت اس کا داخل ہونا محال ہے، کیونکہ توبہ کے بغیر معاصی کی مغفرت اہلِ ایمان کے لیے خاص ہے جو ایمان کی ترغیب دینے اور کفر سے زجر و توبیخ کرنے کا ایک کامل اسلوب ہے۔

جس نے مشیت ﴿لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ کو دونوں فعل ﴿لا يغفر﴾ اور ﴿يغفر﴾ کا متعلق بتایا ہے اور اول کو غیر تائب پر اور ثانی کو تائب پر حمل کیا ہے، وہ راہِ صواب سے بھٹک گیا ہے، اس لیے کہ آیتِ کریمہ کا سیاق کفر کے عظیم ترین جرم ہونے کے اظہار اور اس کو دوسرے معاصی سے ممتاز کرنے کے لیے ہے۔ یہ صریح دلیل ہے کہ کفر کی مغفرت محال اور دوسرے معاصی کی مغفرت جائز و ممکن ہے۔ اگر اس کا جواز توبہ کی شرط پر مانا جائے گا تو دونوں کے درمیان کوئی فرق ظاہر نہیں ہوگا، حالانکہ توبہ کی صورت میں دونوں کی مغفرت پر اجماع ہے۔ مزید یہ کہ کفر و طغیان پر سخت توبیخ سے جو مقصود ہے، وہ اب حاصل نہ ہوگا اور توبہ و ایمان پر حمل کرنے کا مدعا بھی ہاتھ نہیں آئے گا۔''[1]

---

[1] تفسير أبي السعود (٢/ ١٨٧)

پھر مفسر موصوف نے دوسری آیت کے تحت آیتِ اولی کا حوالہ دیتے ہوئے تکرار کا فائدہ تاکید وتشدید قرار دیکر طعمہ بن ابیرق اور بوڑھے اعرابی کے قصے کو آیت کا سببِ نزول بتایا ہے۔[1]

6 علامہ علی بن ابراہیم مہائمی کی تفسیر:

شیخ علی مہائمی اپنی تفسیر میں کہتے ہیں کہ اللہ شرک کو نہیں بخشتا جس طرح دنیا کے بادشاہ مملکت میں شراکت اور حصے داری کے قصور کو معاف نہیں کرتے۔ ہاں اللہ تعالیٰ شرک سے کم تر گناہ کو بخش دیتا ہے۔ جس نے شرک کیا، اس نے ایک بڑے گناہ کا ارتکاب کیا، لہٰذا حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو سب سے بڑا عذاب دیا جائے جو خلود فی النار ہے۔ انتھی.[2]

7 علامہ اسماعیل حقی استانبولی کی تفسیر:

تفسیر روح البیان میں شیخ ابو السعود کی طرح تقریر کر کے کہا ہے کہ سید عثمان کہتے ہیں کہ جو لوگ شرک باللہ سے بچ گئے، اللہ تعالیٰ ان کے شرک نہ کرنے کی وجہ سے ان کے صغائر و کبائر کو بخش دے گا، مگر مشرکوں کے گناہ، جو شرک سے کم تر ہیں، ان کو نہ بخشے گا، اس لیے کہ انھوں نے شرک کیا ہے۔ جس طرح ان کا شرک ناقابل معافی ہے، اسی طرح شرک سے کم تر گناہ بھی مغفور نہ ہوگا، بخلاف مومنین کے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو شرک سے محفوظ رکھ کر اس کے عذاب سے بچایا ہے، اسی طرح ان کو شرک سے کم تر گناہوں کو معاف کر کے ان کے عذاب سے محفوظ رکھے گا، وللہ الحمد. یہ آیت اس امت کے لیے خیر وفضل کی آیات میں سب سے عظیم تر ہے۔ اس لیے کہ اس آیت نے یہ بات بتائی ہے کہ جو گناہ شرک سے کم تر ہے، وہ مشیتِ الٰہی کے مطابق بخش دیا جائے گا تو جو وعدہ مشیتِ کریم پر معلق ہوتا ہے، وہ پورا ہو کر رہتا ہے۔ خاص کر موحدین مخلصین محبین کے حق میں پورا ہونا ہی ہے، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا﴾ [الزمر: ۵۳] [اللہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے] پھر اس کے بعد وحشی کا قصہ ذکر کیا ہے۔

حکایت:

ابو العباس شریح نے اپنی بیماری میں یہ خواب دیکھا کہ قیامت قائم ہوئی ہے اور جبار تعالیٰ

---

[1] تفسير أبي السعود (۲/۲۳۳)

[2] تبصير الرحمن و تيسير المنان للمهائمي (۱/۱۵۱)

فرماتا ہے: علما کہاں ہیں؟ جب وہ حاضر ہوئے تو فرمایا: تم نے اپنے علم میں کیا عمل کیا ہے؟ ہم نے کہا: اے رب! ہم قاصر رہے اور ہم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ پھر اللہ پاک نے وہی سوال کیا، گویا اس جواب کو پسند نہ فرما کر دوسرا جواب چاہا۔ میں نے کہا: میرے صحیفے میں شرک نہیں ہے اور تو نے وعدہ کیا ہے کہ جو گناہ شرک سے کم تر ہے، وہ تو بخش دے گا۔ اللہ نے فرمایا: جاؤ میں نے تم سب کو بخش دیا۔ پھر اس خواب کے تین دن بعد شریح کا انتقال ہو گیا۔ یہ اللہ کے ساتھ ان کے حسن ظن کا نتیجہ ہے۔[1] وللہ الحمد، اللهم اجعلنا منهم (اے اللہ ہمیں بھی انھیں میں شامل فرما)

اس کے بعد صاحبِ روح البیان نے دوسری آیت [النساء: ۱۱۶] کی تفسیر میں بوڑھے اعرابی کا قصہ ذکر کر کے کہا ہے کہ شرک صرف توبہ ہی سے بخشا جاتا ہے اور شرک کے ماسوا گناہ معاف ہوتا ہے، خواہ توبہ کی ہے یا نہیں کی، لیکن یہ مغفرت ہر کسی کے لیے نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کے لیے جس کا بخشنا اللہ کو منظور ہوتا ہے۔ حدادی نے کہا ہے کہ اللہ پاک نے شرک کو ضلال بعید اس لیے فرمایا ہے کہ جنت سے دور ہونے کے مراتب ہیں، جن میں سب سے زیادہ دوری والا مرتبہ یہی شرک باللہ ہے۔ غرض کہ رذائل میں سب سے زیادہ قبیح شرک ہے، جس طرح توحید تمام حسنات میں بہترین نیکی ہے۔

سیئات کے بھی مراتب ہیں، جیسے حرام کھانا، شراب پینا، غیبت کرنا اور اس طرح کی برائیاں کرنا، لیکن ان سب سے بدترین شرک باللہ ہے، اسی لیے یہ کم بخت بخشا نہیں جاتا، چاہے کھلا شرک ہو یا چھپا، اللہ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ اسی طرح حسنات کے مدارج ہیں جن کو عمل صالح کا لفظ شامل ہے۔ عمل صالح وہ ہے کہ اس سے اللہ کی ذات مقصود ہو، ان سب میں سب سے بہتر توحید خالص ہے، یہی تمام حسنات کی بنیاد اور ساری سیئات کو دفع کرنے والی ہے۔[2]

⑧ علامہ خطیب شربینی کی تفسیر:

خطیب نے "سراج منیر" میں پہلی آیت کی تفسیر کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ارشاد: ﴿لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ﴾ اللہ کے عدل کا بیان ہے، پھر یہ ارشاد ﴿وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ اس کے فضل کا اظہار ہے کہ شرک عظیم کے سوا ہر چھوٹی بڑی معصیت کو بخش دیتا ہے، خواہ اس کے کرنے والے

[1] تفسیر روح البیان (۲/ ۱۷۴)

[2] تفسیر روح البیان (۲/ ۲۸۵)

نے توبہ کی ہے یا نہیں کی۔ پھر اس بات سے خبر دار کرنے کے لیے کہ اللہ مختار ہے اور اس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے، یہ فرمایا: ﴿لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ کلبی نے کہا ہے کہ یہ آیت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل وحشی کے بارے میں اتری ہے۔[1]

[9] علامہ جلال الدین سیوطی کی تفسیر:

جلالین میں ہے کہ ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ سے مراد ماسوا شرک ہے۔ اللہ چاہے تو اس کو معاف کر کے بلا عذاب داخلِ جنت کرے یا عذاب دے کر بخش دے۔[2]

[10] علامہ معین الدین شافعی کی تفسیر:

جامع البیان میں کہا ہے کہ جو بندہ مشرک ہو کر اللہ سے ملتا ہے، اللہ اس کو نہیں بخشتا، البتہ جو شرک سے کم درجے کا گناہ ہے، چاہے صغیرہ ہو یا کبیرہ، اس کو از راہِ کرم بخش دیتا ہے۔

آیت میں شرک کو افترائے اثم عظیم (بڑا گناہ باندھنا) اس لیے فرمایا ہے کہ شرک کے سامنے باقی گناہ حقیر ہیں، اسی لیے دوسری آیت میں شرک کو "ضلال بعید" (دور بھٹک جانا) کہا ہے، کیونکہ شرک ضلالت کی تمام قسموں سے عظیم ترین اور حق وصواب سے بہت ہی دور ہے۔[3]

[11] امام قرطبی کی تفسیر:

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ آیت میں یہ ارشاد کہ اللہ شرک کو نہیں بخشتا ہے، باتفاقِ اہلِ علم اور بلا اختلافِ امت محکم ہے اور شرک سے کم تر گناہ کی مغفرت متشابہ ہے، جس میں علما نے کلام کیا ہے۔[4]

[12] امام ابن جریر طبری کی تفسیر:

ابن جریر طبری نے کہا کہ اس آیت نے یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ صاحبِ کبیرہ مشیت الٰہی کے تحت ہے، چاہے اللہ اس کو بخشے یا نہ بخشے، بشرطیکہ وہ کبیرہ شرک باللہ نہ ہو۔ بعض علما کا خیال ہے کہ اللہ نے اس مغفرت کو دوسری آیت کے ساتھ مقید کیا ہے:

---

[1] تفسير السراج المنير للشربيني (١/ ٣٥٤)

[2] تفسير الجلالين (١/ ١٠٨)

[3] تفسير جامع البيان (١/ ٣٦٥، ٤٠٨)

[4] تفسير القرطبي (٥/ ٢٣٥)

﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ﴾ [النساء: ٣١]

[اگر تم بڑے گناہوں سے جن سے تمھیں منع کیا جاتا ہے، بچتے رہو گے تو ہم تمھاری برائیاں معاف کر دیں گے]

اس میں یہ بتایا ہے کہ کبائر سے بچنے والے کے صغائر کو اللہ تعالیٰ بخشنا چاہتا ہے اور کبائر کے مرتکب کے صغائر نہیں بخشتا ہے۔[1] مگر اس میں تامل ہے۔ پھر دوسری آیت کے ذیل میں کہا ہے کہ یہ آیت خوارج پر رد ہے جو مرتکبِ کبیرہ کو کافر کہتے ہیں۔ ابن فورک نے کہا ہے کہ ہمارے اصحاب کا اس بات پر اجماع ہے کہ فاسق کے لیے خلود فی النار نہیں ہے۔ اہلِ قبلہ میں سے کوئی فاسق اگر توبہ کے بغیر مر گیا اور داخلِ جہنم ہوا تو بھی رسول اللہ ﷺ کی شفاعت یا رحمت الٰہی کی بدولت لامحالہ جہنم سے باہر نکل آئے گا۔

۱۳ امام شوکانی کی تفسیر:

امام شوکانی رحمہ اللہ نے "فتح القدیر" میں فرمایا ہے کہ آیتِ شرک کا حکم اہلِ کتاب اور غیر اہلِ کتاب کفار کے تمام گروہوں کو شامل ہے، صرف اہلِ حرب کفار کے لیے خاص نہیں ہے، کیونکہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا ہے۔ یہ نصاریٰ ثالث ثلاثہ کے بھی قائل ہیں، یعنی اللہ کو تین خداؤں کا تیسرا کہتے ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مشرک جب اپنے شرک پر مر جاتا ہے تو وہ اہلِ مغفرت میں سے نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا فضل و کرم اپنی مشیت کے مطابق غیر اہلِ شرک پر کیا ہے، یعنی غیر مشرک نافرمان اور گناہ گار مسلمان مشیتِ الٰہی کے تحت داخل ہیں، وہ ان میں سے جسے چاہے بخشے اور جسے چاہے نہ بخشے۔ آیت کا ظاہر مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی مغفرت اس کے لیے ہے جس کو از راہِ فضل و کرم اس کی مشیت مقتضی ہو، اگرچہ اس گناہ گار سے توبہ واقع نہ ہوئی ہو۔ معتزلہ نے اس آیت کو اجتناب کبائر والی آیت کے ساتھ مقید کیا ہے۔ وہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ سیئات کی مغفرت کبائر سے بچنے والے کے لیے ہوگی، پس مجتنبِ کبائر ان لوگوں میں سے ہے جس کی مغفرت اللہ نے چاہی ہے۔

حکایت:

ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہا کہ میرا بھتیجا

[1] تفسیر الطبري (٨/ ٤٥١)

حرام سے باز نہیں آتا۔ فرمایا اس کا دین کیا ہے؟ کہا: وہ نمازی موحد ہے۔ فرمایا: تو اس سے اس کا دین مانگ لے۔ اگر ہبہ نہ کرے تو اس سے خرید لے۔ اس آدمی نے اس سے اس کا دین اسی طرح طلب کیا، وہ نہیں مانا تو اس آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر کہا: "وجدته شحيحا على دينه" (میں نے اس کو دین پر بخیل پایا ہے) تو اس پر یہ آیت: ﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَ يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ نازل ہوئی۔[1] (رواه ابن أبي حاتم و الطبراني)

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنی شفاعت اہلِ کبائر کے لیے رکھ چھوڑی ہے۔[2]

سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تفسیر میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مغفرت کو ہر اس شخص پر حرام کیا ہے جو کافر فوت ہوا اور اہلِ توحید کو اپنی مشیت کی امید دلائی ہے، ان کو مغفرت سے مایوس نہیں فرمایا۔[3]

۱۴ ملا احمد جیون کی تفسیر:

ملا جیون نے اپنی تفسیر میں کہا ہے کہ ان دونوں آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ شرک توبہ کے بغیر بخشا نہیں جاتا، البتہ جو گناہ، صغیرہ ہوں یا کبیرہ، شرک سے چھوٹے ہیں، وہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں، چاہے ان پر عذاب کرے اور چاہے معاف فرمائے۔ رہا گناہوں سے تائب شخص تو وہ اللہ کے فضل سے مغفور ہے، اس لیے نہیں کہ اس کا بخشنا اللہ پر واجب ہے۔ اہلِ سنت و جماعت کا یہی مذہب ہے۔ پھر ملا جیون نے معتزلہ وخوارج کے مذہب کا رد کیا ہے اور کہا ہے کہ آیت: ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ۵۳] سے توبہ کے بغیر شرک کی مغفرت ثابت نہیں ہوتی ہے۔ انتہی۔[4]

۱۵ امام شہاب الدین خفاجی کی تفسیر:

شہاب خفاجی نے "عنایہ" میں مذہبِ معتزلہ سے متعلق زمخشری کے بیان کی تردید کی ہے اور

[1] تفسیر ابن أبي حاتم (۹۷۱/۳) المعجم الکبیر للطبراني (۱۷۷/٤) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني" وفيه واصل بن السائب، وهو ضعيف" (مجمع الزوائد: ٦١/٧)

[2] المعجم الأوسط (۱۰٦/٦) مسند أبي يعلى (۱۸۵/۱۰) نیز دیکھیں: سنن أبي داود (۴۷۳۹)

[3] فتح القدير للشوكاني (۷۱۷/۱)

[4] تفسير أحمديه (ص: ٤٣، اردو مترجم) ضياء القرآن پبلی کیشنز، لاہور۔

اس سے متعلق تفصیلی بحث کی ہے۔[1]

16 شاہ عبدالقادر کا قول:

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے موضح القرآن میں دوسری آیت کے فائدے میں کہا ہے کہ اسلام کے سوا جو دین ہے سب شرک ہے، اگرچہ وہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔ انتهى.

17 امام ابن کثیر کی تفسیر:

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے:

''اس آیت کے متعلق جو حدیثیں آئی ہیں، ہم ان کو ذکر کرتے ہیں:

① پہلی حدیث یہ ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

''اللہ کے پاس تین دیوان (دفتر) ہیں۔ ایک دیوان وہ ہے جس کی اللہ کو کوئی پروا نہیں ہوتی۔ دوسرا دیوان وہ ہے، جس میں سے وہ کوئی چیز چھوڑتا نہیں۔ تیسرا دیوان وہ ہے، جس کو وہ نہیں بخشتا ہے۔ یہ دیوان شرک باللہ ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ الآية﴾ دوسری جگہ فرمایا: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ﴾ [المائدة: ٧٢] [جو شخص اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے، اللہ نے اس پر جنت کو حرام کر دیا ہے] وہ دیوان جس کی اللہ کوئی پروا نہیں کرتا، بندے کا ان چیزوں میں اپنی جان پر ظلم کرنا ہے، جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہیں، جیسے کسی دن کا روزہ یا نماز چھوڑ دینا۔ اس کو اگر اللہ چاہے تو بخش دیتا اور درگزر کرتا ہے۔ رہا وہ دیوان جس میں سے کچھ نہیں چھوڑتا تو یہ وہ ظلم ہے جو بندے آپس میں ایک دوسرے پر کرتے ہیں۔''[2] (اس حدیث کو صرف امام احمد نے روایت کیا ہے)

② دوسری حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ظلم تین طرح کے ہیں۔ ایک وہ جسے اللہ نہیں بخشتا۔ دوسرا وہ ظلم جسے اللہ بخش دیتا ہے۔ تیسرا وہ ظلم جس میں سے کچھ نہیں چھوڑتا۔ جس ظلم کو اللہ بالکل نہیں بخشتا، وہ شرک ہے۔

[1] عناية القاضي وكفاية الراضي للخفاجي (١٤٤/٣)

[2] مسند أحمد (٢٤٠/٦) المستدرك للحاكم (٦١٩/٤) امام ذہبی رحمہ اللہ ''تلخيص المستدرك'' میں اس کی سند کے بارے میں فرماتے ہیں: ''صدقة ضعفوه، وابن بابنوس فيه جهالة''

اللہ نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے۔ وہ ظلم جسے بخش دیتا ہے، بندوں کا ان امور میں اپنی جانوں پر ظلم کرنا ہے جو ان کے اور اللہ کے درمیان ہیں۔ رہا وہ ظلم جس کو اللہ نہیں چھوڑتا تو وہ ظلم ہے، جو بندے ایک دوسرے پر کرتے ہیں، یہاں تک کہ بعض کے لیے بعض سے بدلہ لے گا۔'' (رواہ البزار)[1]

③ تیسری حدیث معاویہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قریب ہے کہ اللہ ہر گناہ کو بخش دے، مگر اس آدمی کا گناہ جو کافر فوت ہوا یا کسی مومن کو قصداً قتل کیا۔'' (رواه أحمد و النسائي)[2]

④ چوتھی حدیث ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے میرے بندے! اگر تو مجھ سے زمین بھر خطائیں لے کر ملے گا، پھر مجھ سے ملے گا کہ میرے ساتھ کوئی چیز شریک نہیں کرتا تھا تو میں تجھ سے زمین بھر مغفرت لے کر ملوں گا۔'' (تفرد به أحمد من هذا الوجه)[3]

⑤ پانچویں حدیث سیدنا ابو ذر رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جس بندے نے ''لا الٰہ الا اللہ'' کہا، پھر اسی پر فوت ہوا تو وہ جنت میں جائے گا۔ ابو ذر نے کہا: اگرچہ اس نے زنا یا چوری کی ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگرچہ اس نے زنا یا چوری کی ہو۔ یہ بات تین مرتبہ فرمائی۔ چوتھی بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: « عَلٰى رَغْمِ أَنْفِ أَبِيْ ذَرٍّ » اگرچہ ابو ذر کی ناک خاک آلود ہو۔'' (رواه الشيخان وأحمد بطوله)[4]

اس حدیث کے دوسرے الفاظ یہ ہیں:

« ذَاكَ جِبْرِيْلُ آتَانِيْ، فَقَالَ: مَنْ مَّاتَ مِنْ أُمَّتِكَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا دَخَلَ الْجَنَّةَ، قُلْتُ: وَإِنْ زَنٰى وَإِنْ سَرَقَ؟ » (رواه أحمد والشيخان)[5]

---

① مسند البزار (١٣/ ١١٥) السلسلة الصحيحة (٤/ ٥٦٠)

② مسند أحمد (٤/ ٩٩) سنن النسائي (٣٩٨٤)

③ صحيح مسلم (٢٦٨٧) مسند أحمد (٥/ ١٥٤)

④ صحيح البخاري (٥٨٢٧) صحيح مسلم (٩٤) مسند أحمد (٥/ ١٦٦)

⑤ صحيح البخاري (٢٣٨٨) صحيح مسلم (٩٤) مسند أحمد (٥/ ١٥٢)

تیسری روایت میں ہے:

«ذَاكَ جِبْرِيلُ عَرَضَ لِي مِنْ جَانِبِ الْحَرَّةِ فَقَالَ: بَشِّرْ أُمَّتَكَ ... إِلَى قَوْلِهِ: وَإِنْ سَرَقَ وَإِنْ زَنَى؟ قَالَ: نَعَمْ وَإِنْ شَرِبَ الْخَمْرَ»[1] (رواہ البخاري ومسلم)

(ان روایتوں کا معنی ومفہوم وہی ہے جو پہلی روایت میں بیان ہوا ہے)

⑥ چھٹی حدیث سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا: ایک آدمی نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! دو واجب کرنے والی چیزیں کیا ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو شخص شرک کے بغیر مرجائے تو اس کے لیے جنت واجب ہوئی اور جو شخص شرک کے ساتھ مرجائے تو اس کے لیے آگ واجب ہوگئی۔''[2] (رواہ عبد بن حمید)

اس حدیث کا دوسرا لفظ یہ ہے کہ جو شخص مرجائے اور وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں کرتا تھا تو اس کے لیے مغفرت واجب ہوتی ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی: ﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ ... الآية﴾[3] (رواہ ابن أبي حاتم)

⑦ ساتویں حدیث سیدنا جابر رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً یوں مروی ہے: ''بندے کی ہمیشہ مغفرت ہو جاتی ہے، جب تک حجاب واقع نہ ہو۔ لوگوں نے عرض کی: اے اللہ کے نبی ﷺ! حجاب کیا ہے؟ فرمایا: شرک باللہ۔''[4] (رواہ أبو یعلی)

⑧ آٹھویں حدیث ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے اس بات کی گواہی دی کہ اللہ وحدہ لا شریک لہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں اور یہ گواہی سچی زبان اور دل سے ہو تو وہ بہشت میں داخل ہوگا۔'' (رواہ أحمد بطولہ)[5]

⑨ نویں حدیث وہی ہے جو اوپر گزر چکی ہے، یعنی «وَجَدْتُهُ شَحِيحاً عَلَى دِينِهِ»[6] (رواہ ابن أبي حاتم بطولہ)

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٤٣) صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٤)

② صحيح مسلم، رقم الحديث (٩٣) مسند عبد بن حميد (١٠٥٨)

③ تفسير ابن أبي حاتم (٩٧١/٣) اس کی سند میں ''موسی بن عبیدۃ ربذی'' ضعیف ہے۔

④ مسند أحمد (١٧٤/٥) صحيح ابن حبان (٣٩٣/٢) اس کی سند میں ''عمر بن نعیم'' اور ''أسامة بن سلمان'' مجہول ہیں۔

⑤ مسند أحمد (٤١٣/٥) اس کی سند میں ''عبداللہ بن لہیعہ'' ضعیف ہے۔

⑥ تفسير ابن أبي حاتم (٩٧١/٣) اس کی سند میں ''واصل بن السائب'' ضعیف ہے۔ (مجمع الزوائد: ٥/٧)

⑩ دسویں حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ہے: ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آ کر کہا: «مَا تَرَكْتُ حَاجَةً وَلَا دَاجَةً إِلَّا قَدْ أَتَيْتُ» ''میں نے ہر طرح کا اچھا برا کام کیا ہے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم اس بات کی گواہی نہیں دیتے ہو کہ ''لا إله إلا الله وأن محمدا رسول الله؟'' اس کو تین بار فرمایا۔ اس نے کہا: ''ہاں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: «فَإِنَّ ذٰلِكَ يَاتِي عَلٰى ذٰلِكَ كُلِّهٖ»[1] ''بیشک یہ گواہی ان تمام غلط کاریوں پر غالب رہے گی۔'' (رواہ أبو يعلى)

⑪ گیارھویں حدیث سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''بنی اسرائیل میں ایک آدمی تھا جو عبادت میں محنت کرتا تھا، جب کہ دوسرا شخص اپنی جان پر زیادتی کرتا تھا (یعنی گناہ کے کام میں لگا رہتا تھا) ان دونوں میں دوستی تھی۔ عابد اس گناہ گار کو ہمیشہ گناہ کرتے ہوئے دیکھتا اور کہتا: اے شخص! باز آ جا۔ وہ کہتا تو مجھ پر نگہبان مقرر ہو کر آیا ہے؟ یہاں تک کہ ایک دن اس کو ایک گناہ کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے کہا: ''مالك ويحك أقصر!'' (یہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے؟ اب تو باز آ جا) اس نے کہا: ''علي أوزاري أبعثت علي رقيبا؟'' (میرے گناہوں کا نقصان مجھ کو ہو گا۔ کیا تم میرے گناہوں پر نگراں مقرر ہوئے ہو؟) عابد نے کہا: اللہ کی قسم، اللہ تیری مغفرت نہیں فرمائے گا اور نہ کبھی تمھیں جنت میں داخل کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس ایک فرشتہ بھیجا جو ان کی روحیں قبض کر لے۔ جب وہ دونوں اللہ کے پاس اکٹھے ہوئے تو گناہ گار سے کہا: تم جنت میں جاؤ۔ دوسرے (عابد) سے فرمایا: ''أكنت على ما في يدي قادرا؟'' (کیا جو چیز میرے قبضہ قدرت میں ہے، تم اس پر قادر ہو؟) اس کو آگ میں لے جاؤ۔'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں ابو القاسم کی جان ہے، اس نے ایک ہی ایسی بات کہی جس سے اپنی دنیا و آخرت تباہ کر لی۔'' (رواہ أحمد و أبو داود)[2]

⑫ بارھویں حدیث سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے، جو رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں

---

[1] مسند أبي يعلى (٦/ ١٥٥) المعجم الكبير (٧/ ٣١٤)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٢٣) سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٩٠١)

کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''جس نے یہ بات جان لی کہ میں گناہوں پر قدرت والا ہوں تو میں اس کو بخش دیتا ہوں اور کچھ پروا نہیں کرتا، جب تک اس نے کسی چیز کو میرا شریک نہیں ٹھہرایا ہے۔''[1]

⑬ تیرھویں حدیث سیدنا انس رضی اللہ عنہ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس سے اللہ نے کسی عمل پر ثواب کا وعدہ کیا ہے، اللہ اس کو پورا کرتا ہے اور جس سے کسی عمل پر عقاب کا وعدہ فرمایا ہے، اس میں اللہ کو اختیار ہے۔'' (رواہ البزار و أبو یعلی)[2]

''اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے لیے خلفِ وعید (وعدۂ عقاب کی خلاف ورزی) جائز ہے اور وعدہ خلافی ناجائز ہے۔ کئی حدیثوں میں صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ ہم مرتکبِ کبیرہ کے لیے جہنم کی شہادت دیتے تھے، لیکن جب شرک کے ماسوا کی مغفرت والی آیت نازل ہوئی تو ہم اس سے رک گئے۔[3] رہی آیتِ اسراف علی النفس ﴿قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ تو یہ توبہ کے ساتھ مشروط ہے۔ جو کوئی کسی گناہ سے توبہ کرتا ہے، اگرچہ وہ گناہ اس سے مکرر ہوا ہو تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے، اسی لیے یوں فرمایا ہے کہ اللہ سارے گناہ بخش دیتا ہے، یعنی توبہ مشروط ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوگی تو شرک بھی اس میں داخل رہے گا اور یہ درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ نے یہاں آیت کو اس بات پر ختم کیا ہے کہ وہ شرک کو نہیں بخشتا ہے، پھر یہ حکم لگایا ہے کہ جو گناہ شرک سے کم ہے، اس کو بخش دیتا ہے، اگرچہ اس سے توبہ نہ کی ہو، اس وجہ سے یہ آیت بڑی امید افزا ہے۔ رہا شرک تو اللہ نے اس کو اثمِ عظیم فرمایا ہے۔

⑭ صحیحین میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے آیا ہے کہ میں نے کہا: اے اللہ کے رسول ﷺ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟

---

[1] المعجم الکبیر للطبراني (١١/ ٢٤١) اس کی سند میں "إبراهیم بن حکم بن أبان" راوی ضعیف ہے۔

[2] مسند أبي یعلی (٦/ ٦٦) اس کی سند میں "سهیل بن أبي حزم" راوی متکلم فیہ ہے، لیکن علامہ ناصر الدین البانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کی سند اگرچہ ضعیف ہے، لیکن اس میں بیان کردہ معنی صحیح ہے: (الصحیحة: ٢٤٦٣)

[3] اس کی تخریج گزر چکی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: «أَنْ تَجْعَلَ لِلّٰهِ نِدًّا وَهُوَ خَلَقَكَ»[1] (تم اللہ کا شریک یا برابر والا کسی کو بناؤ، حالانکہ اس نے تم کو پیدا کیا ہے)

⑮ عمران بن حصین کی حدیث میں شرک کو اکبر کبائر فرمایا ہے۔[2] (رواہ ابن مردویہ)[3]

⑱ امام حسن بن محمد نیساپوری کی تفسیر:

مولانا نظام نیساپوری نے اپنی تفسیر ''انوار التنزیل'' میں کہا ہے کہ یہ آیت ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهِ الآية﴾ اس بات پر دلیل ہے کہ یہودی کو عرفِ شرع میں مشرک کہا جاسکتا ہے، اس لیے کہ یہ آیت ایک یہودی قصے ہی سے متصل ہے اور اس بات پر دال ہے کہ شرک کے ما سوا مغفور ہے، جب کہ یہودیت بالاجماع مغفور نہیں ہے، اسی لیے امام شافعی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مسلمان کسی ذمی کے بدلے قتل نہیں کیا جاتا، کیونکہ ذمی مشرک ہے اور مشرک مباح الدم ہوتا ہے۔ مباح الدم وہی شخص ہے جس کے قاتل پر قصاص واجب نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ ذمی کو قتل کرنے سے نہی وارد ہوئی ہے تو وہ اس دلیل پر ترکِ عمل کا فائدہ نہیں دیتی، لہٰذا قاتل سے سقوطِ قصاص کے بارے میں وہ دلیل معمول بہ رہے گی۔

''اشاعرہ نے اس آیت سے صاحبِ کبیرہ کی مغفرت قبل از توبہ پر استدلال کیا ہے، کیونکہ آیت کا لفظ ﴿مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ اس کو بھی شامل ہے۔ معتزلہ نے اس کو تائب شخص کے ساتھ خاص کیا ہے، جس طرح اول آیت ﴿لَا يَغْفِرُ﴾ غیر تائب کے ساتھ بالاجماع خاص ہے۔ رہی مشیت ﴿لِمَنْ يَّشَاءُ﴾ تو یہ کبیرہ کی قید ہے، پس صاحبِ کبیرہ مستحق مغفرت ہوگا۔ دوسری آیت میں اللہ نے شرک کو ضلال بعید فرمایا ہے، اس لیے کہ صانع عالم کے وجود اور وحدت سے بڑھ کر کوئی چیز واضح نہیں ہے، مطلوب جتنا اجلا یعنی روشن و واضح تر ہوگا، اس کا نقیض اتنا ہی اَبعد اور اَضل ہوگا۔'' انتہی۔[4]

---

① صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٢٠٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٦)

② الأدب المفرد (٢٩٣) المعجم الكبير (١٨/ ١٤٠) امام ہیثمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "رواه الطبراني في الكبير إلا أن الحسن مدلس و عنعنه" (مجمع الزوائد: ١/ ٢٩٢)

③ تفسير ابن كثير (١/ ٨، ٩، ١٠، ٥١١)

④ تفسير النيسابوري (٤/ ٤٢٦)

⑲ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی تفسیر:

قاضی ثناء اللہ نے ''تفسیر مظہری'' میں کہا ہے کہ اللہ وجوبِ وجود یا عبادت میں شرک کرنے والے کو نہیں بخشتا، جب کہ وہ مشرک ہونے کی حالت میں مرا ہو۔ ہاں اگر شرک سے توبہ کر کے ایمان لایا ہے تو اس کا گذشتہ شرک اور دوسرے گناہ بخش دیے جاتے ہیں، اس پر تمام لوگوں کا اجماع ہے، اس لیے کہ گناہ سے تائب بے گناہ کی مانند ہو جاتا ہے۔ گویا اس سے کوئی گناہ صادر ہی نہیں ہوا تھا۔ اللہ نے فرمایا ہے کہ اے رسول! کافروں سے کہہ دو کہ اگر تم باز رہو گے تو تمھارا اگلا گناہ بخش دیا جائے گا۔ ﴿يَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ سے شرک کے ماسوا ہر قسم کے گناہ مراد ہیں، خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ، عمداً ہوں یا سہواً اور خواہ بے توبہ مر گیا ہو۔

''آیت میں لفظ ﴿لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ شرک کے علاوہ کی مغفرت کی عمومیت بیان کرنے کے لیے ہے، پھر اس کو مشیتِ الٰہی کے ساتھ مقید کرنا مذہب مرجیہ کو باطل کر دیتا ہے۔ یہ لوگ ہر گناہ کی مغفرت کو واجب کہتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ ایمان کے ہوتے ہوئے کوئی گناہ نقصان نہیں پہنچاتا، جس طرح کہ کوئی عملِ خیر شرک کے ساتھ نفع نہیں دیتا۔ اس میں مذہبِ معتزلہ کی تردید بھی ہے، کیونکہ وہ مغفرتِ ذنوب کو توبہ کے ساتھ مقید کرتے ہیں، حالانکہ یہ آیت مغفرت کو توبہ کے ساتھ مقید کرنے کی نفی پر دلالت کر رہی ہے، کیونکہ سیاقِ کلام مشرک اور مذنب کی حالتوں کے درمیان فرق بتانے کے لیے ہے اور جب اس کو مشیت کے ساتھ مقید کریں گے تو تائب کے لیے وجوبِ مغفرت اور غیر تائب کے لیے وجوبِ تعذیب کا قول باطل ہو جائے گا۔ اگر کوئی اعتراض کرے کہ مشیت کی قید وجوب کے منافی نہیں ہے، بلکہ مغفرت کے بعد مشیت کے وجوب کو مستلزم ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اس تقیید کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

''اس آیت سے مذہبِ خوارج کا بھی رد ہوتا ہے، جو کہتے ہیں کہ ہر گناہ شرک ہے، اس لیے گناہ گار مخلد فی النار ہوگا۔ امام بغوی رحمہ اللہ نے دوسری آیتِ شرک کے تحت طعمہ بن ابیرق کا پورا قصہ لکھ کر کہا ہے کہ بعض کے نزدیک اس آیت کا نزول حرہ بن سلیم کے بارے میں ہوا ہے۔ یہ شخص ایک بت کو پوجتا تھا، یہاں تک کہ مر گیا۔ اس کے بعد امام بغوی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بوڑھے اعرابی کا قصہ بھی نقل کیا ہے۔ انتہیٰ.

''بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ شرک مغفور نہیں ہوتا، اس کا جو عذاب مقرر ہے، وہ ضرور ہی ہوگا، پھر اگر شرک اس اونچے درجے کا ہے جس سے مشرک کافر ہو جاتا ہے، تو اس کی سزا وہی خلود فی النار ہے اور وہ ابد الآباد تک جہنم میں رہے گا، کبھی آرام نہ پائے گا۔ اگر شرک کفر سے کم درجے کا ہے تو جو عذاب اس کے لیے معین ہے، وہ اس کو ہوگا، باقی ذنوب وسیئات اللہ کی مشیت پر ہیں، چاہے عذاب کرے اور چاہے بخش دے۔'' انتھی۔[1]

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ شرک اکبر کبائر، اعظم ذنوب، افتح آثام، اخبث خبائث اور اشنع معاصی ہے، پس آیتِ شرک محل نزاع میں نص جلی ہے اور شرک کے معاف نہ ہونے پر دلیل قطعی ہے، اس بنا پر کسی قول وفعل میں شرک جلی یا خفی کی کوئی بات ثابت ہوگئی اور کتاب وسنت سے یا صرف کتاب یا صرف سنت سے اس کا شرک ہونا پایا جائے گا تو وہ ہرگز مغفور نہ ہوگا، اس میں کسی شک وشبہے کی گنجایش نہیں ہے، البتہ اس چیز کا قائل و فاعل صحیح توبہ کرے اور باطل اعتقاد سے جدا ہو کر ظاہر وباطن میں عمل صالح بجا لائے تو وہ قابل بخشش ہے۔ اللهم ارحم الموحدين وقهم عن شر المشركين.

⑳ علامہ عبدالرحمٰن بن حسن آلِ شیخ کی تفسیر:

کتاب ''فتح المجید'' میں کہا ہے کہ اس آیت سے ظاہر ہوا کہ شرک سب سے بڑا گناہ اور معصیت ہے، کیونکہ اللہ نے خبر دار کیا ہے کہ وہ شرک کو توبہ کرنے کے بغیر ہرگز نہیں بخشے گا، اس کے سوا دوسرے گناہ اس کی مشیت میں ہیں، چاہے بخشے اور چاہے عذاب کرے۔ یہ آیت بندے پر شرک سے سخت پرہیز کرنے کو واجب قرار دیتی ہے، کیونکہ شرک کا حال اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ کسی طرح بھی مغفور نہیں ہو سکتا ہے اور مغفرت کیوں ہو کہ شرک بہت سے عظیم جرائم ومعاصی کا مجموعہ ہے، مثلاً:

① شرک انتہائی قبیح اور بدترین ظلم ہے۔
② شرک میں اللہ رب العالمین کی تنقیص ہے، کیونکہ اس کا حق مار کر غیر کو دیا جاتا ہے۔
③ شرک ہر لحاظ سے مقصدِ خلق وامر کے مقصود کے منافی ہے۔
④ شرک میں احکم الحاکمین کے ساتھ بہت بڑی عداوت ہے۔
⑤ شرک کرنا ایک طرح سے اللہ کی اطاعت وفرماں برداری اور اس کے سامنے عجز وانکساری سے

[1] التفسير المظهري (٢/٢٣٨)

غایت درجہ تکبر کرنا ہے۔

◈ شرک میں بڑی خرابی یہ ہے کہ مخلوق کی خالق کے ساتھ خصائصِ الوہیت میں تشبیہ ہوتی ہے، جیسے ملکیت و مالکیت، نفع وضرر، عطا و منع، دعا، خوف ورجا اور توکل وغیرہ انواع عبادات، جس نے ان میں سے کوئی کام کسی مخلوق کے ساتھ کیا تو اس نے اس مخلوق کو خالق کے مشابہ ٹھہرایا اور جس کو اپنے نفع وضرر اور موت و حیات کا کوئی اختیار نہ تھا، اس کو مالکِ خلق و امر کے مثل کر دیا، عیاذاً باللّٰہ۔

اس آیت میں فرقہ خوارج پر رد ہے جو گناہ گار کی تکفیر کرتے ہیں اور معتزلہ پر بھی رد ہے جو صاحبِ کبیرہ کو مخلد فی النار بتاتے اور کہتے ہیں کہ کبائر کا مرتکب مومن ہے نہ کافر، بلکہ بین بین ہے۔[1] ان دونوں آیاتِ شرک کی تفسیر ہم نے ''دین خالص'' میں مفصل طور پر لکھی ہے۔[2]

[1] فتح المجید (ص:۷۸)

[2] الدین الخالص (۱/۲۴۶۔ ۲۸۰)

چھٹا باب

انواعِ شرک کا بیان

ستارہ پرستی:

1 زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

«مَنْ قَالَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا، فَذٰلِكَ كَافِرٌ بِي، وَمُؤْمِنٌ بِالْكَوَاكِبِ» (رواه الشيخان)[1]

[جس نے یہ کہا کہ ہم پر فلاں فلاں نچھتر (ستارے) سے بارش ہوئی تو وہ میرا منکر ہوا اور تاروں پر ایمان لایا]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو کوئی عالم کے کاروبار کو ستاروں کی تاثیر سے سمجھتا ہے تو اللہ اس کو اپنے منکروں میں جانتا ہے اور کواکب پرستوں میں شمار کرتا ہے۔ اس کے برعکس جو کوئی اس کاروبار کا کارخانہ اللہ کی طرف سمجھتا ہے تو اللہ بھی اس کو اپنے مقبول بندوں میں شامل کر لیتا ہے اور اسے ستارہ پرستوں سے نکال لیتا ہے۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ نیک اور بد گھڑی کا ماننا، اچھی بری تاریخ اور دن کا پوچھنا اور نجومی کے کہنے پر یقین کرنا شرک کی باتیں ہیں، کیونکہ یہ سب نجوم سے تعلق رکھتی ہیں اور نجوم کا ماننا ستارہ پرستوں کا کام ہے۔ ''نوء'' چاند کی منزل کو کہتے ہیں۔ چاند کی اٹھائیس منزلیں ہیں۔ چاند ہر رات ان میں سے ایک منزل میں جاتا ہے۔ عرب کا یہ اعتقاد تھا کہ پانی کا برسنا اسی چاند کی چال ڈھال سے ہوتا ہے، جب مشرق سے ایک ستارہ نکلتا ہے اور مغرب میں دوسرا تارہ ڈوب جاتا ہے تو پانی برستا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ أَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ [الواقعة: ٨٢] [اور تم اپنا شکریہ اس طرح ادا کرتے ہو کہ جھٹلاتے ہو] اس کی تفسیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨٤٦، ١٠٣٨) صحيح مسلم (١/ ٨٣، ٨٤)

«تَقُوْلُوْنَ: مُطِرْنَا بِنَوْءِ كَذَا وَكَذَا وَبِنَجْمِ كَذَا وَكَذَا»[1]

[تم کہتے ہو فلاں فلاں نچھتر اور فلاں فلاں ستارے سے ہمیں بارش حاصل ہوئی]

صحابہ کی ایک جماعت اور جمہور مفسرین کا یہی قول ہے۔

٢ سیدنا ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری امت میں چار کام جاہلیت کے ہیں، ان میں ایک ستاروں سے بارش طلب کرنے کو بھی ذکر فرمایا ہے۔ (رواہ مسلم)[2]

اس سے مراد بارش کی نسبت نچھتر اور تارے کی طرف کرنا ہے۔ جاہلیت سے مراد وہ زمانہ ہے جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے تھا اور ہر وہ کام جو رسول اللہ ﷺ کی شریعت کے خلاف ہے، اسے بھی جاہلیت کہا جاتا ہے۔

٣ مسند احمد میں جابر سوائی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي ثَلَاثاً: اِسْتِسْقَاءاً بِالنُّجُومِ»[3]

[مجھے اپنی امت پر تین باتوں کا خوف ہے، ان میں سے ایک ستاروں کی طرف بارش کی نسبت کرنا ہے]

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جس نے یہ کہا: فلاں تارے سے ہم کو بارش حاصل ہوئی تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہے:

1. ایک یہ کہ کہنے والے کا اعتقاد یہ ہے کہ تارے کو نزولِ بارش میں کچھ تاثیر ہے تو یہ عقیدہ وہی شرک وکفر ہے جس پر اہلِ جاہلیت تھے یا جس طرح موجودہ زمانے کے قبر پرست کہتے ہیں کہ میت وغائب کی دعا سے ہم کو نفع وضرر حاصل ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی شرک کو مٹانے کے لیے آئے تھے اور اسی کے سبب قتال کیا تھا۔

2. دوسرے یہ کہ یا اس قائل کا یہ اعتقاد ہے کہ موثر اکیلا اللہ ہے، لیکن عادت یوں ہی جاری ہے کہ جب فلاں تارہ ساقط ہوتا ہے تو پانی برستا ہے۔ سقوطِ نجم کی طرف مطر (بارش) کی یہ نسبت بھی حرام ہے، گو بطور مجاز ہو، کیونکہ اس قائل نے اس فعل کو جس پر اللہ کے سوا کوئی قادر نہیں

---

[1] مسند أحمد (١/٨٩، ١٠٨، ٢/٥٢٥) سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٣٤٩)

[2] صحيح مسلم (٢/٦٤٤)

[3] مسند أحمد (٥/٩٠)

ہے، ایک مجبور مخلوق کی طرف منسوب کیا جو نفع دے سکتی ہے اور نہ نقصان کر سکتی ہے۔ پس یہ شرک اصغر ہوا، حالانکہ شرک اصغر سارے کبائر سے اکبر ہوتا ہے، پھر شرک اکبر کا کیا ذکر ہے؟

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میری امت جاہلیت کا یہ کام کرے گی، چاہے اس کی حرمت کو جاننے کے بعد کرے یا اپنی جہالت کی وجہ سے کرے۔ بعض اہلِ علم نے ایک تالیف لطیف میں سارے امورِ جاہلیت کو یکجا ذکر کیا ہے، جن کی تعداد ایک سوتیں مسائل ہیں۔[1]

شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں خبر دی ہے کہ بعض امورِ جاہلیت کو سب لوگ ترک نہیں کریں گے۔ اس میں جاہلی امور کا ارتکاب کرنے والوں کی مذمت ہے۔ اس کا اقتضا یہ ہے کہ جاہلیت کا جو فعل ہے، وہ دینِ اسلام میں مذموم ہے، ورنہ ان منکرات کی جاہلیت کی طرف اضافت میں مذمت کا پہلو نہیں ہوگا، حالانکہ کسی چیز کی جاہلیت کی طرف نسبت مذمت ہی کے لیے ہوتی ہے، جس طرح آیتِ کریمہ ﴿وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولٰى﴾ [الأحزاب: ۳۳] [اور پہلی جاہلیت کے زمانے کی طرح بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو] میں تبرج کی مذمت اور جاہلیت کے حال کی مذمت ثابت ہوتی ہے۔[2] انتهى.

۴ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب بھی اللہ تعالیٰ آسمان سے کوئی برکت نازل کرتا ہے تو صبح کو کچھ لوگ کافر ہو جاتے ہیں۔ بارش اللہ نازل کرتا ہے، لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ فلاں تارے کی وجہ سے پانی برسا۔"[3]

ستاروں کی تاثیر کا عقیدہ:

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ جس شخص کا ایمان یہ ہے کہ امورِ عالم کی نقل و حرکت اور گزرگاہیں

---

[1] اس سے مراد شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمہ اللہ (۱۲۰۶ھ) کی کتاب "مسائل الجاهلية" ہے۔ علامہ محمود شکری آلوسی رحمہ اللہ (۱۳۴۳ھ) نے "مسائل الجاهلية التي خالف فيها رسول الله أهل الجاهلية" کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔ مزید برآں علامہ عبداللہ بن محمد الدویش رحمہ اللہ نے بھی "الزوائد على مسائل الجاهلية" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں دو سو گیارہ (۲۱۱) مسائل مذکور ہیں۔ علاوہ ازیں شیخ ابو حامد شنقیطی نے "نظم مسائل الجاهلية" کے نام سے اول الذکر کتاب کو دو سو سات ابیات میں منظوم بیان کیا ہے۔

[2] اقتضاء الصراط المستقيم (ص: ۲۳۵)

[3] صحيح مسلم (۱/ ۸٤)

کواکب کی تاثیر سے ہیں تو ایسا شخص اللہ کے نزدیک اللہ کا منکر اور ستارہ پرستوں میں شامل ہے۔ اس کے مقابل جس کا ایمان یہ ہے کہ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے تو وہ اللہ کا مقبول بندہ ہے۔ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مبارک اور منحوس ساعتوں پر اور سعادت ونحوست کی تاریخوں کے لحاظ واہتمام پر ایمان رکھنا اور نجومی کی بات پر یقین کرنا شرک جلی ہے۔ جس کسی نے یہ اعتقاد کیا کہ ان امور کا تعلق نجوم سے ہے تو وہ ستارہ پرستوں میں شامل ہو گیا اور وہ شخص اللہ کا منکر اور کواکب ونجوم پر ایمان لانے والا ٹھہرا اور موحدین کی جماعت سے خارج ہو گیا۔

فتح المجید میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بارش کے انزال میں کواکب وانوا کی تاثیر کا اعتقاد رکھنا شرک فی الربوبیۃ ہے اور اگر یہ اعتقاد نہیں، بلکہ کواکب کی طرف انتساب ہے تو شرک اصغر ہے، اس لیے کہ اس نے اللہ کی نعمت کو غیر اللہ کی طرف منسوب کیا ہے، حالانکہ اللہ نے نوء (نچھتر) کو نزولِ باراں کا سبب نہیں بنایا ہے، بلکہ بارش تو محض اس کے فضل سے نازل ہوتی ہے، چاہے برسائے اور چاہے تو روک دے۔ دیکھو! تارہ موجود ہوتا ہے، پھر بھی کبھی بارش کیوں نہیں ہوتی؟ ایامِ قحط میں اس کی تاثیر کہاں چلی جاتی ہے؟[1]

توحید کا معنی:

توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے افعال کو ہرگز غیر کی طرف بر سبیل مجاز بھی منسوب نہ کرے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ غیر اللہ کی طرف نعمت کی نسبت کفر ہے، اسی لیے اس نسبت کو حرام کہا ہے، اگرچہ وہ انواء وکواکب کی تاثیر کا قائل نہ ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا﴾ [النحل: ۸۳]

[یہ لوگ اللہ کی نعمت کو خوب پہچانتے ہیں، پھر اس کو نہیں مانتے ہیں]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ﴾ [الواقعة: ۷۵]

[میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے ڈوبنے کی جگہوں کی]

ان آیتوں میں علم نجوم کی تردید ہے، کیونکہ آخر میں کہا ہے:

---

[1] فتح المجيد في شرح كتاب التوحيد (ص: ۳۱۱)

﴿وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ﴾ [الواقعة: ٨٢]

[اور تم اپنا شکریہ یہ ادا کرتے ہو کہ تکذیب کرتے ہو]

حالانکہ نوء، نجم اور کوکب کا نزولِ باراں میں کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ یہ کام تو اللہ ہی کا ہے، لیکن مشرک لوگ بات نہیں سمجھتے۔

۵ صحیح بخاری میں آیا ہے کہ سیدنا قتادہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ نے تارے تین کام کے لیے بنائے ہیں۔ ایک شیاطین کو آسمان سے مار بھگانے، دوسرے آسمان کی زینت اور تیسرے راستوں کی علامت کے لیے۔ جس نے ان کی تاویل کچھ اور کی، وہ خطا کھا گیا اور اس نے اپنا نصیب ضائع کیا اور اس نے ایسی بات کے لیے تکلیف اٹھائی جس کا اسے کوئی علم نہیں ہے۔[1]

امام ربیع بن زیاد رحمہ اللہ کا قول ہے:

''اللہ نے تارے میں کسی کی حیات رکھی ہے نہ کسی کا رزق اور نہ کسی کی موت۔''[2]

یہ تارے، چوپائے اور پرندے غیب کی بات کیا جانیں؟ اگر کوئی غیب داں ہوتا تو آدم علیہ السلام ہوتے، جن کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا تھا، فرشتوں سے سجدہ کرایا تھا، آدم کو سب چیزوں کے نام سکھائے تھے۔

ابطالِ نجوم کے سلسلے میں بہت سی حدیثیں آئی ہیں، جن سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ نجوم کا سیکھنا اور منازلِ قمر کا معلوم کرنا سرے سے حرام ہے۔ سلف میں سے کسی نے قبلۂ نماز معلوم کرنے کے لیے بھی علمِ نجوم سے کام نہیں لیا۔ یہ بدعت آخر زمانے میں نکلی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پنج گانہ کے اوقات کو ایسا صاف اور واضح کرکے بیان کیا ہے کہ ہر بچہ، بوڑھا، مرد، عورت، شہری، دیہاتی اور عالم وجاہل اس کو پہچان سکتا ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی حدیث میں منجم (نجومی) کو کاہن، کاہن کو ساحر (جادوگر) اور ساحر کو کافر فرمایا ہے۔[3] (رواہ رزین)

---

[1] صحيح البخاري (بدء الخلق) باب في النجوم.

[2] مشكاة المصابيح، رقم الحديث (٤٦٠٣، ٤٦٠٤)

[3] مشكاة المصابيح (٢/ ٥٤٢) اس کی سند نا معلوم ہے، کیوں کہ یہ حدیث ''رزین'' کے حوالے سے صاحبِ مشکاۃ نے نقل کی ہے اور ''رزین'' کی کتاب تا حال غیر مطبوع اور غیر معلوم ہے۔

یعنی نجومی کافر ہے۔ بعض اہلِ علم کا قول ہے کہ نجوم کو کائنات میں متصرف جاننا اور ان سے علم غیب کا استفادہ کرنا شرک ہے۔ یہ کام کافر براہمہ اور اہلِ تاتار کیا کرتے ہیں۔ شیخ الاسلام نے کہا ہے کہ تنجیم کا معنی ہے احوالِ فلکیہ سے حوادثِ ارضیہ پر استدلال کرنا۔[1] تنجیم ایک طرح سے غیب پر زبردستی حکم لگانا ہے، جس کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے علمِ سیمیا اور خاوند کو بیوی سے خواہش پوری کرنے سے روک دینا یا میاں بیوی کے درمیان محبت یا عداوت کا عمل کرنا، کبیرہ گناہوں میں ذکر کیا ہے۔[2]

[1] الفتاوی الکبری (٥/٥٣٥) شیخ الاسلام رحمہ اللہ اس کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ سحر کی قسم سے ہے اور وہ اجماعاً حرام ہے۔

[2] كتاب الكبائر للذهبي (ص: ١٤)

فصل

عرافت، کہانت، عیافت، طرق اور طیرہ کا بیان

① سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو عراف کے پاس آیا اور اس سے کسی چیز کے متعلق پوچھا تو چالیس رات اس کی نماز قبول نہیں ہوتی۔''[1]

''عراف'' وہ آدمی ہے جو چرائی گئی یا گم شدہ چیز کی جگہ بتائے۔ یعنی یہ کہے کہ چوری کا مال فلاں مکان میں اور فلاں گم شدہ جانور یا چیز فلاں جگہ میں ہے۔ یہاں یہ بھی ملحوظ رہے کہ عراف سے کوئی بات پوچھنا تصدیق کے ساتھ ہو، بطور استہزا اور تکذیب کے لیے نہ ہو، تو پوچھنے والا اس وعید کا مصداق ہوگا۔ عراف سے پوچھنے والے کی نماز قبول نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس نے شرک کا کام کیا ہے اور شرک نیک عمل کو برباد کر دیتا ہے۔ شرعی نقطۂ نگاہ سے عراف کے لفظ میں نجومی، اہلِ رمل وجفر وفال اور کشف واستخارہ والے سب داخل ہیں جو غیب کی باتیں بتائیں۔

فتح المجید میں مذکور ہے کہ ظاہر حدیث یہ بتا رہی ہے کہ عراف کے پاس محض جانے اور پوچھنے پر وعید لازم ہوتی ہے، چاہے پوچھنے والا اس کی بات کا یقین کرے یا نہ کرے۔ جب سائل کا یہ حال تو مسئول کا خدا حافظ ہے۔

② قبیصہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''عیافت، طرق اور طیرہ شرک سے ہیں۔'' (رواہ أبو داود)[2]

یعنی شگون لینے کے لیے پرندے اڑانا، زمین پر خط کھینچنا اور پرندوں کے دائیں بائیں جانے اور گزرنے سے فال نکالنا، سب کفر وشرک کی رسمیں ہیں۔ معاویہ بن حکم رضی اللہ عنہ کی حدیث، جس کو مسلم

---

① صحیح مسلم (۱۷۵۱/٤)

② سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (۳۸۸۹)

نے روایت کیا ہے، اس بات پر دلیل ہے کہ کاہن کے پاس جانا، بدفالی لینا اور علمِ رمل سیکھنا ممنوع ہے اور شرک وکفر میں پڑنے کا گمان ہے۔[1]

کاہن ایک بات کے ساتھ سو جھوٹ ملاتا ہے، جیسا کہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: فرشتے بادل میں اتر کر آسمانی حکم کا چرچا کرتے ہیں، جسے شیاطین چوری سے سن کر کاہنوں کو بتاتے ہیں اور وہ اس میں سو جھوٹ اپنی طرف سے ملا لیتے ہیں۔ (رواه البخاري)[2]

عیافت اور طرق کا معنی:

عیافت یہ ہے کہ پرندے کو اڑا کر اس کے نام یا آواز یا گزرگاہ سے فال لینا۔ طرق کہتے ہیں کنکری پھینکنے کو یا خط رمل کھینچنے کو، یہ سب افعال شرک ہیں۔

◈ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں طیرہ یعنی فالِ بد لینے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار شرک فرمایا ہے۔ (رواه أبو داود و الترمذي وصححه)[3]

بدشگونی اور بدفالی لینا شرک ہے:

عرب کے لوگوں میں شگون لینے کا بڑا رواج اور اس پر بہت اعتقاد تھا، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی بار فرمایا کہ یہ شرک ہے، تاکہ لوگ اس عادت کو چھوڑیں۔ بدفالی اس لیے شرک قرار پائی کہ اہلِ عرب کا یہ اعتقاد تھا کہ پرندہ نفع پہنچانے والا اور نقصان دور کرنے والا ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طیرہ کو شرک کہنا کافی ہے، چاہے اور کوئی کہے یا نہ کہے۔ یہ رسمِ شرک عرب میں بہت زیادہ رائج تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو شرک فرمایا۔ یہ کام توحید کے منافی ہے۔ اگر کوئی اس کو شرک اصغر کہے تو بھی یہ قبیح ترین شرک اور جاہلیت کا عمل ہے۔ اسلام میں شرک کا کام کرنے کو جاہلیت وکفر کہا جاتا ہے۔ پرندہ ایک بے شعور جاندار ہے، اس کو کیا خبر کہ زید و عمرو کے لیے کیا ہوتا ہے کہ اس کے دائیں بائیں، اڑنے بیٹھنے یا چلنے سے کسی خیر وشر، نفع وضرر اور برکت ونحوست کا حال معلوم ہو سکے؟ ان مشرکوں کی عقل ان پرندوں سے بھی کم ہے۔

---

[1] صحيح مسلم (٤/ ١٧٤٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٢١٠)

[3] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٩٢) سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٣)

سعد بن مالک کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''نہ ہامہ ہے نہ عدوی نہ طیرہ۔''[1]

''یہ کلام نفی اور نہی دونوں معنی پر محمول ہو سکتا ہے۔ ہامہ ایک قسم کا پرندہ ہے جسے الو کہتے ہیں۔ جاہلیت میں اس سے بدشگونی لیتے تھے۔ عدوی کہتے ہیں ایک کی بیماری دوسرے کو لگنا۔ طیرہ کا معنی ہے: پرندوں سے شگون لینا۔ مطلب یہ کہ ان چیزوں میں خیر و نحوست کی کوئی خاصیت نہیں ہے، اس لیے ان سے شگون اور فال نہ لیا کرو۔

حکایت:

''عکرمہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ہم عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک پرندہ آواز کرتا ہوا گزرا۔ ایک شخص نے کہا: ''خیر خیر'' عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا: خیر ہے نہ شر۔ طاؤس ایک دوست کے ساتھ سفر کے لیے نکلے تو ایک کوا بولا، ان کے ساتھی نے کہا: خیر ہو۔ طاؤس نے کہا: اس کے پاس کیا خیر ہے؟ تم جاؤ! میرے ساتھ نہ چلو۔''[2]

طیرہ کہاں ہو سکتی ہے؟

سعد بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''اگر طیرہ (بدشگونی) ہوتی تو گھر، گھوڑے اور عورت میں ہوتی۔'' (رواه أبو داود)[3]

یہ فرمان فرض محال کے طور پر ہے، اثبات کے لیے نہیں۔ بعض لوگوں نے اس حدیث کو ظاہر پر حمل کر کے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ گھوڑے کی بدشگونی یہ ہے کہ اس پر اللہ کے راستے میں جہاد نہ کیا جائے یا گھوڑا منہ زور اور گراں قیمت ہو۔ گھر کی نحوست یہ ہے کہ گھر تنگ ہو یا ہمسائے برے ہوں اور عورت کی نحوست یہ ہے کہ بچہ نہ جنے، زبان دراز اور شکی مزاج ہو۔ غرض کہ ان تینوں میں شوم و نحوست مراد نہیں ہے جس پر وعید بیان کی گئی ہے، جیسا کہ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ یہود کو ہلاک کرے، جو کہتے ہیں کہ نحوست تین چیزوں میں ہوتی ہے۔''[4]

دوسری حدیث میں ہے کہ اہلِ جاہلیت ان تینوں چیزوں سے فال بد لیتے تھے۔[5]

---

1. سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٢)
2. مفتاح دار السعادة لابن القيم (٢/ ٢٣٤۔ ٢٣٥)
3. مصدر سابق
4. أبو داود طيالسي (١٥٣٧)
5. مسند أحمد (٦/ ١٥٠، ٢٤٠)

ہامہ اور عدویٰ کا معنی:

حدیث میں ہامہ اور عدوی وغیرہ کے جو الفاظ آئے ہیں، ان کی تشریح یہ ہے کہ ہامہ الو پرندے کو کہتے ہیں۔ اہلِ عرب جاہلیت میں یہ اعتقاد تھا کہ جب مردے کی ہڈیاں گل سڑ کر خاک ہو جاتی ہیں تو وہ الو کے روپ میں قبر سے نکل کر قبر کا حال سناتی ہیں، اسی لیے کسی گھر پر الو کا بیٹھنا منحوس خیال کرتے اور اس سے خانہ ویرانی کی فال لیتے ہیں۔ یہ بالکل خرافات اور واہیات باتیں ہیں۔ جو کوئی یہ کہے کہ آدمی مر سڑ کر کسی جانور کی صورت میں آتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔

"تقوية الإيمان" میں مذکور ہے کہ عرب کے جاہلوں میں مشہور تھا کہ جو کوئی مارا جائے اور اس کا بدلہ نہ لیا جائے تو اس کے سر کی کھوپڑی سے ایک الو نکل کر فریاد کرتا پھرتا ہے، اس کو ہامہ کہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات غلط ہے۔[1]

بیماری کا متعدی ہونا:

اسی طرح اہلِ عرب کا یہ اعتقاد تھا کہ بعض امراض جیسے چیچک، خارش اور جذام وغیرہ متعدی ہو کر دوسرے کو لگ جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ یہ غلط اور وہم ہے۔ عدوی (ایک کی بیماری دوسرے کو لگنا) کی کوئی اصل نہیں ہے۔ یہ سب اوہام اور رسومِ کفر ہیں۔ سیدنا جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جذامی شخص کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ رکابی میں رکھ دیا اور فرمایا:

«كُلْ ثِقَةً بِاللّٰهِ وَتَوَكُّلًا عَلَى اللّٰهِ» (رواه ابن ماجه)[2]

یعنی ہم کو اللہ پر بھروسا ہے، وہ جس کو چاہے بیمار کر دے، جس کو چاہے تندرست رکھے۔ ہم کسی بیمار کے ساتھ کھانے سے پرہیز نہیں کرتے اور بیماری کا سرایت کرنا نہیں مانتے۔ آب وہوا کی ناموافقت کے سبب سے نقل مکانی کرنا یا دفع توہم کے لیے بیمار سے اختلاط نہ رکھنا یا شریر گھوڑے کو بدل ڈالنا یا بدزبان عورت کو چھوڑ دینا اور بات ہے، اسی لیے نیک فال لینا جائز ہے اور بد فال لینا شرک ہے، کیونکہ نیک فال میں اللہ سے خیر کی امید ہوتی ہے اور بد فال میں اللہ کے ساتھ بدگمانی کا خطرہ ہے۔

---

[1] تقوية الإيمان (ص: ٦٦) ادارہ علم القرآن، لاہور۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٢٥) سنن الترمذي (١٨١٧) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٤٢) اس کی سند میں "مفضل بن فضالہ" راوی ضعیف ہے۔

حدیث کی وضاحت:

حدیثِ عدویٰ اور مجذوم وغیرہ سے فرار کی حدیث کے بارے میں امام شوکانی رحمہ اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عام کو خاص پر حمل کرنا چاہیے، یعنی مجذوم سے بھاگنے اور بچنے کے بارے میں جو حدیثیں آئی ہیں، ان میں اور حدیثِ عدویٰ میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ وہ احادیث حدیثِ عدوی کے عموم کی مخصص ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ عدویٰ صرف ان ہی امور میں ہے، اسی طرح شوم صرف ان تین چیزوں میں ہے۔ تقویۃ الایمان کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اس سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں کبھی نا مبارک بھی ہوتی ہیں، مگر اس کے معلوم کرنے کی راہ نہیں بتائی کہ کس طرح معلوم کیا جائے کہ یہ مبارک ہے اور وہ نا مبارک۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو مکان شیر کی شکل وصورت کا ہو اور جو گھوڑا ستارہ پیشانی ہو اور جو عورت گنجی ہو تو نا مبارک ہوتی ہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ان باتوں کا خیال نہ کریں۔ جب نیا مکان لیں یا گھوڑا ہاتھ لگے یا بیاہ کریں یا لونڈی خریدیں تو اللہ سے اس کی بھلائی مانگیں اور اس کی برائی سے پناہ چاہیں۔ باقی اور چیزوں میں اس قسم کے خیالات نہ دوڑائیں کہ فلاں کام مجھے راست آیا اور فلاں نہ آیا۔''[1]

سیدنا ابن عمرو رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ جس کو بد فال نے اس کے کام سے پھیر دیا، اس نے شرک کیا۔[2] فال بد سے بچنے کا کفارہ یہ ہے کہ یوں کہے:

«اَللّٰهُمَّ لَا خَيْرَ إِلَّا خَيْرُكَ وَلَا طَيْرَ إِلَّا طَيْرُكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ» (رواه الطبراني)[3]

[اے اللہ تیرے خیر کے سوا کوئی خیر نہیں، تیری فال کے سوا کوئی فال نہیں اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے]

جو شخص اللہ پر توکل کرتا ہے اس کو فال بد ضرر نہیں پہنچاتی ہے۔ اس شرک کا ضرر اسی کو ہوتا ہے جو فالِ بد لیتا ہے۔

---

[1] تقوية الإيمان (ص: ٦٧)

[2] مسند أحمد (٢/ ٢٢٠)

[3] مصدر سابق

صفر کی نحوست:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں عدوی اور طیرۃ کے ساتھ صفر کا ذکر بھی آیا ہے۔ (رواہ البخاري)[1]

صفر سے مراد سانپ ہے۔ اہلِ عرب کا گمان یہ تھا کہ جب آدمی بھوکا رہتا ہے اور کھانے سے پیٹ نہیں بھرتا تو اس کے پیٹ میں ایک سانپ پیدا ہو کر اس کو ستاتا ہے اور وہ متعدی ہو جاتا ہے۔ یا اس سے مراد تاخیر ہے، یعنی ماہِ صفر کو محرم کا مہینا قرار دینا۔ یہ بھی جاہلیت کا فعل تھا۔ وہ کہتے تھے کہ یہ مہینا منحوس ہے۔ عرب کے جاہلوں میں یہ مشہور تھا کہ مرض جوع الکلب، جس میں آدمی خوب کھاتا ہے مگر شکم سیر نہیں ہوتا، میں کوئی شیطان یا بھوت جیسی بلا انسان کے پیٹ میں گھس جاتی ہے اور وہی کھاتی چلی جاتی ہے، اسی کا نام صفر ہے۔ غرض کہ جو بھی ہو، رسول اللہ ﷺ نے اس بد فالی سے منع فرمایا ہے۔

اسی طرح یہ اعتقاد رکھنا کہ ماہ صفر کے تیرہ دن منحوس ہیں اور اسی پر ان دنوں کا نام تیرہ تیزی ہے، یا فلاں ماہ یا فلاں تاریخ یا دن یا ساعت منحوس ہے اور اس میں آفت یا بلا نازل ہوتی ہے، یہ سب کھلا ہوا شرک ہے۔ جو کوئی ان چیزوں کا معتقد ہے، وہ مشرک باللہ ہے۔

غول کی نفی:

حدیث میں غول (بھوت پریت) کی بھی نفی فرمائی ہے، لیکن غول کی ذات اور وجود کی نفی مراد نہیں ہے، بلکہ غول کے تصرف کے خیال و وہم کی نفی مراد ہے، یعنی جس کا اللہ پر توکل ہوتا ہے اور وہ اللہ کا ذاکر رہتا ہے، غول اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔ غول کہتے ہیں جو صحرا و بیابان میں جن وشیاطین مختلف صورتوں اور بھیسوں میں لوگوں کے سامنے آ کر انھیں ڈراتے بہکاتے ہیں۔ ان کا کام تلبیس و تخییل ہے۔

اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے ہاں سفارشی بنانا:

اللہ پاک کو اس کی مخلوقات میں سے کسی کے پاس سفارشی بنانا شرک ہے، چنانچہ جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ایک اعرابی نے کہا: اے رسول اللہ ﷺ! ہمارے لیے پانی مانگیں، ہم آپ کو اللہ پر اور اللہ کو آپ پر سفارشی قرار دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: سبحان اللہ! دیر تک یوں ہی فرماتے رہے، پھر کہا:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٧٠٧)

«وَيْحَكَ إِنَّهُ لَا يُسْتَشْفَعُ بِاللّٰهِ عَلَى أَحَدٍ» (رواه أبو داود)①

[تجھ پر افسوس! تو اتنا نہیں جانتا کہ اللہ کو کسی کے پاس سفارشی بنا کر نہیں لے جاتے ہیں]

سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ ایک اعرابی کی بات سن کر اس قدر ڈر گئے اور ہمارے ہاں جاہلوں کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے رب کو ایک پیسے میں خرید لیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ میں اللہ سے دو برس بڑا ہوں۔ کوئی کہتا ہے کہ اگر میرا رب میرے شیخ کے سوا کسی اور کی صورت میں تجلی کرے گا تو میں اس کی طرف نظر بھی نہیں کروں گا۔ کوئی کہتا ہے کہ میں محبتِ رسول میں اللہ کا رقیب ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ اللہ کے ساتھ دیوانہ بنو اور محمد ﷺ کے ساتھ ہوشیار رہو۔ کسی نے حقیقتِ محمدیہ کو حقیقتِ الوہیت پر فضیلت دے دی ہے، جس طرح بعض لوگ ولایت کو نبوت سے افضل بتاتے ہیں۔ یہ سارے کلمات والفاظ واضح کفر وضلالت، خالص شرک والحاد اور حقیقی زندیقیت ہیں۔ عياذاً بالله.

''یا شیخ عبد القادر شیئا للہ'' کے الفاظ:

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں میں ختم کے نام سے جو بات مشہور ہے جس میں یہ لوگ کہتے ہیں: ''يا شيخ عبد القادر شيئاً لله'' یہ ہرگز درست نہیں ہے، کیونکہ اس لفظ میں اللہ کو شفیع بنا کر شیخ کے سامنے لایا جاتا ہے۔ مانا کہ شیخ عبد القادر کبیر الاولیاء ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ ہر کبیر سے اکبر ہے۔ بعض فقہا کے نزدیک یوں کہنا: ''يا الله أعطني شيئا كذا وكذا للشيخ عبد القادر'' جائز ہے، لیکن یہ توسل بھی بے ضرورت اور ناروا ہے، کیونکہ اگر اس قسم کا توسل ہر سوال میں جائز ہوتا تو صحابہ وتابعین جناب سید المرسلین شفیع المذنبین رحمۃ للعالمین ﷺ سے کیا کرتے، مگر سلف سے یہ طریقہ ماثور ومنقول نہیں ہے۔ اگر منقول ہو بھی تو اہلِ علم وشرع کے نزدیک اس کا اعتبار نہیں ہے، کیونکہ قضایا عین اور واقعات اتفاقیہ ایسے عام احکام میں لائقِ استناد والتفات نہیں ہوا کرتے، خصوصاً اس صورت میں کہ ان آثار واخبار کی اسانید ضعیف یا منکر یا موضوع ہوں اور ان کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ سے دعا وسوال، استعانت واستمداد، استغاثہ والتجا اور تضرع کے بارے میں احادیث صحیحہ مرفوعہ اور آیات قرآنیہ موجود ہوں۔

بہر حال جس حرف، اسم اور فعل سے اللہ جل جلالہ کے ساتھ شرک یا بے ادبی کی بد بو ظاہر ہو،

---

① سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٧٢٦) اس کی سند میں ''جبیر بن محمد بن جبیر'' راوی ضعیف ہے۔

ہرگز اس کو بول کر اپنا منہ اور زبان ناپاک نہ کریں۔ اللہ کی شان تمام شانوں سے عظیم اور اس کی ذات تمام اغنیا سے زیادہ غنی ہے۔ وہ تمام بادشاہوں کا سب سے بڑا بادشاہ ہے، اس کے سوا کوئی شہنشاہ ہے اور نہ حاکم و مالک۔ وہ جس طرح ایک ذرہ نیکی پر قصور معاف کر دیتا ہے، اسی طرح ذرا سی بات پر سخت گرفت کر لیتا ہے۔ نکتہ گیری اور نکتہ نوازی اس کا کام اور غفار و قہار اس کا نام ہے۔

شانِ الٰہی میں استہزا:

اگر کوئی اللہ کی شان میں اپنی بے تکی باتوں سے متعلق یہ کہے کہ ان الفاظ سے میری مراد کچھ اور ہے، ظاہری معنی مقصود نہیں تو یہ بھی اس کی خطاے فاحش ہے۔ کیا پہیلی اور چیستاں بولنے کے لیے یہی جگہ تھی؟ اسے اور کوئی جگہ نہیں ملی؟ ہنسی، ٹھٹھا اور دل لگی برابر والے سے یا اپنے سے کم رتبے والے سے کیا کرتے ہیں نہ کہ ماں باپ، بادشاہ اور امیر و حاکم سے، پھر اللہ کا رتبہ سب سے بڑا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلٰى﴾ [اور اللہ کی شان سب سے اونچی ہے]

شفاعت:

البتہ دنیوی امور میں مخلوق سے سفارش کرانا، جس پر اسے قدرت حاصل ہو، جائز ہے۔ اس پر تمام امت کا اتفاق ہے۔ احادیث متواترہ سے یہ بات ثابت ہے کہ ہمارے رسول مقبول ﷺ شافع و مشفع ہوں گے۔ قیامت کے دن خلائق کی شفاعت کریں گے، لوگ ان سے طالبِ شفاعت ہوں گے۔ یہ شفاعت اس لیے ہوگی کہ گناہ گاروں کے گناہ معاف ہوں اور فرماں برداروں کو ثواب زیادہ ملے۔ اس شفاعت کا انکار کسی نے نہیں کیا ہے۔ جو اس کی نفی کرے تو وہ یا جاہل بے علم ہے یا احادیثِ متواترہ کا منکر ہے، لیکن اتنی بات ہے کہ یہ شفاعت خود بہ خود نہ ہوگی، بلکہ اللہ کی اجازت و حکم سے ہوگی، قرآن و حدیث میں ایسا ہی آیا ہے اور اس کا منکر قرآن و حدیث کا منکر ہے۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت ان لوگوں کے لیے نہ ہوگی جنھوں نے اعتقادی یا عملی طور پر کسی طرح کا شرکِ اکبر یا اصغر اور شرکِ جلی یا خفی کیا ہے، کیونکہ نص قرآن نے شرک کو تمام کبائر و صغائر اور ہر قسم کے گناہوں سے مستثنا کر دیا ہے۔ یہ شفاعت خاص ان لوگوں کے لیے ہوگی جن کی زندگی و موت خالص توحید پر ہوئی اور صحیح ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا۔ رہا قبر پرستوں، پیر پرستوں اور غیر اللہ پرستوں کا یہ خیال کہ ان کے پیر و مرشد شفاعت کر کے انھیں بخشوا دیں گے تو یہ محض خیال

باطل اور گمان فاسد ہے۔ جب پیغمبر کا حال یہ ہے کہ وہ اللہ کی اجازت وحکم کے بغیر شفاعت نہ کر سکیں گے اور اجازت کے بعد صرف ان اہلِ توحید کی شفاعت کریں گے جو مرتکبِ کبائر ہیں تو وہاں پیر، ولی، شہید اور جن پری کس شمار میں ہوں گے؟ جو ان مشرکوں کی شفاعت کریں، جنھوں نے اپنی ساری عمر اولیا یا دشمنانِ خدا کو متصرف سمجھ کر ان کی خدمت ونذر و نیاز میں برباد کی ہے؟ لا حول ولا قوة إلا باللّٰه العلي العظيم .

استغاثہ واستعانت:

اس جگہ کئی الفاظ ہیں۔ ایک استغاثہ (فریاد رسی) ہے۔ یعنی کسی کو اپنی مدد کے لیے بلانا کہ ہمارا یہ کام کر دو یا ہماری اس تکلیف کے ازالے میں شریک حال ہو جاؤ۔ امورِ دنیا میں مخلوق سے اس طرح کی فریاد رسی چاہنا بلا اختلاف جائز ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی کسی کا کچھ کام کر دے، پتھر ڈھو دے یا کسی دشمن کے بیچ میں حائل ہو جائے یا کسی درندہ جانور کو یا چور اچکے کو دفع کرے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَاسْتَغَاثَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيْعَتِهٖ عَلَى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهٖ﴾ [القصص: ١٥]

[پھر جو شخص موسیٰ کی قوم کا تھا، اس نے اس شخص کے مقابلے پر، جو اس کے دشمن گروہ سے تھا، موسیٰ سے فریاد چاہی]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَ اِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ﴾ [الأنفال: ٧٢]

[اور اگر وہ تم سے دین میں مدد چاہیں تو تم پر مدد کرنا واجب ہے]

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَ تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَ التَّقْوٰى﴾ [المائدة: ٢]

[نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو]

رہا وہ کام جس پر اللہ کے سوا کسی کو قدرت حاصل نہیں ہے، جیسے مریض کو شفا دینا، بارش برسانا، گناہ بخشنا اور رزق میں کشادگی ہونا وغیرہ تو اس قسم کے کاموں میں اللہ کے سوا کسی سے فریاد نہیں کرنی چاہیے۔ اہلِ علم نے کہا ہے کہ ہر مکلّف بندے پر واجب ہے کہ یہ بات جان رکھے کہ اللہ

کے سوا نہ کوئی غیاث (فریادرس) ہے نہ مستغاث (جس سے فریاد چاہیں) اور نہ غوث (مددگار) بلکہ علی الاطلاق اور بے روک ٹوک ہر طرح کی فریاد رسی اللہ ہی کرتا ہے، کیونکہ غیاث و مغیث اللہ وحدہ لا شریک لہ ہے، اسی کو "غیاث المستغیثین" (فریاد طلب کرنے والوں کی فریاد رسی کرنے والا) کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں غوث اعظم اور مشکل کشا اللہ ہی ہے نہ کہ شیخ عبدالقادر نہ علی مرتضی نہ اور کوئی۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ﴾ [الأنفال: ۹]

[جس وقت تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے تو اس نے تمھاری فریاد سنی]

صحیحین میں آیا ہے: «اَللّٰهُمَّ أَغِثْنَا»[1] [اے اللہ! ہماری فریاد رسی کر یا ہم پر بارش نازل فرما]

ابو یزید بسطامی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ مخلوق کا مخلوق سے استغاثہ کرنا ایسا ہے جیسے ایک ڈوبنے والے کا دوسرے ڈوبنے والے سے یا کسی قیدی کا دوسرے قیدی سے استغاثہ اور فریاد کرنا۔

دوسرا لفظ استعانت (مدد مانگنا) ہے۔ اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مخلوق سے ان دنیوی امور میں مدد لینا جن پر اس کو قدرت حاصل ہے، یہ بلا اختلاف جائز ہے، جیسے سواری پر سامان بار کرا دینا، جانور کو چارہ کھلانا، کسی کا سلام و پیغام پہنچا دینا، کسی کا کپڑا سی دینا، کھانا پکا دینا، گھر بنا دینا، اسی طرح سارے تمدنی امور اس میں داخل ہیں۔ رہے وہ امور جن پر اللہ کے سوا کسی مخلوق کو قدرت حاصل نہیں ہے تو ان میں اللہ کے سوا کسی سے مدد مانگنا بالکل جائز نہیں ہے۔ ﴿إِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کے یہی معنی ہیں۔ جیسے کسی زندے یا مردے سے بیٹا مانگنا، رزق مانگنا، مصیبت اور بلا کا ازالہ چاہنا وغیرہ؛ یہ سب شرک ہے۔

حکایت:

ایک بادشاہ نے جہاد کے وقت کہا: "یا خالد بن الولید!" پھر دشمن کی فوج پر حملہ کرنا چاہا۔ وہاں شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی موجود تھے، کہا: تم یہ کیا کہتے ہو؟ اللہ سے مدد مانگو اور یوں کہو: ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ [ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے] اس بادشاہ نے یہی کہا اور اللہ تعالیٰ نے فتح یاب کر دیا۔ ولله الحمد.

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٤)

توسل:

تیسرا لفظ توسل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی مقصد کے لیے کسی مخلوق کو اللہ کی طرف وسیلہ بنانا۔ شیخ عز الدین بن عبد السلام نے کہا ہے کہ یہ توسل الی اللہ جائز نہیں ہے مگر صرف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ، بشرطیکہ وہ حدیث درجہ صحت کو پہنچ جائے۔ اس سے مراد وہ حدیث ہے جسے امام ترمذی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔ اس میں یہ لفظ وارد ہوا ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ وَأَتَوَجَّهُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ"[1]

[اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں تیرے نبی محمد ﷺ کے ساتھ]

لیکن اس حدیث کے معنی میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ توسل ہے جو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ نے استسقا میں کیا تھا، چنانچہ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"إِنَّ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رضی اللہ عنہ كَانَ إِذَا قُحِطُوْا اِسْتَسْقٰى بِالْعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ فَقَالَ: اَللّٰهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا ﷺ فَتَسْقِيْنَا، وَ إِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا"[2]

[جب لوگوں پر قحط واقع ہوتا تو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ استسقا کرتے اور یوں دعا کرتے: اے اللہ! ہم اپنے نبی ﷺ کے ذریعے تیرا تقرب چاہتے تھے تو تو ہم کو بارش سے سیراب کرتا تھا، اب ہم اپنے نبی کے چچا کے ساتھ تیرا تقرب چاہتے ہیں، پس تو ہم کو سیراب کر دے]

اس توسل کا مطلب اسی قدر تھا کہ ہم بھی دعا کرتے ہیں اور آپ بھی دعا کریں، گویا رسول اللہ ﷺ داعی اور سفارشی کے قائم مقام تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے توسل آپ کی حیات میں اور وفات کے بعد کیا جائے۔ زمانہ حیات میں آپ سے توسل کرنا تو خود ہی ظاہر ہے۔ رہا آپ کی ممات کے بعد تو صحابہ کرام کے اجماع سکوتی سے کسی زندہ شخص سے توسل کرنا ثابت ہے، اس لیے کسی نے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ پر انکار

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٣٥٧٨) سنن ابن ماجه (١/ ٤٤١)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٠١٠، ٣٧١٠)

نہیں کیا تھا، جس وقت انھوں نے عباس رضی اللہ عنہ سے توسل کیا۔

شیخ عز الدین نے اپنے قول میں جواز توسل کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کیا ہے، لیکن یہ تخصیص دو وجہوں سے بلاوجہ معلوم ہوتی ہے۔ ایک تو اجماعِ صحابہ ہے جو خصوصیت کی نفی کرتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہلِ علم وفضل سے توسل الی اللہ درحقیقت ان کے اعمالِ صالحہ اور مزایا فاضلہ سے توسل ہے، کیونکہ فاضل جب ہی فاضل سمجھا جاتا ہے کہ اس کے اعمال بھی فاضلہ ہوں۔ جب کوئی یوں کہے گا: "اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِالْعَالِمِ الْفَلَانِيِّ" تو اس کا یہ کہنا اس کے علم کے اعتبار سے ہوگا۔ صحیحین میں ان تین افراد کا واقعہ بیان ہوا ہے، جن پر ایک پتھر نے نکلنے کا راستہ مسدود کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر شخص نے اپنے عظیم عمل صالح سے توسل کیا جس سے اللہ کے اذن سے وہ پتھر سرک گیا۔[1] پس اگر اعمالِ فاضلہ سے توسل کرنا ناجائز وشرک ہوتا، جس طرح ابن عبد السلام اور ان کے اَتباع نے گمان کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہرگز ان کی دعا قبول نہ کرتا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے فعل پر سکوت فرماتے، بلکہ حکایتِ حال کے بعد انکار فرماتے۔

جو لوگ انبیا وصلحا سے توسل الی اللہ کے منکر ہیں وہ آیت: ﴿مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى﴾ [الزمر: ۳] [ہم دوسروں کی پوجا اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے نزدیک کر دیں] اور آیت ﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾ [الجن: ۱۸] [اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو] وغیرہ آیات سے استدلال کرتے ہیں، لیکن یہ استدلال بے محل ہے، بلکہ محلِ نزاع سے غیر متعلق ہے، کیونکہ نبی، ولی یا عالم سے توسل کرنے والا اس بات کا معتقد نہیں ہے کہ وہ نبی یا ولی کسی امر میں اللہ کا ساجھی ہے۔ اگر کوئی کسی پیغمبر یا غیر پیغمبر کے ساتھ ایسا اعتقاد رکھے گا تو وہ بے شک کھلا گمراہ ہوگا۔ حاصل کلام یہ کہ زندہ صلحا سے توسل جائز ہے، چاہے انبیا ہوں یا اولیا یا علما۔ یہ توسل ان کے علم وعمل اور فضل کی بنا پر ہے، اس میں شرک کی بات نہیں ہے اور نہ اللہ کو کسی مخلوق کے پاس سفارشی بنانے کی کوئی چیز ہے کہ اسے شرک سمجھا جائے، چنانچہ بعض ادعیہ نبویہ میں آیا ہے:

«اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْأَلُكَ بِحَقِّ السَّائِلِيْنَ عَلَيْكَ»[2] (اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تجھ پر سوال کرنے والوں کے حق کے واسطے سے) اس حدیث کی صحت میں کلام ہے۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۲۰۲) صحيح مسلم، رقم الحديث (۲۷۴۳)

[2] مسند أحمد (۳/ ۲۱) سنن ابن ماجه (۱/ ۲۵۶) اس کی سند میں "عطیہ عوفی" ضعیف ہے۔

اس باب میں میرے نزدیک صحیح ترین قول یہ ہے کہ اس توسل کو خاص حالت و وقت پر محدود رکھیں، اس میں قیاس سے کام نہ لیں، کیونکہ شرک کے چور دروازے بہت باریک ہیں۔ سلف کو اس توسل کے جواز کا علم رہا بھی ہو تو بالعموم وہ اس کو ہر وقت عمل میں نہیں لاتے تھے۔ سب سے بہتر توسل یہ ہے کہ کثرت سے درود شریف پڑھا کریں، اس سے دین و دنیا کی سب مہمات و مشکلات آسان ہو جائیں گی اور کسی طرح کا دھوکا نہ رہے گا، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِذاً تُكْفَى هَمُّكَ وَيُغْفَرُ ذَنْبُكَ»[1]

[اس وقت درود شریف تمھارے غم و فکر میں کفایت کرے گا اور تمھارا گناہ بخش دیا جائے گا]

بعض اہلِ تجربہ نے کہا ہے: "بها وجدنا ما وجدنا" (ہمیں جو کچھ ملا ہے اسی درود شریف کی برکت سے ملا ہے) واللہ أعلم.

شرک في التسمية:

ایسے نام رکھنا جو غیر اللہ کی طرف منسوب ہوں یا بڑائی کو مستلزم ہوں، شرک ہے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بہت ہی قبیح اور برا نام "ملك الأملاك" (شاہنشاہ) ہے۔[2] مسلم شریف میں «أَغْيَظُ أَسْمَاءٍ: مَلِكُ الْأَمْلَاكِ» [ناموں میں سب سے زیادہ لائق غضب نام شاہنشاہ ہے] کا لفظ آیا ہے۔[3] دوسری روایت میں «أَخْنَعُ وَأَخْبَثُ» کا لفظ وارد ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جس کا نام شاہِ شاہاں ہے، اللہ کے نزدیک سب مخلوق سے زیادہ مبغوض، حقیر، خبیث اور قبیح ہے۔ اسی حکم میں ہر وہ لقب اور نام داخل ہے جس میں یہ معنی پایا جاتا ہو، جیسے ہندی میں مہاراج، فارسی میں صاحبِ عالم، شاہ جہاں، شاہ عالم، جہانگیر، عالم گیر، رفیع الشان، رفیع الدرجات وغیرہ۔ رسول اللہ ﷺ نے چند مرد و زن کے نام جو اس سے کم تر درجے میں تھے، بدل دیے تھے، چنانچہ ایک صحابیہ جن کا نام "برہ" تھا، آپ ﷺ نے اس کو بدل کر "زینب" نام رکھ دیا اور فرمایا: «وَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ»[4] [اپنی پاکیزگی مت جتلاؤ]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٥٧٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٢٠٥)

[3] صحيح مسلم (٣/ ١٦٨٨)

[4] صحيح مسلم (٣/ ١٦٨٨)

اس سے معلوم ہوا کہ جس نام سے نام والے کی پاکیزگی ظاہر ہو، وہ بھی اس نہی میں داخل ہے، جیسے فخر الدین، قطب الدین، سلطان الاولیاء، قطب العرفاء، غوث اعظم وغیرہ۔ اسی طرح بادشاہوں کے جو القاب ان کی موت کے بعد مقرر کیے جاتے ہیں، وہ بھی ممنوع ہیں، جیسے خلد آشیانی، فردوس مکانی، عرش آشیانی وغیرہ، کیونکہ عاقبت کا حال مالک ذو الجلال کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔ اس قسم کے ناموں میں کوئی فال ہے نہ دعا ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ ان کے فسق و فجور کا حال معلوم ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ جب میت پر نوحہ کرنے والا میت کے اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے یوں کہتا ہے: "وا سیداہ وا جبلاہ" (ہائے سردار! ہائے پہاڑ!) تو فرشتے قبر میں اس سے کہتے ہیں کہ کیا تو ایسا ہی تھا؟[1] اس بنیاد پر کسی کو ایسے القاب سے یاد کرنا بالکل ناجائز ہے۔ واللہ أعلم.

شرکیہ نام رکھنا:

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا علیہما السلام کا قصہ بیان کیا ہے کہ جب حوا کو حمل ہوا تو انھوں نے یہ دعا کی کہ اگر بچہ اچھا ہوگا تو ہم شکر بجا لائیں گے، لیکن جب بچہ پیدا ہوا تو انھوں نے شرک کیا۔[2] یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ بنی آدم کا حال یہی ہے کہ جب اولاد کی امید ہوتی ہے تو اللہ کو پکارتے ہیں اور شکر کا وعدہ کرتے ہیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ اولاد دیتا ہے تو اوروں کو ماننے لگتے ہیں اور ان کی نذر و نیاز کرتے ہیں۔ کوئی بچے کو کسی کی قبر پر لے جاتا ہے، کوئی کسی کے تھان پر پہنچتا ہے، کوئی کسی کی چوٹی رکھتا ہے، کوئی کسی کی بدھی پہناتا ہے، کوئی کسی کی بیڑی ڈالتا ہے، کوئی کسی کا فقیر بناتا ہے، کوئی امام بخش، پیر بخش، سیتلا بخش، گنگا بخش نام رکھتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ ان کی نذر و نیاز کی پروا نہیں رکھتا، وہ بہت بڑا بے نیاز ہے، یہ لوگ خود ہی مردود و مشرک ہو جاتے ہیں۔

برے نام کو بدل دینا:

رسول اللہ ﷺ ہر قبیح اور برے نام کو اچھے نام سے بدل دیا کرتے تھے، چنانچہ ایک لڑکی کا نام

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (۱۰۰۸) سنن ابن ماجه (۱/ ۷۰۸)

[2] سورة الأعراف (۱۸۹) اس آیت کریمہ میں آدم و حوا علیہما السلام کے نام کی صراحت نہیں ہے کہ انھوں نے بچہ پیدا ہونے پر شرک کا ارتکاب کیا، البتہ ایک حدیث میں یہ بات مروی ہے، لیکن وہ حدیث ضعیف ہے۔ دیکھیں: تفسير ابن كثير (سورة الأعراف: ۱۹۰) تحقيق مسند أحمد بن حنبل (۳۳/ ۳۰۵)

''عاصیہ'' تھا، آپ ﷺ نے اس کو بدل کر ''جمیلہ'' نام رکھ دیا۔[1] اسی طرح ایک صحابی کا نام ''حزن'' تھا، آپ نے ان کا نام ''سہل'' رکھ دیا تھا۔[2] اس طرح کے کئی واقعات حدیثوں میں مذکور ہیں۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو بہت محبوب اور پیارے نام عبد اللہ اور عبد الرحمٰن ہیں۔[3]

عام مسلمانوں نے نام رکھنے میں یہاں تک نوبت پہنچائی ہے کہ صریح شرک کرنے لگے ہیں، جیسے عبد فلاں، غلام فلاں نام رکھنے لگے اور پیر بخش، سالار بخش، مدار بخش کہنے لگے۔ ان ناموں کے شرک ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ غلام کے معنی اگرچہ فرزند کے آتے ہیں، مگر عرف عام میں یہ عبد (بندہ) کے معنی میں مستعمل ہوتا ہے، اس بنا پر ''غلام فلاں'' نام کو شرک کہا جاتا ہے، ورنہ حقیقی معنی کے اعتبار سے اس میں کوئی شرک نہیں ہے، لیکن جس نام میں شرک کا شبہہ ہو، اگرچہ اصطلاحِ عوام میں رائج ہو، ایسا نام رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ محلِ تہمت سے بچنا بھی ایک شرعی حکم ہے، جیسے سلیمان جاہ وغیرہ، اس قسم کے القاب بدعت کی قسم سے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم انبیا کے نام پر نام رکھا کرو۔[4] آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ تم منافق کو سید نہ کہو، اللہ اس پر خفا ہوتا ہے۔[5] اسی طرح کسی چیز کا ایسا نام رکھنا جو اس کی تعریف وتزکیہ کو متضمن ہو، منع ہے، چنانچہ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے انگور کا نام ''کرم'' رکھنے سے منع فرمایا ہے،[6] اسی طرح کنیت کے لیے بھی ایسے الفاظ استعمال نہ کریں جو تزکیہ وتعظیم پر دلالت کرتے ہیں، جیسے ابو الحکم وغیرہ۔

مشیت میں شرک کرنا:

یہ کہنا کہ ''ما شاء اللہ وشاء محمد ﷺ'' ممنوع ہے، بلکہ صرف ''ما شاء اللہ'' کہنا چاہیے۔[7] کیونکہ پہلے قول میں شرک کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور سارے

---

[1] صحيح مسلم (٣/ ١٦٨٦)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٩٠)

[3] سنن أبي داؤد، رقم الحديث (٤٩٢٩)

[4] سنن أبي داؤد، رقم الحديث (٤٩٢٩)

[5] سنن أبي داؤد، رقم الحديث (٤٩٥٦)

[6] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٨٢)

[7] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢١١٨) مسند أحمد (٥/ ٧٢)

انسانوں کی مشیت اللہ کی مشیت کے تابع ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [التكوير: ٢٩]

[اور تم چاہ نہیں سکتے جب تک اللہ نہ چاہے جو سارے جہان کا مالک ہے]

مقصد یہ ہے کہ اللہ کی جو شان ہے اس میں کسی مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لیے مخلوق میں کوئی کتنا ہی بڑا اور کیسا ہی مقرب ہو، اس کو اللہ کے ساتھ کسی حیثیت سے بھی شامل کرنا ہرگز درست نہیں ہے، یہاں تک کہ یہ کہنا کہ اللہ اور رسول چاہیں گے تو فلاں کام ہو جائے گا، اس میں بھی شرک کا خطرہ ہے، کیونکہ دنیا کا سارا کاروبار صرف اللہ ہی کے چاہنے سے ہوتا ہے، رسول کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح کوئی شخص کسی سے کہے کہ فلاں شخص کے دل میں کیا ہے؟ یا فلاں کی شادی کب ہوگی؟ یا فلاں درخت میں کتنے پتے ہیں؟ یا آسمان میں کتنے تارے ہیں؟ تو اس کے جواب میں یہ نہ کہے کہ اللہ ورسول ہی جانیں، کیونکہ غیب کی بات صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ البتہ دین کی کسی بات میں یہ کہنا کہ اللہ ورسول ہی جانیں یا فلاں بات میں اللہ ورسول کا حکم یہ ہے، درست ہے، کیونکہ دین کی تمام باتیں اللہ نے اپنے رسول کو بتا دی ہیں اور سب بندوں کو اپنے رسول کی فرماں برداری کا حکم دیا ہے۔

غیر اللہ کی قسم کھانا:

اللہ کے سوا کسی مخلوق کی قسم کھانا بھی شرک ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی کعبے کی قسم کھائے تو وہ بھی شرک کا مرتکب ٹھہرے گا، اس لیے کہ ایک یہودی نے اس قسم کو شرک کہا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے قول کو برقرار رکھا۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔“ (رواه الترمذي)[1]

یہ شرک جلی ہے۔ ایسی قسم کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا، کیونکہ غیر اللہ کی قسم کھانے والا کھلا شرک کرنے والا ہے۔ عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تم جھوٹے معبودوں کی قسم کھاؤ اور نہ اپنے باپ دادا کی قسم کھاؤ۔“ (رواه مسلم)[2]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٥٧٤)

[2] صحيح مسلم (٣/ ١٢٦٨)

اس حکم میں ہر معظم شخص، بادشاہ ہو یا پیر یا ولی یا نبی، کی قسم کھانا داخل ہے۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں آیا ہے کہ "جس نے قسم کھانا ہو، وہ اللہ کی قسم کھائے یا خاموش رہے۔" (متفق علیہ) [1]

اس نہی میں ہر شے داخل ہے، جیسے نبی، ملائکہ، کعبہ، امانت، حیات اور روح کی قسم کھانا۔ سب سے زیادہ مکروہ امانت کی قسم کھانا ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جس نے اپنی قسم میں یوں کہا: "بِاللَّاتِ وَالْعُزّٰی" اب وہ یوں کہے: "لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ" [2]

یعنی اگر زبان سے ایسا کلمہ عادتِ جاہلیت کی بنا پر نکل جائے تو فوراً توحید خالص کے اقرار سے اس کا تدارک کرنا چاہیے۔ عرب کے لوگ کفر کی حالت میں بتوں کی قسم کھاتے تھے، اسی طرح اہلِ شرک وکفر میں جو قسم کھانے کی رسم جاری ہے، ایسی قسم کھانے سے ایمان میں خلل آجاتا ہے۔

ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے ملتِ اسلام کے علاوہ کاذب ہو کر دوسرے دین کی جھوٹی قسم کھائی تو وہ ویسا ہی ہے جیسا اس نے کہا ہے۔" [3]

یعنی محض قسم کھانے سے یا قسم شکنی کے بعد کافر ہو جاتا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ اگر قسم ماضی پر کھائی ہے تو محض قسم سے کافر ہوگیا اور اگر مستقبل پر قسم کھائی ہے تو قسم شکنی کے بعد کافر ہو جائے گا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم باپ ماں اور انداد کی قسم نہ کھاؤ، اور اللہ کی جھوٹی قسم نہ کھاؤ۔" (رواه أبو داود والنسائي) [4]

یہاں "انداد" سے مراد شرکا ہیں، چاہے حیوان ہوں یا جماد، زندہ ہوں یا مردہ۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قسم کھاتے تو "لَا وَأَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ" کہتے۔ اس کو امام ابو داود اور امام ابن ماجہ نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔ [5]

مطلب یہ ہے کہ اگر بات اور طرح پر ہو تو میں استغفار کرتا ہوں۔ ان احادیث کا حاصل یہ

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٤٦) صحيح مسلم (٣/ ١٢٦٧)

(2) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٥٠) صحيح مسلم (٣/ ١٢٦٧)

(3) صحيح البخاري، رقم الحديث (٦١٠٥) صحيح مسلم (١/ ١٠٤، ١٠٥)

(4) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٣٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٧٦٩)

(5) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٤٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٢٠٩٣) اس کی سند میں "ہلال بن ابی ہلال المدنی" راوی ضعیف ہے۔

ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا شرک ہے، لیکن افسوس لوگوں نے اس باب میں یہاں تک غفلت اور بے پروائی اختیار کی ہے کہ دین و دنیا کے ہر معظم اور بڑے شخص کی قسم کھاتے رہتے ہیں۔ جدھر دیکھو کوئی کسی پیر فقیر کی، کوئی کسی امیر و وزیر کی، کوئی کسی کے سر اور جان کی قسم کھا رہا ہے، حالانکہ یہ واضح شرک ہے۔ شعرا کا حال یہ ہے کہ وہ گل وبلبل، بہار وچمن، اعضائے محبوب، لباسِ محبوب اور مکتوبِ محبوب وغیرہ اشیا کی قسم کھاتے ہیں۔ یہ قسم لغو یمین میں شمار ہوتی ہے، اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے مقصود کلام کی تحسین ہے، مخلوق کی تعظیم نہیں۔ پھر بھی لغو یمین سے بچنا احتیاط ہے۔ ارشادِ نبوی ہے: «مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ» (انسان کے اسلام کی ایک خوبی لا یعنی باتوں کو چھوڑ دینا ہے) ایسے الفاظ وعبارات کا استعمال کرنا جن میں شرک کا شائبہ ہو، غیر مشروع ہے۔ اگر اس طرح کی قسموں سے دوسرے کی تعظیم کی نیت ہو تو اس کے واضح شرک ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔

غیر اللہ کی نذر:

اللہ کی رضا کے لیے کسی عبادت یا مشروع کام کی نذر ماننا درست ہے اور اس کو پوری کرنا واجب ہے، لیکن جو نذر اللہ کے سوا کسی اور کے لیے ہو یا ایسا کام کرنے کے لیے ہو جو اللہ کی نافرمانی والا ہو تو اس کو ہرگز پورا نہ کریں۔ ثابت بن ضحاک رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَا وَفَاءَ لِنَذْرٍ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ» (رواه أبو داود)[1]

[اللہ کی معصیت کے بارے میں کسی نذر کو پورا نہیں کرنا]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی کی نذر نیاز نہیں کرنی ہے۔ اگر کسی نے جہالت سے کسی کی نذر مانی ہے تو اس کو پورا نہ کرے، کیونکہ اول تو وہ نذر ہی معصیت ہے، پھر اس پر اصرار کرنا ایک دوسری معصیت ہے۔

اسی طرح جس جگہ اللہ کے سوا کوئی معبود ہو، یا مشرکین کی عید یا کوئی میلہ ہوتا ہو، یا غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا جاتا ہو؛ وہاں پر جا کر ذبح کرنا یا نذر پورا کرنا منع ہے، کیونکہ اہلِ کفر کی مشابہت کے مقام سے بچنا واجب ہے، چاہے ایسی جگہ جانے والے کی نیت اچھی ہو یا بری، یا وہ کام

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٨٩)

حسنہ ہو یا سیئہ، بہر حال اس سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ اس پر یہ حدیث «مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ»[1] [جو کوئی کسی قوم سے مشابہت رکھے گا وہ انھیں میں شمار ہوگا] دلیل ہے، نیز اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَ مَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ﴾ [المائدة: ٥١] [اور جو کوئی ان سے دوستی رکھے وہ انھیں میں ایک ہے] یعنی کسی قوم کی دوستی اور مشابہت آدمی کو اسی قوم میں داخل کر دیتی ہے، اس لیے مشرکین و کفار اپنی مذہبی رسوم کے تحت جو میلے ٹھیلے کرتے ہیں، ان میں جانا اسی لیے حرام ہے کہ اس میں کفار کے ساتھ تشبہ اور ان کی تعداد میں زیادتی بھی ہوتی ہے، البتہ وہ میلہ جو فقط خرید و فروخت کے لیے ہوتا ہے اور وہاں کوئی بت یا قبر یا تھان یا مکان یا چلہ یا اللہ کے سوا کسی معبود کا نشان نہیں ہے تو وہاں مالِ تجارت کی فروخت کی غرض سے جانا جائز ہے۔ مجمعوں اور میلوں کے درمیان اگر یہ فرق ملحوظ نہ رکھا جائے گا تو شرک کا اندیشہ لگا رہے گا۔ غیر ملت کے ساتھ تشبہ کی بہت سی صورتیں ہیں، ان سب کا حصر اس جگہ مشکل ہے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے ایک کتاب "اقتضاء الصراط المستقیم" اسی کے بیان میں لکھی ہے۔ کسی غیر مسلمان قوم کے ہم وضع ہونا، جیسے اس کے جیسا لباس، مکان یا سواری یا طرزِ طعام اختیار کرنا؛ اس کے ساتھ تشبہ کی صورتیں ہیں۔ غرض کہ نذرِ معصیت میں بھی شرک کی مشابہت ہے۔

سجدۂ غیر اللہ:

اللہ کے سوا کسی مخلوق کو سجدہ کرنا شرک ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ﴾ [فصلت: ٣٧]

[تم سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو، اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو بنایا ہے]

معلوم ہوا کہ غیر خالق کو سجدہ کرنا حرام ہے۔ اس کو شرک فی العبادۃ کہا گیا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے، ایک اونٹ نے آکر آپ کو سجدہ کیا۔ صحابہ کرام نے عرض کی: اے اللہ کے رسول ﷺ! آپ ﷺ کو چوپائے اور درخت سجدہ کرتے ہیں تو ہمیں آپ کو سجدہ کرنے کا حق ان سے کہیں زیادہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے رب کی عبادت کرو اور اپنے بھائی (رسول ﷺ) کی عزت و تکریم کرو۔ اگر میں کسی کو حکم کرتا کہ وہ کسی

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٠١٢) مسند أحمد (٢/ ٥٠)

کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کیا کریں، کیونکہ اللہ نے بیویوں پر ان کا حق رکھا ہے۔[1] (رواہ أبو داود)

اونٹ نے رسول اللہ ﷺ کو جو سجدہ کیا تھا، وہ اللہ کے حکم و تسخیر سے کیا تھا، اس لیے وہ سجدہ بھی اللہ ہی کے لیے ہوا۔ حدیث مذکور سے معلوم ہوا کہ سجدہ اللہ کی خاص عبادت ہے، جو کسی مخلوق کے لیے ہرگز جائز نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب زندہ مخلوق کے لیے سجدہ کرنا ناجائز قرار دیا تو کسی مردہ یا قبر یا تعزیہ یا نشان و مکان کے لیے یہ شرک جلی ہوگا۔

یہ حدیث اس بات پر واضح دلیل ہے کہ کسی بھی شخص کے لیے سجدہ کرنا بالکل ممنوع ہے۔ جب زندہ شخص سجدے کا مستحق نہیں ہے تو یہ ولی اور پیر موت کے بعد کس طرح سجدے کے لائق ہو سکتے ہیں؟ کیا جیتے جی وہ مقید بہ بشریت تھے اور موت کے بعد درجہ الوہیت کو پہنچ کر مستحق سجدہ قرار پا گئے؟ غیر اللہ کو سجدہ کرنا اگرچہ شرک فی العبادۃ ہے، مگر بادشاہوں کے دربار میں اس کی رسم جاری ہونے کی وجہ سے شرک فی العادۃ بھی ہے۔ ملک چین میں بادشاہ کو سجدہ کیا جاتا ہے، جس طرح کسی معبود کو سجدہ کرتے ہیں۔ پہلے ہندوستان کے بعض مسلم سلاطین کے دربار میں بھی سجدے کی رسم جاری تھی۔ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے اس کے خلاف آواز بلند کی تھی اور اس پر قید و بند کی سزا سے دوچار ہوئے تھے۔ بعض فقہا نے سلاطین شیاطین کے لیے جو سجدہ تحیہ جائز قرار دیا ہے، وہ نصِ کتاب و سنت کی بنا پر مردود ہے۔ جب خاص ہیئت و حالت کے ساتھ خدم و حشم کے لیے آقا کے سامنے کھڑا رہنا ممنوع اور گناہِ کبیرہ ہے، تو پھر سجدہ کرنا اس سے کہیں زیادہ بدتر ہے۔ حدیث میں قیام تعظیمی سے بھی منع کیا گیا ہے،[2] پھر سجدہ تعظیم کیسے جائز ہو سکتا ہے؟

کھیتی اور مویشی میں شرک:

شرک کی ایک قسم وہ ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے۔

پہلی آیت:

﴿وَ جَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَ الْاَنْعَامِ نَصِیْبًا فَقَالُوْا هٰذَا لِلّٰهِ

[1] مسند أحمد (٦/ ٧٦) اس کی سند میں ''علی بن زید بن جدعان'' ضعیف ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٥٢٢٩) مسند أحمد (٤/ ٩١)

بِزَعْمِهِمْ وَ هٰذَا لِشُرَكَآئِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ اِلَى اللّٰهِ وَ مَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٣٦]

[اللہ نے جو کھیت اور مویشی پیدا کیے ہیں، ان میں کچھ لوگ اللہ کا ایک حصہ لگاتے ہیں، اپنے خیال کی بنا پر کہتے ہیں یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبود کا ہے، پھر جو حصہ ان کے معبود کا ہے وہ اللہ کو نہیں ملے گا اور جو اللہ کا ہے وہ ان کے معبودوں کو مل سکتا ہے، کیا برا فیصلہ کرتے ہیں]

یعنی کھیتی اور مویشی اللہ ہی نے پیدا کیے ہیں، اس میں کسی اور کی شرکت نہیں ہے، لیکن یہ کافر لوگ جب اس کی خیرات و نیاز نکالتے ہیں تو اس کے دو حصے کرتے ہیں۔ ایک اللہ کے لیے اور دوسرا اوروں (معبودوں وبتوں) کے لیے نیاز کرتے ہیں، بلکہ اوروں کی نیاز جتنی احتیاط اور ادب سے کرتے ہیں، اللہ کی اتنی نہیں کرتے۔ یہ شرک کی رسم ہے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَ قَالُوْا هٰذِهٖٓ اَنْعَامٌ وَّ حَرْثٌ حِجْرٌ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ وَ اَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَ اَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا افْتِرَآءً عَلَيْهِ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ [الأنعام: ١٣٨]

[اور کہتے ہیں یہ کھیتی و مویشی اچھوتے ہیں، ان کو کوئی کھا نہیں سکتا مگر جس کو ہم چاہیں اپنے خیال کے موافق وہی کھا سکتا ہے، کچھ مویشی ایسے ہیں جن کی پیٹھ پر سوار ہونا منع ہے اور کچھ جانوروں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام نہیں لیتے، یہ سب اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے، وہ ان کے جھوٹ باندھنے کی سزا جلد دے گا]

یعنی مشرک لوگ محض اپنے خیال سے یہ بات ٹھہرا لیتے ہیں کہ فلاں چیز اچھوتی ہے، اس کو فلاں نہ کھائے اور فلاں کھائے۔ وہ بعض جانوروں پر بوجھ لادنے اور سواری کرنے سے منع کرتے ہیں کہ یہ فلاں کی نیاز ہے، اس کا ادب واحترام کرنا چاہیے۔ بعض جانوروں کو اللہ کے نام کا نہ کرکے کسی اور کے نام کا بتاتے ہیں اور پھر یوں سمجھتے ہیں کہ ان باتوں سے اللہ خوش ہوتا ہے اور مرادیں دیتا ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے، جس کی سزا ملے گی، کیونکہ وہ اس تقسیم سے مشرک ہو جاتے ہیں۔

دوسری آیت:

دوسری آیت میں فرمایا:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴾ [المائدۃ: ۱۰۳]

[اللہ نے کوئی بحیرہ، کوئی سائبہ، کوئی وصیلہ اور کوئی حام مقرر نہیں کیا، لیکن کافر لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں اکثر عقل نہیں رکھتے ہیں]

یعنی زمانہ جاہلیت میں لوگ بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیتے اور ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ یہاں پر چار قسم کے جانور بیان کیے گئے ہیں۔ وہ اونٹنی جو کسی کے نام پر ٹھہرا کر اس کا کان چیر دیتے، اس کو ''بحیرہ'' کہتے تھے، جو سانڈ کرتے تھے، اسے ''سائبہ'' کہتے تھے، جو بکری نر و مادہ کو جنم دیتی تو نر کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس کا نام ''وصیلہ'' رکھتے تھے، اسی طرح جس اونٹنی کے بطن سے دس بچے پیدا ہو جاتے، اسے بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس کا نام ''حام'' رکھتے تھے۔ ان سب کے بارے میں فرمایا کہ یہ سب باتیں اللہ نے مقرر نہیں کی ہیں، بلکہ ان لوگوں نے اپنی بے وقوفی سے یہ رسمیں باندھ لی ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی جانور کسی کے نام پر ٹھہرانا اور اس پر اس کا کوئی نشان لگا دینا اور یہ مقرر کر دینا کہ فلاں کی نیاز گاؤ ہے، فلاں کی بکری اور فلاں کی مرغی ہے، یہ سب کفر و شرک کی رسمیں اور اللہ کے حکم کے خلاف ہیں۔

تیسری آیت:

تیسری آیت میں فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ﴾ [النحل: ۱۱٦]

[تمھاری زبانیں جو جھوٹ بات بیان کرتی ہیں، ان کے نباہنے کے لیے یوں نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام، تاکہ اللہ پر جھوٹ باندھنے لگو]

یعنی اپنی طرف سے جھوٹ بنا کر یہ مت کہو کہ فلاں چیز حلال اور فلاں چیز حرام ہے۔ یہ اللہ ہی کی شان ہے کہ وہ جس چیز کو چاہے حلال کرے اور جس کو چاہے حرام کر دے، کسی کا اپنی طرف سے

ایسا کہنا یا کرنا اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے، نیز یہ خیال باندھنا کہ فلاں کام یوں کریں تو مرادیں ملتی ہیں، ورنہ کچھ خلل ہو جاتا ہے، یہ غلط خیال ہے، کیونکہ اللہ پر جھوٹ باندھنے سے کبھی مراد نہیں ملتی۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ محرم کے مہینے میں پان نہ کھایا جائے، لال کپڑا نہ پہنا جائے، حضرت بی بی کی صحنک مرد نہ کھائیں، جب ان کی نیاز کریں تو اس میں فلاں فلاں ترکاریاں ضرور ہوں، مسی اور مہندی بھی ہو، اس کو لونڈی نہ کھائے، جس عورت نے دوسرا خاوند کیا ہے وہ بھی نہ کھائے، اسی طرح جو نیچ قوم کا ہو یا بدکار ہو، وہ بھی نہ کھائے، شاہ عبدالحق کا توشہ، جو حلوا ہوتا ہے، اس کو خوب احتیاط سے بنائیں اور حقہ پینے والے کو نہ دیں، شاہ مدار کی نیاز میں صرف مالیدہ چڑھائیں، بوعلی قلندر کی سہ منی اور اصحاب کہف کی گوشت روٹی کا اہتمام کریں، شادی بیاہ میں فلاں فلاں رسمیں، موت ہونے پر اور موت کے بعد فلاں فلاں رسمیں ضروری ہیں، موت کے بعد نہ شادی کریں اور نہ کسی شادی وغمی کی مجلس میں بیٹھیں، نہ اچار ڈالیں، فلاں لوگ نیلا کپڑا نہ پہنیں اور فلاں لال سوسی نہ پہنیں، ایسا کہنے والے سب جھوٹے، دغاباز، مکار، مفتری اور شرک وکفر میں گرفتار ہیں۔ یہ اللہ کی حکومت کی شان میں اپنا دخل دیتے ہیں اور اپنی ایک جداگانہ شریعت قائم کرتے ہیں۔ یہ شرکیہ رسوم ہندوستان کے جاہل عوام میں خوب رائج ہیں، اسی طرح عرب وعجم کے ہر ملک میں الگ الگ بدعات کفریہ رائج ہیں۔

عبادتِ اِناث:

جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے اور پوجتے ہیں، وہ عورتوں کی عبادت کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنْ يَّدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اِنٰثًا وَ اِنْ يَّدْعُوْنَ اِلَّا شَيْطٰنًا مَّرِيْدًا﴾

[النساء: ١١٧]

[یہ لوگ اللہ کے سوا نہیں پکارتے ہیں مگر عورتوں کو، (بلکہ) سرکش شیطان کو پکارتے ہیں]

یعنی مشرکوں کے معبود مونث ہیں، جیسے ملائکہ یا ان کے نام نسوانی ہیں، جیسے لات، مناۃ، عزیٰ وغیرہ۔ اسی طرح آج کل جو لوگ اللہ کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں، وہ اپنے خیال میں عورتوں کا تصور باندھتے ہیں، پھر کوئی حضرت بی بی کا نام لیتا ہے، کوئی بی بی آسیہ کا، کوئی بی بی اوتاولی کا اور کوئی لال

پری، کوئی سیاہ پری، کوئی سبز پری، کوئی سیتلا، مسانی اور کالی کے خیالی ناموں میں سر دھنتا ہے، جب کہ وہاں حقیقت میں کوئی عورت ہے نہ مرد، یہ سب محض ان کا خیال باطل اور ہوائی تصور اور شیطان وخناس کا وسوسہ ہے۔ یہ جو کبھی سر پر چڑھ کر بولتا ہے اور کبھی کوئی کرشمہ دکھاتا ہے، وہ شیطان ہے۔

ان مشرکوں کی ساری نذر نیاز اسی کو پہنچتی ہے۔ یہ اپنے خیال میں عورتوں کو دیتے ہیں، مگر حقیقت میں اس کو شیطان لیتا ہے، ان کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہے، دین کا نہ دنیا کا، کیونکہ شیطان اللہ پاک کی درگاہ سے راندہ ہوا ہے، اس سے دین کا کیا فائدہ ہو سکتا ہے؟ بھلا انسان کا دشمن کب اس کا بھلا چاہے گا؟ وہ تو اللہ کے رو برو کہہ چکا ہے کہ تیرے بہت سے بندوں کو اپنا بندہ بناؤں گا اور ان کو گمراہ کروں گا کہ وہ اپنے خیالات کو مانیں گے اور جانور میرے نام پر ٹھہرائیں گے، ان پر میری نیاز کا نشان کریں گے، جیسے جانور کا کان چیرنا یا کاٹنا یا اس کے گلے میں ناڑا ڈالنا، ماتھے پر مہندی لگانا، منہ پر سہرا باندھنا، منہ کے اندر پیسا رکھنا، غرض کہ کسی جانور پر اس بات کا نشان کر دینا کہ یہ فلاں کی نیاز ہے، وہ سب اس میں داخل ہے۔

شیطان نے یہ بھی کہا ہے کہ میں لوگوں کو سکھاؤں گا کہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بدلیں تو اللہ نے ہر آدمی کی جیسی صورت بنا دی ہے، اس کو بدل ڈالیں گے۔ کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھے گا، کوئی کسی کے نام پر ناک کان چھیدے گا، کوئی ڈاڑھی منڈوا کر یا چڑھا کر یا ڈھاٹا باندھ کر خوبصورتی دکھائے گا۔ یہ سب اللہ ورسول کے خلاف شیطان کے وسوسے ہیں۔ شیطان انسان کو جھوٹے وعدے دے کر ورغلاتا ہے، دور دور کی آرزوئیں جتاتا ہے کہ اتنے روپے ہوں تو ایسا باغ بنے، اتنا مال ہو تو ایسا محل تیار ہو، یہ تمنا تو ہاتھ نہیں آتی، البتہ بندہ پریشان ہو کر اللہ کی راہ بھول جاتا ہے، ان کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو اللہ نے تقدیر میں لکھ دیا ہے۔ کسی کے ماننے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کی دغابازی کا انجام یہی ہے کہ اللہ سے پھر کر شرک، کفر اور بدعت میں گرفتار ہو جاتا ہے، اصل دوزخی بن جاتا ہے اور شیطان کے جال میں ایسا پھنس جاتا ہے کہ کسی طرح چھڑائے چھوٹ نہیں سکتا۔ إنا لله...!

لفظ "عبد" اور "أَمَة" کا اطلاق

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں کوئی یہ نہ کہے: ''میرا بندہ، میری کنیز'' تم سب اللہ کے بندے ہو۔ تمھاری عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں۔ ہاں غلام وجاریہ (باندی) اور فتیٰ (غلام) اور فتاۃ (باندی) کہو، اسی طرح غلام اپنے آقا کو ''میرا رب'' نہ کہے، بلکہ یوں کہے: ''میرا سردار'' ایک روایت میں ''مولیٰ'' کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔ یعنی غلام اپنے آقا کو یہ نہ کہے کہ تو میرا مالک ہے، اس لیے کہ سب کا مالک اللہ ہے۔''[1]

یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ اس طرح کے الفاظ ومحاورات استعمال کرنا ممنوع وحرام ہے، تو پھر عبد النبی، عبد الرسول، بندہ علی اور عبد فلاں کہنا بدرجہ اولی شرک ہوا، اسی طرح بندہ حضور، بندگان عالی وپرستار خاص، امرد پرست، آشنا پرست، پیر پرست، غریب پرور، خداوند نعمت، خداوند خدائے گاں اور خدیو مصر وغیرہ الفاظ کا حکم بھی یہی ہے، کیوں کہ یہ سب شرکیہ محاورات ہیں۔ ذرا سی بات میں یہ کہنا کہ تم ہماری جان ومال کے مالک ہو، ہم تمھارے بس میں ہیں، جو چاہو کرو، یہ محض جھوٹ اور شرک کی بات ہے، اسی طرح وہ مبالغہ اور غلو ہے جو رسول اللہ ﷺ کی مدح وتعریف میں کیا جاتا ہے، حالانکہ حدیثِ ابن عمر رضی اللہ عنہما میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''تم میری تعریف میں مبالغہ نہ کرو، جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کی تعریف میں مبالغہ کیا ہے۔ میں اللہ کا بندہ ہوں، مجھ کو عبد اللہ اور رسول اللہ کہو۔'' (متفق علیه)[2]

یعنی اللہ پاک نے جتنے فضائل وکمالات اور محاسن مجھ کو عطا کیے ہیں، ان کے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن وہ سب اتنے لفظ میں ادا ہو جاتے ہیں کہ مجھ کو رسول اللہ اور عبد اللہ کہیں، کیونکہ بشر کے حق میں رسالت سے بڑھ کر کوئی مرتبہ نہیں ہے، اس کے علاوہ جتنے مراتب ہیں، وہ سب درجہ رسالت سے کم ہیں، اس کے باوجود رسول آدمی ہی رہتا ہے، اللہ نہیں ہو جاتا۔ بشر چاہے رسول ہو، اس کے لیے بڑا فخر یہی ہے کہ وہ اللہ کا بندہ بنا رہے، بندگی سے آگے قدم نہ بڑھائے۔

دیکھو! نصاریٰ اسی سبب سے کافر قرار پائے کہ انھوں نے عیسیٰ رسول کو مرتبۂ عبدیت سے آگے بڑھا دیا، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ممدوح کے بارے میں مبالغہ کرنے سے نہی فرمائی، لیکن اس امت کے حال پر بہت افسوس ہے کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کو قبول نہ کیا اور نصاریٰ

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٥٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٧٦٤)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٣٤٤٥)

کی طرح آپ کی نعت ومدح میں بلند پروازی اور بالا خوانی اختیار کی، کسی نے آپ کو خدا ٹھہرا دیا، کسی نے عالم الغیب بنا دیا، کسی نے احمد بلا میم کہہ دیا، بلکہ بات اس سے آگے تجاوز کر چکی ہے۔ اولیائے امت کے حق میں ایسے قصائدِ مدح لکھے جاتے ہیں جو خدائی اوصاف سے بھرے ہوتے ہیں، اس پر طرہ یہ کہ جو کوئی ان لوگوں کو ایسے الفاظ واسالیب استعمال کرنے سے منع کرتا اور مبالغہ وغلو آمیز مضامین و معانی بولنے سے روکتا ہے تو اس کو کہتے ہیں کہ یہ جناب رسالت مآب ﷺ کی تحقیر کرتا ہے، حالانکہ خود یہی لوگ ان مبالغہ والی عبارات واشارات کے استعمال کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے استخفاف کے مرتکب ہو جاتے ہیں، کیوں کہ استخفاف کی ایک صورت یہ ہے کہ کسی کو اس کے رتبے سے گھٹا دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو اس کے مرتبے و مقام سے بڑھا دیا جائے۔ سید المرسلین ﷺ کے جو اوصاف ونعوت، مدائح و فضائل اور مناقب ومزایا قرآن وحدیث میں مذکور ہیں، وہ کیا کم ہیں جو ماوشما کے ان تراشیدہ الفاظ کی حاجت ہو؟!

باغ مرا چہ حاجت سرو و صنوبر ست
شمشاد خانہ پرور ما از کہ کمترست

[ہمارے باغ کو سرو اور صنوبر جیسے درختوں کی کیا ضرورت ہے؟ ہمارے گھر کا تناور درخت شمشاد کس سے کم ہے؟]

جس کو ایمان محبوب اور توحید خالص مقصود ومطلوب ہو، اس پر فرض ہے کہ سارے انبیا و اولیا و صلحا کے حق میں ہر مشتبہ وناجائز لفظ کے استعمال سے مجتنب رہے۔ صرف اوصاف ماثورہ اور الفاظِ مسنونہ پر اقتصار کرے۔ انھیں عبارات منصوصہ اور مضامین صادقہ ثابتہ کو چاہے ہزار قالب میں ادا کرے، اس میں شرک یا بدعت کا کوئی خوف و اندیشہ نہیں رہے گا۔

فدع عنك نهبا صيح في حجراته
وهات حديثا ما حديث الرواحل

[مکان کے حجروں میں جو بول چال ہوتی ہے، اسے چھوڑو اور میدان کے شہ سواروں جیسی کوئی بات بیان کرو]

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ حدیث مذکور وصفِ نبوت میں ناجائز تعریفات سے اشتغال ا...

غلو و مبالغہ اختیار کرنے سے مانع اور اس بات پر دلیل ہے کہ یہ کام خطواتِ شیطان کی اتباع میں سے ہے۔ جب یہ نہی رسول اللہ ﷺ کے حق میں ہے تو پھر کسی اور کی کیا ہستی و حقیقت ہے کہ اس کی تعریف میں غلو و مبالغہ سے کام لیا جائے؟ ایسی تعریفوں سے جناب باری تعالیٰ کے حق میں بے ادبی ہوتی ہے۔ صلحا کی مدح و ثنا میں مبالغہ اور غلو کرنا دراصل شرک خفی کی ایک نوع ہے، اسی لیے اللہ نے غلو سے منع فرمایا ہے کہ ﴿لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ﴾ [النساء: ١٧١] [اپنے دین میں غلو نہ کرو] حد سے زیادہ تعظیم کو غلو کہتے ہیں، چاہے قول سے ہو یا اعتقاد و فعل سے، اس امت کے غالی لوگ اہلِ کتاب کی خصلت رکھتے ہیں۔ یہ غلو دراصل انھیں کے یہاں سے لیا گیا ہے۔

سیدنا علی مرتضی رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو، جنھوں نے ان کی مدح میں غلو کیا تھا، آگ میں جلا دیا تھا۔ صحابہ کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ غلو کرنے والوں کی سزا قتل ہے۔

انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَا أُرِيْدُ أَنْ تَرْفَعُوْنِي فَوْقَ مَنْزِلَتِيَ الَّتِي أَنْزَلَنِيْهَا اللّٰهُ تَعَالٰى أَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ»[1] (رواه رزين)

[میں نہیں چاہتا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو مرتبہ عطا کیا ہے، تم اس سے زیادہ میری تعظیم کرو۔ میرا نام محمد بن عبد اللہ ہے۔ میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں]

یہ حدیث اس بات پر نص صریح ہے کہ ممدوح کی تعریف و توصیف میں غلو اور مبالغہ کرنا سخت ممنوع ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا جو وصف شرع میں نہیں آیا ہے یا اللہ نے اس کا حکم نہیں کیا ہے، اس سے سکوت کرنا احوط و اولی ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث اس کی موید ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«وَإِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ، فَإِنَّمَا أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ»[2]

(رواه أحمد و الترمذي و ابن ماجه)

[غلو سے بچو، کیونکہ تم سے پہلے لوگوں کو غلو ہی نے ہلاکت میں ڈال دیا تھا]

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اعتقادات اور اعمال و اقوال میں غلو کی تمام انواع کو عام ہے۔[3]

---

[1] مسند أحمد (٣/ ١٥٣)

[2] مسند أحمد (١/ ٢١٥، ٣٤٧) سنن النسائي، رقم الحديث (٣٠٥٧) سنن ابن ماجه (٣٠٢٩)

[3] اقتضاء الصراط المستقيم (ص: ١٠٦)

تصویر کا حکم:

شرک فی العادۃ میں تصویر بنانا اور اسے رکھنا بھی شامل ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ الْبَيْتَ الَّذِيْ فِيْهِ الصُّوْرَةُ، لَا تَدْخُلُهُ الْمَلَائِكَةُ»[1] (متفق عليه)

[جس گھر میں (حیوان کی) تصویر ہوتی ہے، اس میں (رحمت کے) فرشتے نہیں آتے ہیں]

اسی حدیث کے شروع میں یہ ذکر بھی موجود ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تصویر والا روئی کا گدا دیکھ کر یہ ارشاد فرمایا۔ معلوم ہوا کہ انبیا، ائمہ، اولیا، صلحا، مشائخ، احباب، اولاد، ازواج اور اہلِ خاندان کی تصاویر کی تعظیم کرنا خواہ برکت کی امید سے ہو یا یادگار کے لیے ہو، بہر حال گمراہی ہے۔ انبیا اور ملائکہ ایسے لوگوں کے دشمن ہوتے ہیں۔ وہ ان سے نہایت گھن کرتے ہیں اور اس گھر میں قدم نہیں رکھتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کعبے میں ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تصویر کو اپنی چھڑی سے توڑ ڈالا تھا اور اس کی کوئی تعظیم و تکریم نہ کی۔ اب بعض امتی اتنے جری ہو گئے ہیں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جعلی تصویر اپنے گھر میں رکھتے ہیں۔

تصویر بنانے والوں کے بارے میں آیا ہے کہ وہ سب سے زیادہ سخت عذاب میں گرفتار ہوں گے۔[2] تصویر بنانا صرف گناہ کبیرہ ہی نہیں، بلکہ ایک طرح سے خدائی کا دعوی کرنا ہے کہ وہ اللہ جیسی مخلوق بنانا چاہتے ہیں۔ اس کو اگر شرک جلی نہ کہیں تو اس کے شرک خفی ہونے میں کچھ بھی تامل نہیں ہے۔ تصویر بنانے والے اتنے بڑے مجرم ہیں کہ ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مصور کو پیغمبر کے قاتل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔[3] ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَشَدُّ النَّاسِ عَذَابًا عِنْدَ اللّٰهِ الْمُصَوِّرُوْنَ»[4] (متفق عليه)

[اللہ کے یہاں تصویر بنانے والوں کو سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا]

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں آیا ہے:

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (۲۱۰۵) صحيح مسلم (۳/ ۱۶۶۹)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۹۵۰) صحيح مسلم (۳/ ۱۶۷۰)

[3] مسند أحمد (۱/ ۴۰۷) السلسلة الصحيحة، رقم الحديث (۲۸۱)

[4] صحيح البخاري، رقم الحديث (۵۹۵۰) صحيح مسلم (۳/ ۱۶۷۰)

«قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى: وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِي؟ فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً أَوْ لِيَخْلُقُوا حَبَّةً أَوْ شَعِيرَةً»[1] (متفق عليه)

[اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کون ہے جو میری طرح مخلوق بنانے چلا ہے؟ ذرا ایک چھوٹی چیونٹی ہی پیدا کر دیں یا کوئی ایک دانہ یا جو ہی بنا دیں]

یہ حدیث تصویر کشی کے شرک ہونے اور اس بات پر کہ مصور مشرک ہوتا ہے، نص صریح ہے، چونکہ اصطلاحِ قرآن میں شرک کو ظلم عظیم فرمایا ہے اور اس حدیث میں مصور کو اظلم قرار دیا ہے۔

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ تصویر ساز اس آڑ میں الوہیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنی صنعت و تخلیق کو اللہ کی صنعت کی طرح کر دکھانا چاہتے ہیں۔ اللہ کی جناب میں اس سے زیادہ کیا بے ادبی اور دروغ گوئی ہوگی؟ رہا تصویر کا حکم تو فروعی طور پر اس کی کئی صورتیں ہیں جو اپنے محل میں مذکور اور ہماری کتاب ”دلیل الطالب“[2] میں مسطور ہیں۔ کچھ لوگ تصویر کو فرسودہ حالت میں رکھنا جائز بتاتے ہیں، لیکن بہتر یہ ہے کہ گھر میں تصویر کا نام و نشان نہ ہو۔ غیر حیوان کی تصویر کا استعمال اگرچہ جائز ہے، لیکن اس کا ترک اَولیٰ ہے۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ اس زمانۂ خاص میں یہ بلا عام ہوگئی ہے۔ کوئی شے کھانے پینے، لکھنے پڑھنے وغیرہ آلات و اسباب کی باقی نہیں رہی جس میں تصویر نہ ہو۔ موجودہ زمانے میں تصاویر کے استعمال سے اجتناب بہت مشکل ہو گیا ہے، یہاں تک کہ کاغذ، قلم، فرش، چاقو، پاپوش اور کلاہ میں بھی تصویر موجود ہوتی ہے، لیکن جس کو اللہ توفیق اور ہمت دے اس پر ان اشیا سے احتراز کرنا، گو بطور تکلف ہو، کچھ دشوار نہیں ہے، ورنہ اتنا تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ تصویر کو رذیل اور بے حقیقت سمجھے اور اس کو عظمت و کرامت کی نظر سے ہرگز ملاحظہ نہ کرے، اللہ پاک سے استغفار کرتا رہے۔ یہ تصویر ظاہر کا حکم ہے۔

تصویرِ باطن:

دوسری تصویر باطن کی ہے، یعنی کسی پیر، پیغمبر، صالح اور شیخ کی تصویر کا تصور دل میں کر کے اس کو قبلۂ حاجات ٹھہرائے اور اس کے مغیث و معین ہونے کا اعتقاد کرے۔ اس بلا میں اکثر جاہل

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٣٥٩) صحيح مسلم (٣/ ١٦٧١)

[2] اس سے مولف رحمہ اللہ کی کتاب "دليل الطالب على أرجح المطالب" مراد ہے، جس کا نصف حصہ عربی ترجمہ "فتاویٰ صديق حسن خان القنوجي" کے نام سے مطبوع ہے۔

مرید گرفتار رہتے ہیں۔ یہ بھی شرک خفی کی ایک نوع ہے۔ سلف صالح میں ایسا کوئی طریقہ اور دستور نہ تھا، ان کا عقیدہ وعمل تو یہ تھا:

«أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»[1]

[تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو جیسے اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر اتنا نہ ہو تو یہی سہی کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے]

سلف ہرگز تصور شیخ کا مراقبہ نہیں کرتے تھے، بلکہ اگر ان کے سامنے شرک کی یہ نوع پیش آتی تو یقیناً ایسے صاحبِ تصور مرید کو مشرک بتاتے۔ ان کے یہاں تو اللہ کے سوا کسی کا مراقبہ وتصور نہیں تھا، ان کا سارا ذکر وفکر اللہ کی ذات وصفات اور افعال واعمال میں منحصر تھا۔

ولا راے کہ داری دل دروبند
دگر چشم از ہمہ عالم فروبند

[تمام دنیا سے آنکھ بند کر کے صرف اپنے محبوب میں ساری دلچسپیاں محدود رکھو]

تعویذ گنڈا:

سیدنا عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کے ہاتھ میں پیتل کا حلقہ (کڑا) دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ''واہنہ'' کے سبب سے پہنا ہے۔ آپ نے فرمایا: اس کو اتار ڈال، اس سے وہن (بیماری) میں اضافے کے سوا کوئی فائدہ نہ ہوگا: پھر فرمایا: اگر تو اسی حال پر مر جائے گا تو کبھی فلاح نہ پائے گا۔[2] (رواہ أحمد)

''واہنہ'' وہ بیماری ہے جس سے ہاتھ کی رگ اور جوڑوں میں تناؤ پیدا ہوتا ہے۔ اس حدیث میں جو وعید مذکور ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کڑا باندھنے والے نے غیر اللہ سے استعانت کی تھی، اسی لیے صحابہ کرام نے کہا ہے کہ شرک اصغر تمام کبائر سے اکبر ہوتا ہے اور شرک میں جہالت وناواقفیت کا عذر مقبول نہیں ہوتا۔ حدیث مذکور میں اس فعل کے فاعل پر نہایت سخت انکار فرمایا گیا ہے۔ اس سے

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠) صحيح مسلم (١/ ٣٧)

[2] سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٣٥٣١) مسند أحمد (٤/ ٤٤٥) اس حدیث کی سند میں ''مبارک بن فضالہ'' راوی مدلس ہے اور سند میں انقطاع بھی ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: السلسلة الضعيفة، رقم الحديث (١٠٢٩) تحقيق مسند الإمام أحمد (٣٣/ ٢٠٤)

معلوم ہوا کہ جو لوگ ہاتھ اور پاؤں کی کسی بیماری میں کسی چیز کا کوئی چھلا یا کڑا اس اعتقاد سے پہنتے ہیں کہ اس سے مرض دفع ہوتا ہے تو یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ مرض کا علاج دوا کھانے، پینے اور مالش کرنے کے ذریعے کرنا چاہیے، ایسی چیز پر اعتماد نہ ہو جس میں شرک کی بو آتی ہو، جیسے ٹوٹکے وغیرہ میں اللہ سے غفلت اور غیر سے استعانت ہوتی ہے۔

سیدنا عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ ''جس نے تمیمہ (تعویذ گنڈا، مالا) لٹکایا تو اللہ اس کو پورا نہ کرے اور جس نے کوئی ودعہ (کوڑی، گھونگا) آشوبِ چشم کے لیے لٹکایا تو اللہ اس کو آرام نہ دے۔'' (رواہ أحمد) [1]

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دفع مرض کے لیے دونوں قسم کی چیزوں کے لٹکانے پر بد دعا دی ہے۔ مسند احمد کی دوسری روایت میں ہے کہ ''جس نے تعویذ گنڈا لٹکایا تو اس نے یقیناً شرک کیا۔'' [2] یہ حدیث پہلی حدیث سے بھی زیادہ صریح ہے۔ امام ابن اثیر رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کو شرک اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ اس میں تقدیر مکتوب کے دفع کا ارادہ اور غیر اللہ سے دفعِ مصیبت کی درخواست ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ ایک بزرگ صحابی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رازداں کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک شخص کے ہاتھ میں بخار کا گنڈا بندھا ہوا دیکھا تو اس کو توڑ ڈالا اور یہ آیت پڑھی:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [يوسف: ١٠٦]

[اللہ پر ایمان رکھنے والوں میں اکثر مشرک ہیں]

دوسری روایت میں ہے کہ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک بیمار کے بازو میں چمڑے کا ایک ٹکڑا دیکھا، اس کو کھینچ کر توڑا اور یہ آیت پڑھی: ﴿وَمَا يُؤْمِنُ... الآية﴾ [3]

معلوم ہوا کہ جاہل لوگ دفعِ بخار وغیرہ کے لیے تعویذ اور گنڈے لٹکایا کرتے تھے، جس کا ابطال وازالہ کرتے ہوئے حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آیت مذکورہ سے اس کے شرک ہونے پر استدلال کیا ہے، جو اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ نے جو آیت شرک اکبر کے بارے میں نازل کی ہے، اس سے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٥٤)

[2] مسند أحمد (٤/ ١٥٦) المستدرك للحاكم (٤/ ٢١٩)

[3] تفسير ابن أبي حاتم (٨/ ٤٧٣)

شرکِ اصغر پر استدلال کرنا بھی صحیح ہے، کیونکہ یہ آیت شرک کے ہر مسمیٰ کو شامل ہے۔

سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک بیمار کو دیکھا کہ اس کے بازو پر دھاگا بندھا ہے۔ کہا: یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: اس پر میرے لیے منتر پھونکا گیا ہے۔ کہا: اگر تو یہ دھاگا باندھے ہوئے مر جائے گا تو میں تیری نمازِ جنازہ نہیں پڑھوں گا۔[1]

الغرض سیدنا حذیفہ رضی اللہ عنہ نے دفعِ مرض کے لیے بدن پر تعویذ، گنڈے اور دھاگے باندھنے کو شرک قرار دیا تھا، اسی لیے اہلِ علم نے کہا ہے کہ تعویذ، گنڈے، دھاگے، مالے اور اس قسم کی چیزیں جنھیں جہلا لٹکایا اور پہنا کرتے ہیں؛ یہ سب شرک کی انواع ہیں۔ ان کا قول وفعل سے ازالہ وانکار کرنا واجب ہے، اگرچہ کرنے والے اجازت نہ دیں۔ یہ آثار صحابہ رضی اللہ عنہم کمالِ توحید، اخلاص تفرید اور ان کے منافی شرک کی انواع کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔

شیطان لعین جو آدم علیہ السلام کے وقت سے سارے بنی آدم کا جانی دشمن ہے، اسی تاک میں لگا رہتا ہے کہ جس طرح ہو سکے، ان کو توحید سے بہکا کر دامِ شرک میں گرفتار کرے، کیونکہ اسے یہ بات معلوم ہے کہ توحید کے موجود ہوتے ہوئے صغائر وکبائر قیامت کے دن شروع یا آخر میں بخش دیے جائیں گے، البتہ شرک، خواہ اکبر ہو یا اصغر، ہرگز معاف نہ ہوگا، اس لیے شیطان ہر حیلے اور مکر وفریب سے مسلمان کو ہر ایسے کام میں پھنساتا ہے جس میں شرک مخفی ہوتا ہے، پھر جس موحد پر شرک کا داؤ نہیں چلتا تو اس کو ایجادِ بدعات کی طرف مائل کر دیتا ہے اور وہ اس بدعت کو حسنہ سمجھ کر ساری عمر تائب نہیں ہوتا، جب کہ دوسرے گناہ سے تائب بھی ہو جاتا ہے، حالانکہ ہم جس پر ایمان لائے ہیں، اس نے ہر بدعت کو گمراہی اور ہر گمراہی کو کسی نوع کی تخصیص کے بغیر علی الاطلاق جہنم کا سبب قرار دیا ہے، اب جس کا جی چاہے وہ مومن بنا رہے اور جس کا جی چاہے وہ انکار کرے۔

تعویذ:

بعض اہلِ علم نے ازالہ مرض کے لیے ایسے تعویذ اور گنڈے باندھنا جائز قرار دیا ہے جو کسی آیت یا حدیث سے ماخوذ ہے، لیکن بہتر بلکہ ضروری یہ ہے کہ تعلیق (لٹکانے، باندھنے) سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ صدرِ اول میں ہر قسم کے امراض وآفات موجود تھے لیکن وہ لوگ کتاب وسنت سے حصولِ شفا کا

[1] مصنف ابن أبي شيبة (٧/ ٣٧٢) السنة للخلال (١٦٢٤)

عمل اس طرزِ تعلیق سے نہیں کرتے تھے، بلکہ آیات واحادیث کو پڑھ کر دوسرے پر پھونک دیتے تھے۔ ان کے ہاں یہ دستور نہ تھا کہ تعویذ بنا کر گلے میں لٹکائیں یا بازو پر باندھیں یا ہاتھ پاؤں میں کوئی چھلا پہنیں۔ بالفرض یہ بات فی الجملہ جائز بھی ہو تو شرک کے خطرات ومشتبہات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم کسی امر مباح کے ترک پر مشرک ہو سکتے ہیں نہ مبتدع، ہاں جس کام کی اجازت ہم کو شارع کی طرف سے صراحتاً نہیں ہے، بلکہ شارع نے ہم کو ان امور سے منع کیا ہے، ان کو کرنے میں ہمیں یہ خوف ہے کہ مبادا کہیں شرک یا کفر ہو کہ ہم تو اس دھوکے میں رہیں کہ یہ بات جائز ہے اور دوسری طرف ہمارا ایمان شرک خفی یا کفر خفی کے سبب جاتا رہے اور زمانۂ اسلام کا سارا کیا کرایا عمل اکارت ہو جائے، کیونکہ شرک اتنا باریک ہے کہ اندھیری رات میں سیاہ پتھر پر چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ مخفی اور پوشیدہ چیز ہے، لیکن اکثر لوگ اس نکتے کو نہیں سمجھتے اور اقوال ضعیفہ پر اعتماد کر کے ایسی آفتوں میں پھنس کر اپنا ایمان تباہ، اسلام برباد اور اخلاص فنا کر دیتے ہیں۔ اللھم وفقنا للخیر.

شرکیہ دم اور منتر:

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی اہلیہ کا بیان ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے میرے گلے میں ایک دھاگا دیکھا تو پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے کہا: اس میں میرے لیے دم کیا گیا ہے۔ انھوں نے اس کو توڑ ڈالا اور کہا: آلِ عبداللہ شرک سے کوسوں دور ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ آپ فرما رہے تھے:

''جھاڑ پھونک، تعویذ اور جادو شرک ہیں۔''[1]

سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہما کی بیوی نے کہا: میری آنکھ میں تکلیف تھی تو میں فلاں یہودی کے پاس گئی، اس نے منتر پڑھا اور آنکھ کو سکون ہوگیا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا: یہ کام شیطان کا ہے، وہ تیری آنکھ میں آہستہ سے کچوکے لگاتا تھا، جب منتر پڑھا گیا تو رک گیا۔ تم کو وہی کافی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہتے تھے، تم بھی وہی کہو:

«أَذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ، وَاشْفِ أَنْتَ الشَّافِي لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ شِفَاءً لَّا يُغَادِرُ سَقَمًا»[2]

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٦٥)

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٦٥) سنن ابن ماجه (٢/ ١١٦٧)

[اے لوگوں کے رب اس بیماری کو دور کر دے اور شفا دے، تو ہی شفا دینے والا ہے، شفا صرف تیری ہی شفا ہے، ایسی شفا دے جو کسی بیماری کو نہ چھوڑے]

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی حدیثِ مذکور میں ''رقی'' سے مراد وہ منتر ہے جو مریض پر پڑھ کر پھونکا جاتا ہے، انھوں نے اس کو شرک فرمایا ہے، لیکن دوسری دلیل شرعی سے وہ دم مستثنا ہیں جن میں کسی طرح کے شرک کا شائبہ نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رخصت و اجازت دی ہے۔ امام خطابی نے کہا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دم کیا اور آپ پر دم کیا گیا، آپ نے اس کا حکم بھی دیا اور جائز بھی رکھا۔[1] اس سے معلوم ہوا کہ دم جب قرآن یا اسمِ الٰہی سے ہو تو جائز ہے۔ مکروہ اور ناجائز وہ دم ہے جو عربی زبان میں نہ ہو، کیونکہ یہ احتمال ہے کہ اس میں کفر یا شرک کی کوئی بات ہو۔

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہر مجہول اسم سے دم نہیں کرنا چاہیے، اس کے ساتھ دعا کرنا تو دور کی بات ہے، اگرچہ اس کا معنی معلوم ہو، کیونکہ غیر عربی زبان میں دعا کرنا مکروہ ہے۔ ایسی دعا اس کے لیے جائز ہے جسے عربی زبان بہ خوبی نہیں آتی۔ رہے عجمی الفاظ کو شعار بنانا تو اس کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[2]

اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ جمعہ، عیدین، نکاح، استسقا اور کسوف و خسوف وغیرہ کا خطبہ بھی عجمی زبان میں نہ پڑھا جائے، بلکہ عربی عبارت کا خطبہ پڑھیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے اسلام عجم میں آیا ہے، تب سے اب تک خطبہ ہمیشہ عربی ہی میں رہا، کسی ملک میں عجمی زبان میں نہیں پڑھا گیا۔

مشروع دم کی شرطیں:

امام سیوطی نے لکھا ہے کہ علما کا اس بات پر اجماع ہے کہ دم کرنا تب جائز ہے جب اس میں تین شرطیں موجود ہوں۔ ایک یہ کہ دم اللہ کے کلام یا اسما و صفات سے ہو۔ دوسرے یہ کہ عربی زبان میں ہو اور دم کرنے والا اس کے معنی سمجھتا ہو۔ تیسرے یہ کہ دم کے بارے میں یہ عقیدہ ہونا چاہیے کہ اس میں بذات خود شفا کی قدرت نہیں ہے، بلکہ اللہ کی تقدیر سے ہے۔[3]

تمیمہ وہ چیز ہے جسے نظر بد کے لیے لٹکاتے ہیں، چاہے ہڈیاں ہوں یا منکا یا کسی چیز کا دانہ۔

---

[1] معالم السنن مع سنن أبي داود، رقم الحديث (١٥٢٤)

[2] مجموع الفتاوی (١/ ٣٣٦، ١٣/ ١٩)

[3] تيسير العزيز الحميد (ص: ١٦٧) نیز دیکھیں: فتح الباري (١٠/ ٢٠٦)

اس کے ناجائز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے، البتہ کاغذ وغیرہ پر آیتِ قرآن لکھ کر لٹکانا بعض سلف کے نزدیک جائز ہے، جیسے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما، جبکہ بعض سلف کے نزدیک جائز نہیں ہے، جیسے عبداللہ بن مسعود اور ابن عباس رضی اللہ عنہم۔ یہی قول حذیفہ اور عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہم وغیرہ کا بھی ہے۔ تابعین کی ایک جماعت بھی اسی طرف گئی ہے۔ محققین نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے، اس لیے کہ لٹکانے سے نہی عام ہے اور اس کے عموم کا کوئی مخصص نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں سد ذریعہ ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ قضاے حاجت اور استنجا کے وقت اس کی اہانت ہوتی ہے، بہر حال بہ نسبت تعلیق کے ترکِ تعویذ افضل بلکہ حق وصحیح ہے، مومن کو اسی افضل پر قائم و دائم رہنا چاہیے۔ تقوی و اخلاص کے کئی مراتب ہیں، ایک رتبہ دوسرے رتبے پر فائق ہوتا ہے، لیکن اس کے حاصل کرنے والے بہت کم لوگ ہوتے ہیں، اسی لیے حدیث میں جن ستر ہزار لوگوں کا بغیر حساب جنت میں جانے کا ذکر ہے، ان کی ایک خاص صفت یہ بھی ہے کہ وہ دم نہیں کرتے، حالانکہ یہ جائز ہے، لیکن متقی شخص وہ ہوتا ہے جو مباح چیز کو اس لیے چھوڑ دیتا ہے کہ کہیں اس میں کراہت وقباحت کا کوئی عنصر نہ ہو۔

تِوَلة:

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیثِ مذکور میں منتر کی طرح تِوَلہ کو بھی شرک فرمایا ہے۔ یہ بھی تعویذ اور منتر جیسا ایک عمل ہے، جسے اس لیے کرتے ہیں کہ بیوی اپنے میاں کی محبوب ہو جائے اور میاں اس کو چاہنے لگے۔ سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس لفظ کی یہی تفسیر کی ہے، جو سحر (جادو) کی ایک قسم ہے۔ اس کے شرک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس عمل سے غیر اللہ سے حصولِ منفعت اور دفعِ مضرت کا قصد کیا جاتا ہے۔ عبداللہ بن حکیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ تَعَلَّقَ شَيْئًا وُكِّلَ إِلَيْهِ» [1] (رواه الترمذي)

بعض علما نے کہا ہے کہ کسی چیز سے تعلق کبھی دل سے ہوتا ہے، کبھی فعل سے اور کبھی دونوں سے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ اس شخص کو اسی معلق شے کے حوالے کر دیتا ہے اور اس سے اپنا تعلق اٹھا لیتا ہے، پھر اس آدمی کا بھروسا اللہ پر نہیں رہتا، بلکہ اسی معلق شے پر اس کا اعتماد ہوتا ہے۔

ڈاڑھی کو باندھنا اور لپیٹنا:

ڈاڑھی کو باندھنا، لپیٹنا یا اس میں گرہ لگانا ممنوع ہے۔ رویفع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ

[1] مسند أحمد (٤/ ٣١٠) سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٥٢) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٩)

نے مجھ سے فرمایا: ''اے رویفع! شاید تیری زندگی دراز ہو، تم لوگوں کو خبر کر دینا کہ جس نے ڈاڑھی باندھی یا تانت پہنی یا گوبر یا ہڈی سے استنجا کیا تو بیشک محمد ﷺ اس سے بری ہیں۔''[1]

یہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا معجزہ ہے، کیونکہ رویفع ۵۳ھ تک زندہ رہے۔ امام خطابی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ڈاڑھی لپیٹنے کی دو صورتیں ہیں جو ممنوع ہیں۔ ایک یہ کہ کچھ لوگ جنگ میں از راہِ تکبر وغرور عجمیوں کی طرح ڈاڑھی باندھ کر لڑتے تھے، ڈاڑھی کو بٹتے اور گرہ لگاتے تھے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بالوں کو لہریا دار اور گھنگھریالے بناتے، یہ بھی جاہلیت کا ایک طریقہ تھا۔ ابو زرعہ نے کہا ہے کہ ڈاڑھی کو نماز میں سمیٹنا اور باندھنا مراد ہے۔[2] لیکن اس تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ یہ حرکت بے برکت نماز کے اندر اور بھی زیادہ بدتر ہے۔

حدیث میں تقلیدِ وتر سے جو ممانعت آئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ چوپایوں کے گلے میں تانت اور چھلا لٹکانا، تاکہ ان کو نظر نہ لگے، اس سے بھی منع کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہ ایک طرح کا شرک خفی ہے۔ سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا قول ہے کہ جس نے کسی انسان کا تعویذ گنڈا کاٹ دیا، اس کو ایک غلام آزاد کرنے کے برابر ثواب ہوگا۔[3] اہلِ علم کے نزدیک سعید بن جبیر رحمہ اللہ کا یہ اثر مرفوع حدیث کے حکم میں ہے، کیونکہ ایسی بات کوئی شخص اپنی رائے سے نہیں کہہ سکتا ہے۔ یہ حدیث مرسل ہے۔

بت پرستی:

فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ﴾ [النجم: ۱۹، ۲۰]

[بھلا بتاؤ لات وعزیٰ کو اور تیسرے پچھلے منات کو]

یہ آیتِ شریفہ اس بات کی دلیل ہے کہ حجر و شجر سے تبرک حاصل کرنا شرک ہے۔ یہ تینوں جاہلیت کے بتوں کے نام ہیں۔

لات:

''لات'' قبیلہ ثقیف کے بت کا نام تھا۔ ''عزیٰ'' قریش کا اور ''منات'' بنی ہلال کا بت تھا۔ اس

[1] مسند أحمد (٤/ ١٠٨) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٦) سنن النسائي، رقم الحديث (٥٠٦٧)

[2] معالم السنن مع سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٦)

[3] مصنف ابن أبي شيبة (٥/ ٣٦)

کی تفصیل یہ ہے کہ "لات" طائف میں ایک سفید منقوش پتھر تھا، اس کے لیے ایک گھر بنایا گیا تھا، جس پر پردے ڈالے گئے تھے اور اس کے مجاور پجاری تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو وہاں بھیجا جنھوں نے اس گھر کو ڈھا کر بت کو آگ میں جلا دیا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ "لات" ایک آدمی تھا جو حاجیوں کے لیے ستو گھولتا رہا، جب وہ مرگیا تو لوگ اس کی قبر پر اعتکاف کرنے لگے۔[1]

(رواه البخاري)

دوسری روایت میں یوں ہے کہ وہ آدمی ایک پتھر کے پاس بیٹھ کر گھی ستو بیچتا تھا۔ قبیلہ ثقیف کے لوگ اس پتھر کو پوجنے لگے، اس طریق سے اس کی تعظیم کرتے تھے یا خود اس کی قبر کے پجاری تھے۔ ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ پتھر پوجنا یا کسی بشر کی قبر کو پوجنا ایک ہی بات ہے، اس امت میں جو مشاہد اور قبروں پر قبے بنائے گئے ہیں، یہ عملِ سخیف اسی فعلِ ثقیف سے مشتق ہے، (یعنی قبیلہ ثقیف کی بت پرستی کی ایک شکل ہے) معلوم ہوا کہ اہلِ جاہلیت صلحا اور احجار و اشجار کے پجاری تھے۔

عُزّیٰ:

"عزیٰ" ایک درخت کا نام تھا۔ قریش اس کی تعظیم کرتے تھے اور انھوں نے اس درخت کے گرد ایک گھر بھی بنایا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اس درخت کو جڑ سے کٹوا کر پھینکوا دیا۔ وہ درخت ببول کے تین درختوں کا مجموعہ تھا۔ ان کی جڑ سے ایک برہنہ عورت بال کھولے ہوئے نکلی تو سیدنا خالد رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی تلوار سے قتل کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: عزیٰ یہی تھا۔[2] اس درخت پر کفار دھاگے لٹکاتے تھے، اس امت میں اس سے عظیم تر ضلالت یہ ہے کہ مقابرِ اموات، اَشجار و اَحجار اور صلحا کے مشاہد و قبور پر چادر و غلاف چڑھاتے اور ان کے تعزیے بناتے ہیں۔

منات:

"منات" مکے اور مدینے کے درمیان ایک بت تھا۔ لوگ اس کے پاس خوں ریزی کرتے تھے اور اس کو تبرک سمجھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کے سال علی مرتضی رضی اللہ عنہ کو بھیج کر اسے ڈھا دیا۔ بعض کا قول یہ ہے کہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تڑوا ڈالا۔

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٨٥٩)

[2] سنن النسائي الكبرى (٦/ ٤٧٤) مسند أبي يعلى (٢/ ١٩٦)

غرض کہ اسلام میں ''عزیٰ'' کی ساری عزت جاتی رہی۔ مسلمانوں نے لات پر لات ماری اور منات کو کسی نے نہ مانا، بلکہ اسے خاک میں ملا دیا، ولله الحمد۔[1] معلوم ہوا کہ کسی شجر، حجر اور قبر وغیرہ سے تبرک حاصل کرنا شرک اکبر ہے۔ اگر اس کو شرک اصغر کہیں تو بھی سلف شرک اکبر کی دلیل سے شرک اصغر پر استدلال کرتے تھے۔ اب جو شخص مسلمان ہو کر ایسا کام کرتا ہے تو وہ کام بعینہٖ مشرکینِ جاہلیت جیسا ہے، جو حجر و شجر اور قبر کے معتقد تھے۔

حدیثِ ابو واقد رضی اللہ عنہ میں ذاتِ انواط کا قصہ تفصیل سے بیان ہوا ہے،[2] جو اس بات پر دلیل ہے کہ انسان بسا اوقات کسی چیز کو اللہ کے تقرب کا ذریعہ سمجھتا ہے، حالانکہ وہی چیز اس کو اللہ سے دور ڈال دیتی ہے۔ جب ایسی بات بعض صحابہ سے اس وقت میں ظاہر ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اس فرمایش پر بنی اسرائیل کے مشابہ قرار دیا تو اس زمانہ آفت کا کیا ذکر ہے؟ جو بات اہلِ جاہلیت نے کسی درخت یا پتھر کی بابت کہی تھی، وہی کام اس وقت نام کے مسلمان اولیا وصلحا کی قبر و مزار پر کرتے ہیں۔ جس طرح ذاتِ انواط ایک جماد معبود تھا، اسی طرح قبر بھی ایک جماد ہے۔ جیسے درخت پر کپڑے اور ہتھیار بطور تبرک و تعظیم لٹکانا ہے، ویسا ہی قبر پر چادر اور غلاف چڑھانا ہے، ان دونوں میں بوجہ علت جامعہ کوئی فرق وتفاوت نہیں ہے۔

غرض کہ کسی شجر وحجر یا قبرِ بشر سے تبرک کا اعتقاد رکھنا، وہاں مجاورت اختیار کرنا یا جانور ذبح کرنا، شرک جلی اور کفر واضح ہے، اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ انواط کا سوال کرنے والوں سے فرمایا تھا: ﴿إِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ﴾ یعنی تم جاہل لوگ ہو، کچھ نہیں جانتے سمجھتے ہو۔ نیز فرمایا: «لَتَرْكَبُنَّ سَنَنَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ» تم انھیں اگلوں کی چال پر چلو گے۔[3] (رواہ الترمذي)

اس حدیث میں یہ بات بیان ہوئی ہے کہ اس امت کے پچھلے لوگ اگلی امتوں کی تقلید کریں گے، پس جیسا فرمایا تھا، ویسا ہی ہوا۔ یہ حدیث اس بات پر دلیل ہے کہ مسلمانوں کو اہلِ جاہلیت اور اہلِ کتاب کے ساتھ تشبہ نہیں کرنا چاہیے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ اس امت میں شرک واقع ہونے والا ہے۔ شرک میں جہالت وناواقفیت کو عذر نہیں بنایا جا سکتا، ورنہ نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غصہ نہ فرماتے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیں: تفسير ابن كثير (٤/ ٣٢٣)

[2] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢١٨٠) مسند أحمد (٥/ ٢١٨)

[3] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٢٧١)

رہا بعض متاخرین کا یہ دعوی کہ آثارِ صلحا سے برکت لینا جائز ہے، تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر بالفرض صحیح ہو تو اسی قدر جائز ہوگا جو سنت صحیحہ سے ثابت ہے۔ ایسا تبرک ہرگز جائز نہیں ہے جو آج کل قبر پرست اور پیر پرست کیا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں زمین وآسمان کا فرق اور مشرق ومغرب کا تفاوت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہرگز اس کام پر ثواب نہیں دیتا جس کو رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا یا نہیں بتایا، گو ہمارے تمھارے نزدیک وہ کام کیسا ہی مستحسن ہو۔ کسی امر کا مستحسن اور قبیح ہونا شرعی حکم کی بنا پر ہوتا ہے، ان میں عقل و رائے اور اجتہاد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اہلِ سنت کا یہی مذہب ہے، البتہ معتزلہ حسن وقبح عقلی کے قائل ہیں۔ وہ باتفاق اہلِ علم مشرک اور تقدیر کے مکذب ہیں، ان کی بات کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ذبح لغیر اللہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُكِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ لَا شَرِیْكَ لَهٗ﴾ [الأنعام: ١٦٢]

[اے پیغمبر کہہ دو کہ بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے خاص ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے]

یہ آیت اس بات پر دلیل ہے کہ نماز یعنی عبادت اور ذبح خاص اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ اصنام و مزارات کی پوجا کرنا اور ان کے لیے جانور ذبح کرنا مشرکین کا کام ہے۔ اللہ کے لیے ذبح کرنے کی تخصیص ﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ﴾ [الکوثر: ٢] [نماز اور قربانی اللہ کے لیے خاص کرو] میں لام اختصاص سے ظاہر ہے۔ یہ آیت اس بات پر واضح دلیل ہے کہ بدنی اور مالی عبادت خاص اللہ کے لیے ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص نماز اللہ کے لیے پڑھتا ہے، لیکن جانور غیر اللہ کے لیے ذبح کرتا ہے تو یہ بھی شرک فی العبادۃ ہے۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

«لَعَنَ اللّٰهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰهِ»[1] (رواہ مسلم)

[اللہ اس شخص پر لعنت کرے جو غیر اللہ کے لیے ذبح کرے]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر جانور ذبح کرنے والا ملعون ہے،

---

[1] صحیح مسلم (٣/ ١٥٦٧)

نیز اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کسی کے نام پر جانور ذبح کرنا، انھیں کاموں میں سے ہے جنھیں اللہ نے خاص اپنی تعظیم کے لیے مقرر کیا ہے، اس لیے ذبح اسی کے نام پر کرنا چاہیے۔ کسی اور کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور ذبح کرنے والا ملعون ہے۔ ظاہر آیت: ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ [البقرة: ١٧٣] [اور وہ جانور جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے] بھی یہی ہے کہ غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے، خواہ ذبح کے وقت اللہ پاک ہی کا نام کیوں نہ لیں، اس لیے کہ عمل کا اعتبار نیت پر ہوتا ہے۔ جب نیت غیر اللہ کی ہوئی تو ظاہر میں اللہ کا نام لینے سے کیا کام بنے گا؟

ذبح ایک عبادت ہے اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت حلال نہیں ہے، بلکہ شرک ہے، اس لیے غیر اللہ کے لیے ذبح کرنے والا مشرک ہو جاتا ہے اور وہ ذبیحہ بھی حرام ہوتا ہے، خواہ کسی صالح کے لیے ذبح کیا گیا ہو یا غیر صالح کے لیے۔ حرمت وخباثت میں دونوں صورتیں برابر ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں۔ امام ابراہیم مروزی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ سلطان کے استقبال کے وقت اس کے تقرب کی خاطر جانور ذبح کرنا اہلِ بخارا کے نزدیک حرام ہے، اس لیے کہ یہ بھی ﴿وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ﴾ میں داخل ہے۔ حاصل یہ ہوا کہ غیر اللہ کے لیے ذبح اور قربانی کرنے والا ملعون ہے اور وہ ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہے، اس کا کھانا حرام ہے۔

نذرِ اصنام:

بتوں اور کسی بھی غیر اللہ کے لیے نذر ماننا اور نیاز دینا شرک ہے، چنانچہ طارق بن شہاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''ایک مکھی کے سبب سے ایک آدمی جنت میں گیا اور دوسرا دوزخ میں۔ صحابہ کرام نے پوچھا: کس طرح؟ فرمایا: دو آدمیوں کا گزر ایک قوم پر ہوا تھا، وہاں ایک بت تھا۔ کوئی شخص کسی شے کا نذرانہ دیے بغیر اس بت سے تجاوز نہ کرتا، یعنی جب تک اس بت پر کوئی چیز چڑھاتا یا نذر نہ کرتا آگے نہ بڑھتا۔ مجاوروں نے دونوں آدمیوں میں سے ایک سے کہا کہ نذرانہ پیش کرو۔ ایک نے کہا: میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ لوگوں نے کہا کہ مکھی ہی اس کی نذر کرو، اس نے ایک مکھی نذر کی تو اس کو قوم نے چھوڑ دیا۔ وہ آدمی جہنم میں گیا۔ دوسرے آدمی سے کہا کہ کچھ نذر کرو۔ اس نے کہا: میں اللہ کے سوا کسی کو کوئی چیز

نذر کرنے والا نہیں ہوں۔ قوم نے اس کی گردن مار دی اور وہ بہشت میں گیا۔"[1] (رواہ أحمد)

اس حدیث میں توحید واخلاص کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے اور یہ بات بتائی گئی ہے کہ مومنوں کے دل میں شرک ایسی حقیر اور بے قدر شے ہے کہ جان تو جائے مگر ایمان نہ جائے۔ ان بت پرستوں نے صرف ایک ظاہر عمل میں موافقت چاہی تھی، لیکن اس بندۂ خدا نے قتل ہو جانے پر صبر کیا اور شرک نہیں کیا۔

موحد کہ در پائے ریزی زرش
وگر آرہٗ می نہی برسرش
امید وہراسش نباشد زکس
ہمین ست بنیاد توحید وبس

[موحد کے پاؤں میں سونے کا ڈھیر لگا دو یا اس کے سر پر تلوار رکھو، اس کو کسی سے لالچ اور خوف نہیں ہوتا ہے، توحید کی بنیاد فقط یہی ہے]

ایک صحیح حدیث میں مروی ہے:

«اَلْجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلٰى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذٰلِكَ»[2]

[جنت تم میں سے کسی کے جوتے کے تسمے سے بھی قریب تر ہے اور یہی حال جہنم کا بھی ہے]

بعض اہلِ علم نے آیت کریمہ ﴿لَا تَقُمْ فِيْهِ أَبَدًا﴾ [التوبة: ١٠٨] [مسجد ضرار میں کبھی کھڑا نہ ہو] سے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ جس جگہ غیر اللہ کے لیے کوئی جانور ذبح کیا گیا ہے، وہاں اللہ کے لیے ذبح نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مقبول کو مسجد ضرار میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور آپ کے واسطے سے امت کو بھی یہی حکم ہے۔ اس استدلال کی صورت یہ ہے کہ جب مسجد ضرار میں نماز ممنوع ہوئی تو ذبح لغیر اللہ کی جگہ میں ذبح اور قربانی سے بچنا بدرجہا واجب ہوگا، کیونکہ وہ جگہ اللہ کے غضب کا مقام ہے۔ اللہ نے نماز اور ذبح کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے، اس لیے یہ قیاس بہت صحیح اور جلی ہے۔

---

[1] الزهد للإمام أحمد (١٥) نیز دیکھیں: تيسير العزيز الحميد (١/ ٢٤٢)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٤٨٨)

مقام شرک میں نذر پوری کرنا حرام ہے:

ایک شخص نے نذر مانی تھی کہ وہ مقام بوانہ[1] میں اونٹ ذبح کرے گا۔ جب اس نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا: کیا وہاں جاہلیت کا کوئی بت پوجا جاتا تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ فرمایا: وہاں پر ان کی کوئی عید (میلہ) ہوتی تھی؟ کہا: نہیں۔ فرمایا: تم اپنی نذر پوری کرو۔ البتہ وہ نذر پوری نہیں کرنا جو اللہ کی معصیت میں ہو اور جس کا انسان مالک نہ ہو۔[2] (رواہ أبو داود)

معلوم ہوا کہ معصیت کا اثر زمین پر بھی ہوتا ہے، جس طرح طاعت و نیک کام کا اثر ہوتا ہے۔

کفار و مشرکین کے تہواروں میں شرکت کا حکم:

عید معتاد طریقے پر منعقد اجتماع عام کو کہتے ہیں، چاہے وہ ہر سال ہو یا ہر ماہ یا ہر ہفتے میں ہو۔ یہاں پر مراد اہلِ جاہلیت کا اجتماع معتاد ہے، جہاں وہ اپنی عادات و عبادات کو بجا لائیں۔ اس میں کسی معین یا مطلق جگہ کی کوئی قید نہیں ہے۔ لفظ عید کا اطلاق زمان و مکان دونوں پر ہوتا ہے، جیسے جمعہ کے دن کو عیدِ مسلمین فرمایا ہے اور اپنی قبر مبارک کو عید بنانے سے منع کیا ہے۔ بہر حال حدیث مذکور اس بات کی دلیل ہے کہ مشرکین و کفار کی مشابہت کا قصد نہ ہو تو بھی ان کی عیدوں اور میلوں میں شرکت و مشابہت سے اجتناب کرنا ضروری ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر مشرکوں کے مراسم اور اعیاد عبادت یا عادت میں شرکیہ اعمال سے خالی ہوں، تب بھی مشرکوں کے ساتھ ان میں جمع ہونا درست نہیں ہے، کیونکہ محض ان کی تعداد میں کثرت کا باعث ہونا بھی ایک معصیت ہے، لیکن اہلِ زمانہ نے اس باب میں نہایت مسامحت اور بے پروائی اختیار کی ہے۔ یہ بات عام ہے کہ ہر ایسے کام میں جسے شیطان نے ان کی نظروں میں زینت و آرائش بخشی ہے، وہ مشرکوں کے ساتھ مجتمع ہوتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ معاصی کفر و شرک کا ذریعہ ہیں۔ اس جگہ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اہلِ بدعت کے مجمع تعزیہ داری اور قبورِ صلحا کے پاس میلوں اور عرسوں میں اہلِ بدعت کے ساتھ شریک ہونا سخت گناہ ہے۔ یہ بدعت انجام کار میں کفر و شرک تک پہنچا دیتی ہے۔

---

[1] "بوانہ" مدینے کے قریب ایک پہاڑ ہے۔

[2] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٢٨٩)

غیر اللہ کی نذر:

اسی طرح اللہ کے سوا کسی کے لیے بھی نذر ماننا شرک ہے، کیونکہ نذر ایک عبادت ہے اور عبادت اللہ کے سوا کسی کی کرنی جائز نہیں ہے، اسی لیے صرف اسی نذر کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ کے لیے مانی گئی ہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُوفُونَ بِالنَّذْرِ﴾ [الدهر: ٧] [نذر پوری کرتے ہیں]

نذر وہ طاعت ہے جس سے کسی کا تقرب حاصل کیا جائے، جب وہ تقرب غیر اللہ کے ساتھ کیا گیا تو شرک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ﴾ [الأعراف: ١٣٨]

[اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرایا تو وہ ایک قوم کے پاس سے گزرے جو اپنے بتوں پر بیٹھے رہتے تھے]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بتوں کے مجاورین اور خادمین کو نذر و نیاز دینا معصیت ہے، یہی حال اس نذر کا ہے جو کسی قبر و مشہد کے مجاور کو دی جائے۔ پھر یہ نذر اگر اس کی خانقاہ، زاویے اور حاضر ہونے کی جگہ وغیرہ کی تعظیم کے لیے ہے یا مقبور و مدفون شخص کی تکریم کے واسطے ہے تو بالکل باطل ہے۔ اگر نذر اس بنیاد پر مانی ہے کہ وہ مزارات یا قبر والے بلاؤں کو دور کرنے یا نعمتوں و راحتوں کو فراہم کرنے والے ہیں اور ان کی نذر و نیاز کرنے سے آفات و امراض دور ہوتے ہیں تو پھر یہ شرک جلی ہوا۔ قبور پر چراغ جلانا، تیل صرف کرنا، خواہ کسی پیغمبر کی قبر ہو یا کسی صالح وولی کی، بالکل باطل ہے۔ نذر وہی صحیح ہوتی ہے جو اللہ کے لیے ہو۔

صحیحین میں ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نذر ماننے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے: ''نذر کسی شے کو رد نہیں کرتی، بلکہ اس حیلے سے بخیل کا مال نکالا جاتا ہے۔''[1]

دوسری حدیثوں میں نذر طاعت کی اجازت دی گئی ہے اور نذر معصیت سے نہی وارد ہوئی ہے، جس سے اللہ کے لیے نذر ماننے کا جواز ثابت ہوتا ہے، پھر بھی ترک نذر افضل ہے۔ صحابہ کرام

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٦٩٣) صحيح مسلم (٣/ ١٢٦١)

نماز، روزے، زکات اور حج وعمرے کی نذر مانتے تھے تو اللہ نے ان کا نام ''أبرار'' رکھا ہے۔

نذر کا کفارہ وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے۔[1] مساجد و کعبہ کی آرایش و زیبایش کرنے کے لیے نذر کرنا یا فاسقوں وبدعملوں کو نذر کا مال دینا جس سے ان کو معصیت پر مدد ملے، مخالفِ شرع اور ناجائز امر ہے، اسی طرح ایسی چیز کی نذر جو مشروع تو ہے، مگر اس کو پورا کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس کو پورا کرنا بھی واجب نہیں ہے، البتہ اس کا کفارہ دینا چاہیے۔ اگر کسی مشرک نے قربت اور نیک کام کی نذر کی تھی، پھر وہ مسلمان ہوگیا تو اس کو پورا کرنا لازم ہے۔ نذر ثلث مال (۱/۳) سے زیادہ میں نافذ نہیں ہوتی ہے۔

استعاذہ بغیر اللہ:

غیر اللہ کی پناہ پکڑنا شرک ہے۔ اس کو استعاذہ بغیر اللہ کہتے ہیں۔ یعنی اللہ کے سوا کسی کی پناہ پکڑنا۔ جس کی پناہ پکڑی جائے، اس کو ''معاذ'' اور ''ملجا'' بولتے ہیں۔ عیاذ دفعِ شر کے لیے بولا جاتا ہے، اس کے مقابل ''لیاذ'' طلبِ خیر کے لیے ہے۔ استعاذہ باللہ (اللہ کی پناہ پکڑنا) ایک عبادت ہے جس کا حکم اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے۔ ارشاد ہے:

1. ﴿فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ [الأعراف: ۲۰۰]

[اللہ کی پناہ چاہو، بے شک وہ سننے جاننے والا ہے]

2. ﴿اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ﴾ [الفلق: ۱] [میں پناہ پکڑتا ہوں صبح کے رب کی]
3. ﴿أَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ﴾ [الناس: ۱] [میں پناہ پکڑتا ہوں لوگوں کے رب کی]

اس لیے جو کوئی غیر اللہ کے لیے یہ عبادت کرتا ہے، وہ مشرک فی العبادۃ اور غیر اللہ کا پجاری ٹھہرتا ہے، وہ اللہ کا عابد اور پرستار نہیں ہوتا۔ جاہلیت میں کچھ لوگ جنوں سے استعاذہ کرتے اور کہتے تھے: ''أعوذ بسيد هذا الوادي''[2] [میں اس علاقے کے سردار کی پناہ پکڑتا ہوں] اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت کی۔

فتح المجید میں مذکور ہے کہ علما کا اجماع ہے کہ استعاذہ بغیر اللہ جائز نہیں ہے۔[3]

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (١٦٤٥)

[2] تاريخ دمشق (١٦/ ٣٤٨) تفسير ابن كثير (٤/ ٥٥٠)

[3] فتح المجيد (ص: ١٥٥)

خولہ بنت حکیم رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو کوئی کسی منزل میں اترے اور ﴿أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ [میں اللہ کے پورے کلمات کے ذریعے سے پناہ چاہتا ہوں ان سب چیزوں کی برائی سے جن کو اس نے پیدا کیا] کہے تو اس کو کوئی چیز نقصان نہیں دے گی، جب تک اس جگہ سے کوچ کرے۔'' (رواہ مسلم)[1]

اللہ تعالیٰ نے استعاذۂ جاہلیت کے عوض یہ استعاذہ مشروع کیا ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ مخلوق سے استعاذہ کرنا شرک ہے، چاہے جن سے ہو یا غیر جن سے۔ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جن تعویذوں اور منتروں کے معنی معلوم نہ ہوں، ان سے اہلِ علم نے اس ڈر سے منع کیا ہے کہ کہیں ان میں مخلوق کے ساتھ استعاذہ نہ ہو، کیونکہ یہ شرک ہے۔[2]

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جو کوئی کسی شیطان سے استعاذہ کرتا ہے، وہ اس کا عابد ہے، گو اسے عبادت نہ کہے، بلکہ اس کا نام استخدام رکھے۔ شیطان کے لیے یہ استخدام اس کو شیطان کا خادم بنا دیتا ہے، کیونکہ شیطان اس کے لیے کچھ بھی عاجزی وفروتنی نہیں کرتا ہے۔[3]

دعاے مذکور میں لفظ ﴿شَرِّ مَا خَلَقَ﴾ ہر مخلوق کے شر کو شامل ہے، خواہ وہ حیوان ہو یا انسان وجن، زہر دار کیڑا ہو یا چوپایا، آندھی ہو یا بجلی، یا دین و دنیا میں کوئی بھی بلا ہو۔ امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ خبر صحیح اور قول صادق ہے۔ ہمیں اس کا صدق تجربے سے معلوم ہو چکا ہے۔ جب سے میں نے اس حدیث کو سنا ہے، اس پر عمل کرتا ہوں اور مجھ کو کسی شے نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔ ایک بار بچھو نے ڈنک مارا تو میں نے جی میں سوچا: اس کا کیا سبب ہے؟ یاد آیا کہ اس دن میں ان کلمات کو پڑھنا بھول گیا تھا۔[4]

استغاثہ بغیر اللہ:

استغاثہ کہتے ہیں مشکل کشائی کے لیے فریاد کرنا اور پکارنا۔ یعنی استغاثہ بھی دعا ہے، لیکن یہ

---

[1] صحیح مسلم (٤/ ٢٠٨٠، ٢٠٨١)

[2] مجموع الفتاویٰ لابن تیمیة (١٩/ ١٣)

[3] بدائع الفوائد لابن القیم (٢/ ٤٦١)

[4] تیسیر العزیز الحمید (١/ ٢٧١) الفتوحات الربانیة لابن علان (٣/ ٩٤)

شدت و مصیبت کے ازالے کے لیے خاص ہے، جبکہ دعا عام ہوتی ہے۔ دونوں میں عموم وخصوص مطلق کی نسبت ہے، یعنی ہر استغاثہ دعا ہے اور ہر دعا استغاثہ نہیں ہے۔ دعا کی دو قسمیں ہیں۔ دعاے عبادت اور دعاے مسئلہ۔ قرآن پاک میں کبھی یہ، کبھی وہ اور کبھی دونوں دعائیں مراد ہوتی ہیں۔ اس کا ضابطہ یہ ہے کہ جو امر اللہ کی طرف سے مشروع و مامور بہ ہوتا ہے، اس کو غیر اللہ کے لیے کرنا شرک ہوتا ہے۔ جو کوئی کسی ولی سے یوں کہتا ہے:

”يا سيدي فلان! انصرني وأغثني و ارزقني وعافني“

[اے میرے فلاں آقا! میری مدد کر، میری فریاد رسی کر، مجھے رزق عطا کر اور مجھے عافیت دے]

یا کہتا ہے: ”أنا في حفظك وحمايتك ورعايتك“

[میں تیری حفاظت، حمایت اور نگہبانی میں ہوں]

یا اس قسم کے اقوال کہتا ہے تو یہ سب شرک وضلال ہے، اس سے توبہ کرانی چاہیے، اگر توبہ کر لے تو ٹھیک ہے، ورنہ وہ ہلاک ہو گیا۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ انواعِ شرک میں سے ایک نوع مُردوں سے حوائج طلب کرنا اور ان سے استغاثہ و استعانت کرنا ہے۔ دنیا جہان کا اصل شرک یہی ہے، حالانکہ میت کا عمل موت ہوتے ہی منقطع ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جان کے نفع وضرر کا تو مالک ہی نہیں رہتا، پھر مستغیث و مستعین کو کیا نفع دے گا؟ جب اس نے میت سے یہ کہا کہ اللہ کے پاس ہماری سفارش کر تو یہ سائل کی بالکل جہالت وحماقت ہے کہ شفیع ومشفوع کے حال کی اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے۔[1]

شیخ صنع اللہ حنفی نے ان لوگوں کے رد میں ایک کتاب لکھی ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ اولیا اپنی حیات میں اور بعد الممات بھی تصرف والے ہوتے ہیں۔ مصنف موصوف نے اَبدال و اَوتار، نقبا ونجبا، غوث وقطب اور قبروں پر نذر و نیاز وغیرہ سب کا انکار کیا اور کہا ہے کہ ان سب امور میں شرک کی بدبو، کتاب وسنت سے مصادمت، عقائدِ ائمہ ملت اور اجماعِ امت کی مخالفت جیسی خرابیاں پائی جاتی ہیں۔[2] پھر تصرفاتِ اولیا کے قول کا رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت ﴿ءَ اِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ﴾ [النمل: ٦٠، ٦١، ٦٢، ٦٣، ٦٤] [کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے] اور آیت ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ﴾

---

[1] مدارج السالكين (١/ ٣٤٦)

[2] سيف الله على من كذب على أولياء الله للشيخ صنع الله الحلبي الحنفي المكي (ص: ٢٢- ٢٣)

[الأعراف: ٥٤] [سنو! اللہ ہی کے لیے خلق اور امر ہے] اور آیت ﴿وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ [المائدة: ١٧، ١٨] [اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی حکومت ہے] وغیرہ آیات اس بات پر دلیل ہیں کہ خلق، تدبیر، تصرف اور تقدیر میں اللہ تعالیٰ منفرد ہے، کسی غیر کو خلق وامر میں کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ سب اللہ کے حکم وقہر اور تصرف کے تابع ہیں۔ پیدا کرنا، مارنا اور جلانا صرف اسی کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ﴾ [الفاطر: ١٣]

[اور اللہ کے سوا جن کو تم پکارتے ہو وہ گٹھلی کے چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں]

﴿دُوْنِهٖ﴾ کا لفظ عام ہے، اس میں اللہ کے سوا ہر ولی اور شیطان داخل ہے، تو جس کو اپنی جان پر قدرت نہ ہو، وہ غیر کی کیا مدد کرے گا؟ غیر اللہ کے تصرف کا عقیدہ شرک عظیم ہے۔ رہا یہ قول کہ اولیا وغیرہ موت کے بعد تصرف کرتے ہیں تو یہ پہلے قول (تصرف فی الحیاۃ) سے بھی بدتر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾ [المدثر: ٣٨]

[ہر شخص اپنے کاموں کے ساتھ گرفتار رہے گا]

ایک حدیث میں آیا ہے:

«إِذَا مَاتَ ابْنُ آدَمَ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ»[1]

[جب انسان مر جاتا ہے تو اس کا عمل منقطع ہو جاتا ہے، سوائے تین باتوں کے]

یہ سب آیات واحادیث اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ میت کی ہر حس اور حرکت ختم ہو جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ مردوں کی روحیں روک لی جاتی ہیں اور ان کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ وہ بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فَيُمْسِكُ الَّتِيْ قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ﴾ [الزمر: ٤٢]

[پھر اس کو رکھ چھوڑتا ہے جس پر موت کا حکم لگا رکھا ہے]

جب میت کو اپنی ذات ہی میں کوئی تصرف باقی نہیں رہتا اور نفس حرکت سے عاجز ہو گیا ہے تو

---

[1] صحیح مسلم (٣/ ١٢٥٥)

وہ دوسرے میں کیا تصرف کرے گا؟ اللہ سبحانہ تو یہ کہتا ہے کہ اَرواح اس کے پاس ہیں، جبکہ یہ ملحدین کہتے ہیں کہ اَرواح بااختیار و متصرف ہیں۔ ﴿قُلْ ءَ اَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ﴾ [البقرة: ١٤٠] [کہہ دو کہ تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟] ان کا یہ کہنا کہ یہ سارے تصرفات اولیا کی کرامات ہیں، محض مغالطہ دہی ہے، اس لیے کہ کرامت اللہ کی عطا کردہ چیز ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے، اس سے نوازتا ہے۔ یہ شے ان کے قصد و ارادے اور اختیار سے ظاہر نہیں ہوتی، جیسا کہ مریم علیہا السلام، اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ اور ابو مسلم خولانی رحمہ اللہ کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔[1] رہا اموات سے استغاثے کا اعتقاد تو یہ پہلے دونوں قولوں سے زیادہ قبیح و شنیع اور قرآنی آیات سے متصادم ہے۔

امور حسیہ میں سے اسباب ظاہرہ عادیہ سے استغاثہ کرنا جائز ہے، جیسے قتال و جہاد یا کسی دشمن یا درندے کا سامنا ہونے کے وقت یہ پکارنا کہ اے زید! اے مسلمانو! رہے امور معنویہ تو ان میں کسی کی قوت و تاثیر سے استغاثہ بالکل جائز نہیں ہے، جیسے مرض، خوفِ غرق، تنگ دستی و فقیری اور طلبِ رزق وغیرہ کہ یہ سب باتیں اللہ کے خصائص میں سے ہیں۔[2]

حاصل یہ ہے کہ اہلِ علم ہمیشہ ان امور شرکیہ کا انکار کرتے رہے ہیں۔ اگر سب کا کلام جمع کیا جائے تو ایک دفتر بے پایاں ہو جائے۔

نفع و نقصان کا مالک:

اللہ تعالیٰ اپنے رسول مقبول کو حکم دے رہا ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَ لَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَ مَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ﴾ [الأعراف: ١٨٨]

[اے پیغمبر! کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے نفع و نقصان کا بھی مالک نہیں ہوں مگر جو اللہ چاہے، اور اگر میں غیب کی بات جانتا تو اپنے لیے بہت سی بھلائی حاصل کر لیتا اور مجھے تکلیف نہ پہنچتی]

---

[1] سیدہ مریم علیہا السلام کا قصہ قرآن مجید میں موجود ہے۔ دیکھیں: سورت آل عمران (آیت: ٣٧) سیدنا اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ صحیح البخاري، رقم الحدیث (٣٨٠٥، ٤٧٣٠) صحیح مسلم، رقم الحدیث (٧٩٦) اور ابو مسلم خولانی والا قصہ تاریخ دمشق (٩/ ١٩) اور سیر أعلام النبلاء (٤/ ٨۔٩) میں مذکور ہے۔

[2] تیسیر العزیز الحمید (١/ ٢٩٨)

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿قُلْ إِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا رَشَدًا ۝ قُلْ إِنِّي لَن يُجِيرَنِي مِنَ اللَّهِ أَحَدٌ وَلَنْ أَجِدَ مِن دُونِهِ مُلْتَحَدًا ۝ إِلَّا بَلَاغًا مِّنَ اللَّهِ وَرِسَالَاتِهِ﴾

[الجن: ۲۱، ۲۲، ۲۳]

[اے پیغمبر! کہہ دو میں تمھارے نقصان ونفع کا مالک نہیں ہوں، کہہ دو مجھ کو ہرگز اللہ سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا اور مجھ کو ہرگز اللہ کے سوا کوئی جاے پناہ نہیں مل سکتی، صرف اللہ کا حکم اور اس کا پیغام پہنچانا میرا کام ہے]

یعنی میں نہ اپنی ذات کے فائدے ونقصان کا مالک ہوں نہ تمھارے لیے نفع وضرر کا اختیار رکھتا ہوں اور میں غیب داں بھی نہیں ہوں، اگر علم غیب رکھتا تو بہت کچھ اپنا ہی بھلا کر لیتا۔

ملحدین کا عقیدہ:

اس کے خلاف ملحدین یہ کہتے ہیں کہ اولیا وصلحا قبر کے اندر سے ہمارے نفع وضرر کے مالک ہیں، چنانچہ قبر پرست قبروں سے ساری حاجتیں مانگتے ہیں اور پیر پرست ارواحِ اولیا کا تصرف ثابت کرتے ہیں۔ نعوذ باللّٰه منه. انھوں نے اشخاصِ امت اور افرادِ ملت کو رسول مقبول ﷺ سے زیادہ بزرگ اور خدا رسیدہ سمجھ لیا ہے کہ سید المرسلین تو اپنے اور دوسرے کے نفع ونقصان کے مالک نہ ہوں، لیکن اہلِ قبور سارے عالم میں تصرف کریں، مخلوق کی حاجت روائی فرمائیں، انھیں روحانی فیض بخشیں، اپنے سائلوں اور فریادیوں کے حال سے واقف ہوں اور اللہ کے رسول ﷺ بے خبر ہوں۔

اللہ اکبر! اس کفر وشرک اور بے ادبی کا کیا ٹھکانا ہے؟ اس عقیدے وعمل سے صراحتاً شرک جلی ثابت ہو جاتا ہے۔ اللہ پاک نے تو یوں فرمایا ہے: ﴿لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ﴾ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ پھر فرمایا ہے: ﴿أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ﴾ [یوسف: ۴۰] یعنی اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ یہ خطاب تمام لوگوں کو شامل ہے۔ انبیا ہوں یا صلحا وغیرہ ان سب کو اخلاصِ عبادت کا حکم اور عبادتِ غیر سے نہی ہے، خواہ وہ عبادت چھوٹی ہو یا بڑی، ظاہر ہو یا باطنی، خواہ کسی حالت میں ہو، تنگی ہو یا آسانی، نشاط ہو یا کراہت، راحت ہو یا شدت؛ ہر حال میں اسی ایک اللہ کی عبادت کرنی ضروری ہے۔ یہی وہ دینِ حق ہے، جو سب رسولوں کو دے کر بھیجا گیا تھا اور جس کے لیے یہ ساری کتابیں

اتری تھیں، اسی کو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے۔

صحیح بخاری میں جبریل علیہ السلام کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

«أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا»[1]

[اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو]

یہ بات شکوک و شبہات سے بالا تر ہے کہ تمام انبیا و صلحا اللہ کے عابد و پرستار ہیں، لیکن اب ان ملحدین نے ان عباد کو معبود بنا لیا ہے اور معاملے کو الٹ دیا ہے۔ یہی معبود قیامت کے دن ان کے شرک کے منکر ہو جائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کریں گے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ﴾ [الفاطر: ١٤]

[قیامت کے دن وہ تمھارے شرک کا انکار کریں گے]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ۝ كَلَّا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا﴾ [مريم: ٨١، ٨٢]

[اور ان مشرکوں نے اللہ کے سوا دوسروں کو معبود بنا لیا ہے، تاکہ وہ ان کے لیے عزت ہوں۔ ہرگز نہیں، وہ ان کی عبادت کا انکار کریں گے اور ان کے دشمن ہو جائیں گے]

غرض کہ جو کوئی ایسا کام کرتا ہے جو اہلِ کفر کا عمل ہے یا ایسی بات کہتا ہے جو اہلِ کفر کی باتوں جیسی ہے تو وہ ان آیات کا مصداق ہے جو اہلِ کفر کی شان میں آئی ہیں، گو وہ اپنے بارے میں یہ گمان بلکہ یقین کرے کہ وہ مسلمان ہے۔ جس طرح کوئی کافر اگر اسلام کی کوئی خصلت بجا لائے اور کلمۂ اسلام زبان سے کہے، لیکن دل سے تصدیق نہ کرے تو وہ اتنی بات سے مسلمان نہیں ہوتا۔ شرک ایمان اور کفر کے درمیان ایک مشترک شے ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَ هُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ [يوسف: ١٠٦]

یعنی اقرارِ ایمان کے باوجود اکثر لوگ مشرک ہوتے ہیں، اس کے مقابل توحید اور اخلاصِ عبادت

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٠)

ایک ایسی شے ہے جس میں کوئی اشتراک نہیں ہے، اس میں کوئی کافر و مشرک شریک نہیں ہوتا ہے، اسی لیے اہلِ توحید کے سوا کوئی بشر بھی اخلاصِ توحید اور اتباع کے ساتھ متصف نہیں ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ﴾ [ص: ٤٦]

[ہم نے ان کو خالص آخرت کی یاد کے لیے چن لیا]

رسول اللہ ﷺ کو یہ خطاب ہے:

﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ﴾ [آل عمران: ۱۲۸] [تمھیں کام میں کوئی دخل نہیں]

اس میں خاص رسول اللہ ﷺ سے اختیار و تصرف کی نفی فرمائی گئی ہے، تو پھر اولیا کو کہاں سے تصرف و اختیار حاصل ہوا؟

جب یہ آیت نازل ہوئی تھی: ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ [الشعراء: ٢١٤] تو رسول اللہ ﷺ نے ہر ایک سے کہا تھا:

«لَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا»[1] [میں تمھارے کسی کام نہیں آ سکتا]

مطلب یہ کہ اللہ کے عذاب سے ایمانِ خالص، توحیدِ کامل اور عملِ صالح کے سوا کوئی کسی کو نجات نہیں دے سکتا ہے۔

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٧٧١) صحيح مسلم (١/ ١٩٣)

ساتواں باب

مسئلہ شفاعت وغیرہ کا بیان

قرآنی آیات:

قیامت کے دن شفاعت کے بارے میں چند آیات قرآنیہ حسب ذیل ہیں:

① ﴿وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٨]

[اور وہ سفارش نہیں کر سکتے مگر جس کے لیے اللہ کی مرضی ہو اور وہ اس کی ہیبت سے خوف زدہ ہیں]

② ﴿مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا شَفِيْعٍ﴾ [السجدة: ٤]

[اس کے سوا تمھارا کوئی سرپرست اور سفارشی نہیں ہے]

③ ﴿قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا﴾ [الزمر: ٤٤]

[اے پیغمبر کہہ دو کہ ساری سفارش اللہ کے اختیار میں ہے]

④ ﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا﴾ [طٰه: ١٠٩]

[اس دن کسی کی شفاعت فائدہ نہ دے گی مگر جس کو رحمن سفارش کرنے کی اجازت دے اور اس کی بات پسند کرے]

⑤ ﴿لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا إِلَّا مِنْ بَعْدِ أَنْ يَّأْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَرْضٰى﴾ [النجم: ٢٦]

[ان کی سفارش کچھ کام نہیں آ سکتی، مگر اس کے بعد کہ اللہ حکم دے جس کے لیے چاہے اور پسند کرے]

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ شفاعت قیامت کے دن اسی کی ہوگی جس کو اللہ پسند کرے گا،

کیونکہ ساری شفاعت اللہ کے لیے ہے، اس کے حکم واجازت کے بغیر کوئی کسی کا شفیع نہیں ہو سکتا ہے۔

⑥ ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ [البقرة: ۲۵۵]

[کون ہے جو اس کے پاس اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکتا ہے؟]

احادیثِ نبویہ:

① ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا:

"من أسعد الناس بشفاعتك يوم القيامة؟"

[اے اللہ کے رسول! لوگوں میں سب سے بڑا خوش نصیب کون ہے جسے قیامت کے دن آپ کی شفاعت حاصل ہوگی؟]

آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ خَالِصًا مِنْ قَلْبِهٖ»[1]

[جس نے سچے دل سے اقرار کیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے]

معلوم ہوا کہ شفاعت اہلِ اخلاص کے لیے ہوگی جس نے کسی طرح کا شرک نہیں کیا اور وہ بھی اللہ کے حکم و اجازت سے ہوگی۔ کسی شفیع کی خود مختاری اور خود رائی نہیں چلے گی۔ قرآن پاک میں جس جگہ شفاعت کی نفی ہے، یہ وہ شفاعت ہے جس میں شرک ہے، یعنی مشرک کی شفاعت نہ ہوگی۔ جس شفاعت کا اثبات ہے، اس سے مراد وہ شفاعت ہے جس میں اخلاصِ توحید ہے، مگر یہ شفاعت اذنِ الٰہی سے ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ پہلے شفاعت شروع نہیں کریں گے، بلکہ سجدے میں گریں گے، پھر جب اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی، تب شفاعت کے لیے لب کشائی کریں گے، پھر ان ہی لوگوں کی شفاعت کریں گے جو موحد ہیں، نہ کہ مشرکوں کی جو قبر پرست ہیں۔ حدیث مذکور بخاری اور نسائی میں مروی ہے۔

② مسند احمد اور صحیح ابن حبان میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں یہ الفاظ مروی ہیں:

«شَفَاعَتِيْ لِمَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا، يُصَدِّقُ قَلْبُهٗ لِسَانَهٗ وَلِسَانُهٗ قَلْبَهٗ»[2]

[میری شفاعت اس کے لیے ہوگی جس نے لا الہ الا اللہ اخلاص کے ساتھ کہا کہ اس کا دل اس کی زبان کی اور اس کی زبان اس کے دل کی تصدیق کرتی ہو]

---

[1] صحيح البخاري، رقم الحديث (٩٩، ٦٥٧٠)

[2] مسند أحمد (٢/ ٣٠٧) سنن النسائي الكبرى (٦/ ١٢) صحيح ابن حبان (١٤/ ٣٨٤)

اس کو امام احمد رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے۔

④ صحیح مسلم میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں یوں مروی ہے:

«إِنِّي اخْتَبَأْتُ دَعْوَتِي شَفَاعَةً لِأُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَهِيَ نَائِلَةٌ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مَنْ مَاتَ لَا يُشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا»[1]

[میں نے قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کے لیے اپنی دعا چھپا رکھی ہے، اللہ چاہے تو یہ شفاعت ہر اس شخص کو پہنچے گی جو شرک پر نہ مرا ہو]

یہ حدیث اس بارے میں نص صریح ہے کہ جس مشرک کی موت شرک جلی یا خفی پر واقع ہوئی ہے، اس کی شفاعت نہیں ہوگی۔ مشرکین کا یہ اعتقاد کہ جن کو ہم نے اپنا ولی یا شفیع ٹھہرایا ہے، وہ ہمارے سفارشی اور سعی کار ہو کر ہم کو عذابِ الٰہی سے بچائیں گے، جس طرح کہ بادشاہوں کے خواص ومقربین سفارش کر کے لوگوں کا کام نکال دیتے ہیں، تو یہ جہلِ عظیم اور انتہائی باطل عقیدہ ہے۔

شفاعت کی انواع:

شفاعت کی چھے قسمیں ہیں:

1. ایک شفاعت کبریٰ ہے جس سے انبیاے اولوا العزم اپنی جان چھڑائیں گے، یہاں تک کہ اس کی نوبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آئے گی اور آپ فرمائیں گے:

«أَنَا لَهَا»[2] [ہاں یہ شفاعت میں ہی کروں گا]

اس سے معلوم ہوا کہ شفاعت کبریٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مختص ہوگی، اس میں کوئی دوسرا آپ کا شریک نہ ہوگا۔

2. دوسری شفاعت وہ ہوگی کہ جنتی جنت میں داخل ہو جائیں۔ اس شفاعت کا ذکر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی متفق علیہ طویل حدیث میں آیا ہے۔[3]

3. تیسری شفاعت وہ ہوگی کہ گناہ گار موحدین جو جہنم کے حق دار ہوں گے، وہ جہنم میں نہ جائیں۔

---

[1] صحيح مسلم (١/ ١٨٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٧٠٧٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٣)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٤٤٣٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٩٤)

④ چوتھی شفاعت وہ ہوگی کہ جو موحدین گناہوں کے سبب آگ میں گئے ہیں، وہ اس سے نجات پائیں۔ اس بارے میں احادیث متواترہ آئی ہیں اور اس پر سارے صحابہ و اہلِ سنت کا اجماع ہے۔ جو کوئی اس شفاعت کا منکر ہے، اس کے خلاف ہر طرف سے رد و قدح ہوئی ہے اور وہ گمراہ قرار دیا گیا ہے۔

⑤ پانچویں شفاعت وہ ہوگی کہ اہلِ جنت کو زیادہ ثواب ملے اور ان کے درجات بلند تر ہوں، اس میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

⑥ چھٹی وہ شفاعت ہے کہ بعض کفار کے لیے یہ سفارش کی جائے گی کہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو۔ یہ شفاعت خاص ابو طالب کے لیے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [القصص: ٥٦]

[آپ جس کو چاہیں ہدایت نہیں کر سکتے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے]

یہ آیت خاص ابو طالب کے حق میں نازل ہوئی ہے۔[1] نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ﴾ [البقرة: ٢٧٢]

[آپ کے ذمے ان کو راستے پر لگا دینا نہیں ہے، لیکن اللہ جسے چاہتا ہے راستے پر لگا دیتا ہے]

اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا ہے:

﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ [يوسف: ١٠٣]

[اور اکثر لوگ ایسے ہیں جو ایمان نہ لائیں گے خواہ آپ کتنی ہی حرص کریں]

ہدایت اور نفع و نقصان کی توفیق صرف اللہ کے پاس ہے:

ان آیات سے معلوم ہوا کہ ہدایت کی توفیق خاص اللہ کے ہاتھ میں ہے اور یہ قدرت اسی کو ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت دے، اس کے سوا کوئی کسی کو ہدایت نہیں دے سکتا۔ اگر ہدایت کی توفیق دینا رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ میں ہوتا تو آپ ﷺ کے چچا ابو طالب ہی کو ہدایت مل جاتی اور آپ ان کو عذاب جہنم سے بچا لیتے، حالانکہ مرتے وقت ابو طالب نے یہی کہا تھا کہ میں ملتِ عبدالمطلب پر ہوں، اسے ایمان نصیب نہ ہوا۔ پس جس صورت میں خود رسول اللہ ﷺ اللہ کے حکم کے بغیر ابو طالب

[1] تفسیر ابن کثیر (٣/ ٥٢٣)

کو کچھ نفع نہ پہنچا سکے تو پھر وہ کون ولی، پیر اور مرشد ہیں جو قبر پرستوں کو نفع پہنچا سکیں گے اور ان کی شفاعت کر کے عذابِ الٰہی سے نجات دلائیں گے؟

ہمارے رسول ﷺ افضل الخلائق اور اقرب الی اللہ ہیں۔ اللہ کے نزدیک آپ کا مرتبہ بہت عظیم ہے۔ آپ کو ابو طالب کی حیات میں اور موت کے وقت ان کی ہدایت واسلام کی بڑی حرص تھی، لیکن یہ بات آپ کو میسر آئی نہ آپ کو اس کی قدرت حاصل ہوئی، پھر جب ان کی موت کے بعد ان کے لیے استغفار کرنا چاہا تو اللہ کی طرف سے منع کر دیا گیا، جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے رسول بھی کسی کے نفع وضرر اور عطا ومنع کے مالک نہیں ہیں۔ سب کام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہے ہدایت کرے اور جس کو چاہے گمراہ کرے، وہ جسے چاہے ثواب دے اور جسے چاہے عذاب کرے۔ جس کو چاہے نفع بخشے اور جس کو چاہے نقصان پہنچائے۔

قرآن مجید کی آیاتِ صریحہ اس بات پر واضح دلیل ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی ذات کے نفع ونقصان کے مالک ہیں نہ اللہ کے خزائن ان کے ہاتھ میں ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَکُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ﴾ [الأنعام: ٥٠]

[اے پیغمبر کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب جانتا ہوں]

ان آیات واحادیث کی سماعت کے بعد کس طرح کسی مومن کے دل میں یہ بات آسکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب، نفع وضرر کے مالک اور کارخانۂ الٰہی کے مختار ہیں؟ اللہ تعالیٰ ایسے دشمنانِ اسلام اور عاشقانِ شرک کو ہلاک کرے جو مدح نبوی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں اور بے حد غلو کرتے ہیں۔ کسی کو یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ رسول اللہ ﷺ کو شفاعت کی اجازت دے گا یا نہیں۔

"تقوية الإيمان" سے مسئلہ شفاعت کا بیان:

"تقویۃ الایمان" میں مسئلہ شفاعت کی بابت جو تقریر مرقوم ہے، وہ نہایت سادہ اور دل نشیں ہے، جسے ہم ذیل میں ذکر کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا لِمَنْ اَذِنَ لَهٗ حَتّٰۤی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ قَالُوْا

مَاذَا قَالَ رَبُّكُمْ قَالُوا الْحَقَّ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيرُ﴾ [سبأ: ٢٣]

[اور اللہ کے یہاں کوئی سفارش کام نہیں آتی مگر جس کو اجازت دے، یہاں تک کہ جب ان کے دلوں سے گھبراہٹ دور ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا فرمایا تمھارے رب نے؟ کہتے ہیں کہ حق، اور وہی ہے بلند اور بڑا]

یعنی جو کوئی کسی سے مراد مانگتا ہے اور مشکل کے وقت اس کو پکارتا ہے، اس کے جواب میں وہ اس کی حاجت روائی کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ یا تو وہ خود مالک ہو یا مالک کا ساجھی یا مالک پر اس کا دباؤ ہو، جیسے بڑے بڑے امیروں کی بات کو بادشاہ ان کے دباؤ سے مان لیتا ہے، کیونکہ وہ اس کے بازو ہیں اور اس کی سلطنت کے رکن۔ ان کے ناخوش ہونے سے سلطنت بگڑتی ہے، یا وہ مالک سے سفارش کرے اور اسے اس کی سفارش قبول کرنی ہی پڑے، خواہ وہ دل سے خوش ہو یا ناخوش، جیسے بادشاہ اپنے شہزادوں یا بیگمات کی محبت سے ان کی سفارش رد نہیں کر سکتا ہے، چار و ناچار ان کی سفارش قبول کر لیتا ہے۔

لیکن یہاں حال یہ ہے کہ اللہ کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں، وہ نہ تو آسمان و زمین میں ایک ذرہ برابر چیز کے مالک ہیں اور نہ ان کا کچھ حصہ ہے، نہ وہ اللہ کی سلطنت کے رکن ہیں اور نہ اس کے بازو کہ ان سے دب کر اللہ ان کی بات مان لے، یہاں تک کہ وہ اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت بھی نہیں کر سکتے کہ اصرار کر کے اس سے کچھ دلوا دیں، بلکہ اس کے دربار میں ان کا حال یہ ہے کہ جب وہ کچھ حکم فرماتا ہے تو یہ سب رعب میں آ کر حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور ادب و دہشت سے دوسری بار اس بات کی تحقیق اس سے نہیں کر سکتے، بلکہ ایک دوسرے سے پوچھتا ہے اور جب آپس میں اس بات کی تحقیق کر لیتے ہیں تو "آمنا و صدقنا" کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پھر بات الٹنے کا کیا ذکر ہے اور کسی کی وکالت و حمایت کرنے کی کیا طاقت؟

دنیوی شفاعت کی قسمیں:

اس جگہ ایک بات بڑے کام کی ہے، جسے سن لینا چاہیے کہ اکثر لوگ انبیا و اولیا کی شفاعت پر بہت اترا رہے ہیں اور اس کے غلط معنی سمجھ کر اللہ کو بھول گئے ہیں، اس لیے پہلے شفاعت کی حقیقت سمجھ لینی چاہیے، شفاعت کہتے ہیں سفارش کو۔ دنیا میں شفاعت کئی طرح کی ہوتی ہے۔

پہلی صورت:

جیسے کسی بادشاہ کے یہاں کسی شخص کی چوری ثابت ہو جائے اور کوئی امیر و وزیر اس کو اپنی سفارش سے بچالے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ بادشاہ کا جی تو اس چور کر پکڑنے ہی کی خواہش کرتا ہے اور اس کے قانون کے موافق وہ چور سزا کا مستحق ہے، مگر اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے، کیونکہ وہ امیر اس کی سلطنت کا اہم رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے۔ اس موقع پر بادشاہ یہ مناسب سمجھتا ہے کہ اس وقت اپنے غصے کو ضبط کر لینا اور ایک چور سے درگزر کر جانا، اس سے بہتر ہے کہ اتنے بڑے امیر کو ناخوش کیا جائے، جس سے بڑے بڑے کام خراب ہو جائیں اور سلطنت کی رونق کم ہو جائے۔ اس کو ''شفاعتِ وجاہت'' کہتے ہیں، یعنی اس امیر کی وجاہت و مرتبت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کی گئی ہے۔

اس قسم کی سفارش اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی، لہٰذا جو کوئی کسی نبی، ولی، امام، شہید یا کسی فرشتے یا کسی پیر کو اللہ کی جناب میں اس قسم کا شفیع سمجھے، وہ اصل مشرک اور بڑا جاہل ہے کہ اس نے اللہ کا معنی نہ سمجھا اور اس مالک الملک وحدہ لا شریک لہ کی قدر نہیں پہچانی۔ اس شہنشاہ کی شان تو یہ ہے کہ ایک آن میں ایک حکم ''کُنْ'' سے چاہے تو کروڑوں نبی، ولی، جن اور فرشتے پیدا کر ڈالے اور ایک دَم میں سارا عالم عرش سے فرش تک الٹ پلٹ کر ڈالے اور ایک دوسرا عالم اس جگہ قائم کر دے، کیونکہ اس کے محض ارادے سے ہر چیز ہو جاتی ہے۔ کسی کام کے لیے اس کو اسباب وسامان جمع کرنے کی حاجت نہیں ہوتی۔

اگر بالفرض سب اگلے پچھلے جن وانس مل کر جبرئیل علیہ السلام اور افضل الانبیا علیہم السلام جیسے ہو جائیں تو اس مالک الملک کی سلطنت میں ان کے سبب سے کوئی رونق نہیں بڑھ جائے گی اور اگر سب لوگ شیطان اور دجال کی طرح ہو جائیں تو اس کی رونق میں کچھ کمی نہیں آئے گی۔ وہ ہر صورت میں سب بڑوں کا بڑا اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اس کا کوئی کچھ بگاڑ سکے گا نہ کچھ سنوار سکے گا۔

دوسری صورت:

اس چور کے بارے میں دوسری صورت یہ ہے کہ بادشاہ کا کوئی شہزادہ یا کوئی بیگم یا بادشاہ کا کوئی معشوق اس چور کا سفارشی ہو کر کھڑا ہو جائے اور چوری کی سزا نہ دینے دے، تو بادشاہ اس کی

محبت سے ناچار ہو کر اس چور کی تقصیر معاف کر دے۔ اس کو ''شفاعتِ محبت'' کہتے ہیں۔ یعنی بادشاہ نے محبت کے سبب سے اس کی سفارش قبول کر لی اور یہ بات سمجھی کہ ایک بار غصہ پی جانا اور ایک چور کو معاف کر دینا اس رنج سے بہتر ہے جو اس محبوب کے روٹھ جانے سے مجھ کو ہوگا۔

اس قسم کی شفاعت بھی دربارِ الٰہی میں کسی طرح ممکن نہیں ہے، لہٰذا جو کوئی کسی کو اللہ کے دربار میں اس قسم کا شفیع سمجھے تو وہ بھی ویسا ہی مشرک و جاہل ہے جیسا کہ پہلا مشرک تھا جس کا ذکر اس سے پہلے ہوا۔ اللہ وہ مالک الملک اور خود مختار ہے کہ اپنے بندوں کو طرح طرح سے نوازے، کسی کو حبیب، کسی کو خلیل، کسی کو کلیم اور کسی کو روح اللہ اور وجیہ کا خطاب بخشے، کسی کو رسول کریم ومکین اور روح القدس وروح الامین کے القاب عطا کرے، مگر پھر مالک مالک ہے اور غلام غلام۔ کوئی بندگی کے رتبے سے قدم باہر نہیں رکھ سکتا اور غلامی کی حد سے تجاوز نہیں کر سکتا، جیسا کہ ہمہ وقت اس کی رحمت سے خوشی خوشی محظوظ ہوتا ہے، ویسا ہی اس کی ہیبت سے رات دن کلیجا پھٹتا ہے۔

تیسری صورت:

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری تو ثابت ہوگئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں ہے اور چوری کو اس نے اپنا پیشہ نہیں بنایا، بلکہ نفس کی شامت سے قصور ہو گیا، جس پر وہ شرمندہ ہے۔ رات دن ڈرتا رہتا ہے۔ بادشاہ کے آئین کو سر اور آنکھوں پر رکھ کر اپنے کو قصور وار سمجھتا اور لائقِ سزا جانتا ہے، مگر بادشاہ سے بھاگ کر کسی امیر وزیر کی پناہ نہیں ڈھونڈتا، اس کے مقابلے میں کسی کی حمایت سے مطلب نہیں رکھتا اور رات دن اسی بادشاہ کا منہ دیکھ رہا ہے کہ وہ میرے حق میں کیا حکم صادر فرمائے؟ اس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر رحم آتا ہے، مگر آئینِ بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب اس کو درگزر نہیں کر سکتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں اس آئین کی قدر کم نہ ہو جائے، اس صورت میں کوئی امیر وزیر اس کی مرضی پا کر اس قصور وار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر کی عزت افزائی کے لیے ظاہر میں اس کی سفارش کا نام کر کے اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے، جب کہ اس امیر نے اس چور کی سفارش اس لیے نہیں کی ہے کہ وہ اس کا قرابتی یا حمایتی یا آشنا ہے، بلکہ محض بادشاہ کی مرضی سمجھ کر اس کی سفارش کی ہے، کیونکہ وہ تو بادشاہ کا امیر ہے نہ چوروں کا ساتھی کہ چور کا حمایتی بن کر سفارش کرتا، اس طرح تو وہ خود بھی چور ہو جاتا۔ اس کو ''شفاعت بالاِذن'' کہتے ہیں، یعنی یہ سفارش خود

مالک کی مرضی سے ہوتی ہے، اسی قسم کی شفاعت اللہ کی جناب میں ہو سکتی ہے۔ جس نبی اور ولی کی شفاعت کا ذکر قرآن و حدیث میں مذکور ہے، اس کے معنی یہی ہیں، اس لیے ہر بندے کو چاہیے کہ ہر دم اللہ ہی کو پکارے، اسی سے ڈرتا اور التجا کرتا رہے، اسی کے روبرو اپنے گناہوں کا قائل رہے، اسی کو اپنا مالک اور حمایتی سمجھے، جہاں تک خیال دوڑائے اللہ کے سوا کہیں اپنے لیے پناہ نہ جانے اور کسی کی حمایت پر بھروسا نہ کرے، کیونکہ وہ خود بڑا غفور رحیم ہے، سب مشکلیں اپنے ہی فضل سے کھول دے گا۔ سب گناہ اپنی ہی رحمت سے بخش دے گا اور جن کو چاہے گا، اپنے حکم سے اس کا شفیع بنا دے گا۔

غرض کہ جیسے اپنی ہر حاجت اس کو سونپنا چاہیے، اسی طرح حاجتِ شفاعت بھی اسی کے اختیار پر چھوڑ دی جائے، وہ جس کو چاہے ہمارا شفیع کر دے، ایسا نہ ہو کہ ہم کسی کی حمایت پر بھروسا کر بیٹھیں، اس کو اپنی حمایت کے لیے پکاریں، اس کو اپنا حمایتی سمجھ کر اصل مالک کو بھول جائیں اور اس کے اَحکام کو بے قدر کر کے اپنے خود ساختہ حمایتی کی راہ و رسم کو مقدم سمجھیں جو بڑی قباحت والی بات ہے اور سارے نبی اور ولی اس سے بے زار ہیں۔ وہ ہرگز ایسے لوگوں کے شفیع نہیں بنتے، بلکہ اس سے ناراض ہوتے اور الٹے اس کے دشمن بن جاتے ہیں، کیونکہ ان کی بزرگی یہی تھی کہ اللہ کی رضا کو اپنی بیوی، بیٹے، مرید، شاگرد، نوکر، غلام، دوست اور واقف کار سب کی خوشی پر مقدم رکھتے تھے۔ جب یہ لوگ اللہ کی مرضی کے خلاف کچھ کرتے تھے تو وہ ان کے دشمن ہو جاتے تھے، پھر یہ پکارنے والے لوگ ایسے کون سے چہیتے ہیں کہ وہ بزرگ لوگ ان کے حمایتی بن کر اللہ کی مرضی کے خلاف ان کی طرف سے اللہ کے حضور میں جھگڑنے بیٹھیں گے؟ بلکہ بات تو یوں ہے کہ "الحب للّٰه و البغض للّٰه" ان کی شان ہے، جس کے حق میں اللہ کی مرضی یہ ہوگی کہ اس کو دوزخ میں بھیجے تو وہ اسے دو چار دھکے اور دینے کو تیار ہیں۔[1]

تنبیہ:

اس مضمون کے بارے میں بعض نادانوں نے اعتراض کیا تھا، جس کا جواب خود صاحبِ کتاب نے کتاب و سنت کی روشنی میں فارسی میں لکھا۔[2] اس کے علاوہ موحدین کی ایک جماعت نے ہر مطلب کی دلیل شرعی دلائل سے ثابت کر دی ہے۔ ہماری کتاب ''دین خالص'' ان سب دلائل کی جامع ہے۔

---

[1] تقوية الإيمان (ص: ٣٧۔٤١) إدارة الفرقان، لاهور.

[2] اس جواب کا نام ''یک روزی'' تھا۔ دیکھیں: تصدیر "اکمل البیان" از مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی رحمہ اللہ (ص: ١٤) مکتبہ سلفیہ، لاہور۔

بعض شبہات کا ازالہ:

اس عبارت سے شفاعت کا انکار ثابت کرنا معترض کے جہل کی دلیل ہے۔ رہا یہ قول کہ اللہ کو یہ قدرت حاصل ہے کہ جبرئیل اور رسول اللہ ﷺ کے برابر اور کوئی بندہ پیدا کر سکتا ہے، تو اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اللہ ایسا کرے گا، کیونکہ صفتِ قدرت علاحدہ امر ہے اور صفتِ تکوین علاحدہ چیز ہے۔ دونوں میں باہم کوئی تلازم نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر ﷺ کو سید المرسلین، شفیع المذنبین اور خاتم النبیین پیدا کیا ہے۔ اللہ پاک اپنے قول و خبر میں صادق ہے۔ شفاعتِ وجاہت اور شفاعتِ محبت کا موثر نہ ہونا صدہا آیاتِ قرآن اور نصوصِ سنت سے ثابت ہے۔ رہی شفاعت بالاذن (اللہ کے حکم سے شفاعت) تو اس کا انکار اس عبارت میں کہیں نہیں کیا گیا، بلکہ اس کو بہ خوبی ثابت فرمایا ہے اور اس کا انکار کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ جب کہ خود کتاب و سنت سے اس قسم کی شفاعت ثابت ہو چکی ہے۔

مصنف نے اللہ ذو الجلال کے عمومِ قدرت کے لیے ایک مثال جبرئیل علیہ السلام اور خاتم النبیین ﷺ کی لکھی ہے اور دوسری مثال سلطنت کی بے رونقی کے سلسلے میں شیطان اور دجال کی دی ہے۔ یہ مضمون ابو ذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث سے بہ خوبی ثابت ہے، جو کتبِ صحاح و سنن میں مروی ہے۔[1] خود رسول اللہ ﷺ نے اس مضمون کو بیان فرمایا ہے۔ صاحبِ کتاب کی طرف سے یہ کوئی ایجاد نہیں ہے۔ بے علم لوگ خصوصاً جن لوگوں کو قرآن یا کتبِ سنت کی مزاولت نہیں ہے اور ان کا سارا علم فروعِ مذاہب ہی پر منحصر ہے، وہی ایسا اعتراض کیا کرتے ہیں۔ ان کا یہ اعتراض ان کے جہل کے سبب ہے، قرآن و حدیث کے دلائل سے ماخوذ نہیں ہے۔

تفسیر عزیزی میں بھی یہی لکھا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے، وہ چیز موجود ہو یا نہ ہو، عادت کے موافق ہو یا خلاف؛ بہر حال اللہ پاک پر کسی کا دباؤ نہیں ہے کہ وہ کسی سے دب کر کوئی کام کرے۔ یہ تو اس کا فضل و کرم ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے، جاہ و مرتبہ عنایت کرتا ہے اور اپنی بارگاہ میں اس کو عرض معروض کا حکم دیتا ہے، پھر چاہے اس عرض کو قبول کرے، چاہے تو پھیر دے۔ اس سے ساری مخلوق ڈرتی، کانپتی اور لرزتی ہے، کیا ملائکہ مقربین، کیا انبیا و مرسلین اور کیا صلحا و اولیا و عارفین؛

---

[1] صحيح مسلم، رقم الحديث (٢٥٧٧) مسند أحمد (٥/ ١٦٠)

کوئی بھی اس کی مرضی کے بغیر بول نہیں سکتا۔ شیخ سعدی نے کہا ہے:

گر بحشر خطاب قہر کند
انبیا را چہ جائے دم زدن ست
دراں دم کہ از فعل پرسند وقول
اولو العزم را تن بلرزد زہول

[قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اگر قہر وجلال سے کلام کرے تو انبیا کو بھی دَم مارنے کی گنجایش نہیں ہے۔ جس وقت انسان کے قول وفعل کے متعلق باز پرس ہوگی تو بلند حوصلہ لوگ بھی دہشت کے مارے کانپنے لگیں گے]

شیخ سعدی چھے سو پچاس ہجری (۶۵۰ھ) میں تھے، اس وقت بھی سارے اہلِ اسلام کا یہی عقیدہ تھا۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سارے اولین وآخرین گھبرائیں گے۔ کوئی شخص جنابِ باری تعالیٰ کے سامنے بول نہ سکے گا۔ ہر کوئی اپنی ندامت ظاہر کرے گا۔ اولوا العزم انبیا اپنی خطاؤں کا ذکر کرکے شفاعت کرنے سے انکار کریں گے۔ آدم سے لے کر مسیح تک سب پہلو تہی فرمائیں گے۔ آخر کار جناب سید المرسلین، خاتم النبیین، شفیع المذنبین، فخر الاولین والآخرین اور افضل النبیین ﷺ سے لوگ التجا کریں گے کہ آپ ﷺ ہماری سفارش بارگاہ عالمِ پناہ رب العالمین، ارحم الراحمین، اکرم الاکرمین، احکم الحاکمین میں کریں، تب رسول اللہ ﷺ مقام محمود میں جا کر سجدے میں سر رکھ کر پڑے رہیں گے۔ حمد وثنا کرتے رہیں گے۔ پہلا کام یہی ہوگا۔ شاید بعض روایات میں اس سجدے کی مدت سات دن آئی ہے۔[1] تب کہیں شاہنشاہ حقیقی مالک الملک وحدہ لا شریک لہ فرمائے گا: تم سر اٹھاؤ، کیا کہتے ہو؟ عرض کرو۔ اس وقت خاتم النبیین گناہ گاروں کی شفاعت کے لیے لب کشائی فرمائیں گے۔ اللہ پاک منظور فرما کر ایک حد مقرر کر دے گا، جن کے بارے میں شفاعت کی اجازت ہوگی۔ صحیح بخاری میں آیا ہے:

«فَيُحَدُّ لِي حَدًّا»[2] [میرے لیے ایک حد مقرر کر دی جائے گی]

---

[1] دیکھیں: مسند أحمد (١/ ٤) صحيح ابن حبان (١٤/ ٣٩٣) مسند أبي يعلى (١/ ٥٦) صحيح الترغيب والترهيب (٣/ ٢٣٩)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٦٥٦٥) صحيح مسلم (١/ ١٨١)

سبحان اللہ! اس مالک الملک کی کیا زبردست بارگاہ ہے، جس کے سامنے دین و دنیا کے سارے بادشاہ سرنگوں ہوں گے اور سارے نبی و پیغمبر اس کے جلال سے ڈر کر "نفسی نفسی" کہیں گے؟ ان میں سے کوئی بھی بے خوف نہ ہوگا اور وہ مالک الملک کسی سے کسی بات میں بھی نہیں دبے گا۔ بلکہ وہاں تو سب بڑے چھوٹے حبیب وکلیم وخلیل اور روح اللہ اسی کی طرف دیکھیں گے کہ دیکھیں کیا فرمانِ عالی نافذ ہوتا ہے اور ہماری بھول چوک کا کیا نتیجہ پیش آتا ہے؟ یہ تو محض اس شاہنشاہ کی رحمت و رافت ہے کہ وہ اپنی شانِ رحمت وعطوفت اور تفضّل کے اظہار کے لیے شفاعت کی اجازت اپنے انبیا، اولیا اور صلحا کو دے گا اور یہ لوگ ہر نیک وبد اور ہر کسی موحد کی شفاعت اس کی مرضی پا کر کریں گے۔

غرض کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان یعنی اخلاصِ توحید ہوگا، وہ دوزخ سے باہر نکلے گا اور جس کے دل میں ذرہ برابر بھی شرک ہوگا، وہ دوزخ میں جائے گا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ایمان کی مضبوطی، اخلاص کی درستی اور توحید کی پختگی کے لیے کوشش کریں، عمل صالح پر کمربستہ ہوجائیں اور ہر دم اس کے قہر وغضب سے پناہ مانگتے رہیں، اس کے سوا کسی کو اپنا معبود، حاجت روا، مشکل کشا، نفع ونقصان دینے والا، عطا کرنے والا اور منع کرنے والا سمجھیں نہ کسی غیر اللہ سے کوئی ظاہری و باطنی تعلق رکھیں۔

اہلِ کتاب اسی لیے گمراہ ہو کر ناری ہوگئے کہ انھوں نے اپنے آپ کو "أبناء اللہ" اور "احباء اللہ" سمجھا، اپنی وجاہت کو اپنا شفیع ٹھہرایا اور سفارشِ انبیا اور مقامِ اولیا پر بھروسا کر بیٹھے، جس طرح کہ پیر زادے پیروں پر، مریدین شیخوں پر، قبر پرست قبروں پر اور بت پرست بتوں پر شفاعت وحمایت اور رعایت وحفاظت کا اعتماد رکھتے ہیں۔ یہ ایک بڑا مغالطہ ہے، جو شیطان نے نام کے مسلمانوں کو دے رکھا ہے، ان کو جہالت وضلالت کے دام میں پھانس کر توحید کی صراطِ مستقیم سے گمراہ کر دیا ہے اور توحید کی تاریکیوں میں لے جا کر شفاعتِ صلحا کا فریب دے کر ان کو مشرک بنا دیا ہے۔

ہر مسلمان کو پختہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ کا کوئی محبوب ایسا نہیں ہے جو اس سے روٹھ یا بگڑ کر اللہ کو رنجیدہ کرے یا اپنا زور جتائے، اسے دھمکائے، ڈرائے، دبائے اور اللہ کو اس کے سامنے کچھ بن نہ پڑے، پھر وہ چار وناچار اپنی قضا وقدر کو بدل ڈالے اور اس کا کہنا مانے، لیکن یہاں معاملہ الٹ ہے۔ جو بندے اللہ کے مقرب ومحبوب ہوتے ہیں، وہ سب سے زیادہ اس کی مرضی کے پابند رہتے ہیں، اسی لیے ان کی اکثر دعائیں، جو مرضی الٰہی کے موافق ہوتی ہیں، قبول ہو جاتی ہیں اور بعض

دعائیں قبول نہیں ہوتیں، مگر وہ اللہ سے ضد نہیں باندھتے، بلکہ اس سے ڈر جاتے ہیں اور اس کی پناہ مانگنے لگتے ہیں۔ دیکھو نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے غرق کے وقت اس کی نجات کے لیے دعا کی تھی، جب اس پر ان کو ٹکا سا جواب ملا تو عذر کرنے لگے۔ جب انبیا کا یہ حال ہے تو کسی اور کی کیا حقیقت ہے جو اللہ تعالیٰ سے ضد کرے کہ اس کے مشرک و بدعتی شاگرد، مرید اور معتقد کو بخش دے؟!

جادو کی حرمت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ﴾ [البقرة: ١٠٢]

[یہودیوں کو معلوم ہے کہ جس نے جادو خریدا، وہ آخرت میں بے نصیب ہے]

امام قتادہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اہلِ کتاب جانتے ہیں کہ آخرت میں جادوگر کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ جادوگر بے دین ہوتا ہے۔ آیتِ مذکورہ سحر کی حرمت پر دلیل ہے۔ تمام رسولوں کے دین میں ہمیشہ سے جادو کی حرمت چلی آئی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴾ [طٰہٰ: ٦٩]

[جادوگر جہاں آئے جائے بامراد نہیں ہوتا]

امام احمد رحمہ اللہ کے اصحاب نے کہا ہے کہ جادوگر جادو سیکھنے سکھانے کی وجہ سے کافر ہے۔ ابو محمد مقدسی رحمہ اللہ کے نزدیک عزائم، رقی اور عقد (جھاڑ پھونک، منتر اور گنڈے) کو سحر کہتے ہیں، جو دل اور بدن میں اثر کرتے ہیں۔ ان سے آدمی بیمار پڑ جاتا ہے یا مر جاتا ہے یا میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے۔ فرمایا:

﴿يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ﴾ [البقرة: ١٠٢]

[اس جادو کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی کر دیتے ہیں]

نیز فرمایا:

﴿وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ﴾ [الفلق: ٤]

[اور گنڈوں پر پھونکنے والیوں کی برائی سے]

پہلی آیت میں سارے جھاڑ پھونک اور منتر داخل ہیں۔ دوسری آیت میں ہر قسم کے گنڈے

دھاگے وغیرہ شامل ہیں۔ اگر جادو بے اصل ہوتا تو اللہ پاک اس سے پناہ مانگنے کا حکم نہ دیتا۔ خود رسول اللہ ﷺ پر ایک یہودی یا یہودیہ نے جادو کیا تھا۔ جب معوذتین (الفلق والناس) نازل ہوئیں، تب اس کا اثر دور ہوا۔[1] اس سحر کی مدت چالیس دن یا چھے مہینے یا ایک سال تک رہی۔[2] راغب نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ میں سحر کی تاثیر اس حیثیت سے نہیں ہوئی تھی کہ وہ نبی ورسول تھے، بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ انسان اور بشر تھے۔

معوذتین کی ازالۂ سحر میں بڑی تاثیر ہے۔ جو کوئی رات دن ان دونوں سورتوں کو پڑھتا ہے، اس کو اللہ کے حکم سے سحر ضرر نہیں پہنچاتا، بلکہ اگر جادو زدہ شخص ان کو پڑھے تو اس کا سحر دور ہو جاتا ہے۔ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیمار ہوتے تو خود ان کو پڑھ کر اپنے اوپر دم کیا کرتے تھے۔[3] (أخرجه مالك في الموطأ، وهو في الصحيحين من طريقه)

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس نے گرہ لگائی، پھر اس میں پھونکا تو اس نے سحر کیا اور وہ مشرک ہو گیا۔''[4]

(رواه النسائي و ابن مردويه)

صفوان بن سلیم کی روایت میں یہ الفاظ مروی ہیں:

''جس نے تھوڑا سا یا زیادہ جادو سیکھا تو یہ اللہ تعالیٰ سے اس کا آخری عہد ہے۔''[5] (رواه عبد الرزاق)

یعنی وہ مشرک و کافر ہو گیا اور اللہ سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا، عیاذاً باللہ۔

لكل شيءٍ إذا فارقته عـوض
وليس لله إن فارقته عوض

[کوئی چیز بھی تم سے چھوٹ جائے تو اس کا کوئی بدل ہوتا ہے، لیکن اگر اللہ تم سے چھوٹ جائے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہے]

---

(1) صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٤٣٠) صحيح مسلم، رقم الحديث (٢١٨٩)

(2) فتح الباري (١٠/ ٢٢٦)

(3) موطأ الإمام مالك (١٦٨٧) صحيح البخاري (٥٠١٦) صحيح مسلم (٤/ ١٧٢٣)

(4) سنن النسائي، رقم الحديث (٤٠٧٩) اس کی سند میں ''عباد بن میسرۃ المنقری'' راوی ضعیف ہے، نیز اس کی سند میں انقطاع ہے۔

(5) مصنف عبد الرزاق (١٠/ ١٨٤) یہ روایت مرسل ہے۔

جادوگر کی سزا:

ائمہ ثلاثہ کا مذہب یہی ہے کہ ساحر کافر ہے۔ اہلِ حدیث کہتے ہیں کہ وہ مرتد اور واجب القتل ہے۔ جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبُهُ بِالسَّيْفِ» (رواہ الترمذي)[1] [جادوگر کی حد قتل ہے]

امام شافعی رحمہ اللہ نے سحر کی بابت تفصیل بیان کی ہے۔ انھوں نے سحر کی بعض انواع کو کفر وشرک قرار دیا ہے اور بعض کو کبیرہ گناہ، مگر قرآن پاک سے سحر کا مطلقاً کفر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ﴾ [البقرة: ١٠٢]

[سلیمان نے کفر نہیں کیا، لیکن شیطانوں نے کفر کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے]

امام جوہری رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ ''سحر'' منتر کو کہتے ہیں اور جس چیز کا ماخذ لطیف اور دقیق ہوتا ہے وہ سحر ہے۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سحر کو کبائر میں سے شمار کیا ہے۔ یہ سحر شرک کی ایک قسم ہے، اس لیے جادوگر کا شرعی حکم وہی ہے، جو مشرک مرتد کا ہے۔ سحر کا سیکھنا سکھانا گناہ کبیرہ ہے، جو ساحر کو حد کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ الطَّاغُوْتِ﴾ [النساء: ٥١]

[اہلِ کتاب جبت اور طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں]

یہاں ''جبت'' سے مراد سحر ہے۔ صحیحین میں سحر کا ذکر شرک کے ساتھ ہی سات مہلکات میں کیا گیا ہے۔[3]

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (١٤٨٥) اس کی سند میں ''اسماعیل بن مسلم المکی'' راوی ضعیف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: سلسلة الأحاديث الضعيفة، رقم الحديث (١٤٤٦)

[2] الصحاح للجوهري (٣/ ٢٤٢)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٦١٥) صحيح مسلم، رقم الحديث (٨٩)

حکایت:

تاریخ بخارا میں ابو عثمان نہدی سے مروی ہے کہ ولید کے پاس ایک جادوگر تماشا دکھاتا تھا۔ اس نے ایک شخص کا سر اس کے تن سے جدا کر دیا تو ہمیں بڑا تعجب ہوا، پھر اس نے اس کا سر لگا بھی دیا۔ اتنے میں جندب ازدی آئے تو انھوں نے اس جادوگر کو قتل کر دیا اور کہا کہ اگر سچے ہو تو اپنے آپ کو زندہ کر کے دکھاؤ۔[1] (رواه البيهقي في الدلائل مطولا)

اس قسم کی شعبدہ بازی علم سحر کی ایک نوع ہے، اسی لیے اس کو شرک میں شمار کیا گیا ہے۔ مسلمان فلسفی شہاب الدین مقتول اس علم میں بڑی مہارت رکھتے تھے، وہ ملحد ہو کر مرے۔[2]

کراماتِ اولیا... یا... احوال شیطانیہ؟

انواع سحر میں سے وہ احوال شیطانیہ بھی ہیں جن کو عوام و جہال کراماتِ اولیا خیال کر کے دھوکا کھاتے ہیں، حالانکہ وہ لوگ اولیاے شیطان ہیں نہ کہ اولیاے رحمان۔ شیطان بھی اپنے ولیوں کی طرف وحی کرتا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَ اِنَّ الشَّيٰطِيْنَ لَيُوْحُوْنَ اِلٰٓى اَوْلِيٰٓئِهِمْ﴾ [الأنعام: ١٢١]

[بے شک شیطان اپنے دوستوں کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں]

قبیصہ ہلالی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیافہ، طرق اور طیرہ کو انواعِ جبت سے قرار دیا ہے۔[3] (رواه أحمد بإسناد جيد)

''جبت'' سحر کو کہتے ہیں اور طاغوت اللہ کے ماسوا ہر معبود باطل کو کہتے ہیں۔ تفسیر ابن مخلد میں ہے کہ شیطان نے چار بار آہ و بکا کی، ایک جب وہ ملعون ہوا، پھر جب وہ بہشت سے نکالا گیا، پھر جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور جب سورۃ الفاتحہ نازل ہوئی۔

---

① تاريخ دمشق (١١/ ٣٠٩) تاريخ الإسلام للذهبي (٥/ ٨٧)

② اس سے مراد ''ابو الفتوح یحییٰ بن حبش بن امیرک شہاب الدین سہروردی'' جو مقتول کے لقب سے بھی معروف ہیں۔ انھیں سلطان صلاح الدین نے قلعہ حلب میں ۵۸۶ھ کو فسادِ معتقد کے سبب قتل کروا دیا۔

③ مسند أحمد (٣/ ٤٧٧، ٥/ ٦٠) سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٨٨٩) اس کی سند میں ''حیان بن العلاء'' راوی مجہول ہے۔

علم نجوم:

علمِ نجوم بھی سحر کا ایک شعبہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے علم نجوم کی کوئی بات سیکھی، اس کے سوا جو اللہ نے بیان کیا ہے تو اس نے جادو کی ایک قسم سیکھی۔ نجومی کاہن ہے اور کاہن جادوگر ہے اور جادوگر کافر ہے۔[1] (رواہ رزین)

ستاروں کی تاثیر کا اعتقاد شرک و کفر ہے:

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تاروں کا بھی ذکر کیا ہے کہ ان میں اللہ کی قدرت و حکمت معلوم ہوتی ہے۔ ان تاروں سے آسمانوں کی خوبصورتی ہے، انھیں سے شیطانوں کو مار مار کر بھگایا جاتا ہے اور رات کو لوگ ان سے راستہ پاتے ہیں۔ اللہ نے یہ بات ذکر نہیں کی کہ ان تاروں کو جہان کے کارخانے میں کچھ دخل ہے اور دنیا میں کوئی بھلائی یا برائی ان کی تاثیر سے پیدا ہوتی ہے، پس جو کوئی پہلی بات چھوڑ کر اس دوسری بات کی تحقیق کے پیچھے پڑے اور تاروں سے معلوم کر کے غیب کی باتیں بتایا کرے، جیسے برہمن جنوں سے پوچھ کر غیب کی باتیں بتلاتا ہے تو یہ نجومی اور کاہن کی ایک ہی راہ ہے۔ کاہن جادوگروں کی طرح جنوں سے دوستی کرتا ہے۔ یہ دوستی اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ ان کے بارے میں اعتقاد رکھے، مصیبت کے وقت ان کو پکارے اور کھانا دانہ چڑھائے، جو کفر کی علامت ہے۔ معلوم ہوا کہ نجومی، کاہن اور ساحر کفر کی راہ پر چلتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے دوسرا لفظ مرفوعاً یہ مروی ہے کہ جس نے نجوم کا کچھ علم سیکھا، اس نے سحر کا ایک شعبہ لیا۔ اب جتنا چاہے زیادہ لے۔[2]

(رواہ أبو داود بإسناد صحیح وأحمد وابن ماجه)

مطلب یہ کہ علم نجوم میں جو کوئی جتنا زیادہ دخل دے گا وہ اتنا ہی بڑا ساحر ہوگا۔

کاہن:

کاہن وہ شخص ہوتا ہے جو چوری سے بات سن کر خبر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کاہن بہت تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کم ہو گئے، اس لیے کہ اللہ نے آسمان کی حراست تاروں کے ذریعے فرمائی۔ کہانت اس طرح ہوتی ہے کہ جن اپنے یاروں کو کچھ غیبی چیزوں کی، جو زمین میں

---

[1] مشكاة المصابيح (۲/ ۵٤۲) اس حدیث کی سند معلوم نہیں ہو سکی، کیونکہ رزین کی کتاب غیر مطبوع اور نامعلوم ہے۔

[2] مسند أحمد (۱/ ۲۲۷، ۳۱۱) سنن أبي داود، رقم الحديث (۳۸۸۷) سنن ابن ماجه (۲/ ۱۲۲۸)

ہونے والی ہیں، خبر دیتے ہیں اور جاہل آدمی یہ سمجھتا ہے کہ یہ اس شخص کی کرامت وکشف ہے، حالانکہ وہ ایک بات کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر کہتا ہے۔ حدیث میں کاہن کے پاس جانے سے بھی ممانعت آئی ہے۔

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ أَتٰى كَاهِنًا فَصَدَّقَهُ بِمَا يَقُوْلُ فَقَدْ كَفَرَ بِمَا أُنْزِلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ ﷺ» [1]

(رواه أبو داود)

[جو شخص کاہن کے پاس گیا اور اس کی بات کی تصدیق کی تو اس نے محمد ﷺ پر نازل شدہ شریعت سے کفر کیا] اس کو حاکم نے بخاری ومسلم کی شرط پر صحیح کہا ہے۔[2]

امام قرطبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اس سے کتاب وسنت کا انکار اور اس سے کفر مراد ہے، یعنی کاہن کو سچا سمجھنے والا اللہ اور رسول کا منکر ہوتا ہے۔ کاہن اس لیے کافر ٹھہرا ہے کہ وہ غیب دانی کا دعوی کرتا ہے اور ایسا دعوی کفر ہے، اس کی تصدیق کرنے والا کفر کی تصدیق کرتا ہے اور علم غیب میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانا شرک ہے، اس لیے کہ یہ کفر شرک کے سبب سے آیا ہے اور ہر مشرک کافر ہوتا ہے۔

عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے:

«لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَطَيَّرَ أَوْ تُطُيِّرَ لَهٗ أَوْ تَكَهَّنَ أَوْ تُكُهِّنَ لَهٗ أَوْ سَحَرَ أَوْ سُحِرَ لَهٗ» [3]

(رواه البزار بإسناد جيد، والطبراني بإسناد حسن)

[ہم سے اس شخص کا تعلق نہیں ہے جو بدشگونی لے یا اس کے لیے بدشگونی لی جائے، یا وہ کہانت کرے یا اس کے لیے کہانت کی جائے، یا جادو کرے یا اس کے لیے جادو کیا جائے]

یعنی وہ شخص مسلمان نہیں ہے جو یہ کام کرے یا اس کے لیے یہ کام کیے جائیں۔ غرض کہ جن امور کی معرفت کو غیب دانی میں دخل ہے، وہ سب کام کبائر یا حرام یا کفر وشرک ہیں، مثلاً پرندے کو اڑانا، کنکری پھینکنا، لکیر کھینچنا، ستارہ شناسی، کہانت، سحر، عرافت، عیافت وغیرہ سب علومِ جاہلیت ہیں۔ اہلِ جاہلیت وہ لوگ ہیں جو رسولوں کا اتباع نہیں کرتے تھے، جیسے فلاسفہ، حکما، کاہن اور نجومی وغیرہ کہ یہ لوگ غیب دانی کا دعوی کیا کرتے تھے۔

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٣٩٠٤)

[2] المستدرك على الصحيحين للحاكم (١/ ٤٩)

[3] مسند البزار (٢/ ٣٠) المعجم الكبير للطبراني (١٨/ ١٦٢) السلسلة الصحيحة (٢١٩٥)

اسی طرح جو شخص ولایت کا مدعی ہو اور اپنی خبر دہی کو غیب دانی کہے، وہ شیطان ولی کا ہے نہ کہ رحمان کا۔ اولیاء اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ غیب داں ہوں یا اس طرح کا دعوی کریں۔ ولایت یا کرامت وہ امر ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ کسی مومن متقی کے ہاتھ پر اس کی دعا یا عمل صالح سے جاری کرتا ہے، اس میں ولی کی کوئی کاریگری یا قدرت نہیں ہوتی۔ ان لوگوں کا غیب دانی کا یہ دعوی ہی کفر بواح (صریح کفر) ہے، پھر ایسا مدعی کیوں کر ولی ہو سکتا ہے؟ وہ تو اصل ایمان سے بھی باہر ہے!!

امام شوکانی رحمہ اللہ نے کاہن کو قتل کا سزاوار لکھا ہے۔ بہر حال کاہن کی تصدیق ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے حروف تہجی الف، با، جا، دا لکھنے والے کو نجومی قرار دیا ہے۔ جو لوگ ابجد کے حروف مفردہ لکھ کر تعویذ دیتے ہیں یا عدد نکال کر لکھتے ہیں اور انھوں نے اس کا نام "علم الحرف" رکھا ہے، وہ حقیقت میں علمِ غیب کے مدعی ہیں۔ ابجد کا سیکھنا سکھانا تہجی اور حساب کے لیے ہوتا ہے، اس کام کے لیے نہیں۔

"نُشْرَۃ":

یہ ایک قسم کا علاج اور منتر ہے، جو آسیب زدہ کے لیے کیا جاتا ہے۔ امام حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ نشرہ ایک قسم کا سحر ہے۔ امام ابن الجوزی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ نشرہ سحر کو مسحور سے دور کرنا ہے، یعنی آسیب زدہ سے جادو اتارنے کو "نشرہ" کہتے ہیں۔ یہ کام بھی جادوگر کے سوا اور کسی سے نہیں بنتا۔ جابر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آیا ہے کہ کسی نے رسول اللہ ﷺ سے "نُشرہ" کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«هِيَ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ» (رواہ أحمد بإسناد جيد و أبو داوٗد)[1] [یہ شیطانی کام ہے]

ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ نشرہ مکروہ یعنی حرام ہے۔ اس نشرہ سے مراد وہ کام ہے جو اہلِ جاہلیت کیا کرتے تھے۔ یہ قید اس لیے ہے کہ اگر کوئی شخص سحر کا ازالہ کسی آیت یا قرآن کی سورت سے کرے گا تو کوئی مضائقہ نہیں ہے، چنانچہ سورۃ الفاتحہ ہر بیماری سے شفا ہے اور معوذتین (سورۃ الفلق والناس) سحر کے اثر کو زائل کرنے والی ہیں۔

ازالۂ سحر کا عمل:

لیث بن ابی سلیم نے کہا ہے کہ آیاتِ ذیل سحر سے شفا کا ذریعہ ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ

[1] مسند أحمد (٣/ ٢٩٤) سنن أبي داوٗد، رقم الحديث (٣٨٦٨)

ایک برتن میں پانی ڈالیں اور ان آیتوں کو پڑھ کر اس پر دم کر کے جادو کیے ہوئے شخص کے سر پر ڈالیں، اس سے سحر جاتا رہے گا:

① ﴿فَلَمَّآ اَلْقَوْا قَالَ مُوْسٰى مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللّٰهَ سَيُبْطِلُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝ وَ يُحِقُّ اللّٰهُ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ [يونس: ٨١، ٨٢]

[جب انھوں نے ڈالا تو موسیٰ نے کہا: جو تم لائے ہو جادو ہے، بیشک اللہ اس کو مٹا دے گا]

② ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَ بَطَلَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [الأعراف: ١١٨]

[سچی بات ہو کر رہی اور جادوگر جو کچھ کرتے تھے، وہ رائیگاں ہوا]

③ ﴿اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴾ [طٰه: ٦٩]

[بے شک انھوں نے جو کچھ بنایا ہے وہ جادوگر کا تماشا ہے اور جادوگر جہاں آئے جائے بامراد نہیں ہوگا][1]

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے تعوذات، دم اور مباح دواؤں کے ذریعے جادو کا علاج جائز لکھا ہے۔ بہرحال مومن متقی کو چاہیے کہ وہ منتروں، تعویذوں اور عملوں میں احتیاط رکھے۔ یہ تعویذات جو حروف مفردہ آ، با، جا، دا اور خطوط وہندسوں وغیرہ میں لکھے جاتے ہیں یا دھاگوں میں گرہ لگاتے ہوئے پھونک کر گنڈا بنایا جاتا ہے، ان کے بجائے اللہ واحد قدیر پر توکل کر کے مسنون دعائیں، شرعی اعمال اور جائز دوا وعلاج پر اکتفا کرنا کہیں زیادہ بہتر ہے۔

اس بات کو مستحضر رکھنا چاہیے:

«مَنْ حَامَ حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ أَنْ يَّقَعَ فِيْهِ»[2]

[جو شخص چراگاہ کے آس پاس منڈلاتا ہے، خطرہ ہے کہ اس میں جا پڑے گا]

کیونکہ شرک بری بلا ہے۔ خدانخواستہ اگر ایمان میں خلل آ گیا تو پھر موت کے بعد اس کا کچھ علاج نہیں ہوسکتا۔ اگر شرک کے ڈر سے کسی مباح چیز کو ترک کر دیا تو فکر کی بات نہیں ہے، ڈر تو اسی کم بخت شرک کا ہے جو چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔ اس کے دروازوں کا بند کرنا اور درزوں

---

① تيسير العزيز الحميد (ص: ٣٦٨)

② صحيح البخاري، رقم الحديث (٥٢) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٥٩٩) حدیث کے الفاظ مختلف ہیں۔

کا برابر کرنا سب امور پر مقدم ہے۔ اگر ایمان، توحید اور اخلاص سلامت ہے تو سب آفات سے ایک دن بیڑا پار ہو جائے گا۔ اگر یہ نہیں ہے تو ادنا شرک سے ساری عمر کی عبادت و طاعت اور تمام جہان کا زہد و تقوی برباد ہو جائے گا۔ عیاذاً باللہ.

محبتِ الٰہی:

اصل دینِ اسلام یہ ہے کہ اللہ سے محبت ہو اور یہ ہر چیز کی محبت سے زیادہ ہو، کیونکہ کمالِ توحید و اخلاص کا دار مدار اسی محبتِ الٰہی پر ہے۔ جس کو یہ محبت نہیں ہے یا غیر کی محبت اللہ کی محبت سے زیادہ ہے تو سمجھ لو کہ وہ غیر اللہ کا محبّ اور دوسروں کو خدا بنانے والا ہے۔ کفار و مشرکین جن کو بتوں کی محبت تھی، وہ بھی ندّیت و غیریت کی محبت تھی، ان کی ربوبیت و خالقیت کی محبت نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾
[البقرة: ١٦٥]

[اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کا شریک دوسروں کو بناتے ہیں، اللہ کے برابر ان سے محبت رکھتے ہیں]

روے زمین کے اکثر لوگوں نے دوسروں کو محبت و تعظیم میں اللہ کا شریک بنایا تھا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان پر انکار کیا اور فرمایا: ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرة: ١٦٥] یعنی مومنوں کا اللہ سے محبت رکھنا مشرکوں کے غیر اللہ سے محبت رکھنے کی بہ نسبت کہیں زیادہ اور سخت تر ہے۔

امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ اللہ نے مشرکوں کی مذمت اس لیے کی ہے کہ انھوں نے اللہ کی محبت اور غیروں کی محبت کے درمیان اشتراک کیا ہے اور مومنوں کی طرح اللہ کی خالص محبت اختیار نہیں کی۔ اللہ کی محبت اور غیر اللہ کی محبت کے درمیان اسی برابری کو یاد کر کے وہ جہنم میں کہیں گے:

﴿تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾
[الشعرآء: ٩٧، ٩٨]

[اللہ کی قسم ہم تو دنیا میں کھلی گمراہی میں تھے، جب ہم تمھیں سارے جہان کے مالک کے برابر سمجھ رہے تھے]

کیونکہ یہ تسویہ تخلیق و ربوبیت میں نہ تھا، بلکہ محبت و تعظیم میں تھا۔ اللہ کی محبت کا نشان یہ ہے

کہ رسول اللہ ﷺ کا اتباع واطاعت ہو، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ﴾ [آل عمران: ٣١]

[اے پیغمبر کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو محبوب بنا لے گا]

دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَسَوْفَ يَأْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ﴾ [المائدة: ٥٤]

[جلد ہی اللہ ایسی قوم کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں پر نرم اور کافروں پر زبردست ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے، کسی ملامت گر کی ملامت سے ڈریں گے نہیں]

اس آیت میں محبت کی چار علامتیں بتائی ہیں۔ ایک ایمان والوں پر شفقت، دوسرے کفار پر شدت، تیسرے اللہ کی راہ میں جان و مال اور ہاتھ و زبان سے لڑنا، چوتھے کسی کے ملامت کرنے سے نہ ڈرنا۔ دوسری جگہ ایک آیت میں محب کے تین مقام بتائے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ﴾ [الإسراء: ٥٧]

[جن لوگوں کو پکارتے ہیں وہ خود اپنے رب کی طرف ذریعہ تلاش کرتے ہیں کہ ان میں کون اللہ کے زیادہ قریب ہے، اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں]

ایک مقام اعمالِ صالحہ کے ذریعے اللہ کے قرب کی تلاش کا ہے، دوسرا مقام رجا کا ہے اور تیسرا مقام خوف کا ہے۔

محبتِ الٰہی کے اسباب

جنید بغدادی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ اللہ سے محبت حاصل ہونے کے دس اسباب ہیں:

① ایک قرآن کو تدبر کے ساتھ پڑھنا اور اس کے معنی مراد کو سمجھنا۔

② دوسرا یہ کہ فرائض کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا تقرب چاہنا۔

③ تیسرا سبب یہ کہ ہر حال میں زبان اور دل سے مسلسل اللہ کا ذکر کرنا۔

④ چوتھا یہ کہ خواہشِ نفس کے غلبے کے وقت اللہ کی محبوبات کو اپنی محبوبات پر ترجیح دینا۔

⑤ پانچواں یہ کہ بندے کا دل اللہ کے اسما و صفات کا مطالعہ و مشاہدہ کرے اور اس معرفت کے باغ میں ٹہلتا پھرتا رہے۔

⑥ چھٹا اللہ کے احسان اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں کا مشاہدہ کرنا۔

⑦ ساتواں اللہ کے سامنے دل کی انکساری و عاجزی ہے، یہ سبب تمام سے زیادہ خوش آیند ہے۔

⑧ آٹھواں یہ کہ نزولِ الٰہی کے وقت خلوت اور قرآن کی تلاوت پھر توبہ و استغفار پر اس کا ختم کرنا۔

⑨ نواں یہ کہ محبین صادقین کی ہم نشینی اختیار کرنا اور ان کے کلام سے ثمراتِ محبت چننا اور جب تک کلام کی مصلحت راجح نہ ہو کلام نہ کرنا۔

⑩ دسواں ہر اس سبب سے دور رہنا جو اللہ کے اور بندوں کے درمیان حائل ہو۔

ان اسباب دہ گانہ سے محبّ اپنے محبوب تک پہنچ جاتا ہے۔[1]

یہ سب جو ذکر ہوا ہے، ایک صوفیانہ نکتہ ہے، ورنہ اصل تصوف وسلوک اسی مالک الملوک کی محبت ہی ہے۔ کتاب ''ریاض المرتاض''[2] میں سنی تصوف کے ابواب تفصیل کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور اس کو ساری بدعات ورسوم کے شوائب سے پاک صاف کر کے بتایا گیا ہے۔

شرک سے نجات کا راستہ:

بہر حال شرک اور اس کے ابواب و انواع سے رہائی اسی وقت ممکن ہے جب اللہ کی خالص محبت ساری کائنات ومخلوقات کی محبت پر غالب ہو، ورنہ جس قدر اس محبت میں کمی ہوگی، اسی قدر انسان کا دل شیطان کی آماج گاہ ہوگا۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ کوئی اللہ کو چاہے، پھر اس کے مخالفین سے بھی محبت رکھے۔ ایک دل میں دو محبتیں جمع نہیں ہوتی ہیں۔ اگر دل میں غیر کی محبت ہے تو پھر ایمان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾ [المجادلة: ٢٢]

---

① دیکھیں: مدارج السالکین لابن القیم رحمہ اللہ (٣/ ١٧)

② اس سے مولف رحمہ اللہ کی فارسی کتاب ''رياض المرتاض و غياض العرباض'' مراد ہے۔

[جو لوگ اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان رکھتے ہیں، تم ان کو نہیں پاؤ گے کہ ان لوگوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہیں]

دائمی محبت:

اسی لیے حدیث میں "حب لله" اور "بغض في الله" کو افضل اعمال اور تکمیلِ ایمان کی علامت قرار دیا ہے۔[1] دوسری حدیث میں اس کو افضل ایمان فرمایا ہے۔[2] قیامت کے روز سارے دوست اور یار آشنا ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے، مگر اہلِ تقویٰ کی دوستی برقرار رہے گی، اس لیے کہ دنیا داروں کی محبت شرکیہ تھی لیکن اہلِ ایمان کی محبت الٰہیہ تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ﴾ [الزخرف: ٦٧]

[اس دن جگری دوست ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، سوائے ان لوگوں کے جو حقیقی متقی ہیں]

دنیا میں جتنی محبتیں ہیں، جیسے باپ ماں کی محبت یا بیوی وشوہر کی محبت یا اولاد کی محبت، وہ سب دنیوی اغراض پر مبنی ہیں، اگرچہ ظاہر میں کوئی اس کا انکار کرے، کیوں کہ ہر محبت کا مرجع جمال ہوتا ہے یا کمال یا معاش کی حسنِ تدبیر یا جمعِ مال کی حرص یا حصولِ آرام و دفعِ تکلیف۔ اسی طرح اجانب کی محبت کا حال ہے کہ وہ بھی دنیوی غرض کی طرف راجع ہوتی ہے۔ محبت کی یہ ساری اقسام بے کار ہیں، البتہ جو محبت عذابِ نار سے بچائے اور بہشت میں لے جائے، وہ معبود برحق کی محبت ہے، یا وہ محبت ہے جو معبود کے لیے کسی شخص سے ہو، جیسے انبیا، اولیا، اہلِ بیت، صحابہ، علما، حفاظ وقرا کی محبت کہ یہ اللہ کی محبت کا ایک شعبہ ہے، اسی لیے یہ محبت آخرت میں کام آئے گی۔ اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے والے عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے۔[3]

مسلمان موحد کو چاہیے کہ اپنی ساری محبت اللہ کے واسطے صرف کرے۔ جب اس کو یہ محبت حاصل ہو جائے گی تو وہ غیر اللہ کی محبت سے بے زار ہو جائے گا اور شرک سے کوسوں دور جا پڑے گا،

---

[1] سنن أبي داود، رقم الحديث (٤٦٨١)

[2] مسند أحمد (٥/ ٢٤٧)

[3] صحيح البخاري، رقم الحديث (١٣٥٧) صحيح مسلم، رقم الحديث (١٠٣١)

یہاں تک کہ خالص محبت کے ساتھ مقامِ توحید پر فائز ہوگا اور اس آیتِ شریفہ ﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ [البقرة: ١٦٥] کا مصداق ہو جائے گا اور ﴿يُحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗ﴾ [المائدة: ٥٤] کا کامل نمونہ بن جائے گا۔

اللهم اجعل حبك أحب الأشياء إِلَيَّ وارزقني حب من تحبه وحب عمل ترضاه.

[اے اللہ اپنی محبت کو میرے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ محبوب بنادے اور مجھے اپنے محبوب بندوں سے اور پسندیدہ عمل سے محبت کرنے کی مجھے توفیق دے]

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ [مريم: ٩٦]

[بیشک جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کیے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت ڈال دے گا]

ریاکاری:

شرک کی راہوں میں ایک ریا ہے۔ یعنی اس قصد سے عبادت کا اظہار کرنا کہ لوگ اس کو دیکھیں سنیں، اس کی تعریف و توصیف کریں اور اس کے مداح و ستایش کناں رہیں، جیسے نماز، قراءتِ قرآن، وعظ و ارشاد اور عمل صالح کا چرچا کرنا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا﴾ [الكهف: ١١٠]

[جس کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو، اسے چاہیے کہ خلوص کے ساتھ اچھا کام کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے]

اس آیت سے مقصود ریا کاری کی ممانعت ہے، کیونکہ عمل صالح وہی ہے جس میں دکھانے سنانے کا کوئی شائبہ نہ ہو۔ کلامِ عرب کا قاعدہ ہے کہ جب نکرہ سیاقِ نفی میں آتا ہے تو عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ یہاں عموم میں انبیا، ملائکہ، صلحا و اولیا وغیرہ سب شامل ہیں، یعنی کسی چھوٹی و بڑی مخلوق کو اللہ کی عبادت میں شریک نہ کریں۔ معلوم ہوا کہ عبادت میں انبیا و صلحا کی شرکت اگر شرک و ریا ہے تو طالحین، جو معبودان باطلہ ہیں، چاہے حیوان ہوں یا جماد و نباتات، ان کی شرکت کا کیا ذکر ہے؟

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ عمل صالح وہ ہے جو ریا سے صاف اور سنت کے ساتھ مقید ہو۔[1]

[1] الجواب الكافي (ص: ٩١)

طلبِ جاہ:

شرکیہ ریا کاری کی ایک نوع یہ ہے کہ والیوں اور حاکموں کے یہاں یا علما و مشائخِ وقت کے نزدیک جاہ و مرتبہ طلب کرنا اور اس کے لیے جزئیات کی تالیف میں مشغول رہنا اور عوام الناس میں اپنی مجددیت یا اجتہاد کا دعوی کرنا، باوجودیکہ وہ اس رتبے تک پہنچ نہیں پایا ہے اور اس کے اسباب بھی مفقود ہیں، مگر شہرت ومقبولیت کے لیے اپنے سے افضل شخص پر رد وتنقید کرنا، تاکہ لوگ اس کو بڑا فقیہ سمجھیں، یہ سب شرک ہی کی اقسام ہیں۔ اس مسکین شہرت طلب کو یہ معلوم نہیں ہے کہ مقلدین باتفاق اہلِ علم، علما نہیں ہوتے ہیں، پھر مجدد و مجتہد ہونے کا کیا ذکر ہے؟ جیسا کہ ابن عبد البر نے ''کتاب العلم'' میں اس کی صراحت کی ہے۔[1]

بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ دین میں ریا کے کئی مفاسد ہیں، اس میں ریاست ومرتبت کا شوق، لوگوں کا اعتقاد و تعظیم، پوشیدہ نفسانی خواہشات و چالبازیوں اور نفس و شیطان کی فریب کاریوں کے امکان وگمان کی بڑی گنجایش ہے۔ صدیقین کے سوا کم ہی لوگ اس سے محفوظ رہتے ہیں، اس لیے پوشیدہ اور سنجیدہ رہنا اولی طریقہ ہے، اگر کسی کو جاہ وشہرت اس کے ارادے کے بغیر حاصل ہو تو یہ ایک نعمتِ الٰہی ہے۔

بہر حال ریا کا باب نہایت وسیع ہے اور اس کے انواع بہت زیادہ ہیں۔ یہ شرک غایت درجہ پوشیدہ اور باریک ہے۔ اس کی تفصیل "إحياء العلوم" میں، پھر کتاب ''زواجر'' میں بسط سے لکھی ہے۔[2] ہم نے بھی ''قوارع الانسان'' میں زواجر کا خلاصہ لکھا ہے۔[3] اس لیے اس جگہ اس کے حوالے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

ریا کاری سے اعمال برباد ہوجاتے ہیں:

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«قَالَ اللّٰهُ تَعَالَى: أَنَا أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ، مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيْهِ مَعِيَ غَيْرِيْ تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ»[4]

---

[1] جامع بيان العلم لابن عبد البر (٢/ ٢٢٠)

[2] إحياء علوم الدين (٣/ ٢٧٤) الزواجر عن اقتراف الكبائر للهيتمي (ص: ٩٢)

[3] اس سے مولف رحمہ اللہ کی کتاب "قوارع الإنسان عن اتباع خطوات الشيطان" مراد ہے۔

[4] صحيح مسلم (٤/ ٢٢٨٩)

[میں تمام لوگوں میں سب سے زیادہ شرک سے بے نیاز ہوں۔ جس نے کوئی ایسا عمل کیا جس میں میرے ساتھ میرے غیر کو شریک کیا تو میں اس کو اور اس کے شریک کیے ہوئے عمل کو چھوڑ دیتا ہوں]

شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے:

«مَنْ صَلّٰى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ»[1]

[جس نے دکھانے کے لیے نماز پڑھی تو اس نے شرک کیا، جس نے دکھانے کے لیے روزہ رکھا تو اس نے شرک کیا اور جس نے دکھانے کے لیے صدقہ کیا تو اس نے شرک کیا]

یعنی نماز، روزہ، صدقہ اور کوئی بھی نیک عمل دکھانے کے لیے کرنا شرک ہے۔ امام ابن رجب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جو عمل غیر اللہ کے لیے کیا جاتا ہے، کبھی وہ محض ریا کاری ہوتا ہے، جیسے منافقین کا عمل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ﴾ [النساء: ١٤٢]

[جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو کاہلی سے کھڑے ہوتے ہیں لوگوں کو دکھاتے ہیں]

یہ محض ریا کاری کی نماز ہے، اس میں للہیت نہیں ہوتی۔ اہلِ ایمان سے ریا کاری غالباً صادر نہیں ہوتی ہے۔ کبھی بندے کا عمل اللہ کے واسطے ہوتا ہے، لیکن اس میں ریا کاری بھی شامل ہو جاتی ہے۔ اب اگر عمل کے آغاز ہی سے اس میں ریا شامل ہے تو نصوص صحیحہ اس کے بطلان پر دلالت کرتی ہیں، لیکن اگر اصل میں ریا مشارک نہیں ہے تو جس قدر ریا کی شمولیت ہے، اتنا ہی نقصان ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کا نام شرک خفی رکھا ہے اور اس کو فتنہ دجال سے زیادہ خوفناک فرمایا ہے۔[2]

شرکِ ریا کا پتہ چلنا غایت درجہ مشکل امر ہے، چنانچہ بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اندھیری رات میں کالے پتھر پر چیونٹی کا چلنا اتنا مشکل نظر نہیں آتا جتنا یہ ریا معلوم کرنا مشکل ہے۔

دوسری حدیث میں ریا کا نام "شرک السرائر" رکھا ہے۔[3] شداد بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١٢٥، ١٢٦) المستدرك للحاكم (٤/ ٣٢٩)

[2] مسند أحمد (٣/ ٣٠)

[3] صحيح ابن خزيمة (٩٣٧) صحيح الترغيب والترهيب (١/ ٨)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ریا کو "شرک اصغر" کہتے تھے۔[1] یہ ریا جہال وفساق کی نسبت صلحا و علما میں زیادہ ہوتی ہے۔ فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے آیتِ کریمہ ﴿لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ۲] [تا کہ تمھارا امتحان لے کہ تم میں کون بہتر عمل والا ہے] کی تفسیر میں کہا ہے کہ ﴿أَحْسَنُ﴾ سے مراد "اَخلص و اَصوب ہے۔" کسی نے پوچھا: "اَخلص و اَصوب" کیا ہے؟ کہا کہ جو عمل خالص ہوتا ہے، لیکن صواب نہیں ہوتا تو وہ قبول نہیں ہوتا اور جب صواب ہوتا ہے اور خالص نہیں ہوتا، تب بھی مقبول نہیں ہوتا، جب تک کہ خالص نہ ہو۔ خالص وہ عمل ہے جو صرف اللہ کے لیے ہو اور صواب وہ عمل ہے جو سنتِ نبویہ کے موافق ہو۔[2]

دنیوی لالچ کے ساتھ عمل کرنا بھی شرک ہے:

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ انسان اپنے عمل سے دنیا طلب کرے، یعنی نیک عمل سے مقصد و غرض دنیا طلبی ہو۔ اس میں اور ریا میں فرق یہ ہے کہ ریا میں لوگوں کے نزدیک اپنی عزت وشہرت اور تعریف وتوصیف مراد ہوتی ہے۔ اس میں بھی کبھی دنیا طلبی ہوتی ہے، لیکن دنیا طلبی کی نیت سے جو عمل ہوتا ہے اس میں مال و دولت کا حصول غالب ہوتا ہے، جیسے تحصیلِ مال کے لیے جہاد کرنا یا اغراضِ دنیویہ کے لیے علم حاصل کرنا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا وَ زِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَ هُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ﴾ [هود: ۱۵]

یعنی جس کسی کا ارادہ کسی کام سے یہ ہوتا ہے کہ اس کو مال اور دنیا ہاتھ آئے تو اس عمل کا ثواب یہیں دنیا میں اس کو دے دیا جاتا ہے، جیسے صحت وتندرستی اور مال و اولاد کی طرف سے سرور وسکون۔ اس دنیوی ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جاتی۔ ہاں آخرت میں وہ تہی دست اور مفلس ہو کر آتا ہے، مثلاً قرآن اس لیے پڑھا ہے کہ قاری کہلائے، عالم اس لیے ہوا ہے کہ مولوی مولانا مشہور ہو اور مال اس لیے خرچ کیا ہے کہ سخی کہا جائے۔ پھر وہ دنیا میں انھیں ناموں سے مشہور ہوا تو قیامت میں

---

[1] المعجم الكبير للطبراني (۷۱۶۰) المستدرك للحاكم (۴/ ۳۲۹)

[2] حلية الأولياء (۸/ ۹۵)

پہلے پہل انھیں تین قسم کے آدمیوں سے جہنم کو بھڑکایا جائے گا۔ یہ مضمون مفصل طور پر ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے۔[1] (رواہ ابن جریر)

اس کی شہادت قرآنِ کریم میں بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ﴾ [التوبة: ٣٤]

[اے ایمان والو! بہت سے علما اور پادری لوگوں کے مال باطل طور پر کھاتے ہیں]

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ علم و عمل سے ان لوگوں کی مراد یہی دنیا تھی۔ یہ ارادہ و عمل شرک ہے، اس لیے جس علم و عمل سے ذاتِ الٰہی مقصود نہیں ہوتی، بلکہ اس سے متاعِ دنیا اور اہلِ دنیا کی خوشنودی مقصود ہوتی ہے تو وہ شرک ہے، مثلاً مال لینے کے لیے حج کرنا، کسی عورت سے شادی کرنے کے لیے ہجرت کرنا، مدرس بننے کے لیے علم سکھانا، وظیفہ معاش مقرر کرانے کے لیے نماز پڑھنا، اجرت لینے کے لیے امام و موذن بننا وعلی ہذا القیاس۔ بعض اہلِ علم نے کہا ہے کہ اگر میں جان لوں کہ اللہ پاک میرا ایک سجدہ قبول کر لے گا تو میں مرنے کی آرزو کروں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ [المائدة: ٢٧] [اللہ متقیوں ہی سے قبول فرماتا ہے]

صحیح بخاری میں ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً مروی ہے کہ دینار، درہم اور سامان کے بندے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلاکت کی دعا فرمائی ہے۔[2] اس لیے کہ وہ اپنی خواہش کا بندہ اور نفس پرست ہے۔

شرکِ عشق:

انواعِ شرک میں سے ایک شرک فتنہ عشق ہے۔ یہ فتنہ بہت بڑا اور بہت برا ہے، کیونکہ عاشق معشوق کا بندہ ہو جاتا ہے اور معشوق اس کا معبود بن جاتا ہے، جب کہ عشق اور توحید کے درمیان جنگ ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ عاشق کا ایمان قائم رہ سکے، خواہ وہ عشق کسی مرد سے ہو یا کسی عورت سے، اور خواہ مرد کو مرد سے عشق ہو یا کسی عورت کو عورت سے۔ اطبا نے اس مرضِ عشق کو مالیخولیا کی

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٤٨٩) صحيح ابن خزيمة (٤/ ١١٥) المستدرك للحاكم (١/ ٤١٨)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٢٨٨٧)

ایک قسم بتایا ہے۔ غرض کہ عاشق کا سارا دین معشوق کے واسطے ہو جاتا ہے، اللہ کے لیے اس کا دین کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ ؎

نہ ہوش دین کے باقی رہے نہ دنیا کے
یہ عشق کا ہے کٹہرا کوئی بلا ٹھہری

امام ابن القیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الداء والدواء" اور کتاب "إغاثة اللهفان" وغیرہ میں عشق اور عشاق کی مذمت بہت تفصیل سے لکھی ہے اور عشق کو شرک قرار دیا ہے۔ عشق کا شرک ہونا ایسی واضح بات ہے جس کو ہر عاقل قبول کر سکتا ہے، بلکہ شرک سے بڑھ کر اگر کوئی اور گناہ اور جرم عظیم ہوتا تو یہی عشق ہوتا۔ در اصل جہنم میں جانے کی کنجی اور کافر ہونے کا دروازہ یہی شکلوں وصورتوں کا عشق ہے۔ سارے فسق وفجور کی بنیاد اور ساری محبتِ نفس، شہوت پرستی اور حبِ دنیا کی جڑ یہی فتنۂ عشق ہے جو خانہ برباد دین وایمان ہے۔ یہ قصہ ہائے عشق کی صدہا کتابیں اور یہ بے شمار دواوین اشعار کس لیے تیار ہوئے ہیں؟ ان میں کیا مزا ہے؟ آخر اسی نامراد عشق کی مہا بھارت اور اس کے تطورات کا ذکر کرنا ہی مقصود ہے۔ جو لوگ اس قسم کی کتب اور دواوین میں منہمک رہتے ہیں اور ان کی تالیف وجمع میں اوقات بسر کرتے ہیں، یقیناً وہ اخلاصِ توحید سے دور اور شرک وفجور سے بہت نزدیک ہیں۔ ان کے یہ سارے اعمال آخرت میں برباد کر کے ان لوگوں سے جہنم آباد کی جائے گی۔ عیاذاً باللہ تعالیٰ.

خاتمہ

شیطان لعین کے مکائد ومصائد کا بیان

شیطان کی مکاریاں اور چالبازیاں بے شمار ہیں، اس نے پہلا مکر وفریب اپنی ذات کے ساتھ کیا۔ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا تو وہ اس میں اپنی حقارت اور آدم علیہ السلام کی عزت خیال کر کے ملعون ہو گیا، پھر اس نے آدم وحوا علیہما السلام کے ساتھ یہ مکر کیا کہ قسم کھا کر وہ راہ بتائی اور ایسی خیر خواہی جتائی جس سے وہ جنت سے باہر نکالے گئے، پھر ان کی اولاد کا جانی دشمن ہو گیا اور ان کو راہِ توحید سے بہکا کر شرک جلی وخفی کی کوئی نوع باقی نہیں چھوڑی جوان سے نہ کرائی ہو، إلا من عصمه الله ورحمه. اس نے اللہ کے سوا جتنی مخلوق ہے، انسان کو سب کا بندہ بنا دیا۔ کسی سے بت پرستی کرائی، کسی سے گور پرستی، کسی سے ہوا پرستی، کسی سے رائے پرستی، کسی سے آتش پرستی، کسی سے ستارہ پرستی، کسی سے معشوق پرستی، کسی سے آب پرستی اور کسی سے چوب پرستی جس میں تعزیہ دار بھی داخل ہیں۔

تا چند گہ از چوب وگہ از سنگ تراشی
بگذار خدائیکہ بصد رنگ تراشی

[کبھی پتھر کے کبھی لکڑی کے کتنے دیوتا تراشتے رہو گے، ان صدہا رنگ کے تراشے ہوئے معبودوں کو چھوڑو]

شیطان نے کبھی یہ گل کھلایا کہ کسی سے دو خدا اور کسی سے تین خدا کہلوائے، کسی سے بے شمار خالق منوائے اور کسی کو یہ سمجھا دیا کہ ان مصنوعات کا کوئی صانع نہیں ہے:

﴿مَا هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ﴾

[الجاثية: ٢٤]

[زندگانی یہی ہماری دنیوی زندگی ہے۔ اسی میں ہم مرتے جیتے رہتے ہیں اور زمانے کے

علاوہ ہمیں کوئی ہلاک نہیں کرتا]

اسی طرح شیطان نے کسی سے ملائکہ، جنات اور شیاطین کے وجود کا انکار کرایا اور کسی کو فلسفی بنا دیا۔ یہ فلسفیت کسی امت کے ساتھ خاص نہیں ہے، یونان ہو یا ایران یا اور کوئی جائے آباد یا ویران، ہر جگہ اور ہر امت میں اس مذاق کے لوگ ہوتے ہیں۔ اسلام میں بھی یہ فلسفۂ شرک و کفر خیر القرون کے بعد گھس آیا اور اکثر امت اس میں پھنس گئی۔ إلا ما شاء الله تعالى.

دو گونہ فتنہ:

فتنہ دو طرح کا ہوتا ہے: ایک فتنہ شبہات۔ دوسرا فتنہ شہوات۔ فتنہ شبہات بصیرت کی کمزوری اور علم کی کمی سے ہوتا ہے، خصوصاً جب کہ اس کے ساتھ فاسد ارادہ اور خواہش پرستی بھی شامل ہو جائے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ﴾ [النجم: ٢٣]

[یہ لوگ بس گمان اور خواہش نفس کی پیروی کرتے ہیں]

فتنہ شبہات اور اس کا تدارک:

آخر کار اس فتنے کا انجام کفر و نفاق ہوتا ہے۔ منافقین اور اہلِ بدع اپنے نفاق وابتداع کے حسبِ مراتب اسی فتنے میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس فتنے سے تب ہی نجات ملتی ہے کہ ہر چھوٹے بڑے کام میں صرف رسول کا اتباع کرے اور ان کو فیصل مانے، ظاہر و باطن میں کتاب وسنت کے خالص مدلولات کا مطیع رہے، کفارِ یونان وغیرہ کے علوم سے اشتغال نہ کرے اور منقول کو کسی معقول کی وجہ سے نہ چھوڑے۔ شارع علیہ السلام نے تو آسمانی کتب منسوخہ کا مطالعہ بھی پسند نہیں کیا ہے، بلکہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں اجزائے تورات دیکھ کر غصہ کیا اور فرمایا:

«لَوْ كَانَ مُوسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا اتِّبَاعِي»[1]

[اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے سوا انھیں چارہ نہ ہوتا]

شریعت محمدیہ کا جب یہ مقام ہے تو ہند اور یونان کے کفار و فجار کے علوم کی تعلیم و تعلم کا یہاں کیا کام ہے اور اصولِ دین میں علمِ کلام کے خلط ملط قوانین اور فروعِ مذاہب میں قوانینِ معقولات

[1] مسند أحمد (٣/ ٣٨٧) شعب الإيمان للبيهقي (١٧٥) اس کی سند میں "مجالد بن سعید" راوی ضعیف ہے۔

سے کیا غرض ہے؟ ہدایت کا دار ومدار رسول اللہ ﷺ کے اقوال، افعال اور احوال پر ہے۔ جس قدر سنتِ مطہرہ سے دوری ہوگی، اسی قدر ضلالت بھی زیادہ ہوگی۔

فتنہ شہوات کا علاج:

رہا فتنہ شہوات تو وہ صبر سے دفع ہوسکتا ہے، جس طرح فتنہ شبہات یقین سے دور ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ﴾ [العصر: ۳] [اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کرتے ہیں] فتنہ شبہات کے دفع کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس قول ﴿وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: ۳] [ایک دوسرے کو صبر کرنے کی نصیحت کرتے ہیں] میں فتنہ شہوات کے دفع کی طرف اشارہ ہے۔ جب کوئی بندہ ان دونوں فتنوں سے صحیح سلامت رہتا ہے تو اس کو فلاح وسعادت اور ہدایت و رحمت، جو اصل مقصود ہیں، حاصل ہوتی ہیں۔ ہدایت کو قبول کرنے والا محل بندۂ پرہیز گار کا دل ہوتا ہے اور جو غیر قابل محل ہوتا ہے تو اس میں جب ہدایت آتی ہے تو اس پر کچھ بھی اثر نہیں کرتی، جس طرح مریض کے لیے اچھی غذا سود مند نہیں ہوتی، بلکہ اس کے ضعف وفساد کو زیادہ کرتی ہے۔

ایک نکتہ:

اس جگہ ایک نکتہ یہ ہے کہ انسان کبھی یہ بات دیکھتا ہے کہ اہلِ ایمان پر دنیا میں لگاتار مصیبتیں آتی ہیں اور فجار کو دنیا میں مال وریاست ملتی ہے تو وہ یہ اعتقاد کر لیتا ہے کہ دنیا کی نعمت انھیں کفار وفجار کے لیے ہے، مومنوں کا حصہ دنیا میں بہت کم ہے، اور وہ اس بات کا معتقد ہو جاتا ہے کہ عزت ونصرت دنیا میں کفار ومنافقین کے لیے مقرر ہے، پھر جب قرآن پاک میں یہ آیات دیکھتا ہے:

1. ﴿وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [المنافقون: ۸]

[اور اللہ ہی کے لیے عزت ہے، اور اس کے رسول اور مومنوں کے لیے ہے]

2. ﴿وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ [الصافات: ۱۷۳] [یقیناً ہمارا لشکر ہی غالب ہوگا]

نیز فرمایا:

3. ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ﴾ [المجادلة: ۲۱]

[اللہ نے لکھ رکھا ہے کہ میں غالب رہوں گا اور میرے رسول غالب رہیں گے]

④ ﴿وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٢٨] [اور آخرت پرہیز گاروں کے لیے ہے]

تو وہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ آیات نعیمِ آخرت پر محمول ہیں، فقط دنیا میں نصر و ظفر انھیں کفار و اہلِ نفاق کے لیے ہے اور صاحبِ حق اس جگہ مقہور، مغلوب اور مجبور رہتا ہے۔ پھر اگر کوئی اس سے یہ بات کہتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوا؟ تو وہ شخص اگر اللہ کے احکام کی توجیہ حکمت و مصلحت کے حوالے سے نہیں کر سکتا تو یہ جواب دیتا ہے:

① ﴿وَ يَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾ [إبراهيم: ٢٧] [اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے]

② ﴿إِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ﴾ [المائدة: ١] [بیشک اللہ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے]

③ ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ [الأنبياء: ٢٣]

[اللہ جو کرتا ہے اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا، اور لوگوں سے ان کے اعمال کی پوچھ ہوگی]

اگر وہ اللہ کے افعال کی توجیہ اور حکمت کا علم رکھنے والا ہو تو یہ کہتا ہے کہ یہ بات اس لیے ہوتی ہے کہ اللہ اس صبر کے عوض ان کو آخرت میں ثواب جزیل، اجر جمیل اور درجات رفیعہ مرحمت فرمائے گا۔ حالانکہ قرآن خلافِ حس وارد نہیں ہوا۔ یہ اس شخص کا جہل ہے اور اللہ کے وعد و وعید سے ناواقفیت ہے، کیونکہ دشمن کو اس پر جو قابو ملا ہے، اس کے ضعفِ ایمان کے سبب سے ملا ہے۔ اگر وہ شرائع و احکام واجبہ پر قائم دائم رہتا تو ہرگز یہ ذلت وخفت اس کو نہ گھیرتی، لیکن چونکہ اس کو اللہ کے وعدے پر پورا وثوق نہیں ہے اور اللہ کی کتاب کا صحیح فہم بھی نہیں ہے، اس لیے وہ ایسا اعتقاد رکھتا ہے، ورنہ قرآن پاک میں دنیا و آخرت دونوں جگہوں کے لیے صراحتاً وعدۂ نصرت آیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾

[المؤمن: ٥١]

[بے شک ہم اپنے رسولوں اور ایمان والوں کی مدد دنیا کی زندگی میں کرتے ہیں اور اس دن بھی جس دن گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے]

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿وَ مَنْ یَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾

[المائدة: ٥٦]

[اور جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان والوں سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ ہی کا گروہ غالب رہے گا]

اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ جو مصیبت بڑی یا چھوٹی بندے پر آتی ہے، وہ اس کے گناہوں کا نتیجہ ہے۔ یہ دونوں مقدمے کتاب اللہ میں مذکور ہیں، جن میں غور کرنے سے یہ اشکال زائل ہو جاتا ہے اور ان تکلفات باردہ وتاویلات بعیدہ کی حاجت باقی نہیں رہتی۔ بایں ہمہ اگر سارا جہان کسی کا دشمن ہو جائے اور اللہ نہ چاہے تو اسے کچھ بھی نقصان نہیں پہنچ سکتا ہے۔ یہی سارے موحدین کا عقیدہ اور تجربہ ہے۔

لو الثقلان الجن والإنس أجمعوا
یریدون إیلاما لأصغر نملة
یکون لها رب السماوات ناصرا
لما ظفروا منها بأدنی مضرة

[اگر تمام جن وانس اکٹھے ہو کر سب سے چھوٹی چیونٹی کو تکلیف پہنچانا چاہیں تو آسمانوں کا مالک اس کا مددگار ہوگا، وہ سب اسے معمولی سا نقصان بھی پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکیں گے]

خاتمہ کلام:

اب اس گفتگو کا خاتمہ چند اصولِ جامعہ پر کیا جاتا ہے:

1. جو شرور ومحن اور تکالیف مسلمانوں کو پہنچتی ہیں، وہ ان شرور ومحن سے، جو کفار کو پہنچتے ہیں، کم ہوتی ہیں، اسی طرح جو مصیبت اَبرار (نیکوکاروں) پر آتی ہے، وہ کفار کی مصیبت سے کم ہوتی ہے۔ امر واقع اس کا شاہد ہے۔
2. مومن کی مصیبت رضا اور طلبِ ثواب پر مشتمل ہوتی ہے۔ اگر رضا فوت ہوگئی تو صبر اور حصولِ ثواب پر اعتماد رہتا ہے، جس سے اس بلا کی گراں باری اس پر ہلکی ہو جاتی ہے۔

③ جب مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کی اطاعت واخلاص کے مطابق اللہ کی طرف سے مدد ملتی ہے۔

④ محبتِ الٰہی جس قدر دل میں زیادہ متمکن اور راسخ ہوتی ہے، اتنا ہی محب کو رضائے محبوب میں ہر بلا خوش گوار اور شیریں نظر آتی ہے۔ شاعر نے کہا ہے:

لئن ساءني إن نلتني بمساءة
لقد سرني أني خطرت ببالكا

[اگر تمھاری طرف سے میرے حق میں کوئی ناخوشگوار بات ہونے سے مجھے تکلیف پہنچی تو کوئی پروانہیں، بلکہ اس پر مجھے خوشی ہے کہ تمھارے دل میں میرا خیال تو آیا ہے]

غم کھاتا ہوں لیکن میری نیت نہیں بھرتی
کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

⑤ جو عز و جاہ کفار کو حاصل ہوتا ہے، وہ باطن میں ان کے لیے ذلت ونکبت ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا ہے:

"إنهم، وإن هملجت بهم البغال، وطقطقت بهم النعال، فإن ذل المعصية في قلوبهم، أبى الله إلا أن يذل من عصاه"

[یہ کفار اور دنیا دار جو تیز رفتار اور عمدہ چال والے گھوڑوں پر خوش خرامی کرتے ہیں اور چلتے وقت ان کے جوتوں سے دھماکے ہوتے ہیں، درحقیقت ان کے دلوں میں معصیت کی ذلت پنہاں ہوتی ہے اللہ کو اپنے نافرمانوں کی تذلیل کے سوا کوئی اور بات منظور نہیں ہے]

⑥ مومن کا بلا میں مبتلا ہونا دوا کے مثل ہے، جس سے بیماریاں دور ہوتی ہیں، اسی لیے سب لوگوں میں زیادہ انبیا مصائب میں گرفتار ہوتے ہیں، پھر ان سے قریب ترین افراد کا درجہ ہے۔ مومن کی ابتلا اس کی صلاحیتِ دین کے برابر ہوتی ہے، اگر اس کے دین میں رقت اور نرمی ہے تو پھر بلا میں بھی خفت ہوتی ہے۔ مومن کے ساتھ بلا برابر لگی رہتی ہے، یہاں تک کہ وہ زمین پر بے گناہ ہو کر چلتا پھرتا ہے۔[1]

⑦ کبھی کبھی مومن پر دشمن کا غلبہ ایک امر لازم ہے، جیسے ہر انسان کے لیے اس دار فانی میں سخت گرمی سردی یا امراض و ہموم لازم طبیعت ہوتے ہیں۔ یہ سب بشریت کا مقتضا ہیں، یہاں تک

---

[1] سنن الترمذي، رقم الحديث (٢٣٩٨) سنن ابن ماجه، رقم الحديث (٤٠٢٣)

کہ بچوں اور چوپایوں کو بھی یہ احوال عارض ہو جاتے ہیں۔ یہاں دنیا میں سارے بشر اس حالت خیر وشر میں شریک ہیں، مگر وہاں خبیث سے طیب کی تمیز بہ خوبی ہو جائے گی۔

⑧ مومن کی ابتلا میں اللہ کی حکمت ہے، جس کی تفصیل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے، جیسے ذلت و انکسار، افتقار اور سوال و دعا کے ذریعے عبودیت کا اظہار کرنا۔

⑨ اس سارے کارخانے اور آسمان و زمین کی تخلیق سے مقصود بندے کا امتحان لینا ہے کہ دیکھیں وہ کیسے کام کرتا ہے، چنانچہ ارشاد ہے:

① ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الملك: ٢]

[تا کہ اللہ تمھارا امتحان لے کہ تم میں سے کون اچھے عمل والا ہے]

② ﴿لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ [الكهف: ٧]

[اور تا کہ ہم انھیں آزمائیں کہ ان میں کون اچھے عمل والا ہے]

معلوم ہوا کہ امتحان کا ہونا ضروری ہے، خواہ مومن ہو یا کافر۔ دونوں کے امتحان میں اتنا فرق ہے کہ مومن کا امتحان اسہل ہوتا ہے اور اسی دار فانی میں ہو جاتا ہے، البتہ کافر کا امتحان بہت سخت ہے جو یہاں بھی ہوتا ہے اور قیامت میں بھی ہوگا اور ہمیشہ رہے گا۔

⑩ جو بلا بندے کو اللہ کی راہ میں پہنچتی ہے، وہ جان یا مال یا اہل یا محبوب میں پہنچتی ہے۔ جو بلا جان پر آتی ہے، وہ کبھی جان کو تلف کر دیتی ہے اور کبھی الم وتکلیف دیتی ہے۔ ان سب اقسام میں سخت تر یہی بلائے جان ہے۔ یہ بات ہر کسی کو معلوم ہے کہ ساری مخلوق مرنے والی ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ﴾ [الزمر: ٣٠]

[بیشک آپ مرنے والے ہیں اور وہ لوگ بھی مریں گے]

مومن کی بڑی غایت یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں شہید ہو۔ یہ موت تمام موتوں سے اشرف ہوتی ہے اور سب سے زیادہ سہل تر ہے۔ اس لیے کہ شہید کو موت کی تکلیف فقط اتنی ہی ہوتی ہے، جیسے چیونٹی کے کاٹنے سے اذیت محسوس ہوتی ہے۔[1] شہادت میں کوئی مصیبت موت معتاد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جو کوئی اس مصیبت کو بستر پر موت سے بڑا خیال کرتا ہے، وہ جاہل ہے۔ یہی حال مال، آبرو اور بدن پر آنے

① سنن الترمذي، رقم الحديث (١٦٦٨) مسند أحمد (٢/ ٢٩٧)

والے مصائب کا بھی ہے، پس جو کوئی انفاقِ مال میں بخل کرتا ہے اور راہِ خدا میں اس کو صرف نہیں کرتا تو وہ جلد یا بدیر مضرت میں گرفتار ہوتا ہے، اسی طرح جو اپنی آبرو اور بدن کو راہِ خدا میں مشقت سے دو چار نہیں کرتا تو وہ اللہ کی غیر مرضیات میں اس سے بھی زیادہ محنت و مشقت میں مبتلا ہوتا ہے، اس بات کو سب لوگ تجربے سے اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں۔

ابلیس نے سجدۂ آدم سے گریز کر کے اپنا اعزاز چاہا تھا، آخر اللہ نے اس کو سب سے زیادہ ذلیل کر دیا اور اہلِ فسوق و فجور اور اصحابِ عصیان کا خادم قرار دیا۔ وہ سجدۂ آدم پر تو راضی نہ ہوا مگر اس نے فاسقوں فاجروں کا خدمت گار بننا پسند کر لیا، اسی طرح بت پرست وغیرہ جنھوں نے اتباعِ رسل سے عار ظاہر کی اور ان کو بشر اور اپنا ہم جنس سمجھ کر ان کا انکار کیا تو وہ اس ذلت میں گرفتار ہیں کہ اَحجار و اَشجار کے غلام اور عبادت گزار ہیں۔ بعض سلف نے کہا ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی کے ہمراہ اس کی حاجت میں چند قدم چلنے سے باز رہتا ہے تو اللہ اس کو گناہوں میں خوب دوڑاتا ہے۔ اسی طرح جو لوگ توحید خالص کی تعظیم سے باز رہتے ہیں تو وہ شرک کی انواعِ ذلت میں مبتلا ہو کر جہنم کے حق دار ہو جاتے ہیں۔ اللہ کے سامنے تو وہ عجز و عبودیت ظاہر کرنے میں عار کرتے ہیں، مگر ادنا مخلوق کے آگے سر جھکاتے ہیں اور خوشامد سے پیش آتے ہیں، اسی طرح جو لوگ اتباعِ سنت سے انکار رکھتے ہیں تو وہ افرادِ امت کی رائے پر چل کر حقیر و ذلیل بنتے ہیں اور معصوم کو چھوڑ کر غیر معصوم کے تابع ہو جاتے ہیں۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

[دونوں راہوں کے درمیان تفاوت میں غور تو کرو]

غور کرنے سے ان حالات کا تفاوت بہ خوبی ظاہر ہوتا ہے اور طیب خبیث سے ممتاز ہو جاتا ہے۔

بعد از خدائے ہر چہ پرستند خوب نیست

بیدولت آنکہ تکیہ بغیر اختیار کرد

[اللہ کے بعد جس چیز کی لوگوں نے پوجا کی اچھا نہیں کیا، بڑا بدنصیب ہے وہ جس نے غیر اللہ پر اعتماد کیا]

ذيل الخاتمة في بيان حسن الخاتمة

حدیثِ جبرئیل علیہ السلام میں، جس کو مسلم نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، اسلام، ایمان واحسان کی تعریف آئی ہے اور ان تینوں باتوں میں سے ہر ایک کا مطلب بیان ہوا ہے۔ فرمایا:

«اَلْإِسْلَامُ أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلَاةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكَاةَ، وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ، وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلًا»[1]

[مسلمان وہ شخص ہے جو اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول ہیں، اور نماز پڑھا کرتا ہے، زکات دیا کرتا ہے، رمضان کا روزہ رکھا کرتا ہے، اللہ کے گھر کا حج بجا لاتا ہے، اگر اس تک راستہ پاتا ہے]

انھیں پانچ چیزوں پر اسلام کی بنیاد ہے، جس طرح ابن عمر رضی اللہ عنہما کی متفق علیہ حدیث میں آیا ہے۔[2] یہ پانچوں چیزیں اعمالِ جوارح سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو کہے اور ان پر عمل کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہوسکتا۔ پہلی چیز کا نام توحید ہے، باقی چار چیزوں کا نام عملِ صالح ہے۔ توحید کی ضد کو شرک کہتے ہیں اور عملِ صالح نہ کرنے کو کفر بولتے ہیں۔ معاذ رضی اللہ عنہ کی مرفوع حدیث میں توحید کی بابت یہ تاکید آئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

«لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّإِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ»[3]

[اگر کوئی تجھ کو جان سے مارے یا آگ میں جلائے تو پھر بھی تم شرک نہ کرنا]

فرض نماز کی بابت یہ وعید فرمائی ہے:

«لَا تَتْرُكَنَّ صَلَاةً مَّكْتُوْبَةً مُّتَعَمِّدًا فَإِنَّ مَنْ تَرَكَ صَلَاةً مَّكْتُوْبَةً مُّتَعَمِّدًا فَقَدْ

---

[1] صحيح مسلم (١/ ٣٧)

[2] صحيح البخاري، رقم الحديث (٨) صحيح مسلم (١/ ٤٥)

[3] مسند أحمد (٤/ ١١، ٥/ ٢٣٨) سنن ابن ماجه (٢/ ١٣٣٩)

بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ» [1] (رواه أحمد)

[تم ہرگز کوئی فرض نماز جان بوجھ کر نہ چھوڑو، کیونکہ جو شخص کوئی فرض نماز قصداً چھوڑ دیتا ہے تو اس سے اللہ کا ذمہ بری ہو جاتا ہے]

یعنی ایک فرض نماز دیدہ و دانستہ ترک کر دینے سے اللہ کا ذمہ اس شخص سے بری ہو جاتا ہے۔

دوسری حدیث میں قصداً ترکِ نماز کو کفر فرمایا ہے۔[2]

پھر اسی ترک کو تیسری حدیث میں مومن اور کافر کے درمیان فارق ٹھہرایا ہے۔[3]

پس جو حکم قصداً ترکِ نماز کا ہے وہی حکم صوم و زکات و حج کو قصداً ترک کرنے والے کا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح خلافِ توحید سے شرک ثابت ہوتا ہے، اسی طرح ترکِ عملِ صالح سے کفر در آتا ہے اور جس طرح شرک کی جزا خلودِ نار ہے، اسی طرح ترکِ عمل کی جزا دخولِ نار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر جگہ قرآن پاک میں ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی قید لگائی اور ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ فرمایا ہے، پھر جب ان اعمالِ صالحہ کے مجرد ترک پر یہ شدید وعید وارد ہے تو پھر عمل غیر صالح کے ارتکاب پر خدا حافظ ہے، جیسے ان کبائر ظاہرہ کا ارتکاب جو جوارح سے تعلق رکھتے ہیں، اسی لیے قرآن وحدیث میں اکثر کبائر کے مرتکب پر تکفیر کا حکم لگایا گیا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ شہادتین کا تارک مشرک ہے اور اعمالِ اسلام کا مستقل طور پر ترک کرنے والا، نیز بعض کبائر کے ارتکاب پر اصرار کرنے والا کفر کے دام میں پھنس جاتا ہے، پھر جس کی سیئات زیادہ اور حسنات کم ہیں، وہ جہنم کا حق دار ہوتا ہے اور جس کی حسنات زیادہ اور سیئات کم ہیں، وہ مغفور ہو سکتا ہے۔

ایمان:

دینِ حق کا دوسرا جز ایمان ہے۔ اس کی تعریف میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے:

«أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ» [4]

[ایمان یہ ہے کہ دل سے اللہ پر اور اس کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور آخرت کے

---

[1] مسند أحمد (٤/ ١١، ٥/ ٢٣٨) سنن ابن ماجه (٢/ ١٣٣٩)

[2] مسند أحمد (٦/ ٤٢١)

[3] صحيح مسلم (١/ ٨٨)

[4] صحيح مسلم (١/ ٣٧)

دن پر یقین لائے، اور تقدیر کی بھلائی برائی پر ایمان لائے]

یہ ایمان لانا دل کا عمل ہے، جس طرح اسلام لانا جوارح کا فعل تھا۔ یہ فعل بھی ایسا ہی ہے جس کا انکار کفر ہوتا ہے۔ قرآن میں جابجا ایمان کے مقابلے میں کفر اور مومن کے مقابلے میں کافر کا ذکر کیا گیا ہے۔ پھر جس طرح کبائرِ ظاہرہ عملِ جوارح کے مفسد ہوتے ہیں، اسی طرح کبائرِ باطنہ فعل قلب کے مفسد ہیں۔ اہلِ علم نے ان کبائرِ باطنہ کی تعداد ساٹھ کبیرہ گناہوں تک بتائی ہے، جس طرح کبائرِ ظاہرہ کو چار سو سے زیادہ شمار کیا ہے، پس جو کوئی ایمان نہیں رکھتا، وہ مسلمان نہیں ہوتا۔ پھر جب اس کا اسلام ہی ثابت نہ ہوا تو لا محالہ وہ مستحق نار ٹھہرے گا۔ اب ضرورت ہے کہ اسلام کے ہمراہ ایمان بھی درست کریں، یعنی ظاہر و باطن دونوں سے پکا موحد اور عامل صالح بنے، تب کہیں نجات کی امید قوی ہو سکتی ہے، وگرنہ ساری تگ و دو بے کار ہے۔

احسان:

دینِ حق کا تیسرا جز احسان ہے۔ اس کی تعریف حدیث مذکور میں یوں آئی ہے:

«أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهٗ يَرَاكَ»

یعنی عبادت الٰہی کے وقت یوں سمجھے گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، پھر اگر یہ جانے کہ اللہ کو نہیں دیکھتا تو اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔ جبریل علیہ السلام کی یہ حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے مزید الفاظ کے ساتھ متفق علیہ مروی ہے، ایسی حدیث سارے اقسامِ حدیث میں اَصح و اَعلا ہوتی ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام و ایمان کے ہمراہ اخلاصِ عبادت بھی ضروری ہے، اگر یہ اخلاص پیدا نہ ہوا، بلکہ اس کی ضد ہوئی، یعنی ریا و سمعہ کے لیے عبادت ہوئی تو پھر وہ مشرک کا مشرک ہی رہا اور سب کیا دھرا اکارت گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ریا کو شرکِ اصغر اور شرکِ سرائر فرمایا ہے، جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے۔ اکثر لوگ جو اس زمانۂ آخر میں مسلمانی، ایمانداری اور درویشی کا دعویٰ کرتے ہیں، جب ان کی حالت حدیثِ جبریل علیہ السلام سے ملائی جاتی ہے تو وہ اس پر پورا نہیں اترتے۔ کوئی محض زبان سے کلمہ گو ہے، لیکن اس اقرار کے ساتھ افعالِ شرک بھی بجا لاتا ہے، پھر اگر شرک ظاہر سے بچ کر نماز، روزہ، حج اور زکات ادا کرتا ہے تو اس کے ایمان میں ایک طرح کا خلل ہوتا ہے۔ کسی کو

معاد جسمانی (دوبارہ زندہ کیا جانا) کا انکار ہے، کسی کو قدر میں بحث ہے، کسی کو کتاب پر چلنے سے انحراف ہے، اس صورت میں اس کا ظاہری اسلام محض بے کار ٹھہرتا ہے، پھر اگر اسلام و ایمان کو صورتاً درست بھی کر لیا، مگر احسان کو معناً بجا نہ لایا تو بھی صحتِ دین میں بڑا نقصان رہا۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی مغفرت و جنت کے لائق جب ہی سمجھا جاتا ہے کہ دین کے ہر سہ مراتب (ایمان واسلام واحسان) کو بہ خوبی ان کی شروط کے مطابق بجا لائے، اگر شرط فوت ہوگئی تو مشروط بھی فوت سمجھو۔ اس زمانے میں کوئی نرا مسلمان ہے، کوئی نرا مومن اور کوئی نرا محسن، پھر بھی وہ اپنے آپ کو دین دار سمجھ کر اپنی مغفرت کا یقین رکھتا ہے۔ اللہ کی عبادت کو لوگوں نے یوں ہلکا سمجھ لیا ہے کہ وہ غفور رحیم ہے، اس کی رحمت اس کے غضب پر سابق ہے، لہٰذا وہ اپنے حقوق کا مطالبہ نہ کرے گا، اس کو ہماری عبادت کی کچھ پروا نہیں ہے، اس بنیاد پر اسلام تو پہلے ہی سے جاتا رہا، اب ایمان کو یوں سبک خیال کر لیا ہے کہ دنیا نقد ہے، آخرت ادھار ہے، اس کو کس نے دیکھا ہے؟ اس جگہ سارا کام تدبیر سے چلتا ہے نہ کہ تقدیر سے۔ جو کچھ اہلِ کلام لکھ گئے ہیں وہی مراتبِ ایمان کے لیے کافی ہیں۔ قرآن وحدیث کا سمجھنا انھیں کا ذمہ تھا، ہم کو کیا حاجت ہے کہ ہم کتاب اللہ کا ترجمہ دیکھیں؟ اس کا مطلب سمجھنے بیٹھیں؟ حدیث کے معنی کو جاننے کا ارادہ کریں؟ یہ کام جن لوگوں کا تھا وہ کر گئے، ہم کو انھیں کی راہ پر چلنا کافی ہے۔

پھر احسان کو یوں بے قدر ٹھہرا دیا ہے کہ دنیا ظاہر پرست ہے، جو کام کرو، وہ ان کو دکھانے، سنانے، خوش کرنے اور نام پیدا کرنے کے لیے کرو۔ اخلاصِ دل ہوا تو کیا ہوا، اس کو کون دیکھتا سنتا پوچھتا ہے؟

غرض کہ دینِ حق کے جو تین اصول تھے، اب ان سب میں کامل فتور و قصور پیدا ہوگیا ہے۔ اللہ کے عوض سارے غیر اللہ پوجے جاتے ہیں۔ کتاب اللہ کے بجائے علم فروع کی صدہا کتابیں موجود ہیں۔ سنت کے عوض صدہا بدعات پیدا ہوگئی ہیں۔ نماز روزے کے بدلے سیکڑوں منکرات پر عمل ہو رہا ہے۔ زکات تو سیکڑوں میں شاید کوئی ایک دیتا ہو۔ اتفاقاً اگر کوئی حج بھی کر آتا ہے تو مالِ حلال کو حج وعمرے کے لیے شرط نہیں جانتا۔ ایمان کے عوض صدہا عقلی مسائل پسند آگئے ہیں یا فلاسفہ کی باتوں پر عقیدہ درست کیا جاتا ہے، احسان کے عوض مسئلہ وحدتِ وجود وغیرہ موجود ہے وعلیٰ ہذا القیاس۔

غرض کہ اسلام کی بے قدری، ایمان کی غریبی اور احسان کی نایابی کا یہ حال ہے کہ فساق وفجار اہلِ تقوی کو بہائم و وحوش کی طرح ذلیل وخوار جانتے ہیں۔ اہلِ دین کو احمق، بے وقوف، بے عقل، بدنصیب اور کم بخت سمجھتے ہیں۔ بڑا عقل منداس زمانے میں وہ شخص ہے جو دہریہ یا فلسفی، یا مداہن فی الدین یا صلحِ کل کا علم بردار اور تحصیل مال میں چست چالاک ہو، کذب و افترا اور جملہ اخلاق ذمیمہ میں بے باک ہو اور اس کا یہ عقیدہ ہو کہ جیسا دیس ویسا بھیس۔ یہ سارے مکائدِ شیطان اور مصائدِ ابلیس ہیں۔ اللہ پاک کو ان لوگوں سے جہنم کا آباد کرنا منظور ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ ایسے ہی احوال وافعال میں مبتلا رہتے ہیں اور دنیا میں بڑے دانش مند، عزت دار اور شریف کہلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جن لوگوں کا جنت میں لے جانا منظور ہے، وہ ان کو توحید و اتباعِ سنت کی توفیق بخشتا ہے، اگرچہ وہ دنیا میں خوار زار ہی کیوں نہ ہوں۔ آج کا دن کفار وفجار کا ہے، کل اللہ نے چاہا تو اہلِ تقوی و اَبرار کا دن ہوگا۔

«حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ»[1]

[جنت مشقتوں سے اور جہنم شہوات سے گھری ہوئی ہے]

آخری تمنا:

اللہ تعالیٰ نے جب مجھ کو میرے سوال کے مطابق دنیوی امور کے اشتغال سے نجات بخشی اور مطالعہ کتب کی فرصت عنایت فرمائی تو جو لوگ دنیادار ظاہر پرست تھے، انھوں نے افسوس ظاہر کیا، مگر میں نے یہ شعر پڑھا:

ترا بلنگرۂ عرش می زنند صفیر
ندانمت کہ دریں دا مگہ چہ افتادہ است

[تمھارے لیے بلند عمارتوں کے کنگروں سے پرندے شور کر رہے ہیں کہ ہم یہ نہیں جان سکے کہ تم اس قید خانے میں کیوں پڑے رہے؟]

اپنے ربِ معبود کا ہزار دل لاکھ زبان سے شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھ کو اس دلدل سے رہائی بخشی اور ناجنس کی صحبتوں سے فرصت دی۔ اب فقط میں ہوں اور میرا دل ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سلامت رکھے۔ غایت تمنا یہ ہے کہ جو ذرا سا علاقہ دنیا اور اہلِ دنیا سے باقی رہ گیا ہے، وہ بھی حسنِ اسلوب اور مناسب بہانوں سے کسی طرح منقطع ہو جائے اور میں نماز روزہ وغیرہ عبادات بجالانے اور علومِ کتاب وسنت

[1] صحیح مسلم (٤/ ٢١٧٤)

میں مشغول رہنے کے سوا کسی اور کام کا باقی نہ رہوں۔

یارب ایں آرزوے من چہ خوش ست
تو بدیں آرزو مرا برساں

[اے میرے پروردگار! میری یہ آرزو کتنی اچھی ہے؟ تو اس آرزو تک مجھے پہنچادے]

ساری طویل عمر بلا قصد وارادہ اور چار و ناچار بمشیت پروردگار ظاہری نسبت کے سبب اہلِ دنیا کی صحبت میں گزری، اگرچہ تہ دل سے ہر طرح کی بے زاری اور نفرت قلبی حاصل رہی، لیکن اب اس آخر عمر میں اللہ پاک سے امید قوی ہے کہ باقی سانسوں کو اپنی مرضیات میں صرف کرائے اور آفاتِ دنیا وعقابِ نار سے بچا کر گلزار ہمیشہ اور بہارِ فردوسِ بریں میں بود وباش کی جگہ مرحمت فرمائے۔ گو ہمارے واسطے ہر کام سخت مشکل ہے، مگر اس پر ہر مشکل نہایت آسان ہے۔ ہم ہر قسم کے شرک وکفر اور فسق و فجور سے تائب ہو کر آئے ہیں، اگرچہ عمل میں قاصر ہیں، لیکن ہمارا رب رحیم ورحمان ہے:

اے مالک ہر بلندی و پستی — شش چیز عطا بکن ز ہستی
علم و عمل و فراخ دستی — ایمان واماں و تندرستی

[اے ہر بلندی و پستی کے مالک! زندگی کی یہ چھے (٦) چیزیں عطا کر: علم، عمل، آسودگی وفیاضی، ایمان، امان اور تندرستی]

خاتمہ تالیف:

یہ رسالہ ۲۷/ محرم ۱۳۰۴ ہجری کو لکھنا شروع کیا تھا، جو چہارم صفر سنہ صدر کو بحمدہ تعالیٰ تمام ہوا۔ اس کا دوسرا حصہ اتباع کے بیان میں سوچ رکھا تھا، لیکن اس تنگ وقت میں سرانجام نہ ہو سکا۔[1] اگر حیات فانی چندے اور باقی ہے اور توفیقِ الٰہی شاملِ حال ہوئی، تو ان شاء اللہ تعالیٰ اسے اس حصے سے علاحدہ مستقل طور پر لکھا جائے گا۔ والحمد للہ ظاهراً و باطناً وأولاً واخراً.

---

[1] مولف رحمہ اللہ نے یہ حصہ بھی "دعوة الداع إلى إيثار الاتباع على الابتداع" کے نام سے لکھ دیا تھا جو اس رسالے سے الگ طبع ہوا۔ زیرِ نظر مجموعے میں یہ رسالہ بھی شامل ہے۔

برصغیر میں علومِ اسلامیہ اور عقیدہ سلف کی نصرت و اشاعت کے سلسلے میں والا جاہ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ (۱۲۴۸ـ۱۳۰۷ھ) کی مساعیِ جمیلہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نے خود بھی حسبِ ضرورت متعدد کتب رقم فرمائیں، جن کی تعداد دو صد سے متجاوز ہے، اور دوسرے علما کو بھی تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ کیا، ان کے لیے خصوصی وظائف کا بندوبست کیا اور اسلامی علوم وفنون کے اصل مصادر و مآخذ کی از سرِ نو طباعت و اشاعت کا وسیع اہتمام کیا، جو اپنے وقت میں علمائے کرام اور طلبائے دین کے لیے نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوا۔

نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ نے علومِ اسلامیہ کے تقریباً تمام گوشوں سے متعلق مستقل تالیفات رقم کی ہیں اور شاید ہی کوئی ایسا دینی و علمی موضوع ہو، جس پر نواب صاحب رحمہ اللہ نے کوئی مستقل رسالہ یا کتاب نہ لکھی ہو۔ ان تصانیف کی کثرت کا یہ عالم ہے کہ ابھی تک ان کی یقینی تعداد اور موضوعات کی تعیین کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکا، جس کی بڑی وجہ ان مولفات کی عدم دستیابی اور فقدان ہے، کیوں کہ مولف رحمہ اللہ کی زندگی میں تو یہ کتب اشاعت پذیر ہوئیں، لیکن بعد میں دوبارہ ان کی از سرِ نو اشاعت کا کوئی معقول بندوبست نہ ہو سکا اور یہ علمی جواہر پارے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

چنانچہ جمعیۃ احیاء التراث الاسلامی کویت کے ذیلی شعبے لجنۃ القارۃ الهندیہ کے زیرِ اہتمام فضیلۃ الشیخ ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ اور محترم المقام عارف جاوید محمدی حفظہ اللہ کی زیرِ سرپرستی نواب صاحب رحمہ اللہ کی علمی تراث کے احیا کی خاطر یہ علمی مشروع شروع کیا گیا ہے، جس سے نواب صاحب رحمہ اللہ کی مولفات کو حسبِ ضرورت تحقیق و ترجمہ اور تسہیل کے ساتھ مناسب ترتیب سے مجموعات کی شکل میں شائع کرنا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قارئین کی خدمت میں نواب صاحب رحمہ اللہ کی عقیدہ توحید سے متعلق پندرہ کتب کو تحقیق و تسہیل کے بعد پیش کیا جا رہا ہے اور بقیہ کتب بھی موضوعاتی ترتیب کے ساتھ آنے والے دنوں میں شائع کی جائیں گی۔ ان شاء اللہ العزیز

گل روڈ، حمید کالونی گلی نمبر 5 گوجرانوالہ 055-3823990